دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ

کراچی

مئی 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

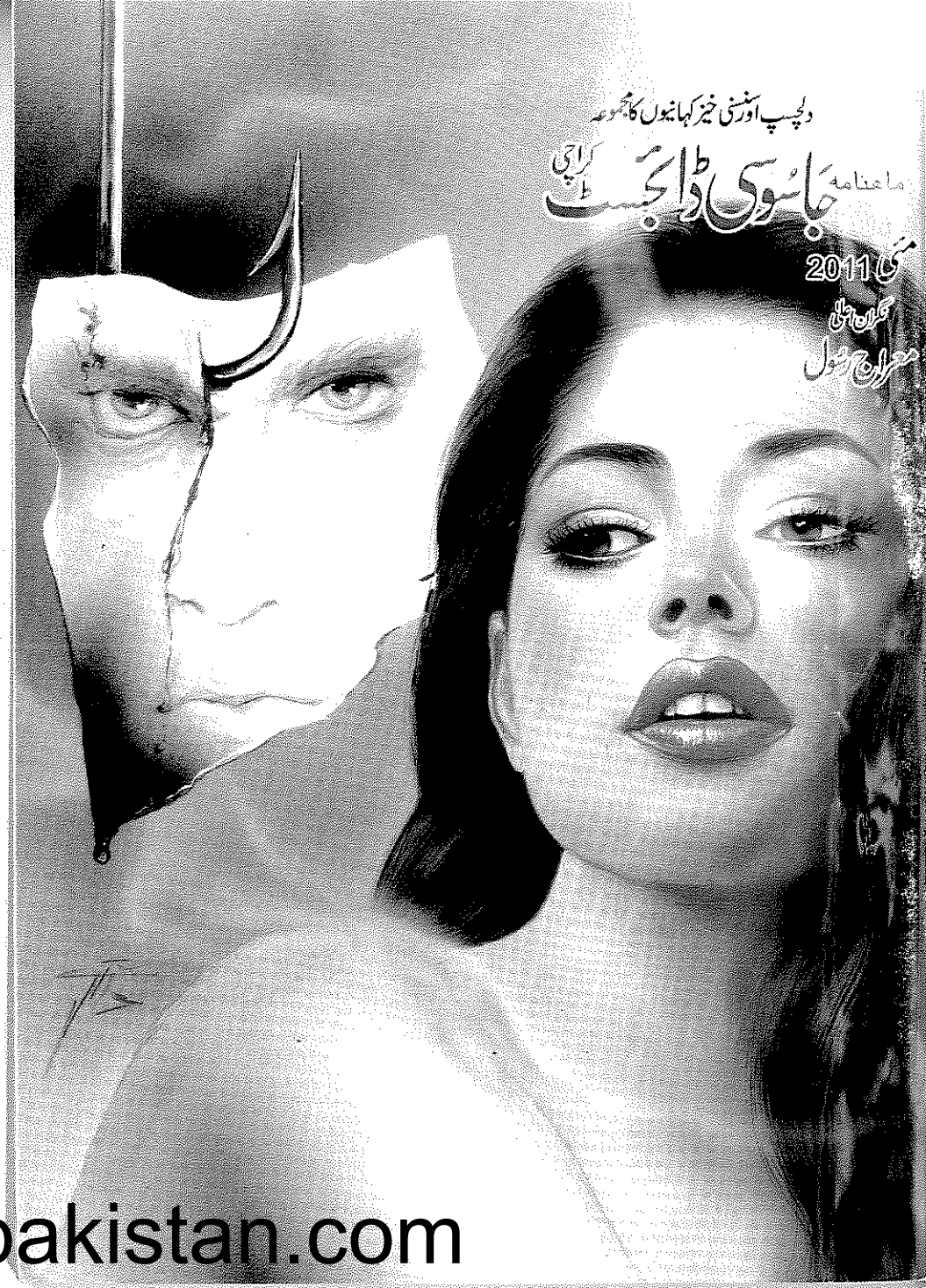

www.kahopakistan.com

www.kahopakistan.com

www.kahopakistan.com

www.kahopakistan.com

جینی، نکلتا چیونٹی
قارئین کی طرف سے بھیجی گئی کہانیاں، ان کی یادیں، شکایتیں اور تجاویز
مدیرِ اعلیٰ — 11

موت کے سائے
منظر امام — 18

تحفہ
صفر کو یادگار بنا دینے والی محبت کی انسانی کاوش
جمال دستی — 59

رقیب
اس لڑکی کی داستان جس کی محبت اور زندگی دونوں داؤ پر لگی تھیں
—محمد بلوچ — 67

انوکھا طریقہ
دو دوستوں کا ماجرا جن کی زندگی شاطرانہ چال کی نذر ہو گئی
تنویر ریاض — 81

للکار
اسے اپنے خوفناک جنگ کا سامنا تھا
طاہر جاوید مغل — 98

پیشہ ور
ایک چونکا دینے والے انجام کی حامل مزاج کہانی
محمد عفان آزاد — 131

فیصلے
حقیقی دنیا سے تعلق رکھنے والے کرداروں کی آگہی کی مہک لئے افسانہ
آصف ملک — 143

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

آسمانی تحفہ
اس تحفے کی کرامات جس نے انسانی زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا
سلیم انور — 153

مجسمہ
اس شخص کا قصہ عبرت جو انسانوں پر سے اعتبار کھو چکا تھا
ایم اے راحت — 157

گرداب
تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازیاں اور مقدر کا کھیل دیکھنے والے کرداروں کی کہانی
اسما قادری — 164

بڑا بھائی
محبت، انتقامی جذبات کے درمیان معلق ہو جانے والے کا شخصی احوال
مریم کے خان — 195

خطر پسند
ایک پولیس آفیسر کی مہم پسندی جو ہر محاذ پر اپنی فتح چاہتا تھا
سکندر ملاح — 207

تاوان
جانی انجانی منزلیں کرنے کی خواہش میں اک نئی دنیا پالینے والے شخص کی روداد
کاشف زبیر — 223

دلدل
انسانی فطرت کے قدرت کے قائم کردہ توازن سے انحراف کرنے والوں کا عبرتناک انجام
احمد اقبال — 262

تراش خراش
اقتباسات، لطیفے اور ٹیلے کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور ذوق کے لئے
ادارہ وقارئین — 000

جلد 40 • شمارہ 05 • مئی 2011 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 3502551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

www.kahopakistan.com

چینی، نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

مئی 2011ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اس وقت ایک شعر یاد آرہا ہے۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

روتوں کو ہنسانا بھی عبادت ہے اور ان کی تو بات ہی کیا جو بچوں سے زیادہ بڑوں کو ہنساتے رہتے تھے۔ پچھلا مہینا پاکستانیوں پر اس حوالے سے بہت بھاری گزرا کہ نڈھال اور افسردہ چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنے والے اپنے پرستاروں کو روتا چھوڑ گئے۔ اس ماہ ملک کے کروڑوں ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پھول کھلانے والے چار ممتاز فنکار یکے بعد دیگرے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ پہلے لیاقت سولجر کے کوچ کی خبر آئی... ان کے پیچھے مستانہ گئے... پھر ببو برال نے رختِ سفر باندھا۔ ان تینوں کے جانے کا غم تازہ تھا کہ خبر آئی کہ معین اختر کا دل بھی درد کے دریا کے آگے ڈھے گیا۔ ایک کے بعد ایک، پے در پے صدمات...! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومین کے صغیرہ و کبیرہ گناہوں کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں ابدی سکون عطا کرے۔

یکم مئی جو مزدوروں کے عالمی دن کے طور پر جانا جاتا ہے، ہر سال آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ اخباروں میں تصویری بیانات آتے ہیں اور پھر ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ کاش اس برس بندۂ مزدور کی حقیقی بھلائی کے لیے کچھ ہو سکے۔ اب تو حال یہ ہو چلا ہے کہ لیڈروں کو حکمراں بنانے والے دو وقت کی روٹی کمانا بھی دشوار پاتے ہیں اور ان کے حکمراں بلٹ پروف گاڑیوں کی گھات میں لگے ہوئے ہیں... ورلڈ کپ کے سیمی فائنل کا دکھ کم کرنے والی خبریں آنے لگی ہیں۔ شکر ہے کہ ویسٹ انڈیز میں ہمارے سپوتوں نے مسلسل ایک روزہ کرکٹ کے دو میچ جیت کر امنگوں کو تازہ کر دیا ہے۔ شاباش! اب یونہی کھیل کے جوہر دکھاتے رہنا۔ یہ قوم چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ترسی ہوئی ہے۔

چلیے... رخ کرتے ہیں آپ کی محفل کا جہاں پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں سے آئے ہوئے آپ ہی کے خطوط کی بزم سجی ہوئی ہے...

امِ ثمامہ کی جھنڈو سے آمد ''اپریل کا جاسوسی دو تاریخ کو مل گیا تھا۔ سب سے پہلے ٹائٹل سے آمنا سامنا ہوا۔ حسینہ کی بے حد لمبوتری شکل میں اگر کوئی چیز قابلِ غور اور قابلِ تعریف تھی تو وہ فقط اس کے کان کی بالی... (شکر ہے... کوئی ایک چیز تو پسند آئی) ٹائٹل پر بنی ٹھاہ ٹھاہ دیکھ کر مجھ سے زیادہ میرا بیٹا خوش ہوا اور ٹھاہ ٹھاہ تھا ہے جو بھائی صاحب مسکرا رہے تھے وہ خود نارنجی اور پیلی لہروں کے درمیان ڈھلتے ہوئے سورج کے مانند لگ رہے تھے اور نیچے بیٹے بھائی صاحب کافی ناراض تھے، شاید کسی فائنل ہارنے کی وجہ سے یا کوئی اور معاملہ تھا، اب یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میٹھی میٹھی چینی، نکتہ چینی میں پہلے اپنے خط کے بارے میں اتنے اچھے اچھے ریمارکس پڑھ کر دل گارڈن گارڈن ہو گیا، سب بہن بھائیوں کا بے حد شکریہ۔ علی آتش صاحب کو کرسیٔ صدارت پر براجمان ہونے کی مبارک باد۔ میرا سیال اور پریشے سیال نے سرورق کا جو بار ریوسٹ مارٹم کیا، وہ اچھا تھا۔ تنسیر بھائی کے مشورے اور تبصرہ کافی اچھا تھا۔ ادا ہمایوں ہماری عبارت خوش فہمی پر نہیں اعتماد کی بنیاد پر کھڑی تھی جس کا اندازہ آپ کو خط کے بارے میں تبصرے پڑھ کر ہو گیا ہوگا پھر بھی تعریف کا شکریہ۔ عائشہ رانی کی شگفتگی بھی اچھی تھی۔ رضا علی بھائی آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نثر نگار ہوں، اچھی ہوں یا بری یہ تو قارئین بہتر جانتے ہیں۔ (ہمیں تو معقول ہی لگتی ہیں) ڈیئر اینڈ سویٹ ماہا ایمان آپ کی ذہانت کی ہم داد دیتے ہیں۔ آپ نے ٹھیک پہچانا، آپ کی ذرہ نوازی ہے رائٹر لکھنے کے لیے ورنہ ابھی تو ہم طفلِ مکتب ہیں۔ دس گیارہ افسانے چھپنے سے کوئی رائٹر تھوڑی بن جاتا ہے (پھر وہ کیا کہلاتا ہے؟) Zong سب کہہ دو کے پس منظر میں منظر امام صاحب کی پرمزاح منظر نگاری نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ مختار آزاد کی کہانی کار بھی اچھی کاوش تھی مگر اس طرح قلم کار کو کامیابی، پیسا اور شہرت تو مل جاتی ہے مگر جب عمر کی نقدی ختم ہونے لگتی ہے تو دل پر بے ایمانی کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے... (یہی تو صد افسوس الیہ ہے... کوئی بھی خرابی بے انتہا بار کے بعد ہی محسوس ہوتی ہے) سلیم انور کی سونے کی کان ایک انوکھی اور اچھی کہانی تھی جسے پڑھ کر دھک دھک کرتے اپنے دل کی سلامتی کی دعا مانگی۔ پہلا رنگ کچھ خاص نہیں تھا لیکن دوسرا رنگ کافی پرتجسس تھا۔ پھر اسامی کی گرداب پڑھی۔ کہانی کا پہلے والا ٹیمپو نہیں رہا۔ کہانی اور کردار دونوں کا پھیلاؤ اب ہر قسط میں بندے مار کر ختم کیا جا رہا ہے اور پھر شہریار کے ساتھ جو کچھ ہوا، کہانی کا چارم تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ آخر میں نہایت اطمینان کے ساتھ للکار کے پاس پہنچے۔ محدود سوچ کے انتہا پسند ہندوؤں نے جو کچھ کیا اور پھر جو کچھ ان کے ساتھ ہوا، وہ مکافاتِ عمل تھا۔ مندر والے سین پڑھتے ہوئے بالکل یوں لگا کہ سب کچھ ہمارے سامنے ہی ہو رہا ہے اور یہ کسی بھی رائٹر کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے کہ قاری خود کو اسی ماحول کا ایک حصہ محسوس کرے اور طاہر جاوید مغل صاحب کی تو کیا ہی بات ہے۔'' (لاڈلی بھتیجی، ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ قارئین کے تمام خطوط من وعن شائع کیے جائیں۔ اچھے بچے ناراض نہیں ہوتے...)

رشی پاکستانی کا اختصاریہ نامعلوم جگہ سے ''جاسوسی میں پہلی بار خط لکھ رہے ہیں (خوش آمدید) بہت زبردست ہے اور پڑھنے میں بھی بہت مزہ آیا۔ ویسے تو سارے ہی رائٹرز اچھا لکھتے ہیں لیکن ہمیں ذاتی طور پر احمد اقبال اور محی الدین نواب بہت پسند ہیں۔''

دنیا بھر سے اچھے برے انسانوں کی
سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں،

ماہنامہ سرگزشت

منفرد و خاص شمارہ
پراسراریت نمبر

حیران کن واقعات جو عقل کو ماؤف کر دیں جن کا کوئی
علمی جواز نہ ہو مگر وہ زندگی کی اٹل حقیقتیں ہوں...

اپنے سحر میں جکڑ لینے والی پراسرار، انوکھی
اور محیر العقول سچ بیانیاں، قصے اور کہانیاں

تحقیقی مضامین سے سجا ایک ایسا خصوصی
شمارہ جو سرگزشت ہی پیش کر سکتا ہے

بہت جلد پیش کیا جا رہا ہے

www.kahopakistan.com

نادیہ خان دھیر، کرم پور سے لکھتی ہیں ”اس بار رسالہ 5 اپریل کو ملا۔ حسینہ سرورق پسند آئی۔ چینی، نکتہ چینی میں علی آتش کرسیِ صدارت سنبھالے بیٹھے تھے۔ اب تو آپ خوش ہیں کہ آپ کا مایوسی کا دورہ خوشی کے دورے میں بدل گیا۔ ڈبل سیال کا تبصرہ اچھا تھا۔ سفیان ہاشمی اب ذرا یہ بتائیں کہ آگے آپ کی توجہ کا مرکز کیا ہے؟ ہمایوں سعید! جب آپ تبصرہ لکھتے ہیں، ساتھ میں یہ بھی لکھ دیا کریں کہ اگلے ماہ سرورق کیسا ہو پھر شاید آپ کو ٹائٹل بھا جائے۔ بشیر احمد! الفاظ کا چناؤ اچھا تھا۔ تفسیر عباس صاحب! کہیں آپ ڈاکٹر تو نہیں جو آپ نے دوشیزہ سرورق کی بیماری کا پتا لگا لیا۔ سید محی الدین اشفاق! تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ وہاڑی میں ایک دلنشین بیکری ہے۔ جب میں محفلِ یاراں میں دلنشین بلوچ کا نام پڑھتی ہوں، میرا دل اس بیکری کے سینڈوچ کھانے کو کرتا ہے۔ ڈبل مرزا! ذرا یہ تو بتا دیں کہ آپ کون سا سونگ گنگنا رہی ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ کاشف زبیر کی طمع بے کنار دل کو بھا گئی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دکھ کے بعد خوشی ضرور ملتی ہے۔ شاہ میر نے جہاں اپنوں کی بے وفائی اور بے حسی کا غم اٹھایا، وہاں اسے لیلیٰ جیسی وفاشعار اور محبت کرنے والی جیون ساتھی بھی ملی کیونکہ احساس کے رشتے خون کے رشتوں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ آزادیِ جرم مجموعی طور پر اچھی تھی۔ Zong کے تعاون سے جڑواں شادی بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور کر گئی۔ اس بار گرداب کی قسط پڑھ کے بہت مزہ آیا جبکہ چھٹکارا کے اختتام نے چونکا دیا۔ آصف ملک کی شکست سسپنس سے بھرپور تھی۔“

اوکاڑہ سے تصویر العین کا عکسی تبصرہ ”اس دفعہ جاسوسی کی ٹائٹل گرل تو خوب صورت تھی لیکن ذاکر انکل! آپ نے اس کا ماتھا بڑا بنا دیا تھا۔ اوپر موجود شخص پستول سے نشانہ لے کر لوگوں کو منع کر رہا تھا کہ خبردار جو کسی نے لڑکی پر بری نظر ڈالی تو... اور سائڈ پر درمیان میں موجود شخص نہ جانے کیسے اپنی سنجیدہ نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ بہرحال، ٹائٹل کے بعد ہم چینی، نکتہ چینی کی محفل میں پہنچے۔ صدارت کی کرسی پر علی آتش بیٹھے ہوئے نظر آئے، مبارکاں جی مبارکاں۔ مبر اسیال اور پریشے سیال اپنے تبصرے میں سفیان ہاشمی کو مشورہ دیتی نظر آئیں۔ اتنے عرصے کے بعد ہمایوں سعید عرف رومیو کو محفل میں موجود پا کر دلی خوشی ہوئی۔ ویسے ہمایوں آپ کو کس نے مشورہ دیا کہ کرکٹ کا بخار چڑھا لیں۔ انجام دیکھا کیا ہوا۔ بشیر احمد بھٹی ٹائٹل کے بارے میں آپ کے خیالات پڑھ کر مجھے لگا آپ یقیناً سلطان راہی کی فلمیں شوق سے دیکھتے ہوں گے۔ قمر زمان ... ہم آپ کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتے ہیں، آئندہ بھی شرکت کرتے رہا کریں۔ رضا علی، شادی کی بہت بہت مبارک۔ چلیں آپ بھی پابہ زنجیر ہوئے۔ طمع بے کنار کاشف زبیر کی کہانی بہت اچھی تھی۔ لیلیٰ کا کردار اچھا لگا۔ منظر امام کی جڑواں شادی پڑھ کر تو ہماری ہنسی نکل گئی۔ للکار اس دفعہ کچھ تیزی آئی ہے۔ یعنی دو اسٹیپ کہانی آگے کو بڑھی۔ اب دیکھتے ہیں کہ عمران تابش کی گردن سے وہ چپ نکال سکے گا یا نہیں اور جہاں تک تابش کے درد کا سوال ہے، یہ بھی یقیناً دشمنوں نے اس چپ کے ساتھ کچھ کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ سلطانہ جلد یا بدیر تابش کی زندگی سے نکل جائے گی، مر کر یا پھر ویسے۔ آخر کو ابھی ہیروئن کی انٹری ضروری ہے۔ آپ نے تابش کے بارے میں تو سب بتا دیا طاہر انکل لیکن عمران کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ آصف ملک کی شکست میں رنگیلا نے میکس کے ساتھ اچھا کیا مگر افسوس کہ وہ اپنی ہار برداشت نہ کر سکا اور خود کو گولی مار لی۔ بابر نعیم کی شکار میں ڈونا اور فرینک چالاک ثابت ہوئے لیکن جارج ان کا بھی باپ ثابت ہوا اور مرتے مرتے بھی فرینک کو پھنسا دیا۔ گرداب، اسما قادری آپ نے کہانی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ لگ رہا ہے کہ اب آپ اس پر اپنی گرفت مضبوط نہیں رکھ پا رہیں... کہانی ایک دم بور ہو گئی ہے۔ آپ گرداب میں کچھ زیادہ ہی تلخی دکھا رہی ہیں جبکہ ہمیں حقیقت میں بھی اس کا سامنا ہے۔ اب ہم کہانی اس لیے تو نہیں پڑھتے کہ اپنا ڈپریشن اور بڑھائیں۔ آپ نے ہیرو ہیروئن کے ساتھ برا کیا۔ ان کے تمام ہمدردوں کو آپ کہانی میں مار رہی ہیں۔ کیا آپ تھوڑا دشمنوں کا نقصان نہیں دکھا سکتیں۔ کہانی پڑھ کر تو بلڈ پریشر بڑھنے لگتا ہے۔ ظفر سعید یوسفی کی خوف پیا لوہے کو لوہا کاٹنے کی عملی تفسیر نظر آئی۔ محمد عثمان کی نیکی کا صلہ بھی اچھی کہانی تھی۔ چھٹکارا میں ریکا نے گیبرائل کے ساتھ بہت برا کیا۔ پہلا رنگ طلسمِ خواب میں دلاور خان نے افضل اور اکبر کے ساتھ اچھا کیا۔ آستین کے سانپ کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ دوسرا رنگ معما موت، انسپکٹر اسد نے وصی کے قتل کا کیس اچھی طرح ہینڈل کیا۔“

تفسیر عباس بابر کی اوکاڑہ سے نیک تمنائیں ”سرورق ایکشن سے بھرپور تھا۔ دونوں صاحبان کے عزائم یقیناً پُرخطر ہیں۔ دوشیزہ سرورق کی ضرورت سے زیادہ لمبی گردن ناقابلِ قبول ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے صراحی کے اوپر تربوز رکھ دیا ہے (ایسا غضب تو نہ ڈھائیں) اپنے ذاکر صاحب نے۔ تبصروں کی دنیا میں تصور سے علی آتش کے تبصرے سے زیادہ... نام نے متوجہ کیا... مبر اسیال نے بھی اپنی عقل بندی کا خوب مظاہرہ کیا۔ بنوں سے ہمایوں سعید اب تو یقیناً آپ کا کرکٹ کا بخار اتر گیا ہوگا۔ قمر الزماں خاموش صاحب شکر کریں آپ کا پہلا تبصرہ بروقت پہنچ کر شاملِ اشاعت ہو گیا ورنہ اب تو یوں ہو رہا ہے کہ تبصرہ تب پہنچتا ہے جب دوسرا تبصرہ شائع ہو چکا ہوتا ہے، یہ ہے مستقبل کا پاکستان۔ وہاڑی سے نادیہ خان بقول اپنے اپنے خوب صورت ہاتھوں کی نمائش کر رہی تھیں۔ اسے کہتے ہیں اپنے منہ میاں مٹھو۔ ٹیکسلا سے دلنشین بلوچ آپ جیسی عقل بند کے لیے تو اشارہ بھی فضول ہے۔ ساہیوال سے اعجاز احمد کی رائے ہائے ہائے پر آپ اتنے مایوس کیوں ہیں؟ کہوٹہ سے قمر تق کافی عجلت میں تھے۔ اقبال مرزا! سرورق پر آپ کی تصویر ہو تو وہ خطرناک ہی ہو سکتا ہے۔ حافظ آباد سے ماہا ایمان کو اس عمر میں بھی اٹکھیلیاں سوجھ رہی ہیں (تو آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں... آپ کا نقشِ ثانی ہیں) ملتان سے عائشہ رانی! اب آپ کو کون بتائے کہ عاجز صاحب آپ جیسی بونگیوں کی اونگیوں بونگیوں سے ہی عاجز ہیں۔ سب سے پہلے کاشف زبیر کی اثر انگیز تحریر طمع بے کنار ملاحظہ کی۔ دولت کی ہوس میں ایک بار پھر چند زر پرستوں نے دامنِ انسانیت کو تار تار کر دیا۔ مریم خان کی آزادیِ جرم شہرِ لاقانونیت کے چند باشندوں کا عبرت انگیز واقعہ دعوتِ فکر دے گیا۔ زونگ کے بھرپور تعاون سے خوش گفتار مصنف کی ہلکی پھلکی تحریر جڑواں شادی بوجھل لمحوں کے لیے اکسیر تھی۔ مغلِ اعظم کی للکار نے اس ماہ بھی میلا لوٹ لیا۔ انتہا پسند مذہبی ٹولے کا انجام متاثر کن رہا۔ سلطانہ کی زندگی کی طرف واپسی خوشگوار عمل ہے۔ اسما قادری کی گرداب اسی اور لڑائی جتنی بڑھا لو... بڑھتی جاتی ہے (واہ...) اب ایک کہانی میں اتنی کہانیاں کون پڑھے۔ رحم کی اپیل ہے۔ پہلا رنگ طلسمِ خواب بربادِ محبت کا دلخراش قصہ مغموم کر گیا۔ معما موت دوسرا رنگ حسام بٹ نے یقیناً ملک صفدر حیات سے متاثر ہو کر لکھا۔“

محسن علی قوم کے بالاکوٹ سے نادر خیالات ”انتظار کتنا جان لیوا ہوتا، یہ وہی جانتے ہیں جنھوں نے انتظار کیا ہو (اور آپ کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے) انتظار کی طویل گھڑیوں بلکہ دنوں کے بعد جاسوسی نے اپنا دیدار دیا۔ ٹائٹل پر موجود حسینہ ماہ جبیں کی نشیلی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں تو دل گویا دھڑکنا ہی بھول گیا۔ (سبحان اللہ) پیچھے موجود بھائی صاحب نہ جانے کس کا نشانہ لے رہے تھے اور ٹیڑھی نظروں سے ہمیں بھی دیکھ رہے تھے۔ محفلِ یاراں میں وکٹری اسٹینڈ پر علی آتش کو آتش بازی کرتے ہوئے پایا، مبارکاں جی۔ ہمایوں سعید راج! اب تو آپ کا بخار اتر گیا ہوگا کرکٹ کا؟ نادیہ خان، اعجاز احمد کا تبصرہ بس ایویں نہیں تھا، آپ سمجھی نہیں۔ دلنشین بلوچ! اتنی بھی افسردگی کیا، تبصرہ ریجیکٹ ہوا آپ تو نہیں۔ ایسا صرف آپ کے ساتھ نہیں، بہت سوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ (یقیناً... شاید کہ اتر جائے دل میں تیری بات) کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی جو ہمیشہ کی طرح زبردست تھی۔ للکار کے بعد گرداب پڑھی، ماہ بانو کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ہمارا پارا کافی چڑھا ہوا ہے۔ اسما جی پلیز کہیں تو اسے کچھ عرصہ سکون سے رہنے دیں۔ پہلے صفحات پر موجود کاشف زبیر کا دلچسپ شاہکار طمع بے کنار مزہ دے گیا۔ جڑواں شادی نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ فرحان کے تو مزے ہی ہو گئے۔ (آپ پر پابندی تو نہیں... آپ بھی اٹھائیں) سونے کی کان ایک انوکھے انداز میں لکھی گئی تحریر تھی۔ اب مکان کے بجائے دھڑکن کا ہی کرایہ، واہ۔ اونچی بولی درمیانے درجے کی تحریر تھی۔ شکست ایک مختلف تحریر تھی جس میں سسپنس بہت زیادہ تھا۔ کہانی کار میں ان کے لیے اچھا مشورہ ہے جو لکھنا چاہتے ہیں۔ بازی، خوف پیا اچھی تحریریں تھیں۔ خود کردہ، جلد بازی بری چیز ہے۔ خود کردہ میں بلیڈ نے جلد بازی میں خود ہی محبوب کو مار ڈالا۔“

فہیم تبسم کی درخواست شورکوٹ سے ”بک اسٹال پر جاسوسی کی آمد تین اپریل کو ہوئی اور میں نے فوراً اچک لیا۔ اس بار جاسوسی نے شاید غسلِ آتش کیا ہوا تھا۔ سرورق پورا کا پورا آتشی رنگ سے مزین تھا، ماسوائے ایک حسینہ ماہ جبیں کی سیاہ گھنی زلفوں اور پنکھڑیوں جیسے ادھ کھلے ہونٹوں کے۔ حسینہ کی نیلی گہری آنکھیں بھی لفظ ”واؤ“ سے ماخوذ تھیں۔ سرورق حسینہ کی پشت پر ایک سفاک شخص کسی کو شعلہ بار نظروں میں تول رہا تھا۔ (کہیں وہ آپ تو نہیں؟) عین اوپر ایک صاحب ڈینجر زون کے کل مختار بنے کسی کو شوٹ کرنے میں کہنہ مشق نظر آ رہے ہیں۔ چینی، نکتہ چینی میں علی آتش کسی بھی طرح اول کے حق دار نہیں لگ رہے تھے۔ پتا نہیں ان کا تبصرہ صدارت تک کتنی سفارشوں کے بعد پہنچا ہے۔ مبر اسیال اینڈ پریشے سیال! آپ کے تبصرے کا شعر موجودہ حالات کی عکاسی کر رہا ہے۔ سعید راج! کرکٹ کا بخار جس تیزی سے چڑھا تھا، دگنی رفتار سے چھومنتر ہو گیا ہے اور ساتھ میں اتنی نقاہت چھوڑ گیا ہے کہ کرکٹ کے تلفظ بھی بہ مشکل ادا ہو رہے ہیں۔ رضا علی! ہماری طرف سے بھی شادی کی ڈھیروں مبارک باد۔ ماہا ایمان کو بھی حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے پر مبارک باد۔ معاف کرنا تھوڑا دیر سے گویا ہوا ہوں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار اور گرداب پڑھیں۔ للکار میں شدت پسند کٹر ہندوؤں کے گروہ کی ظالمانہ اور سفاک رسموں کے بارے میں پڑھ کر تھرتھراہٹ سی طاری ہو گئی۔ جاوید انکل! میرا خیال ہے کہ تابش کے اندر جو چپ نصب ہے وہ اب نکل جانی چاہیے۔ (او جی... انہوں نے آپ کا حکم مان لیا) اسما قادری گرداب کو احسن طریقے سے بڑھا رہی ہیں۔ ساتھ میں معاشرتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈال رہی ہیں۔ پہلا رنگ طلسمِ خواب میں کافی جھول تھے۔ سلیم فاروقی نے کہانی کے ہیرو کو بھرپور ایکشن میں دکھایا، وہ بھی نان اسٹاپ۔ ہیرو نے جس طرح کی خون ریزی کی ابتدا میں اس کے خیالات اس کے برعکس تھے۔ (زندگی اسی کا نام ہے۔ اس میں کوئی شے جامد نہیں رہتی۔ ہر چند یہ ہر خیال تغیر کی زد میں آتا ہے) نیز اختتام بہت اندوہناک تھا۔ دوسرا رنگ حسام بٹ نے اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیا۔ انسپکٹر اسد نے ایک آئیڈیل پولیس افسر کا کردار نبھایا اور وصی کی موت کا معما حل کیا۔ Zong سب کہہ دو تعاون کہانی ہلکی پھلکی مسکراہٹ بکھیرنے میں کامیاب رہی۔ آخر میں تمام دوستوں سے اپیل ہے کہ میرے والد محترم شدید علیل ہیں، ان کے لیے دعا گو ہوں پلیز۔“ (اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد صحت یابی عطا فرمائے)

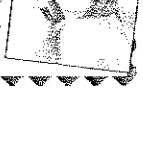

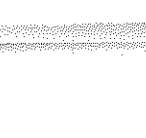

ایم عزیز اسد کے شکوے چکوال سے ”طویل انتظار کے بعد جاسوسی کے درشن ہوئے مگر ہمارا نام گناہ گاروں کی لسٹ میں شامل تھا۔ (اب ہم کیا کہیں... آپ نے خود ہی قبول کر لیا) علی آتش مبارک ہو پہلے آنے پر۔ ہمایوں سعید راج! اب تو آپ کا بخار بڑی اچھی طرح اتر گیا ہوگا۔ (اب تو اتر ہی جانا چاہیے) قمر زمان! کوئی ہمیں بھی ٹوٹکا بتاؤ مکھن لگانے کا۔ غلام اللہ جی کچھ زیادہ ہی نہیں ہو گیا... مرزا سسٹرز کا تبصرہ اچھا تھا۔ للکار ہمیشہ کی طرح زبردست رہی۔ تابش ایکشن ہیرو بن رہا ہے جبکہ عمران نے کوئی خاص کارروائی نہیں کی، پر مندر میں دو کھوپڑیاں صحیح وقت پر اڑائیں۔ اب پتا نہیں تابش کی چپ کس طرح نکلتی ہے۔ طمع بے کنار کاشف زبیر کی ایک خوب صورت تحریر تھی۔ طلسمِ خواب میں سلیم فاروقی صاحب اپنے مخصوص انداز میں جوشیلے ہیرو کے ساتھ موجود تھے۔ دوسرا رنگ بھی ٹھیک ہی تھا۔“ (ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے ہماری غلطی کی نشان دہی کی... شکریہ)

اے کے خان کی تعریفیں خانیوال سے ”جاسوسی حسبِ سابق پانچ تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے ٹائٹل کو دیکھا۔ ٹائٹل کچھ الجھن آمیز تھا۔ ایک طرف زرق برق لباس میں ملبوس طرح دار حسینہ اور ان کے عقب میں ریوالور بردار آدمی۔ ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا۔ (اچھا... چلو کوئی بات نہیں) اس کو کراس کرتے ہوئے ہم حلقۂ یاراں میں پہنچے تو علی آتش صاحب کو کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ آتش دان صاحب مبارک۔ للکار میں اس دفعہ کوئی خاص ہلا گلا نہیں ہوا۔ ہیرو بھیا اور تابی دفاعی پوزیشن میں رہے۔ ایک بات سمجھ نہیں آ رہی کہ تابی ثروت کو بھول کر دن بہ دن سلطانہ کے کیوں قریب ہو رہا ہے؟ نہ جانے اس کا وہ جنون کہاں کھو گیا ہے۔ گرداب بہت اچھی رہی۔ شہر یار نے ایک کامیابی حاصل کر لی۔ چودھری تو ماہ بانو اور کشور کے غیاب پر باؤلا ہوا جا رہا ہے۔ قسط کا اینڈ ذرا افسوسناک تھا۔ پہلا رنگ چودھری دلاور کی غمناک کتھا تھی۔ بے چارے کو اکبر لے ڈوبا۔ واقعی زندگی کی راہوں پر کچھ ایسے مسافر ملتے ہیں جنھیں دوست کے بجائے آستین کے سانپ کہنا شاید بہت بہتر ہوتا ہے۔ دوسرا رنگ معما موت مختصر مگر پُراثر تحریر تھی۔ کاشف زبیر کی طمع بے کنار، حسد، جرم، محبت اور ہلکے سے ایکشن کا بھرپور مکسچر تھی۔ نازک لمحات میں جانی کشتی بان کی جانبازی کی وجہ سے ہی مجرموں کی بساط الٹ گئی۔ ویسے اگر بیسٹ رائٹر آف دی منتھ کا کوئی ایوارڈ ہوتا تو کاشف زبیر کو ملتا۔ کاشف صاحب ویلڈن۔“

www.kahopakistan.com

سکھر سے آغا فرید احمد خان کے فرمودات ”یکم اپریل کی شام جاسوسی ہمارے ہاتھوں تک پہنچا تو شکر بجالائے۔ حسینہ سرورق بڑی محبت اور چاہ سے ہمیں دیکھ دیکھ کے خوش ہورہی ہے، پر یہ اس کی سراسر خوش فہمی ہے کہ ہم بھی اس کی طرح اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے کیونکہ حسینہ کے پیچھے پسٹل لیے میرا رقیب روسیاہ مجھے ہرگز یہ کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ (پس منظر کی کہانی تو ہمیں پتا ہی نہیں تھی) خیر، ذاکر انکل کو داد دیتے ہوئے آگے چلے۔ ہمیشہ کی طرح آپ کی کج ادائی نے ایک بار پھر اداس کردیا۔ اس ماہ تو ٹائم پر خط کو سپرد خاک کردیا تھا پھر بھی ہمارے ساتھ یہ سلوک سمجھ سے باہر ہے۔ علی آتش! مبارک باد کہ وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے ہوگئے۔ میرا سیال اینڈ پریشے سیال! شعر کے علاوہ تبصرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ دلنشین بلوچ عرف ہیلفی! جس سے جھٹ جاؤ چھوڑنے کا نام نہیں لیتیں اگر لیٹر نہیں چھپتا تو میری طرح تعویذ گنڈے کرواؤ پھر دیکھنا۔ عائشہ رانی! پلیز بتانا کہ امی کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اعجاز احمد صاحب! ویل ڈن، آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ انفال مرزا اینڈ صبا مرزا! تبصرہ لکھنے کا مرکزی خیال آپ دونوں میں سے کس کا ہے؟ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے سلسلہ وار کہانی للکار کی پندرھویں قسط پڑھی جس میں اب ہماری دلچسپی کے لیے کچھ بھی نہیں رکھا۔ ہیرو بھائی کے واپس آنے پر کچھ امید ہو چلی تھی کہ کہانی کا ٹوئسٹ کچھ اور ہوگا، پر ہماری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ میرا خیال ہے کہ کہانی کو انڈیا سے لے کر پاکستان لے آنا چاہیے یا پھر یہیں ختم کرنا چاہیے۔ (پسند ناپسند اپنی اپنی... آپ کو تنقید کا حق ہے) دوسرا سلسلہ گرداب اپنے تمام تر ایکشن کے ساتھ جاری وساری ہے۔ جیسا کہ ماہ بانو پہلے بھی بہت بڑی مصیبتوں سے نکل آئی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ شہر یار عادل نے تو گھر بسالیا۔ اب میرا خیال ہے کہ اسلم ڈاکو سے ہیرو بچنے والا ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ طلسم خواب مزہ دے گیا۔ سلیم فاروقی کے قلم سے لکھا یہ خاص تحفہ ہم نے دل سے پڑھا۔ (اچھا... پھر آنکھوں سے محسوس کیا ہوگا؟) یہ ضروری نہیں کہ جو ہم چاہیں وہ ہو، ہر کہانی میں تھوڑا اختلاف تو ہوتا ہی ہے جیسے کہ ہم چاہتے تھے کہ ریشماں نہ مرتی اور ولا اور کومل جاتی لیکن پھر بھی کہانی بہت پسند آئی۔ دوسرا رنگ معما موت بھی کم دلچسپ نہ تھی۔ اس نے بھی بہت سوچنے پر مجبور کیا۔ سوچتے سوچتے دماغ کی دہی ہوگئی لیکن قاتل کوئی اور نکلا۔ ویل ڈن حسام بٹ صاحب۔ پہلے صفحات پر کاشف زبیر طمع بے کنار لائے۔ کردار، مکالمے، پیار محبت ہر چیز اپنی جگہ فٹ تھی۔ یہاں بھی تھوڑا سا اختلاف کرنا تھا لیکن کروں گا نہیں کیونکہ یوں بھی ٹھیک تھا۔ (اس کا بھی اختیار ہے... تنقید، اختلاف اور اعتراض...) منظر امام کی جڑواں شادی میں پورے مطالعے کے دوران لبوں پر مسکراہٹ ایک پل کے لیے بھی جدا نہ ہوئی۔ چھوٹی کہانیاں اچھی تھیں۔“

سمین شمین کی ابجد بلوچستان سے ”جاسوسی کا شمارہ اس دفعہ مجھے 4 اپریل کو ملا۔ سرورق سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنی پیاری محفل نکتہ چینی میں پہنچا۔ علی آتش کو وکٹری اسٹینڈ سنبھالنے پر مبارک باد۔ دلنشین صاحب! اپنا خط شامل نہ ہونے پر ٹپ ٹپ آنسو گرا رہی تھیں۔ دلنشین! حوصلہ رکھو، دیکھو اس دفعہ آپ کا خط شامل ہوگیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کہانی للکار سے ابتدا کی۔ کہانی پچھلی کچھ قسطوں سے ایک ہی دائرے کے اندر گھوم رہی ہے۔ گرداب میں اسماجی شاید ماہ بانو کو اغوا کرانے کا ورلڈ ریکارڈ قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اسماجی پلیز! کشور کے بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ پہلی کہانی کے ساتھ اس دفعہ کاشف انکل حاضر تھے۔ ویلڈن انکل، اتنی اچھی کہانی لکھنے پر۔ سرورق کے رنگوں میں پہلے رنگ کے ساتھ سلیم فاروقی موجود تھے اور انہوں نے کہانی اپنے مخصوص اسٹائل میں لکھی تھی۔ دلاور کا علی نواز کو جوریشماں کی عصمت کا لٹیرا تھا، یوں معاف کردینا مجھے اچھا نہیں لگا۔ حسام بٹ اس دفعہ معما موت کے ساتھ حاضر تھے۔ کہتے ہیں لالچ بری بلا ہے۔ شاکر علی بھی وسی کو کرائے کے قاتل سے مروانے کے باوجود خود پھنس گیا۔ چھوٹی کہانیوں میں آزادی جرم، سونے کی کان، اونچی بولی، بازی اچھی کہانیاں تھیں۔ مختار آزاد کی کہانی کار مجھے بالکل اچھی نہیں لگی۔ شگفتہ کہانی جڑواں شادی کا نام تیسری شادی ہونا چاہیے تھا۔ شکست میں مجھے میکس پر شروع سے شک ہوگیا تھا کہ یہ قاتل ہے۔“

بورے والا سے روبینہ امجد کیانی کی فکریں ”اپریل کا شمارہ 3 کو ملا۔ ماہ بانو کی فکر میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ ڈاکوؤں کے نرغے میں رہ کر بھی ماہ بانو کو گل و گلزار مل گئے ہیں۔ پتا نہیں آخری قسط تک اسے بچا سکیں گی یا نہیں۔ کشور اور آفتاب ایک دفعہ پھر مشکلات میں۔ چلیں اے ایس صاحب کسی طرف تو پہنچے ہیں اور وڈی چودھرائن اپنی طرف سے چودھری کو انکشاف سنا رہی ہے۔ گھر میں رہتے ہوئے اسے چودھری کے کرتوت پتا نہیں چل سکے۔ للکار بہت ہی پیاری کہانی ہے۔ سرورق کے رنگوں میں معما موت اتنا بھی معما نہیں تھا۔ اس کی نسبت طلسم خواب اچھی تھی لیکن ایک بات ہے کہ میٹرک کا اسٹوڈنٹ ہوکر چھوٹے چودھری نے اتنے قتل کردیے اور بڑا چودھری اور ملک صاحب دونوں انہیں بھولو کر بیٹھے رہے تھے کیا۔ ابتدائی صفحات کے لیے اس مرتبہ کاشف زبیر طمع بے کنار لے کر آئے۔ اتنا اچھا لکھنے پر کاشف صاحب کو ہماری طرف سے مبارک باد۔ آصف ملک نے مغربی ماحول پر شکست لکھی۔ ایڈونچر کے شوق میں نینا اور میریا تو گئیں البتہ ریچل مرنے سے پہلے قاتل کو شکست دے گئی۔ جاسوسی کا سرورق پُراسرار ہونا چاہیے۔ اس دفعہ بس سادہ ہی تھا۔ اب ذرا محفل کی بات ہوجائے۔ تو جناب محفل میں جاتے ہی چینی کی گرانی واضح نظر آنے لگی ہے۔ اس دفعہ پہلے نمبر پر علی آتش آئے۔ ویسے انکل! کیا جو تبصرہ سب سے پہلے مل جائے اسے ہی پہلے نمبر پر قرار دیتے ہیں آپ؟ باقی سب تبصرے بس ٹھیک ہی تھے۔ انکل! میرا خط ضرور شامل کیجیے گا۔ اتنی دور سے اتنی... چاہ سے لکھ رہی ہوں۔ ایمرجنسی لائٹ کی روشنی میں بیٹھ کر لکھا ہے اگر شامل ہوا تو انشاء اللہ ہر ماہ لکھا کروں گی...“

تنویر احمد کا شکوہ و فرمائش نوشہرہ سے ”میرا خط شامل نہ ہونے کی وجہ بتایئے انکل۔ میں اتنے پیار سے لکھتا ہوں اور جب شامل نہ ہو تو دل بہت درد کرتا ہے۔ اب آتے ہیں خوب صورت رسالے کی طرف۔ سرورق پر حسینہ اس دفعہ اچھی نہ تھی۔ للکار اور گرداب اچھی کہانیاں ہیں۔ پلیز اسما قادری، مردوں کی اتنی توہین نہ کریں۔ آپ نے کہانی میں مردوں کی توہین کی ہے۔ مرد اچھے بھی ہیں اور برے بھی ہیں۔ پاکستان اس دفعہ تو ورلڈ کپ نہ جیت سکا لیکن انشاء اللہ دوسری دفعہ جیت جائے گا۔ عائشہ رانی اور ایم احمد ہاشمی آپ دونوں سے ایک سوال پوچھنا ہے کیا آپ کو پشتو آتی ہے؟ ہمایوں سعید راج، عباس بابر اور نادیہ خان کی باتیں بہت اچھی تھیں اس دفعہ آمنہ پٹھانی غائب تھیں۔ انکل میں آپ کا سسپنس اور سرگزشت بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ جھوٹ نہیں بولتا ہوں، انکل یہ سچ ہے۔ مجھے گھر میں بھی کہتے ہیں کہ ڈائجسٹ مت پڑھو لیکن میں پڑھتا ہوں کیونکہ یہ تینوں تو میرے دل کی جان ہیں۔ ماہا ایمان کی باتیں بہت اچھی تھیں۔ دونوں رنگ اچھے تھے۔ بازی، شکست، کہانی کار، آزادی جرم، سونے کی کان، اونچی بولی سب اچھی تھیں۔ پلیز! رائٹر کے انٹرویو بھی شائع کریں۔ آخر میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ کاشف زبیر کو کہیے کہ پلیز ایک قسط وار کہانی لکھیں۔ انکل! کیا جاسوسی ڈائجسٹ میں پہلے قسط وار کہانی ناگن کی شائع ہوئی ہے کہ نہیں۔ پلیز جواب ضرور دیں۔ آخر میں ڈائجسٹ کے لیے دعا گو ہوں۔ پلیز پلیز، میرا خط ضرور شامل کریں۔ میں پہلا قاری ہوں جو نوشہرہ سے خط لکھ رہا ہوں اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں ڈائجسٹ سے کتنا پیار کرتا ہوں۔“

عائشہ رانی کی گفتار ملتان سے ”جاسوسی حاصل کرنے کے لیے اس مرتبہ مجھے خود جاسوسی کرنا پڑی۔ پھر کہیں جا کے شمارہ اپریل موصول ہوا۔ (مبارک ہو پھر تو آپ ڈیٹیکٹو بن گئیں) ٹائٹل نارمل تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھوں اور ذاکر انکل کو لڑکی سیدھا کرنے کا مشورہ نہ دوں بلکہ رسالے کو الٹا، سیدھا، ٹیڑھا کر کے دیکھ لیا کروں۔ (ہاں...) پچھلے بھائی صاحب اچھے نشانہ باز معلوم نہیں ہوتے ورنہ اب تک تو مجھے گولی لگ بھی چکی ہوتی۔ میرے نہ مرنے پر بزرگ کافی پریشان حال دکھائی دے رہے ہیں۔ کوئی گل نئی جی۔ ہم بھی اس محفل میں رہتے ہیں جس میں کوئی پنگا شنگا لے تو ہم اپنے علی آتش بھائی کو آگے کردیتے ہیں۔ کیوں جی علی آتش بھائی صاحب...؟ خاموش قاری قمر زمان صاحب! ویلکم ان شوگر ڈوٹ شوگر مگر ایک بات بالکل درست فرمائی انکل نے کہ مکھن کم لگایا کریں۔ عبادت کاظمی صاحب! ضروری تو نہیں ہر خواہش پوری ہو تیری... جب اُن (ماریا شہریار) کی شادی ہوگئی تے ہن رولا کس چیز دا...؟ کہ ان کی شادی کسی صورت نہیں ہونی چاہیے۔ گرداب نہایت بور جارہی ہے۔ کوئی نئی بات نہیں۔ بار بار وہی چیزیں مگر لوگ مختلف۔ Zong کی طرف سے پیش کی جانے والی اسٹوری مزاح سے بھرپور تھی اور اچھا تاثر چھوڑا۔ سونے کی کان بھی اچھی کہانی تھی گو کہ چھوٹی تھی مگر دل واقعی آج کل اپنی قسطیں پوری کرواتا ہے۔ پہلا رنگ طلسم خواب روایتی اور بیکار اسٹوری رہی، مزہ نہیں آیا۔ باقی کہانیاں فی الوقت مصروفیت کی وجہ سے... التوا کا شکار ہیں۔“

ایم احمد ہاشمی ڈسٹرکٹ بوتیر سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں ”آج 6 اپریل ہے اور جاسوسی اس وقت میرے سامنے ہے۔ میں اسے تشنہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں اور اب ایک ماہ کے انتظار کے تصور سے اداسی اور بے کلی محسوس ہورہی ہے۔ خیر، ہم یہ انتظار قبول کرلیتے ہیں کیونکہ فراق کے بغیر وصل بھی مزہ نہیں دیتا۔ ٹائٹل بالکل متاثر نہ کرسکا۔ زونگ اسٹینڈ پر علی آتش صاحب قابض تھے، مبارک باد۔ میرا اینڈ پریشے سیال! میں فطرتاً نرم دل ہوں۔ نادیہ خان صاحبہ! آئندہ انکل کی بات پر کان ضرور دھریے گا، سمجھیں؟ ورنہ... دلنشین باجی! آپ نے تو سلیم بھائی کو رلایا ہوگا۔ بھائی اعجاز احمد! آپ کے شدتِ مایوسی سے لبریز یاسیت بھرے الفاظ نے ہم کو رلانے پر اکسا دیا، پر ہم روئے نہیں، صرف اداس ہونے پر اکتفا کیا۔ بھئی ایسی کون سی پریشانی نے آپ کو بے چین کیا ہوا ہے؟ ہمیں تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔ محترم! آپ ہمیں ایک مخلص دوست سمجھ کر اپنی پریشانی ہم سے شیئر کرسکتے ہیں۔ آپ کی پریشانی کو دیکھ کر ہمیں اپنے دل میں کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اوئے قمر جی بھائی! کدھر تھے یار؟ آئی مس یو۔ (غور سے پڑھو... وہ مس نہیں ہیں مسٹر) حسبِ معمول گرداب سے اسٹارٹ لیا۔ اسماجی! کیا ہوگیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہانی پر آپ کی گرفت کافی کمزور پڑگئی ہے۔ لگاتار کئی مہینوں سے ایک تو صفحات کم ہیں اور دوسرے کہانی اب وہ نہیں رہی جو ہوا کرتی تھی۔ بہرحال کہانی کے حالات سازگار نہیں۔ کاشف زبیر صاحب کی طمع بے کنار ایک زبردست تحریر تھی۔ لیلیٰ کا بھولپن بے حد اچھا لگا۔ دولت کے پجاری سمندر میں غرق ہوکر ہیروں تک پہنچ گئے ہوں گے۔ ایکشن سے بھرپور سلیم فاروقی کا پہلا رنگ طلسم خواب بہترین کہانی تھی۔ ریشماں کی موت نے دکھی کردیا۔ اکبر پر کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ صفحہ بہ صفحہ بکھری حسام بٹ صاحب کی اسٹوری اس ماہ کی تیز رفتار کہانی تھی۔ اسد کی کارکردگی نے متاثر کیا۔ منظر امام کی Zong والی کہانی یعنی جڑواں شادی کچھ خاص مزاحیہ نہیں تھی۔ للکار اچھی تھی۔“

پشاور سے سائرہ خان کی التجا ”جاسوسی کے تمام اسٹاف اور دوستوں کو میری طرف سے محبت بھرا اسلام۔ جاسوسی اور سسپنس سے ہمارا خاندانی رشتہ ہے۔ میں خاص طور پر اس محفل میں اپنی کزن اور دوست آسیہ کی وجہ سے شریک ہورہی ہوں جو کچھ عرصہ پہلے تک اس محفل کا حصہ تھی۔ آپ سب کو شاید معلوم نہ ہو، وہ کینسر کی مریضہ ہے اور عمران خان کے کینسر ہاسپٹل نے اسے ایک سال پہلے ہی لاعلاج اسٹیج کی وجہ سے ڈسچارج کردیا تھا مگر وہ اب تک قرآن پاک اور دعاؤں کی وجہ سے زندہ ہے۔ وہ جاسوسی بے حد شوق سے پڑھتی تھی مگر اب نہیں پڑھتی۔ اسی وجہ سے وہ پھر بیمار رہنے لگی ہے۔ میری انکل اور تمام دوستوں سے گزارش ہے کہ اسے پھر سے اس محفل کا حصہ بننے میں میری مدد کریں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جی اٹھے گی۔“ (ہم اور محفل کے تمام دوست دعا گو ہیں کہ اللہ آسیہ کو جلد شفایاب کرے، آمین)

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی شکائتیں اور پسندیدگی ”سرورق منفرد نہ ہونے کے باوجود خاص لگا۔ ذاکر انکل نے روایت سے بغاوت نہ کرتے ہوئے کرخت مردانہ چہرے پینٹ کیے۔ بہار کا موسم تھا۔ کیا تھا جو چند پھول ہی سرورق پر بکھیر دیتے۔ (چلیے آپ کی آمد کو ہی آمد بہار سمجھ لیتے ہیں) بہرحال حسینہ سرورق پر کمی پوری کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ ایم احمد ہاشمی اپنی سمجھ کو اتنی تکلیف نہ دیا کریں، تھوڑی سی تو سب ختم ہوگئی تو؟ (ہاں... دیکھو... کچھ تو سوچنا چاہیے) دلنشین ڈیئر! اتنے اچھے موسم میں اتنی افسردگی ٹھیک نہیں خوش رہنا اور خوشیاں بانٹنا سیکھو۔ (ترے...) تفسیر عباس بابر صاحب! پر کا کوا بنانے میں تو آپ کا کوئی جواب نہیں ہے۔ نادیہ خان! وارننگ دھیان میں رکھتے ہوئے آئندہ تبصرہ لکھنا، ہم تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔ اعجاز احمد صاحب! آپ دعا کیا کریں کہ یادِ ماضی عذاب ہے یارب، چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ میرا اور پریشے! بہت اچھا تبصرہ لکھا۔ وادیٔ تبصراں سے رخصت ہوئے تو گرداب نے اپنے بھنور میں جکڑ لیا۔ اسماجی نے تو شہر یار کو ہماری گڈ بکس سے ہی خارج کروا دیا تھا لیکن اب کچھ صورتِ حال بہتر ہوئی ہے۔ للکار کی یہ قسط کرداروں کے ایک ہی جگہ محدود ہونے کی وجہ سے خاصی جامد سی محسوس ہوئی۔ ہاں کٹر انتہا پسند ہندوؤں کی رسموں نے تو دل دہلا دیا۔ اپنے پسندیدہ رائٹر کاشف زبیر کی تحریر سے انصاف کرنے پہنچی تو لگا ایک دو جگہ پر تھوڑے الجھاؤ تھے اور زیادہ وضاحت کے متقاضی تھے، باقی تحریر زبردست تھی۔ مردم

www.kahopakistan.com

گزیدہ، ستم رسیدہ اور ٹھکرائے ہوئے دلاور خان کی داستان طلسم خواب از سلیم فاروقی بہترین رنگ ثابت ہوئی جس کی بُنت نہایت عمدگی سے بُنی گئی تھی۔ مختصر تحریروں میں خوف پیا ایک عمدہ تحریر تھی جس کے لیے مترجم اور مصنف دونوں داد کے مستحق ہیں۔ آصف ملک کی شکست ایڈونچر سے بھرپور تحریر تھی جس میں ایڈونچر پسند فرینڈز نے آنٹل مجھے مارو والے مقولے پر عمل کیا اور خود کو ایک سیریل کلر کے حوالے کر دیا۔ زونگ کے تعاون سے پیش کی گئی تحریر جڑواں شادی خاصی شگفتہ سی تحریر ثابت ہوئی۔ آزادیٔ جرم مریم کے خان کی خاصی سنسنی خیز تحریر تھی۔ موڈی اپنے نظریات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ حرفِ آخر یہ ہے کہ اپریل کا شمارہ ہماری بھرپور ذہنی تفریح و تسکین کرنے میں کامیاب رہا۔“

لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی رائے ”جاسوسی 28 تاریخ کو لینے گیا مگر 2 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل حسینہ کی آنکھوں میں شکوہ ہے کہ اس کے ساتھ اتنے بُرے صنفِ وجاہت کیوں پینٹ کیے جاتے ہیں۔ (کمال ہے... پہلی دفعہ کسی نے اس شکوے کو پڑھا ہے) علی آتش ونگ سیٹ مبارک۔ کبھی کلو بسترز کا حساب لگا لیں۔ جو جتنا دور ہے، اس کا تبصرہ لازمی شامل کیا جائے۔ مبرا اینڈ پریشے سیال! کیا آپ بھی ہماری طرح بارش میں بھیگتی ہیں (آپ کوئی خاص طریقہ اختیار کرتے ہیں؟) ویسے آ کہاں سے رہی تھیں۔ نادیہ خان آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ کے ہاتھ خوب صورت ہیں؟ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ دلنشین بلوچ صاحبہ! ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ دعا ہے کہ محکمہ ڈاک میں کچھ اصلاح ہو جائے۔ اعجاز احمد آپ کیوں پریشان ہیں؟ انفال اینڈ صبا مرزا! کس بات کا شکوہ اور شکایتیں تھیں جو ایک طرف رکھ کر ڈائجسٹ ہاتھ میں لے لیا۔ ماہا ایمان صاحبہ! محفل میں کچھ کم آتی ہیں، کیا آپ بھی محکمہ ڈاک کی ڈسی ہوئی ہیں؟ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ کہانی اس وقت جوبن پر ہے، عمران اینڈ تابش گڈ کپل ہے۔ گرداب میں پھنسی ماہ بانو اب ایک ڈاکو کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ امید ہے کہ رائٹر صاحب اس ڈاکو سے ہی ماہ بانو کی شادی کروا دیں گی۔ کشور اور آفتاب بھی مشکلات کا شکار ہیں۔ پہلا رنگ تحریر سلیم فاروقی طلسم خواب تھی۔ ریشماں اور دلاور اپنے ہی دوست اکبر کے ہاتھوں ڈسے گئے۔ محبت میں ایسا ہی کیوں ہوتا ہے؟ دوسرا رنگ معما موت، تحریر حسام بٹ کی تھی۔ وسی کا قتل ہو جانا اور اس کی بیوی کا پریشان ہونا کہانی کو اداس کر گیا۔ کاشف زبیر کی طمع بے کنار حرص و ہوس پر مشتمل تحریر تھی۔ بھائی نے بھائی کا گھر اجاڑ دیا۔ شاہ میر اور لیلیٰ کا ملنا اچھا لگا۔ کہانی مجموعی طور پر اچھی تھی۔“

ضلع کرک سے ثنا کنول، مہرین کنول لکھتا ہے ”سرورق کا لڑکی بالکل خوب صورت نہیں تھا۔ سب سے پہلے فہرست کا مطالعہ کیا۔ وہاں اچھا اچھا کہانی کا اعلان سن کر محفل میں آ گیا۔ انکل نے ایک بار پھر غلطی کیا جو آتش علی کو کرسی پر بٹھایا اور باقی اچھا اچھا خط لکھنے والوں کو نیچے بٹھایا۔ (کیا کریں... کبھی کبھی پیچھے بیٹھنا بھی اچھا ہی ہوتا ہے) مبرا اور پریشے! تم کو اتنا غصہ کیوں آتا ہے۔ (ہمیں بالکل نہیں معلوم) ہمایوں سعید! تم کو پتا ہے کہ میں تصویر العین کو پسند کرتا ہے جبکہ تم مہرین کو بہت پسند کرتا ہے۔ محی الدین صاب! یہ تم ہر بار خود کو خوب صورت کیوں کہتا ہے؟ عائشہ اور ماہا کا تبصرہ بھی پیارا تھا۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اف عمران کا باتیں، بہت مزے کا کرتا ہے۔ تابش زخمی ہو گیا ہے، شاید اب وہ چپ بھی اس سے نکل آئے گا۔ گرداب میں شہریار کا شادی ماریا سے کیوں ہوا؟ (آپ ہم سے پوچھ رہی ہیں، بخدا اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں) کہانی کار میں کچھ بھی مزیدار نہیں تھا۔ جڑواں شادی بہت مزے دار تھا۔ وہ رسومات بہت اچھا لگا۔ سلیم فاروقی کا ہر کہانی ایک جیسا ہوتا ہے اس لیے ہم نہیں پڑھتا۔ (اچھا کرتا ہے...) بازی اور شکار تو سر کے اوپر سے گزر گئی۔“

قصور سے علی آتش کی نرم گفتاری ”اپریل کا پیارا جاسوسی یکم اپریل کو ملا۔ سب سے پہلے سرورق پر نظر دوڑائی۔ سرورق کی قبول صورت دوشیزہ تر آنکھی آنکھوں میں حیرت سمو کر ہمیں دیکھ رہی تھی۔ ہمیں اس وقت تو اس کی حیرت کی سمجھ نہ آئی، اوپر سے ریوالور والے بھائی صاحب ہمیں ریوالور سے ڈرا کر محفل چیتی، نکتہ چینی میں جانے کو کہہ رہے تھے۔ ہم بھی ڈر گئے اور سیدھے محفل میں پہنچ کر ہی سانس لیا۔ اس کے ساتھ ہی سرورق دوشیزہ کی حیرانی بھی سمجھ آ گئی کہ ہم پہلے نمبر پر کھڑے تھے۔ پہلے تو یقین نہیں آیا کہ شاید ہمیں اپریل فول تو نہیں بنایا جا رہا لیکن پھر یقین کرنا ہی پڑا۔ اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتے پھر لگے ہاتھوں باقی تبصرے بھی پڑھنے شروع کر دیے۔ تفسیر عباس بابر صاحب! اگر آپ کوئی حکمت خانہ کھول لیں تو اچھی خاصی آمدن ہو سکتی ہے کہ آپ تو تصویر دیکھ کر بھی بیماری بتا دیتے ہیں۔ ویسے آپ چائے کو میٹھا کرنے کے لیے کس کا نام استعمال کرتے ہیں۔ دلنشین بلوچ صاحبہ! اتنی افسردگی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ ہمارا دوسرا خط ہی شائع نہیں ہوا۔ ہم تھوڑے سے مایوس ہوئے لیکن آپ تو خیر۔ قمرتی صاحب آپ نے جو تجویز دی ہم بھی اس کی حمایت کرتے ہیں، آگے انکل کی مرضی۔ اس دفعہ سارے تبصرے تقریباً سنجیدہ ہی تھے۔ اس کے بعد واپس فہرست پر پہنچے۔ کاشف زبیر اور منظر امام صاحب کے نام پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کاشف انکل اگر ہمیں ایکشن میں اچھے لگتے ہیں تو منظر امام صاحب ہمیں مزاح میں پسند ہیں۔ اسٹوریز میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ ہم نے طاہر انکل کی سلسلے وار اسٹوریز باقاعدہ طور پر تو پرواز سے پڑھنی شروع کی تھیں لیکن پھر دیوی کی اقساط بھی اکٹھی کر کے ساری پڑھیں اور اب للکار پڑھ رہے ہیں۔ للکار کے بارے میں تبصرہ تو سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ اس کے بعد کاشف زبیر صاحب کی طمع بے کنار پڑھی۔ کہانی تو بہترین تھی لیکن کاشف انکل اپنی ہر اسٹوری میں ہیروئن دو ہی لاتے ہیں، ایک مر گئی دوسری آ گئی۔ اس کے بعد سرورق کے رنگوں میں سے طلسم خواب پڑھی۔ اسٹوری سے زیادہ تو ہمیں شروع میں لکھا شعر پسند آیا۔ ہمیں سلیم فاروقی کی فل ایکشن اسٹوریز ہی پسند ہیں۔ لو اسٹوریز ہمیں سلیم فاروقی کے قلم سے اچھی نہیں لگتیں۔ دوسرا رنگ معما موت ملک صفدر حیات ٹائپ کی تحریر تھی لیکن اچھی تحریر تھی۔ اس کے بعد چھوٹی اسٹوریز میں منظر امام صاحب کی جڑواں شادی پڑھی۔ جڑواں شادی ہمیں تو اسٹوری آف دی منتھ لگی۔ اب اجازت۔ (اس دفعہ اتنا ہی تبصرہ کافی ہے۔ اگر تبصرے شائع ہوتے رہے تو بڑھتے جائیں گے)“

جوہر آباد سے احمد اعجاز اپنے دلکش اندازِ بیان میں لکھتے ہیں ”اس مرتبہ رسالہ مقررہ تاریخ سے چھ دن لیٹ ملا۔ سرورق پر غور کیا، کاش نہ کرتے کہ منہ بسورتی لڑکی نظر آئی جیسے ابھی رو دے گی اور پس منظر میں وہی پسٹل والے صاحب۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور محفلِ یاراں میں جا پہنچے۔ کچے پکے جذبوں سے لبریز کھٹے میٹھے تبصرے پڑھ کر بہت لطف آیا۔ علی آتش نے ہمارے تبصرے کو گزارے لائق قرار دیا، بہت مہربانی کی۔ وہ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ہم تبصرہ لکھتے اس لیے ہیں کہ کوئی ہم سے پنگا شنگا لے۔ علی صاحب ایک تو آپ قصوری اوپر سے آتش قصوری ہماری کیا مجال کہ آپ سے پنگا لیں، مبارک باد البتہ قبول فرمائیں۔ نادیہ خان! ہمارے تبصرے کو اوّلیں قرار دینے کا بہت شکریہ۔ اس سے ہمیں اور اچھا لکھنے کی تحریک ملی ہے۔ ہمایوں سعید راج! آپ نے ہمیں عرشی نویس بنا دیا بڑا اکرم کیا۔ ایک جوہری کو ہیرے کی پہچان ہوتی ہے ورنہ جو لوگ خود پڑھنے لکھنے کے قابل ہوتے ہیں انہیں ہم جیسے لوگوں کی کیا قدر... اعجاز بھائی ساہیوال! آپ کی مہکتی مبارک باد کا شکریہ... اور اب ہم تھے اور گرداب کا بائیسواں چکر۔ ماہ بانو کی لک ایک مرتبہ پھر کام کر گئی ورنہ اس کی لک تو اس کے لیے نئے نئے گرداب تخلیق کرتی رہتی ہے۔ داستانِ درد استاں غزالہ کی آپ بیتی نے ثابت کیا کہ ماں باپ کو دکھ دے کر اپنے لیے سکھ تلاش کرنا صحرا میں سراب کے پیچھے بھاگنے جیسا ہے۔ کتابوں اور پھولوں سے محبت کرنے والے لوگ کوئی عام لوگ نہیں ہوتے۔ اس قسط میں یہ جملہ حاصل مطالعہ لگا۔ للکار، تابش کے ہیرو ہونے میں اب کچھ کلام نہیں، قسط خاصی جان دار رہی۔ اس کا اختتام کسی حد تک متوقع تھا۔ للکار اور گرداب میں ایک مماثلت کی طرف توجہ کہ تابش محبت ثروت سے کرتا ہے اور حالات نے اسے سلطانہ کا شوہر بنا دیا۔ یہی معاملہ اپنے اے ہی صاحب کے ساتھ کہ دل کے نہاں خانے میں کسی اور کا پیار چھپائے ماریا کے شوہر نامدار بن گئے۔ ہمیں تو یہ دونوں خواتین ماریا اور سلطانہ اپنے اپنے مصنفین کی ہٹ لسٹ پر لگتی ہیں۔ دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے اور یہی تو قسط وار کہانی کی کامیابی ہے کہ ”دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔“ دو طویل کہانیوں کے بعد کوئی مختصر کہانی پڑھنے کو جی چاہا۔ سونے کا دل چھوٹی سی کہانی... ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اور یہ کہ احتیاط اور پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ اونچی بولی کا مطالعہ کیا۔ بزرگ کہتے ہیں کہ جلد بازی شیطان کا کام ہے۔ میاں بیوی کے درمیان اعتماد قائم ہو تو ایسے المیے جنم نہیں لیتے۔ شکست از آصف ملک ایسی کہانیاں ڈھلتی شب کے سناٹے میں پڑھنے کا اپنا لطف ہے۔ (کیا کہنے...) کہانی کا اختتام متوقع قاتل کی خودکشی پر ہوا۔ غلط ماحول اور حالات ایک انسان کو خونی درندہ بنا ڈالتے ہیں۔ بابر نعیم کی شکار بہترین کاوش۔ خود کو شکاری اور دوسروں کو شکار سمجھنے کی بھول کرنے والوں کے لیے سبق۔ بازی ایک شب کی کہانی اور شب ابھی باقی تھی کہ کہانی بظاہر ختم ہو گئی۔ رضوانہ منظر کی خود کردہ را علاج نیست پر مبنی تحریر پڑھی اور آگے بڑھ گئے۔ نیکی کا صلہ... انسانی ذہن کی الجھی ڈور کی کہانی پسند آئی۔ چھٹکارا ایک اور مختصر مگر تیکھی تحریر۔ بے چارہ گیبرائل اگرچہ اتنا بے چارہ بھی نہیں تھا، پر افسوس ہوا اس کے انجام پر کیونکہ اسے اس انجام تک پہنچانے والے بھی تو برابر کے مجرم تھے۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔“

سرفراز قرام گلگشت ملتان اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں ”اس بار کا شمارہ یکم اپریل کو ہی موصول ہوا۔ سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ صنفِ نازک دیہاتی انداز میں گھورے جا رہی تھی۔ اس کے اوپر نوجوان پستول تانے نہ جانے کس کا نشانہ لگا رہا تھا۔ بہرحال سرورق کو عبور کرتے ہوئے چینی نکتہ چینی میں جا پہنچے۔ علی آتش صاحب کو کرسیٔ صدارت پر براجمان پایا۔ مبارک ہو جی! باقی تبصروں پر نو کمنٹس۔ کہانیوں میں سب سے پہلے محبوب کہانی للکار پڑھی۔ تابش میں بڑھتی ہوئی ہمت اور سلطانہ کا مائل ہونا اچھا لگا۔ کہانی کا اختتام سسپنس پر ہوا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ گرداب میں ماہ بانو حالات کے ہی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ کاشف زبیر کی طمع بے کنار ایک اچھی کاوش تھی۔ حسام بٹ کی معما موت گزارے لائق تھی۔ البتہ پہلا رنگ طلسم خواب بہت اچھا تھا۔“

انفال مرزا اینڈ صبا مرزا کی کاوش چکوال سے ”ہمارا لختِ دل لختِ جگر تین اپریل کو چمکتی دھوپ میں ملا۔ ٹائٹل کے خوب صورت کلر دیکھ کر آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ٹائٹل کی حسینہ ماہ جبینہ کچھ نخرے والی لگی جبکہ ہماری نخروں والوں سے بنتی نہیں۔ (آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمیں تو وہ بالکل ایسی نہیں لگتیں) ٹائٹل کو خدا حافظ کہہ کر اپنے چمن میں قدم رکھا۔ علی آتش ونگ سیٹ پر کھڑے ہو کے سب کو سلامی دیتے ہوئے نظر آئے۔ مبرا سیال اینڈ پریشے سیال! آپ کا تبصرہ لاجواب تھا۔ اعجاز صاحب! کچھ خیال کریں، دل کے تار ٹوٹ جائیں گے۔ اب تذکرہ ہو جائے کہانیوں پر۔ ابتدا میں ہی کاشف زبیر نے کہانی کا نام طمع بے کنار لکھ کر پڑھنے کو دی۔ دولت کے پیچھے بھاگنے سے مسائل اور مصیبتیں ہی گلے لگانے والی بات ہے۔ مغل انکل! اس دفعہ شدت سے ثروت یاد آئی۔ تابی کی یہ دولت نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ طلسم خواب کا موضوع وہی پرانا تھا۔ وہی جاگیری، دشمنی اور پھر محبت۔ دلاور نے جس بہادری سے قتل کیے، حیران کر دیا۔ حسام انکل! کیا حال ہے؟ کافی عرصے بعد جاسوسی میں چکر لگایا۔ آزادیٔ جرم بہترا اسٹوری تھی، اینڈ کی وجہ سے پسند آئی اگر واردات کامیاب ہو جاتی یا قانون دان آ جاتے تو اتنی پسند نہ آتی۔ کہانی کار بے حد پسند آئی۔ نئے لکھنے والوں کے لیے چھپا پیغام تھا۔“ (ہماری طرف سے معذرت کہ آپ کا نام غلط شائع ہوا)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے اس ماہ شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

سلیم شبلی، ملتان۔ مصدق محمود دانش، ضلع گجرات۔ نادیہ خان، کراچی — قمرتی، راولپنڈی۔ مبرا سیال اینڈ پریشے سیال، منڈی بہاؤالدین۔ کاظم خان وسیر، کرمپور۔ سفیان ہاشمی، کراچی۔ محمد طیب حسین ریحان، حافظ آباد۔ سمعیہ لیاقت علی سندھ، ضلع قصور۔ محمد اسماعیل اجاگر، ضلع اٹک۔ سیدہ حرا گیلانی، لاہور۔ حسنین عباس بلوچ، سرگودھا۔ ایم اے انجم، مانسہرہ۔ عثمان تلوکر، میاں والی۔ ملک عتیق مظہر، گجرات۔ عاصم نوید، ٹیکسلا۔ بشیر احمد بھٹی، بہاول پور۔ اعجاز احمد، ساہیوال۔ ہمایوں سعید راج، بنوں۔

پچھلے ماہ کی 29 تاریخ کو ہمیں افواجِ پاکستان کے ایروگرام پر بھیجے گئے دس تعریفی خطوط موصول ہوئے جو تلوکر خاندان یا برادری کے اراکین کی طرف سے ارسال کیے گئے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ رانا نسرین، چودھری روبینہ تلوکر، رفعت رفعی، نائیک غلام شبیر تلوکر، راسب تلوکر اینڈ آصف تلوکر (جہلم)، زاہد تلوکر (کوہاٹ کینٹ)، مظفر قادری، امتیاز تلوکر (کچہ گجرات)، رابعہ تلوکر (تل تلوکراں خوشاب)، غوثی ظفر تنہا تلوکر (کوئٹہ)، ساگر تلوکر (چشمہ بیراج)، ریٹائرڈ حوالدار فیصل تلوکر (پہلاں) اور روبی نعیم (سرگودھا)۔

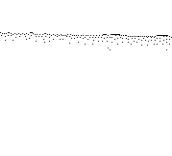

www.kahopakistan.com

موت کے سائے

منظر امام

اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ وسیع کائنات ہر بشر کے لیے ایک حیرت کدہ ہے... ان گنت حصے جو انسانی آنکھ سے اوجھل ہیں... اور ان تک رسائی ابھی تک ممکن نہیں ہوسکی... فلک سے زمین تک ایک بحرِ بیکراں ہے... یہی زمین کہیں یکایک آگ اگلنے لگتی ہے اور کہیں اپنے سینے میں ہزاروں دفینے چھپاتی رہتی ہے... ایسے ہی خزانوں کی تلاش وجستجو میں بھٹکنے والے ہوس کاروں اور مٹی کے فرزندوں کے ٹکراؤ کی پُرتجسس داستان...

سرزمینِ پاک پر رونما ہونے والے تغیر وتبدل اور دشمنوں کے ہیر پھیر سے پردہ اٹھاتی چشم کشا تحریر

میرا خیال تھا کہ میں اسے ایک لمحے میں پکڑ لوں گا۔

میں اس کے پیچھے دوڑ پڑا... پوری قوت اور تیز رفتاری کے ساتھ۔ بس تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ وہ اچانک دائیں جانب مڑا اور زمین پر بیٹھ گیا۔

میں جھونک میں کئی گز آگے چلا گیا تھا۔

میں نے غصے سے پھر چھلانگ لگائی۔ اس بار میں اس کے بالکل قریب تھا لیکن وہ کسی بلی کی طرح کود کر ایک طرف ہو گیا۔ میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ میری سانس بھی پھول رہی تھی لیکن اس کے وہی تیور تھے۔ وہی دم خم تھا۔

''چلو پکڑو۔ تم کیسا نوجوان ہے۔'' اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں آواز لگائی۔

''بس ژانگ میں ہار گیا۔'' میں نے ہاتھ جوڑ لیے۔

وہ ہنستا ہوا میرے پاس آگیا۔ اس نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ ''کوئی بات نہیں۔ تم میں بہت جان ہے۔''

ژانگ میرا انسٹرکٹر تھا، ایک چینی شخص جس کی عمر کے بارے میں اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی عمروں کا پتا نہیں چلتا لیکن شاید وہ تیس اور چالیس کے درمیان تھا۔

ایک نفیس کھلا انسان جس نے پاکستان آکر تھوڑی بہت اردو بھی سیکھ لی تھی اور اپنا کام چلا لیتا تھا۔ میں اس سے بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔

ڈاجنگ، ریسلنگ، جوڈو، کراٹے، کنگ فو اور نہ جانے کیا کیا۔ ژانگ کو میرے لیے مقرر کیا گیا تھا کہ وہ مجھے ٹریننگ دے کیونکہ میرا کام ایسا تھا کہ مجھے ان چیزوں کی ضرورت تھی۔

میں ایک اہم ایجنسی کا آدمی تھا۔

اب میں اپنا تعارف بھی کرا دوں میرا نام ٹیپو سلطان ہے۔ شاید میرے والدین نے میرا یہ نام ٹیپو سلطان جیسے سرفروش سے متاثر ہو کر رکھا تھا۔ اور اتنا ضرور ہوا کہ اس نام کی بدولت میں بچپن ہی سے نڈر اور بے باک رہا تھا۔ میرے دوست مجھے فائٹر کہا کرتے تھے اور میں بہت سے مواقع پر اپنی بہادری ثابت بھی کر چکا تھا۔

ایک صبح چیف نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ وہ چند لمحوں تک میری طرف غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنی گونج دار آواز میں پوچھا۔ ''ٹیپو! تمہیں کیا کیا آتا ہے؟''

''بہت کچھ آتا ہے سر۔''

''لڑائی بھڑائی کا تجربہ ہے؟''

''وہ تو اس فیلڈ میں رکھنا پڑتا ہے سر۔'' میں نے کہا۔

''ہوں۔'' چیف نے ایک گہری سانس لی۔ ''چین کا ایک خطرناک مجرم اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔'' چیف نے بتایا۔ ''اس نے چین میں کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے۔ شاید وہاں کے قیمتی راز لے کر فرار ہوا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں آکر پکڑا گیا۔ ہم تو تھک چکے ہیں' کیا تم اس سے وہ راز اگلوا سکتے ہو؟''

www.kahopakistan.com

پھر جب اس بندے کو میرے سامنے لایا گیا تو میں اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ وہ ایک دبلا پتلا بظاہر کمزور سا آدمی تھا۔ ہم دونوں کو دفتر کے بڑے ہال میں پہنچا دیا گیا۔

میں اس پر جھپٹ پڑا۔ بس ایک بجلی تھی جو میری نگاہوں کے سامنے کوند گئی۔ اس شخص نے نہ جانے کیا کیا کہ میں اچھل کر ایک طرف جا گرا۔

میں غصے میں برا بھلا کہتا ہوا پھر جھپٹا۔ اس دفعہ بھی وہی ہوا۔ مختصر یہ کہ اس شخص نے ذرا سی دیر میں مار مار کر میرے ہوش ٹھکانے کر دیے۔

پھر میرا چیف اور دوسرے لوگ سامنے آ گئے۔ اس وقت میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ چیف نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بھئی، اب کیا خیال ہے اس آدمی کے بارے میں؟''

''سر! یہ... یہ تو کمال کا فائٹر ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''تو اب یہ بھی سن لو کہ یہ کوئی مجرم نہیں ہے بلکہ ہمارے دوست ملک کا فائٹنگ انسٹرکٹر ہے۔ یہ تمہیں کچھ سکھانے کے لیے یہاں آیا ہے۔''

اس طرح ژانگ میرا استاد بن گیا۔ وہ چونکہ اردو بھی بول لیتا تھا اس لیے میری اس سے دوستی ہو گئی۔ وہ مارشل آرٹ کے ہر انداز سے واقف تھا۔ اس نے اپنے سارے ہنر مجھ میں منتقل کرنے میں کنجوسی نہیں کی۔

وہ کہا کرتا۔ ''دیکھو ٹیپو! جس طرح انسان کا زندگی اس کا سانسوں پر ہوتا ہے، اسی طرح اس کے لڑنے کا انحصار بھی اس کا سانسوں پر ہوتا ہے۔ تمہیں اپنا سانسوں پر کنٹرول ہونا چاہیے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

پھر میں نے اس کی نگرانی میں سانسوں کی مشقیں کیں۔ بغیر ہتھیار کے ہتھیار والوں کو کس طرح قابو میں کیا جاتا ہے، یہ ساری تکنیک میں نے اسی سے سیکھی تھی۔

میں جس فلیٹ میں رہتا تھا، ان لوگوں کو بھی میرے بارے میں نہیں معلوم تھا کہ میں کون ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آج کے دور کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ لوگ دوسروں کی ٹوہ میں نہیں رہتے یا شاید مختلف ماحول میں رہنے والوں کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔

میرا فلیٹ چونکہ شہر کے ایک پوش علاقے میں تھا اس لیے کسی نے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ سب اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔

وہاں میری دلچسپی کی صرف ایک چیز تھی۔

ایک لڑکی... جس کے کمرے کی کھڑکی میرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھلا کرتی۔ میں کبھی کبھی اسے دیکھ لیا کرتا تھا۔ وہ خوب صورت لڑکی تھی۔ میں اس کے بارے میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ سامنے والے فلیٹ میں رہتی ہے۔

میرے پروفیشن کی تربیت ہی کچھ ایسی تھی۔ ''لڑکیوں سے بچنے کی کوشش کرو۔ ان کے سنہری رنگوں کے پیچھے سانپ کا زہر شامل ہوتا ہے۔''

لیکن میں اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اس کھڑکی والی لڑکی کے سحر سے نہیں بچ سکا۔ وہ مجھے پسند آ گئی تھی۔

میں نے فیصلہ کر لیا... کہ میں اس لڑکی سے دوستی کر کے رہوں گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ لڑکیاں تباہ کن ہوتی ہیں لیکن پرابلم یہ ہے کہ ان کے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ میں اس لڑکی کے گھر تو نہیں جا سکتا تھا لیکن اس سے راستے میں ضرور بات کر سکتا تھا۔

وہ شاید کہیں جاب کرتی تھی۔

میں نے اکثر اسے شام کے وقت واپس آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں اپنے فلیٹ کی بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس لڑکی کا انتظار تھا۔

وہ لڑکی تو نہیں آئی لیکن عنایت خان آ گیا۔

عنایت خان کسی زمانے میں کالج میں میرے ساتھ پڑھ چکا تھا۔ ایک بے وقوف سا انسان جسے بک بک کرنے کی بہت عادت تھی۔ وہ کسی اور کی سنتا ہی نہیں تھا۔

وہ ہماری بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ میں عام طور پر اس سے باتیں کر لیا کرتا تھا لیکن اس وقت اس کا ٹپک پڑنا مجھے ناگوار گزرا۔

''ہیلو پیارے! کیا کر رہے ہو آج کل؟'' اس نے اپنا وہی سوال دہرایا جو وہ ہر ملاقات میں کرتا تھا۔

اور میں نے وہی جواب دہرایا جو ہمیشہ دیا کرتا تھا۔ ''یار! بتا تو چکا ہوں کہ ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر رہا ہوں۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی پیارے... آج تو تمہیں فرم کا نام بتانا ہی پڑے گا۔ تم ہمیشہ ٹال جاتے ہو۔''

نہ جانے کیوں اس وقت مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ چڑ ہونے لگی تھی اس سے۔ ''اچھا جاؤ... دماغ مت خراب کرو۔ میں نہیں بتاتا۔ میں تمہارا پابند نہیں ہوں۔''

عنایت خان حیرت اور دکھ سے مجھے دیکھتا رہ گیا۔ شاید اسے اس بات کی توقع نہیں رہی ہو گی کہ میں اس طرح اسے جھڑک دوں گا۔

اس نے پھر کوئی بات نہیں کی اور ایک طرف چل دیا۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی لیکن اس کے جانے کے بعد ہی مجھے خیال آیا کہ میں نے اچھا نہیں کیا۔

اس بے چارے نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ میں اس پر ناراض ہوتا۔ دوسری طرف چونکہ وہ لڑکی بھی دکھائی نہیں دی تھی اس لیے عنایت کا اور خیال آنے لگا۔

جب بے چینی بڑھ گئی تو میں اس کے گھر کی طرف چل پڑا جو زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اس لیے پیدل ہی جا رہا تھا۔

نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے فلیٹ کی بلڈنگ سے آگے آتے ہی دو چار آدمیوں نے میرا تعاقب شروع کر دیا ہو۔

ایسے معاملات میں میری تربیت یافتہ چھٹی حس میرے بہت کام آتی تھی۔

اس وقت رات ہو چکی تھی لیکن زیادہ رات نہیں ہوئی تھی۔ گاڑیوں کی آمد و رفت بھی تھی اور کچھ دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود ایک غیر فطری سا سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر میرا تعاقب کرنے والے، نہ جانے کون تھے۔

میرا پروفیشن ہی ایسا تھا کہ محتاط رہنا پڑتا تھا۔ پھر ان دنوں وارداتیں بھی بہت ہونے لگی تھیں۔ موبائل اور پرس وغیرہ چھیننے کی وارداتیں تو بہت عام تھیں۔

مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میرا تعاقب کرنے والے دو تھے۔ میں ذہنی طور پر ان سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اچانک ان دونوں نے اپنی رفتار تیز کر لی اور میرے قریب آ گئے۔

''کہاں جا رہے ہو بھائی؟'' ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔

وہ ایک دبلا پتلا لیکن بھیانک چہرے والا شخص تھا۔ دائیں گال پر زخم کے ایک نشان نے اسے بدنما کر دیا تھا جبکہ دوسرا کسی بیل کی طرح مضبوط دکھائی دے رہا تھا۔

''کیوں، یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''گھبراؤ نہیں بھائی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''ہم اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ آگے ہنگامہ ہو رہا ہے۔ کہیں آگے جا کر پھنس نہ جاؤ۔''

اب میں نے غور کیا تو اس کی بات سچ معلوم ہونے لگی۔ واقعی اس وقت اگر چہ دس سوا دس ہوئے تھے پھر بھی ایک عجیب سا سناٹا تھا۔ کچھ دیر پہلے جتنی گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں، وہ اب غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ دونوں مجھے اسی حال میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

مجھے اپنی حماقت پر شرمندگی ہونے لگی۔ شاید دونوں بھلے آدمی تھے اور میں خوامخواہ ان کی طرف سے مشکوک ہو گیا تھا۔

پریشانی

''اتنے پریشان کیوں ہو دوست؟'' خورشید نے بشیر سے پوچھا۔

''آہ!'' بشیر نے گہری سرد آہ بھری۔ ''ایک چھوٹی سی بات تھی۔ ہم میاں بیوی میں پیار بھرا جھگڑا ہو رہا تھا کہ میری ساس نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا، آپ ہم دونوں کی باتوں میں ٹانگ نہ اڑایا کریں، بس وہ ناراض... ہوئیں اور انہوں نے قسم کھالی کہ وہ مجھ سے ایک مہینے تک بات نہیں کریں گی۔''

''یہ تو خوشی کی بات ہے، کم سے کم ایک مہینے تک تم اپنی ساس کی بے تکی باتوں سے محفوظ رہو گے۔''

''آہ۔'' بشیر نے دوسری سرد آہ بھری۔ ''یہ واقعہ پچھلے ماہ کا ہے اور آج مہینہ ختم ہونے کا آخری دن ہے۔''

آزاد کشمیر سے احمد بٹ کی خوش گمانی

اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ واپس جاؤں یا عنایت کے پاس چلا جاؤں۔ میں نے اچھا خاصا فاصلہ تو طے کر ہی لیا تھا۔ اب کہیں ہنگامہ بھی ہو رہا ہو گا تو کہیں آگے ہو رہا ہو گا۔ یہاں تو کوئی آثار نہیں تھے۔ اب واپس جانا حماقت ہی تھی اس لیے میں آگے بڑھ گیا۔

عنایت کا مکان دو منزلہ تھا۔ نچلی منزل میں مالک مکان کی رہائش تھی جبکہ اوپر کا پورشن انہوں نے عنایت کو کرائے پر دے رکھا تھا۔

اس کے یہاں جانے کا راستہ بغلی گلی میں تھا۔ سیڑھیاں باہر کی طرف بنائی گئی تھیں۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ اوپری حصے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ عنایت گھر ہی میں ہے۔

میں سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ خلاف توقع زینے کے اوپر والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ دوبارہ دستک دی۔ اس بار بھی خاموشی رہی۔ پھر میں نے عنایت کو آواز دی۔ میں کھلے ہوئے دروازے کو مزید کھول کر اندر آ گیا۔ سامنے عنایت کی بیٹھک تھی۔ میں یہاں کئی بار آ چکا تھا۔ یہ بیٹھک بھی تھی، لاؤنج بھی

www.kahopakistan.com

اور کبھی کبھی اس کی خواب گاہ بھی بن جایا کرتی تھی۔
پورے کمرے میں سبز قالین بچھا ہوا تھا۔ اور اس سبز قالین پر سرخ سرخ خون پھیلا ہوا تھا۔ یہ خون عنایت کے جسم کا تھا۔ اس کی لاش قالین ہی پر پڑی تھی۔
کسی نے بہت بے رحمی سے اسے قتل کر دیا تھا۔
میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔
جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ عنایت کا قتل کسی طرح ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو ایک بے ضرر سا انسان تھا۔
اس کے پاس تو کوئی ایسا اہم عہدہ بھی نہیں تھا۔ وہ کسی ایسی فرم میں کام کرتا تھا جو جیالوجیکل سروے کیا کرتی تھی۔ میں اس سے زیادہ اس کی ملازمت کے سلسلے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔
نہ ہی اس بے چارے کے پاس دولت تھی جس کے لیے اس کا قتل کیا جاتا۔ میں اس کی لاش کو دیکھے جا رہا تھا کہ اچانک زینے کے پاس سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔
ایک ہی لمحے میں میرے سارے حواس بیدار ہو گئے۔ مجھے کسی بھی حال میں کسی الجھن میں نہیں پھنسنا تھا۔ ہم لوگوں کی ٹریننگ ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہر حال میں خود کو پولیس سے بچائے رکھیں۔ ہم اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ وہ آوازیں قریب آ رہی تھیں۔
یا تو یہ سب مجھے پھانسنے کی پلاننگ تھی، یا وہ لوگ اتفاقاً اس طرف آنکلے تھے۔ میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں تیزی سے پلٹا اور سیڑھیاں اترنے کے بجائے دائیں طرف کے چھجے پر چلا گیا۔ اس طرف مکمل اندھیرا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو دیوار سے چپکا لیا تھا۔
قدموں کی آوازیں اوپر جا رہی تھیں۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کسی کی آواز سنائی دی۔ ''ایسا لگتا ہے نکل گیا کم بخت۔''
''اتنی جلدی کہاں جا سکتا ہے۔ ہم بھی تو اس کے ساتھ ساتھ پہنچے ہیں۔''
یہ دوسری آواز کچھ جانی پہچانی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس آواز کو سن چکا تھا۔ کہاں؟ یہ اس وقت یاد نہیں آ رہا تھا۔
''سنو، ٹارچ جلا کر دیکھو۔'' کسی نے کہا۔
ٹارچ جلنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ روشنی چھجے کی طرف آتی اور میں ان کی نگاہوں میں آ جاتا۔ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر میں نے چھجے کی منڈیر کو تھام لیا اور ذرا سی کوشش کے بعد میں چھت پر تھا۔ لیکن اسی وقت مجھے دیکھ بھی لیا گیا۔
''ارے، وہ چھت پر ہے۔ جلدی کرو۔''
''رک جاؤ۔'' دوسرے نے آواز لگائی۔
میرے لیے ان سے نمٹنا کوئی اتنا مشکل نہیں تھا لیکن میں اس وقت ممکنہ الجھنوں سے بچنا چاہتا تھا اس لیے میں نے چھت کی دوسری طرف بجری کے ڈھیر پر چھلانگ لگا دی۔
میں اس ڈھیر کو بہت دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی نے مجھے تلاش کر لیا تھا اور اسی وقت ایک گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔
یعنی معاملہ اتنا سیریس تھا کہ وہ لوگ مجھے مار دینا چاہتے تھے اور یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ میں نے بجری کے ڈھیر سے باہر آ کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔
تعاقب کرنے والے بھی مسلسل دوڑتے چلے آ رہے تھے۔
میری خوش قسمتی کہ اس وقت پورے علاقے کی لائٹ چلی گئی اور اب وہ لوگ مجھے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ اندھیرے نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔
میں اب اطمینان سے ٹہلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اب جلدی نہیں تھی۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اب یہ پولیس کا کام تھا کہ وہ بے چارے عنایت کے قاتل کا سراغ لگائی۔
اچانک میری چھٹی حس نے پھر خبردار کرنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ کچھ لوگ مجھے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔
ہاں، وہ چھ سات آدمی تھے۔ جو آہستہ آہستہ میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا۔
میرے بائیں طرف ایک مکان تھا۔ چھوٹا سا جس کی دیواریں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ میری تربیت وہاں بھی میرے کام آئی۔ ایک جست نے مجھے اس مکان کے اندر پہنچا دیا۔
اور وہاں کوئی رو رہا تھا۔
کسی لڑکی کے رونے کی آواز تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ بولتی جا رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ میں جس جگہ کودا تھا، اس کے پاس ہی ایک کمرے سے اس لڑکی کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں اور اس گھر میں اندھیرا تھا... مکمل اندھیرا۔
لڑکی کے رونے کی آواز کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ میں بہت دیر تک اپنی جگہ دبکا ہوا سن گن لیتا رہا۔ پھر اندازہ ہو گیا کہ اس مکان میں اس لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔
میں پودوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے نکل کر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ کمرے کی کھڑکی کے قریب آیا۔ کھڑکی اگرچہ کھلی ہوئی تھی لیکن اندھیرے میں بھی پتا چل رہا تھا کہ اس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔

میں اپنا چہرہ سلاخوں کے قریب لے آیا اور اسی وقت لائٹ آ گئی۔
اس کمرے میں بھی روشنی ہو گئی تھی۔ اس کمرے میں موجود لڑکی کو دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔
یہ وہی لڑکی تھی، میرے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ کی لڑکی۔ میں جس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا اور وہیں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی۔
وہ لڑکی بھی مجھے پہچان گئی۔ وہ شاید مجھ سے بھی زیادہ حیرت زدہ تھی اس لیے رونا بھول گئی۔
''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''خدا کے لیے میری مدد کرو۔'' وہ پھر رونے لگی۔ ''کچھ لوگ مجھے اٹھا کر لے آئے ہیں۔''
''کون لوگ؟''
''میں نہیں جانتی۔'' اس نے بتایا۔ ''میں دفتر سے گھر واپس آ رہی تھی کہ کچھ لوگوں نے مجھے اٹھا لیا۔ کیا تم بھی ان کے ساتھی ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں، میں ان کا ساتھی نہیں ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''میرے ساتھ کوئی اور معاملہ ہوا ہے۔ اس وقت گھر میں کون ہے؟''
''اس وقت کوئی نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ سب کہیں باہر گئے ہیں۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے ورنہ میں کب کی نکل چکی ہوتی۔ خدا کے لیے جلدی باہر نکالو۔ ورنہ کوئی واپس آ جائے گا۔''
میں نے اسے کمرے سے باہر نکال لیا۔
چند لمحوں بعد ہم دونوں اس مکان سے باہر آ چکے تھے۔ لائٹ آ چکی تھی۔ کچھ دکانیں بھی کھلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔
میرا تعاقب کرنے والے بھی اب دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ شاید وہ مایوس ہو کر جا چکے تھے۔ سامنے ایک ایسا ریستوران کھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا جہاں ہم کچھ دیر بیٹھ سکتے تھے۔ ''چلو، پہلے ایک ایک کپ چائے پی لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''نہیں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' لڑکی خوف زدہ تھی۔
''گھبراؤ نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''اب غنڈے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے... آؤ۔''
میں اسے ریستوران میں لے آیا۔ یہ ایرانی طرز کا ایک چھوٹا پُرسکون سا ریستوران تھا۔
میں نے چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ بھی منگوا لیے تھے۔ وہ لڑکی اب کسی حد تک پُرسکون دکھائی دینے لگی تھی۔
''ہاں، اب بتاؤ۔ تمہارے ساتھ کیا گزری ہے؟'' میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔
''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون تھے؟'' لڑکی نے کہا۔ ''میں اسٹاپ پر اتر کر اپنے فلیٹ کی طرف آ رہی تھی کہ ایک گاڑی میرے پاس آ کر رکی۔ دو آدمی اترے اور انہوں نے مجھے ریوالور کے زور پر کار میں بٹھا لیا۔ گاڑی چلانے والا کوئی تیسرا آدمی تھا۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور مجھے اس مکان میں لے جا کر بند کر دیا۔ پھر وہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور تم مجھے نکال کر لے آئے... بس اتنی سی داستان ہے۔''
''حیرت کی بات ہے۔ اغوا تو کسی مقصد سے کیا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا انہوں نے مقصد بھی نہیں بتایا؟''
''بالکل بھی نہیں۔ حالانکہ میں نے پوچھا بھی تھا لیکن وہ خاموش رہے۔''
''نام کیا ہے تمہارا؟''
''غزالہ۔''
''اور کرتی کیا ہو؟''
''ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب ہے میری۔'' اس نے بتایا۔
''کس چیز کی کمپنی؟'' میں نے پوچھا۔
''پتا نہیں کیا ہے۔ زمین کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ کوئی جیالوجیکل سروے قسم کی چیز ہے۔''
''اوہ گاڈ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''میرا ایک دوست بھی اسی قسم کی ایک فرم میں کام کرتا تھا۔''
''کرتا تھا سے کیا مراد؟'' اس نے پوچھا۔
''وہ بے چارہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔'' میں نے بتایا۔ ''شاید ایک گھنٹے پہلے ہی اس کی موت ہوئی ہے۔''
''عجیب بات ہے، کیا نام تھا تمہارے دوست کا؟''
''عنایت خان۔'' میں نے بتایا۔
''کیا؟'' اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''عنایت خان وہی تو نہیں جسے بہت بولنے کی عادت تھی؟''
''ہاں وہی۔ کیا تم اسے جانتی تھیں؟''
''وہ میرے ہی دفتر میں تو کام کرتا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''ساتھی تھا میرا... لیکن تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ مر چکا ہے۔ کیا ہوا ہے اس کو؟''
میں نے پھر اسے پوری کہانی سنا دی کہ میں نے کس طرح اس کی لاش دیکھی اور کس طرح فرار ہوا۔''
''حیرت کی بات ہے۔ اس بے چارے کا کون دشمن

www.kahopakistan.com

ہوسکتا ہے؟''

''مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اس فرم میں کام کرنے والے ایک شخص کا مرڈر ہوا اور دوسری کو اغوا کرلیا گیا۔ غزالہ! تم مانو یا نہ مانو... لیکن ان دونوں واقعات میں کوئی گہرا تعلق ضرور ہے۔''

''میرے خدا! تو پھر... پھر کیا ہوگا؟''

''اب یہی تو معلوم کرنا ہے کہ تعلق کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

چائے ختم ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ دونوں ریسٹوران میں داخل ہوگئے۔ ان میں سے ایک وہی شخص تھا جس کے چہرے پر زخم کا نشان تھا اور دوسرا کسی بیل کی طرح مضبوط۔

☆☆☆

ہم دونوں اب ایک بڑے کمرے میں تھے۔

اس جگہ وہی دونوں ہمیں لے کر آئے تھے۔ ریسٹوران میں دونوں ہمارے پیچھے آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ پھر بیل نما شخص نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''بس... تمہاری بھاگ دوڑ ختم ہوئی۔ اب تم ہمارے ساتھ چلو۔''

ان دونوں پر قابو پانا میرے لیے کوئی خاص مشکل نہیں تھا لیکن میں اس لڑکی کی وجہ سے مجبور ہوگیا تھا۔ پھر ان کے پاس ریوالور بھی تھے جبکہ اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ چکر کیا ہے۔ یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔

یہی سوچ کر میں نے اس لڑکی سے کہا۔ ''پریشان مت ہو۔ یہ لوگ جو کچھ کررہے ہیں، اس وقت ان کی بات مان لو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

پھر ہم ایک گاڑی میں آکر بیٹھ گئے اور وہ گاڑی ہمیں اسی مکان میں لے آئی جہاں ان دونوں کے علاوہ ایک اور آدمی بھی تھا۔ وہی ان دونوں کا باس یا چیف دکھائی دے رہا تھا۔

''آخر یہ چکر کیا ہے؟'' میں نے اس آدمی سے پوچھا۔ ''تم ہمیں کیوں لائے ہو؟''

''تم خوامخواہ اس کھیل میں ہمارے ساتھ پھنس گئے ہو۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''جبکہ ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

''لیکن کھیل تو مجھ ہی سے شروع ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، اس لڑکی سے ہوا ہے۔'' اس نے غزالہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ جس فرم میں کام کرتی ہے، اس فرم کی ایک فائل ہے... ایک خاص قسم کی رپورٹ۔ ہمیں اس فائل کی ضرورت تھی لیکن پتا یہ چلا کہ وہ فائل اس فرم میں کام کرنے والے ایک شخص عنایت نے گم کردی ہے۔''

''ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔'' غزالہ بول پڑی۔ ''عنایت سے ایک فائل گم تو ہوئی تھی۔''

''لیکن وہ گم نہیں ہوئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''عنایت وہ فائل کسی اور کے حوالے کرنے والا تھا اسی لیے اس نے وہ فائل دفتر سے غائب کردی تھی۔''

''تو پھر... اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' غزالہ نے پوچھا۔

''تمہارا قصور یہ ہے کہ عنایت دفتر میں تم سے بے تکلف تھا بلکہ تم دونوں کے درمیان دوستی بھی تھی۔ ہم نے یہ سوچا تھا کہ ہم اس فائل کا سراغ لگانے کے لیے تمہیں اٹھائیں گے پھر عنایت کو اٹھا کر لے آئیں گے۔ اس طرح عنایت پر دباؤ ڈال کر ہم اس فائل کے بارے میں معلوم کرلیں گے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوسکا۔ ہمارے آدمیوں نے تمہیں تو اٹھا لیا لیکن عنایت مارا گیا۔''

''اور تمہارے آدمیوں نے اسے مار دیا؟'' میں نے کہا۔

''نہیں، میرے آدمیوں نے نہیں بلکہ دوسری پارٹی نے۔'' اس نے بتایا۔ ''ان لوگوں نے عنایت سے وہ فائل بھی حاصل کرلی اور اسے جان سے بھی مار دیا۔ میرے آدمی جب وہاں پہنچے تو اس کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اس کو مارنے والا وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ میرے آدمیوں نے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ نکل گیا۔''

''سوال یہ ہے کہ میں اس کہانی میں کہاں فٹ ہوتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارا شبہ یہ تھا کہ شاید تم بھی اس فائل کے چکر میں ہو۔'' اس نے کہا۔ ''جس وقت تم اور عنایت گلی میں باتیں کررہے تھے، اس وقت ہمارے دونوں آدمی قریب ہی کھڑے ہوئے تھے پھر تم دونوں کے درمیان کچھ تلخ کلامی سی ہوئی اور عنایت اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے بعد میرے آدمیوں نے دیکھا کہ تم بھی عنایت کے گھر کی طرف جارہے ہو۔ اسی لیے انہوں نے تمہارا تعاقب کیا جبکہ اس دوران ہم اس لڑکی کو اٹھا چکے تھے اور اب عنایت کو اٹھانے کا مرحلہ تھا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آسکی۔ کسی نے اس کا خون کردیا، شاید اسی فائل کے لیے۔''

''اب میں یہ بتا دوں کہ میرا عنایت سے ایسا کوئی خاص تعلق نہیں تھا کہ وہ مجھے کوئی فائل وغیرہ دیتا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو اتفاق سے تمہاری اس کہانی میں شامل ہوگیا ہوں۔''

''ہاں، اب تو ہمارا بھی یہی خیال ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم ایک غیر متعلق شخص ہو۔''

''ایک بات بتاؤ۔ آخر اس فائل میں ایسی کون سی خاص بات ہے جس کے لیے اتنی بھاگ دوڑ ہورہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ایک کاروباری معاملہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''جس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔''

''اب یہ بتاؤ کہ تم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''چونکہ تم بڑی حد تک ان چکروں میں شامل ہوگئے ہو اس لیے تمہارے بارے میں سوچنا پڑے گا۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا سوچنا چاہتا ہے۔ اب میری دلچسپی اس فائل میں ہوگئی تھی۔ آخر وہ کون سی فائل تھی جس کے لیے بے چارے عنایت جیسے آدمی کا خون ہوگیا تھا اور یہ لڑکی اغوا کرلی گئی تھی۔

کیا تھا اس فائل میں؟ اور کیا یہ کیس ہمارے محکمے کا نہیں بنتا تھا؟

وہ تینوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ انہوں نے دروازہ باہر سے بند کردیا تھا۔ غزالہ اب پہلے سے زیادہ پریشان دکھائی دینے لگی تھی۔ ''ٹیپو! آخر یہ سب کیا ہورہا ہے؟'' اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''یہ تو تم بتاؤ گی کہ یہ سب کیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں تو بلاوجہ اس چکر میں پھنس گیا ہوں۔''

''میں خود نہیں جانتی کہ یہ لوگ کس فائل کی بات کر رہے ہیں۔ ویسے دفتر میں فائل کے حوالے سے باتیں تو ہورہی تھیں۔''

''کیا تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس فائل میں کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ بتاؤ، اب ہمارا کیا ہوگا... یہ لوگ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟''

''خاموش رہو۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرنی ہوگی۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم ایسا کرو، دروازے کے پاس جاکر ان میں سے کسی کو بلانے کی کوشش کرو۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''جب کوئی اندر آئے گا تو پھر میں سنبھال لوں گا کیونکہ اب اس کھیل کو ختم ہوجانا چاہیے۔''

اس نے میری ہدایت کے مطابق دروازے پر جاکر آوازیں دیں۔ دروازے پر زور سے دستک دی تو دروازہ اچانک کھل گیا۔ ''ارے، یہ دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔

☆☆☆

ہم اپنے اپنے فلیٹ میں واپس آگئے تھے۔

کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ کسی نے ہمیں روکنے یا ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ اس مکان میں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک خالی مکان تھا۔ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا کوارٹر جو شہر کے ایک مضافاتی علاقے میں تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی تھی۔ راستے میں غزالہ نے پوچھا۔ ''ٹیپو! یہ سب کیا ہوا؟ وہ ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟''

''اس لیے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ ہمیں اس فائل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس لیے وہ ہمیں اس طرح چھوڑ گئے۔''

پھر ہم اپنے اپنے فلیٹ میں واپس آگئے۔

کچھ بھی نہیں ہوا۔ رات بھی سکون سے گزر گئی اور دوسری صبح چیف نے مجھے طلب کرلیا۔ وہ اس وقت کچھ پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ ''خیریت تو ہے چیف؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ٹیپو! ہم تم پر ایک بہت بڑی ذمے داری کا بوجھ ڈال رہے ہیں۔'' چیف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اپنا فرض خوش اسلوبی سے ادا کرو گے۔''

''فرمائیں چیف۔'' میں مستعد ہوگیا۔

''تمہیں ایک شخص کی حفاظت کرنی ہے... اپنی جان سے زیادہ۔''

''کیا اس شخص کے ساتھ کسی قسم کا کوئی خطرہ ہے؟''

''ہاں، کچھ لوگ اسے مارنا چاہتے ہیں۔'' چیف نے بتایا۔ ''وہ کل صبح کی فلائٹ سے پاکستان پہنچے گا۔''

''وہ کون ہے چیف... کیا نام ہے اس کا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا نام پروفیسر آفندی ہے۔'' چیف نے بتایا۔ ''اس وقت پوری دنیا میں اس سے بڑا جیالوجسٹ کوئی نہیں ہوگا۔ وہ پاکستان کی ارضیاتی تحقیق کے لیے آرہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پاکستان کی زمین میں غیر معمولی طور پر اتنی قیمتی دھاتیں پائی جاتی ہیں جو دنیا میں کہیں اور نہیں ہیں۔''

''اوہ خدا! یہ تو اسی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہورہی ہیں چیف۔'' میں نے کہا۔

''کس سلسلے کی... بتاؤ؟'' چیف نے بے چین ہوکر پوچھا۔

میں نے کل سے اب تک کی پوری رپورٹ سے اسے آگاہ کردیا۔ چیف حیران ہوکر سنتا رہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم پہلے ہی اس معاملے میں ملوث ہوچکے ہو؟''

www.kahopakistan.com

''جی ہاں چیف! حادثاتی طور پر... اور اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس فرم کو چیک کرلوں۔''

''ضرور چیک کرو کیونکہ یہ پروفیسر آفندی ہی کے سلسلے کی کڑی ہے۔'' چیف نے کہا۔ ''اور ہاں، پروفیسر کے ساتھ اس کی بیٹی لیلیٰ بھی آرہی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ پروفیسر بیمار ہے۔ وہ کچھ دنوں تک اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ہی آرام کرے گا۔ تمہیں اس کا خیال رکھنا ہے۔ کوئی شکایت نہ ہو اس کو۔''

''آپ بے فکر رہیں چیف۔ میں ایسے معاملے میں اپنے سارے حواس بیدار رکھتا ہوں۔''

میں اپنے فلیٹ میں واپس آکر اس کمرے کی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا جہاں سے غزالہ کی کھڑکی دکھائی دیتی تھی۔ کچھ دیر بعد غزالہ دکھائی دے گئی۔ میں نے اسے بلڈنگ سے باہر ملنے کا اشارہ کیا۔ اس نے میری بات سمجھ کر اپنی گردن ہلا دی۔

ہم کچھ دیر بعد ایک ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''غزالہ! یہ معاملہ کچھ دلچسپ اور بین الاقوامی سا ہوتا جارہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنی فرم کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتاؤ؟''

''اب کیا بتاؤں... سب کچھ تو بتا چکی ہوں۔''

''پہلے تو اس کا ایڈریس بتاؤ۔ پھر اس کے مالک کا نام بتاؤ۔ فرم کی سرگرمیاں بتاؤ۔''

غزالہ نے اس کا ایڈریس سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ہماری فرم کے مالک کا نام بختیار ہے۔ اس نے باہر کے کئی ممالک سے جیالوجی کی تعلیم حاصل کی ہے اور اب پاکستان آکر اپنے ملک کی خدمت کررہا ہے۔ ہم زمین میں موجود معدنیات وغیرہ کے حوالے سے کام کرتے ہیں۔ معدنیات کی تلاش ہماری فرم کا کام ہے۔''

''کیا وہ گمشدہ فائل اسی سلسلے کی کڑی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے۔'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔''

''میں تمہاری فرم کے باس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے مل لو، جب جی چاہے۔'' غزالہ نے کہا۔ ''وہ ایک خوش اخلاق انسان ہے۔''

''کیا تم ابھی میرے ساتھ چل سکتی ہو؟''

''ابھی تو میں آئی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن چلو، تمہاری خاطر چلتی ہوں... مگر یہ معاملہ کیا ہے؟ اب تم کیوں اس میں الجھ رہے ہو؟''

''یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال مجھے تمہارے خوش اخلاق باس سے ملنا ہے۔''

لیکن اس خوش اخلاق باس سے ملاقات نہیں ہو سکی کیونکہ کچھ دیر پہلے اسے پارکنگ سے اغوا کرلیا گیا تھا۔

☆☆☆

ہم پھر اسی ریستوران میں تھے۔

اس بار غزالہ پہلے سے کہیں زیادہ خوف زدہ تھی جیسے اس کے اعصاب شکست ہو گئے ہوں۔ اس کے باس کا اغوا ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ یقیناً اس کے پاس کوئی ایسا راز ہو گا جس کو حاصل کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا گیا ہو گا۔

''ٹیپو! اب کیا ہو گا؟'' غزالہ نے پوچھا۔

''تم اب تک دس بار مجھ سے یہ سوال کرچکی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''میری خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں کیا جواب دوں۔''

''میں تو بہت زیادہ ڈری ہوئی ہوں۔''

''میں تمہیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔ تم کچھ دنوں کے لیے غائب ہو جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ تمہارے باس کے بعد ایک بار پھر تمہیں نشانہ بنانے کی کوشش کریں۔''

''اوہ خدا! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔'' غزالہ نے کہا۔ ''میرا قوان معاملات سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس قسم کے مجرم اپنے مفاد کے لیے کسی کے ساتھ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔'' میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو یہ کسی بین الاقوامی سازش کی کڑیاں نظر آرہی ہیں۔ خیر، تم گھبراؤ نہیں۔ مجھ سے رابطے میں رہنا۔ میرا فون نمبر ہے تمہارے پاس۔ خدانہ کرے کوئی بات ہو تو فوراً بتا دینا۔''

غزالہ کو گھر رخصت کردینے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے چیف کو نئی صورتِ حال بھی بتا دی تھی۔ غزالہ کے باس کے اغوا کی خبر سن کر چیف بھی متفکر ہو گیا تھا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ پروفیسر آفندی کی حفاظت اور زیادہ اہم ہو گئی ہے... کیونکہ مجھے یہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہورہی ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے چیف۔''

''چلو، کل صبح سے تم اپنی ڈیوٹی سنبھال لو اور اس لڑکی کی بھی نگرانی رکھنا۔ وہ بھی خطرے میں ہوسکتی ہے۔''

دوسری صبح میں مقررہ وقت پر پروفیسر آفندی کو ریسیو

www.kahopakistan.com

کرنے ائرپورٹ پہنچ گیا۔ آفندی کو ترکی سے آنا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹی مقررہ وقت پر پہنچ گئے۔

آفندی ایک صحت مند انسان تھا۔ پچپن اور ساٹھ کے درمیان، مکمل گنجا... لیکن چہرے پر خاص قسم کا وقار تھا۔ ایسا وقار جو علم سے پیدا ہوتا ہے۔

اس کی بیٹی لیلیٰ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ مکمل حسن کا مکمل نمونہ۔ دراز قامت، سنہری رنگت اور مغربی لباس میں ملبوس۔ مجھے ان دونوں کی تصویریں دکھا دی گئی تھیں اس لیے میں انہیں پہچان کر ان کے پاس چلا گیا۔

''خوش آمدید مسٹر آفندی۔'' میں نے انگلش میں کہا۔

''میں ٹیپو ہوں... ٹیپو سلطان۔''

''ہاں، مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''لیکن تم انگریزی کیوں بول رہے ہو، اردو بولو... کیونکہ میں بھی اردو جانتا ہوں اور میری بیٹی بھی جانتی ہے۔''

''اوہ، پھر تو یہ بہت اچھی بات ہوگی۔''

''نہ جانے لوگوں کو انگریزی بولنے کا کیا شوق ہو گیا ہے۔'' آفندی بڑبڑانے لگا۔ ''اپنی زبان کے ہوتے ہوئے انگریزی بولتے ہیں۔''

''معاف کیجیے گا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ آپ اردو نہیں جانتے ہوں گے۔''

''کیسے نہیں جانتا ہوں گا... یہ تم نے پہلے سے کیوں سمجھ لیا؟ تم مجھ سے اردو بول کر تو دیکھتے، اگر نہیں سمجھتا تو پھر انگریزی میں شروع ہو جاتے۔''

''اوہ ڈیڈ! ختم کریں نا اس قصے کو۔'' لیلیٰ نے اپنے باپ کا بازو پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ ''آپ تو ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔''

میں پروفیسر کے ٹائپ کو سمجھ چکا تھا۔ وہ ایک جھکی قسم کا انسان تھا۔ اس کی باتوں پر غصہ تو آ رہا تھا لیکن سوائے صبر کرنے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

''چلیں سر! گاڑی تیار ہے۔'' میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

لوڈر ان کا سامان بھی لے آیا تھا جو بہت مختصر سا تھا اور اعلیٰ ہدایت پر اس کی چیکنگ بھی نہیں ہوئی تھی۔ میرے چیف نے یہ بتایا تھا کہ پروفیسر آفندی کچھ بیمار ہے اس لیے وہ کچھ دنوں تک آرام کرے گا لیکن وہ تو مجھے کہیں سے بیمار نہیں دکھائی دے رہا تھا... بلکہ اچھا خاصا صحت مند انسان تھا۔

ہم کچھ دیر میں گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ راستے میں وہ دونوں شاید ترکی زبان میں باتیں کرتے آئے تھے جو میری سمجھ میں نہیں آسکی تھیں۔

گیسٹ ہاؤس میں بھی ان کی حفاظت کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ ہم گاڑی سے اترے۔ ملازمین نے ان کا سامان اندر پہنچا دیا۔ اچانک لیلیٰ نے ایک چیخ مار کر آفندی کو دھکا دے دیا۔ اس کے دھکا دیتے ہی ایک گولی ان کے سروں کے اوپر سے گزر گئی تھی۔

حملہ آور نے ریسٹ ہاؤس کی چھت پر سے آفندی کا نشانہ لیا تھا۔

☆☆☆

ذرا سی دیر میں چیف بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔

لیلیٰ پوری پچویشن بتا رہی تھی۔ ''گاڑی سے اترتے ہی میں نے جب چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو حملہ آور مجھے چھت پر کھڑا ہوا دکھائی دے گیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کس کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔''

''مس لیلیٰ! آپ کی پھرتی اور قوتِ فیصلہ کا جواب نہیں ہے۔'' میں نے اس کی تعریف کی۔ ''آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ پچویشن کو سمجھنے میں ہی دس منٹ لگا دیتا۔''

''مجھے فخر ہے اپنی بیٹی پر۔'' آفندی کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

''چیف! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کے یہاں پہنچتے ہی کھیل شروع ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ہماری حکومت کو اندازہ تھا۔'' چیف نے کہا۔ ''اس لیے ہم نے پروفیسر کی حفاظت کا بندوبست کر دیا تھا اور تمہاری ڈیوٹی لگا دی تھی۔''

''لیکن میں تو ایک طرح سے ناکام ہی رہا ہوں چیف۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''وہ تو لیلیٰ صاحبہ کی ذہانت نے کام دکھا دیا، ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

''ارے نہیں، اس میں شرمندہ ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔'' آفندی نے کہا۔ ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔''

پروفیسر بہت ہی بامحاورہ اردو بول رہا تھا اور اس کا لہجہ بھی بہت صاف تھا، جیسے ہم بولتے ہیں... اور سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ اس کے اعصاب آہنی معلوم ہو رہے تھے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک کانپ ہی رہا ہوتا جبکہ وہ بہت اطمینان سے کافی پی رہا تھا۔

چیف کچھ دیر بعد واپس چلا گیا۔

میں نے اپنے آدمیوں کو بہت محتاط رہنے کی ہدایت کی اور دوسرے کمرے میں آ گیا۔ گیسٹ ہاؤس کا یہ کمرا میرے لیے مخصوص کیا گیا تھا جبکہ آفندی اور لیلیٰ کو دو ایسے کمرے دیے گئے تھے جن کے درمیان آنے جانے کا دروازہ تھا۔ سونے سے پہلے میں نے اطمینان کے لیے پورے گیسٹ ہاؤس کا چکر لگایا۔ چھت پر بھی جا کر دیکھ چکا تھا۔

حملہ آور نے چھت ہی سے حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا جبکہ میں نے چھت تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی لیکن اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔

میرے ذمے بہت بڑی ذمے داری تھی۔ نہ جانے پروفیسر آفندی یہاں کس مشن پر آیا تھا کہ اس کے لیے اتنے حفاظتی اقدامات کیے جا رہے تھے۔ ان سے اس شخص کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔

میں نے یہ سوچا تھا کہ میں رات بارہ بجے پھر گیسٹ ہاؤس کا چکر لگا لوں گا۔ وہ دونوں باپ بیٹی دس بجے ہی سونے چلے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ طویل سفر کے بعد وہ تھک گئے ہوں گے۔

بارہ بج کر دس منٹ پر میں اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ اس وقت میں پوری طرح چوکنا تھا۔ پھر میں نے پروفیسر آفندی کو دیکھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر آہستہ آہستہ ایک طرف چلا جا رہا تھا۔

یہ ایک عجیب بات تھی۔ وہ اس طرح چوروں کی طرح کہاں جا رہا تھا؟ برآمدے کے بلب اگرچہ احتیاطاً بجھا دیے گئے تھے اس کے باوجود میں نے اس کے چلنے کے انداز سے اسے پہچان لیا تھا۔

میں بھی دبے پاؤں اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس وقت میری کیفیت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ مجھے کیا سمجھنا چاہیے تھا؟ پھر میں نے پروفیسر آفندی کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کو بھی دیکھ لیا۔

واضح طور پر اس نے ایک خوفناک قسم کا ریوالور اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور کسی خاص ارادے سے کسی طرف چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

میں پروفیسر آفندی کو اس کے کمرے میں لے آیا تھا۔

اس سے پہلے جب وہ ریوالور ہاتھ میں لیے برآمدے سے سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے پستول والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ ڈال دیا تھا۔

لیکن یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس کی حرکت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ نیند میں چلنے کا مریض ہے۔ میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے اس کے کمرے میں لے آیا اور بستر پر لٹا دیا تھا۔

وہ کسی بچے کی طرح بستر پر لیٹ گیا... پھر میں نے اس ریوالور کو دیکھا جو میں نے اس سے چھینا تھا اور اس وقت مجھے پتا چلا کہ وہ ریوالور تو نقلی تھا۔

میں نے دوسری صبح لیلیٰ سے بات کی۔ وہ اس وقت لان میں اکیلی بیٹھی تھی۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہیلو سلطان صاحب! کیسے ہیں آپ؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ سے ایک ضروری بات معلوم کرنی ہے۔''

''ضرور... بتائیں کیا بات ہے؟''

''کیا آپ کے ڈیڈی کچھ بیمار ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''وہ بیمار ہیں لیکن ان کی بیماری جسمانی نہیں بلکہ ذہنی ہے۔ وہ نیند میں چلنے کے مریض ہیں... لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟''

میں نے اسے رات کی کہانی سنا دی۔

''ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے ان کے ساتھ۔ انہیں احساس

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس	ایئر ہوسٹس	ہوم اکنامکس	بیوٹی پارلر کورس	
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ	ایئر ٹکٹنگ	بوتیک فیشن	آٹو سروسنگ	
ریڈیو ٹی وی وی سی آر ٹیکنیشن	الیکٹریشن	ڈرافٹس مین	ڈرائنگ پینٹنگ	
اسکول ٹیچنگ میتھڈ	صحافت	فوٹو گرافی	انٹیریئر ڈیکوریشن	
ہومیو پیتھی	شمسی توانائی	مہر سازی	سلمنگ بیوٹی	حکمت / اردو ادب
موٹر سائیکل مرمت	لائبریرین	کمپیوٹر	کوکنگ بیکنگ	لیڈیز ٹیلرنگ
الیکٹریکل سپروائزر	میڈیکل لیب	آئل پینٹنگ	ڈینٹل ٹیکنیشن	
پولٹری ڈیری فارمنگ	نیوز رپورٹر	فلاور میکنگ	پبلک ہیلتھ آفیسر	

[illegible]

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237 ... اسلام آباد

www.kahopakistan.com

نہیں ہوتا کہ وہ کہاں جارہے ہیں۔ پہلے وہ اپنا اصیل ریوالور لے کر نکل جاتے تھے۔ پھر میں نے ان کے پاس نقلی ریوالور رکھنا شروع کردیا۔ اس طرح کم از کم کسی اور کو تو نقصان نہیں ہوسکتا۔''

''یہ آپ نے عقل مندی کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا اس مرض کا کوئی علاج نہیں ہے؟''

''ہم ہر طرح کا علاج کر کے دیکھ چکے ہیں۔ ڈاکٹرز کا یہ کہنا ہے کہ مرض خود ہی ٹھیک ہوجائے گا۔''

کچھ دیر میں پروفیسر آفندی بھی آگیا۔ اب اسے دیکھ کر احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ رات میں اس کی کیا حالت تھی۔

میں نے اپنے آدمیوں کو مزید محتاط رہنے کی ہدایت کی اور اپنے چیف کے پاس پہنچ کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ چیف کی بھویں سکڑ گئیں۔ ''جانتے ہو ٹیپو... اس مرض کا کیا مطلب ہے؟''

''آپ ہی بتائیں چیف۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہاری ذمے داری اور بھی بڑھ گئی ہے۔'' چیف نے کہا۔ ''ایسا شخص تو رات کے وقت اٹھ کر کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''یہ آپ نے میرے ذمے کون سا کام لگا دیا ہے چیف؟'' میں نے کہا۔ ''اور ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ پروفیسر آفندی کی کیا اہمیت ہے؟''

''کچھ اہمیت ہے اس لیے تو تمہاری ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔'' چیف نے بتایا۔ ''اور ہاں، تمہارے لیے ایک خبر بھی ہے میرے پاس۔''

''مجھے یقین ہے کہ وہ بری ہی ہوگی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' چیف نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اچھی خبروں نے آج کل میرے پاس آنا چھوڑ دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے خبر کیا ہے؟''

''خبر یہ ہے کہ وہ لڑکی یعنی غزالہ احمد اغوا ہوچکی ہے۔'' چیف نے بتایا۔

''کیا؟'' میں بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔ ''چیف! یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم نے تو اس کی حفاظت کا انتظام کردیا تھا۔''

''اس کے باوجود وہ اغوا ہوگئی۔'' چیف نے کہا۔ ''وہ لوگ بہت منظم طور پر اپنی کارروائیاں کررہے ہیں۔''

''چیف! کم از کم یہ تو بتا دیں کہ آخر یہ سب کیوں ہورہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''آفندی کس مشن پر یہاں آیا ہے؟''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔ اس کے لیے ہم نے ایک شخص کو مدعو کیا ہے۔ وہ آفندی کا اسسٹنٹ اور شاگرد رہ چکا ہے۔ پاکستانی آدمی ہے۔ وہ آکر ہمیں آفندی کے مشن کے بارے میں بتائے گا کیونکہ خود ہمیں بھی ابھی بہت سی باتیں معلوم نہیں ہیں۔''

آدھے گھنٹے کے بعد خاور حیات نامی وہ پاکستانی، چیف اور دوسرے لوگوں کو بتا رہا تھا۔ وہ دیوار پر لٹکے ہوئے بلیک بورڈ پر اس طرح بتا رہا تھا جیسے کلاس روم میں لیکچر دے رہا ہو۔

''حضرات! پروفیسر آفندی ہمارے ملک پر ایک احسان کرنے آئے ہیں۔ انہوں نے امکانات کا جائزہ لے لیا ہے کہ ہماری زمین کے اندر کون کون سے خزانے پوشیدہ ہیں۔ پروفیسر آفندی اس وقت دنیا کے نمبر ایک ماہرِ ارضیات تسلیم کیے جاتے ہیں۔ شاید آپ کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ اب سے ایک سال پہلے ہم آپ کی زمینوں، پہاڑی سلسلوں اور ریگستانوں کا سروے کر کے گئے ہیں لیکن بدقسمتی سے وہ سروے مکمل نہیں ہوسکا۔ اب پروفیسر صاحب کو اس کی تکمیل کے لیے بلایا گیا ہے لیکن دوسری طرف ان کی زندگی کو خطرہ بھی ہے۔ کچھ طاقتیں یہ نہیں چاہتیں کہ ہم اپنے خزانوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اس لیے پروفیسر صاحب پر حملہ کیا گیا تھا۔''

''کیا میں اپنی معلومات کے لیے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''کیوں نہیں، ضرور پوچھیں۔''

''آپ لوگ سروے کے دوران کیا کیا دیکھتے ہیں؟''

''یہ ایک خالص علمی اور خشک سا موضوع ہے۔ بہرحال، میں مختصراً بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' خاور حیات نے کہا۔

''یوں سمجھ لو کہ اس سروے میں زیرِ زمین ذخائر کے بعض بنیادی خواص کو بہت احتیاط سے جانچا جاتا ہے پھر یہ طے ہوتا ہے کہ ان پر مزید کام سودمند ہوگا یا نہیں۔'' خاور حیات نے بات جاری رکھی۔

''پروفیسر نے طبعی اور کیمیائی خواص پر بہت عرق ریزی سے تحقیقی تجربات کر کے متعدد مقامات پر سونے کے کارآمد زیرِ زمین ذخائر کی نشاندہی کی ہے۔ اس اہم پیش رفت کو آگے بڑھایا جائے تو ہماری زمین حقیقت میں سونا اگلنے لگے گی...''

''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پروفیسر کا کام واقعی بہت اہم تھا اور اس کی حفاظت اس سے زیادہ اہم تھی۔

میں چیف سے اجازت لے کر گیسٹ ہاؤس آگیا۔

پروفیسر کی بیٹی بہت بے تابی سے میرا انتظار کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میرے پاس آگئی۔ اس کے پاس ایک اور خبر تھی۔ پروفیسر آفندی کہیں غائب ہوچکا تھا۔

پروفیسر کا غائب ہوجانا کوئی معمولی بات نہیں تھی لیلیٰ مجھے اس کے غائب ہونے کی تفصیل بتا رہی تھی۔ ''ڈیڈی دوپہر تک یہیں تھے۔ کھانے کے بعد ہم دونوں ریسٹ کرنے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں ان کے کمرے میں گئی تو وہ کمرے میں نہیں تھے۔ میں نے ریسٹ ہاؤس میں تلاش کیا، وہ کہیں نہیں ملے۔ میں نے تمہیں تلاش کیا مگر تم بھی نہیں تھے۔ اب ملے ہو تو میں تمہیں صورتِ حال بتا رہی ہوں۔''

''میرے خدا! وہ کہاں جاسکتے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''یہ شہر تو ان کے لیے نیا ہے پھر وہ خطرے میں بھی ہیں۔ میں اپنے آدمیوں کو ان کی حفاظت کی ذمے داری دے گیا تھا۔ ان کم بختوں نے انہیں جانے ہی کیوں دیا؟''

''لیکن وہ ڈیڈی کو کس طرح روک سکتے تھے؟''

یہ بھی درست تھا۔ پروفیسر کو زبردستی نہیں روکا جاسکتا تھا۔ میں نے چیف کو بتانے سے پہلے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔

میں نے محافظوں سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔ ''پروفیسر صاحب تو پیدل ہی گئے ہیں۔''

''پیدل گئے ہیں؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

''جی ہاں، ہم نے ان کی حفاظت کے طور پر جب ان کے ساتھ چلنا چاہا تو انہوں نے سختی سے روک دیا۔ کہنے لگے میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو گم ہوجاؤں گا۔ میں بس یونہی ادھر ادھر گھوم کر واپس آجاؤں گا۔ کسی کو میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ہم کیا کرسکتے تھے۔''

''لیکن میں نے ان کے منع کرنے کے باوجود ان کا پیچھا کیا تھا۔'' ایک محافظ رجب علی نے بتایا۔ وہ ایک تجربہ کار شخص تھا اور کئی ایجنسیوں کے لیے کام کرچکا تھا۔

''ہاں بتاؤ، کیا دیکھا تم نے؟ کہاں گئے ہیں وہ؟'' میں نے بے تاب ہوکر پوچھا۔

''ناظم آباد۔'' اس نے بتایا۔ ''انہوں نے کچھ دور پیدل چلنے کے بعد ایک ٹیکسی لے لی تھی۔ میں نے دوسری ٹیکسی میں ان کا پیچھا کیا۔ وہ ناظم آباد کے ایک گھر کے سامنے اتر گئے۔ میں بہت دیر تک ان کے انتظار میں کھڑا رہا۔ پھر آپ کو بتانے کے لیے یہاں چلا آیا کیونکہ میرے پاس آپ کا نمبر نہیں تھا۔''

''کیا تمہیں وہ مکان یاد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں صاحب! اچھی طرح یاد ہے۔''

''تو چلو میرے ساتھ۔''

میں نے رجب علی کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میں نے اس وقت لیلیٰ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ویسے یہ پُراسراری بات تھی۔ پروفیسر آفندی تو ایک اجنبی تھا اس شہر کے لیے۔ پھر وہ ناظم آباد کے کسی مکان میں کیوں گیا تھا؟

ناظم آباد کراچی کے اچھے علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ رجب علی نے ایک گلی میں رکنے کا اشارہ کیا۔ ''بس صاحب، یہیں رک جائیں۔'' اس نے کہا پھر ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھیں وہ جو دو منزلہ مکان دکھائی دے رہا ہے۔ پروفیسر صاحب اسی مکان میں گئے تھے۔''

''اچھا رجب علی... تم اب واپس جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس معاملے کو دیکھ لیتا ہوں۔''

رجب علی چلا گیا جبکہ میں گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ میری نگاہیں اس مکان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

ممکن ہے یہ پروفیسر کے کسی جاننے والے کا مکان ہو... لیکن کیسے؟ پھر پروفیسر کو اس کا اتنا صحیح پتا کیسے معلوم ہوا کہ وہ سیدھا یہیں چلا آیا جبکہ اس کی بیٹی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

پھر بہت دیر انتظار کے بعد پروفیسر آفندی اس مکان سے باہر آگیا۔

لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی اور یہ لڑکی وہی غزالہ تھی۔ وہی لڑکی جو میرے فلیٹ کے سامنے رہا کرتی تھی اور جس کے بارے میں چیف نے یہ بتایا تھا کہ وہ اغوا ہوگئی ہے۔

☆☆☆

چیف میری داستان سنتا رہا۔

پھر میں نے کہا۔ ''چیف! پروفیسر آفندی بھی اب مشکوک معلوم ہورہا ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''آپ خود سوچیں، یہ ساری باتیں کس طرف اشارہ کررہی ہیں۔''

''دیکھو، تمہارا کام پروفیسر کی حفاظت کرنا ہے۔ اس پر تنقید تمہارا کام نہیں ہے۔''

''کیسی بات کررہے ہیں چیف! آپ خود دیکھیں، وہ آدمی کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس لڑکی کے ساتھ جو غائب ہوگئی تھی۔''

www.kahopakistan.com

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"میں تو کہتا ہوں کہ ہم اس لڑکی کو اٹھا لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر سارے حالات خود پتا چل جائیں گے۔"

"نہیں، اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کرتا۔" چیف غرا کر بولا۔ "تم اپنے کام سے کام رکھو۔" "تم اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دو گے اور نہ ہی پروفیسر سے اس بارے میں کوئی بات کرو گے۔"

"یہ تو اور بھی الجھی ہوئی سچویشن ہے چیف۔"

"تم سے جو کہا گیا ہے، وہی کرو اور پروفیسر کی حفاظت کرو۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

میں جتنے جوش کے ساتھ چیف کے پاس یہ خبر لے کر پہنچا تھا، اسی شدت سے ٹھنڈا ہو کر واپس آگیا۔ میری جھلاہٹ اپنے عروج پر تھی۔ میں پروفیسر آفندی سے بھی سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن چیف نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔ دوسری طرف اس لڑکی کا کردار بھی حیرت انگیز تھا۔

میں ریسٹ ہاؤس میں پہنچا تو پروفیسر آفندی وہاں آچکا تھا۔

وہ مجھے دیکھتے ہی برس پڑا۔ "تم میری کیا خاک حفاظت کرو گے۔ تم تو دن دن بھر غائب رہتے ہو۔"

"پروفیسر صاحب! آپ خود بھی تو غائب ہو گئے تھے۔" میں منہ بنا کر بولا۔ "حالانکہ آپ کو یہاں کے راستے نہیں معلوم۔"

"تو کیا ہوا۔ میں تو برابر والے پارک میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔" پروفیسر نے بتایا۔

"تو آپ اتنی دیر اسی پارک میں رہے تھے؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو اور کہاں جاتا؟ مجھے یہاں کے راستے کہاں معلوم ہیں۔" آفندی نے کہا۔

اس کے بعد میں نے اس سے تو کوئی سوال نہیں کیا لیکن اس کی طرف سے چوکنا ضرور ہو گیا۔ اس کی یہ حرکت میری سمجھ سے باہر تھی۔ پھر اس لڑکی کا کردار بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

میں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا لیکن میں نے اس کی بیٹی لیلیٰ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا تاکہ وہ بھی اپنی جگہ پر ہوشیار ہو جائے۔

دو گھنٹوں کے بعد مجھے اس کا موقع مل گیا۔ آفندی اپنے کمرے میں تھا اور لیلیٰ لان میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں بھی اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔

"ہیلو۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ "تم ہم لوگوں کی نگرانی کرتے ہوئے بور تو نہیں ہو رہے؟" اس نے پوچھا۔

"بور تو نہیں ہو رہا لیکن پریشان ضرور ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ پروفیسر تعاون نہیں کر رہے جبکہ ان کی زندگی کو کئی خطرات ہیں۔"

"کیسا تعاون؟"

"آج کا واقعہ دیکھو۔" میں نے کہا۔ "وہ آج خاموشی سے باہر نکل گئے۔"

"ہاں، ڈیڈی کو اس طرح کسی پبلک پارک کی طرف نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"بے بی! یہ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ تمہارے پاپا کسی پارک کی طرف نہیں گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر وہ کہاں گئے تھے؟"

"یہاں کا ایک علاقہ ہے ناظم آباد۔ وہ وہاں کے ایک مکان میں گئے تھے۔" میں نے بتایا۔

میرا خیال تھا کہ وہ یہ سن کر اچھل پڑے گی لیکن اس کے برعکس اس نے سرد انداز میں مجھ سے کہا۔ "چلو، اگر وہ چلے بھی گئے تھے تو تمہیں کریدنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم صرف اپنا کام کرو۔"

میں جھلا گیا۔ "کمال کرتی ہو... کیا تمہیں اس بات پر حیرت نہیں ہوئی کہ تمہارے ڈیڈی ایک اجنبی شہر کے ایک علاقے کے کسی مکان میں چلے گئے؟"

"نہیں، مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔" اس نے کہا۔ "اور تم اب اس چکر میں نہ پڑو۔ اگر تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے تو بھول جاؤ اس کو۔"

میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت چیف کے پاس جا کر اس سے معذرت کر لوں۔ یہ کیسے لوگ تھے؟ کیسے رویے تھے ان کے؟ لیلیٰ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں بہت دیر تک وہیں لان میں بیٹھا رہا۔

پھر اچانک ہی آفندی کے کمرے سے آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں لیلیٰ کی تھیں۔ وہ زور زور سے کچھ کہہ رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کس پر غصہ ہو رہی ہے۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر آفندی کے کمرے کے دروازے تک آگیا۔ لیلیٰ کی آوازیں آرہی تھیں۔ "تم کبھی کبھی اپنے ہوش میں نہیں رہتے۔ کس نے کہا تھا کہ تم اس طرح یہاں سے باہر چلے جاؤ؟"

اب یہاں دو باتیں سامنے آئیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ لیلیٰ اپنی مادری زبان کے بجائے اردو میں بات کر رہی تھی

اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ ایسی باتیں اپنے باپ سے کہہ رہی تھی۔ جیسے اس کے نزدیک اپنے باپ کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ آفندی بھی جواب میں کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کی آواز دھیمی تھی اس لیے سنائی نہیں دے رہی تھی جبکہ لیلیٰ کی آواز باہر تک آرہی تھی۔

پھر وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ شاید وہ بیچ کے دروازے کو بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں بھی کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر اپنے کمرے میں آگیا۔

اس رات پھر پروفیسر آفندی اپنے کمرے سے نکل کر نیند کے عالم میں چلتا ہوا گیٹ کی طرف جانے لگا۔ اس کے ہاتھ میں وہی نقلی ریوالور دبا ہوا تھا۔ گزشتہ رات کی طرح اس بار بھی میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے اس کے کمرے میں لے آیا۔

اسے بستر پر لٹا کر اور اپنا اطمینان کر لینے کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ اسی وقت گولی کی اور شیشہ ٹوٹنے اور انسانی چیخ کی آواز نے میرے ہوش اڑا دیے۔ وہ چیخ پروفیسر آفندی ہی کی تھی۔

ذرا سی دیر میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔

سارے محافظ جیسے اس کمرے میں چلے آئے تھے۔ کمرے کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹ کر پورے کمرے میں کرچیوں کی صورت میں بکھر گئے تھے۔ گولی سامنے والی کسی عمارت کی چھت سے چلائی گئی تھی لیکن پروفیسر آفندی کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ وہ محفوظ تھا۔

لیلیٰ بھی سلیپنگ سوٹ میں ملبوس اس کمرے میں چلی آئی تھی۔ وہ بھی بہت پریشان معلوم ہو رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اتنی پریشان نہیں ہے جتنا وہ خود کو ظاہر کر رہی ہے۔

بظاہر وہ پروفیسر آفندی کے پاس کھڑی ہوئی اسے تسلیاں دے رہی تھی لیکن اس کا یہ انداز مجھے مصنوعی معلوم ہو رہا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ یہ میرا وہم ہو۔

پروفیسر آفندی غصے میں دہاڑ رہا تھا۔ "کیا ہو رہا ہے یہ؟ تم لوگ میری کس طرح حفاظت کر رہے ہو؟ مجھ پر یہ دوسرا حملہ ہوا ہے۔ میری قسمت اچھی ہے کہ میں بال بال بچ رہا ہوں۔ میں تمہاری شکایت اوپر والوں سے کروں گا۔ میں اس ملک میں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ مجھ پر حملے ہوتے رہیں۔"

مجھے بھی احساس ہو رہا تھا کہ اب تک میں ناکام ہی رہا ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ گولی اگر پروفیسر آفندی کو لگ جاتی تو پھر کیا ہوتا؟

آس پاس کی عمارتوں کی تلاشی بھی لی گئی لیکن اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ گولی کہاں سے چلی تھی لیکن اتنا ضرور پتا چل گیا تھا کہ حملہ آوروں کو ریسٹ ہاؤس کے بارے میں پوری معلومات تھیں۔ یعنی وہ یہ جانتے تھے کہ کون کس کمرے میں ہوتا ہے۔

میں نے چیف کو اطلاع دے دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس خبر کو سنتے ہی دوڑا چلا آئے گا۔ اس کے برعکس اس نے صرف اتنا کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں نے سن لیا۔ اب تم اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔"

پھر وہ رات اسی طرح گزر گئی۔ یعنی اس رات پھر کوئی اور بات نہیں ہوئی۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ

بااُصول

ایک اخبار نے اعلان کیا کہ وہ کراچی کے سب سے بااصول، سنجیدہ اور خوش اخلاق انسان کو مسٹر کراچی کا خطاب اور بڑا انعام پیش کرے گا۔

مقابلے میں شرکت کے لیے متعدد خطوط آئے۔ ہر شخص کا دعویٰ تھا کہ کراچی کا سب سے بااصول، سنجیدہ اور خوش اخلاق انسان صرف وہی ہے۔

ایک شخص نے لکھا تھا۔ "میں نہ تو سگریٹ پیتا ہوں، نہ کسی قسم کے دوسرے نشے کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ میں اپنی بیوی کا وفادار شوہر ہوں۔ بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت پر اچھی یا بری نظر نہیں ڈالتا۔ میں بڑا محنتی، خاموش طبع اور فرماں بردار انسان ہوں۔ میں نہ تو سنیما دیکھتا ہوں۔ نہ تھیٹر دیکھنے جاتا ہوں۔ میں ہر رات عشا کے فوراً بعد سو جاتا ہوں۔ میں پانچوں اوقات کی نمازیں باجماعت ادا کرتا ہوں۔

میں اس قسم کی عالی شان زندگی پچھلے تین سال سے گزار رہا ہوں اور اب میری رہائی میں صرف چھ مہینے باقی رہ گئے ہیں۔ یاد رکھو، اگر مجھے مسٹر کراچی نہیں چنا گیا تو میں باہر آتے ہی ایک ایک شخص کو سمجھ لوں گا۔"

جرأت خان کی للکار لالہ موسیٰ سے

www.kahopakistan.com

دونوں باپ بیٹی کے درمیان اختلافات ہیں۔ یعنی لیلیٰ اپنے باپ کو پسند نہیں کرتی... لیکن کیوں؟

بہت کچھ الجھا ہوا تھا۔

چیف نے اگرچہ مجھے منع کر دیا تھا کہ میں اس لڑکی یعنی غزالہ کو اس کے حال پر چھوڑ دوں لیکن میں کب تک یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا۔ ابھی تک میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ اس لیے میں نے غزالہ سے ملنے کا ارادہ کر لیا۔

میں نے ریسٹ ہاؤس میں اپنے ایک ماتحت نوشاد کو بلایا۔ وہی ایک ذہین اور بہادر نوجوان تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سخت اور مشکل ترین حالات کو ہینڈل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے میں نے اسے اب تک کی ساری صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نوشاد! میں اب اس لڑکی غزالہ کو کریدنے جا رہا ہوں اور تم یہاں کے حالات پر نظر رکھنا۔''

''آپ بے فکر ہو کر جائیں سر! میں سب دیکھ لوں گا۔''

میں کپڑے تبدیل کر کے جب اپنے کمرے سے باہر نکلا تو لیلیٰ میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ ''مسٹر ٹیپو! مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔''

''جی مس لیلیٰ... فرمائیں، کیا کام ہے؟''

''مجھے تمہارے ساتھ چلنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''میرے ساتھ کہاں؟''

''تم نے اس دن بتایا تھا کہ ڈیڈی کسی لڑکی کے گھر گئے تھے... تو مجھے تمہارے ساتھ اسی لڑکی کے گھر جانا ہے۔''

میں ہونٹ بھینچے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ محض اتفاق تھا یا کوئی اور بات تھی۔ اب یہ لیلیٰ اس کے گھر جانا چاہ رہی تھی۔ تو آخر کیوں؟ جبکہ پہلے اس نے کوئی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

''لیلیٰ! تم وہاں جا کر کیا کرو گی؟'' میں نے کہا۔ ''جبکہ تم اس لڑکی کو جانتی بھی نہیں ہو؟''

''یہ معلوم کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''تم بس مجھے اس کے گھر لے چلو۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔''

میں نے تو یہ سوچا تھا کہ میں تنہا جا کر غزالہ سے ملاقات کروں گا، اسے کریدنے کی کوشش کروں گا لیکن اب یہ میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ ''ٹھیک ہے مس لیلیٰ! چلیں میرے ساتھ۔''

میں نے اسے گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ راستے بھر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں معلوم ہوتی تھی۔ کچھ دیر کے سفر کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

''وہ دیکھیں، وہ سامنے والا مکان ہے۔'' میں نے اشارہ کیا۔

''کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، آپ اکیلی جائیں۔ میرا جانا ٹھیک نہیں ہے۔''

''اوکے، میں بھی یہی چاہتی تھی۔''

میں جھلا کر رہ گیا۔ یہ ایسا کیس تھا جس میں سوائے جھلاہٹ کے مجھے اور کچھ بھی نہیں مل رہا تھا۔ لیلیٰ اتر کر اس مکان کی طرف چلی گئی۔ میں گاڑی میں بیٹھا رہ گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اب کیا ہوتا ہے۔

میں نے گاڑی اس طرح کھڑی کی تھی کہ جہاں سے مکان کا گیٹ نظر آ رہا تھا لیکن گیٹ پر آنے والا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیلیٰ نے گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد گیٹ کھول دیا گیا۔

میں دیکھ رہا تھا۔ گیٹ کھولنے والی وہی لڑکی غزالہ تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ باتیں کیں پھر لیلیٰ کو اندر بلا لیا گیا۔

اس وقت مجھے سخت بے چینی ہو رہی تھی۔ کاش میں کسی طرح ان دونوں کی باتیں سن سکتا، اس گھر کے حالات جان سکتا۔ میں صرف سوچتا رہ گیا اور کچھ دیر بعد لیلیٰ اس مکان سے باہر بھی آ گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات یہ بتا رہے تھے کہ وہ سخت غصے میں ہے۔ یعنی اس گھر میں اس کے ساتھ کوئی خلافِ توقع بات ہوئی ہے۔

میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔

وہ میرے برابر آ کر بیٹھ گئی اور جب میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تو اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ٹیپو! میں اس وقت ریسٹ ہاؤس واپس نہیں جاؤں گی۔''

''تو پھر کہاں جاؤ گی؟''

''کسی ریسٹورنٹ میں جہاں اچھی سی کافی مل سکے۔''

میں اسے فائیو اسٹار لے آیا۔ شہر کا یہ ایک سلیقے کا ریسٹورنٹ تھا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ کوئی ایسی بات جو اس کے دل میں ہے اور پھٹ پڑنے کو بے تاب ہو رہی ہے لیکن میں نے اپنا تجسس ظاہر نہیں کیا بلکہ ادھر ادھر دیکھتا رہا۔

بالآخر کچھ دیر بعد وہ خود ہی بول پڑی۔ ''نہ جانے کیا شوق ہوتا ہے ایسے لوگوں کو... ایسا کیوں کرتے ہیں؟''

''خیریت تو ہے مس لیلیٰ؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا کوئی بات ہو گئی ہے؟''

''مسٹر ٹیپو! کیا تم نے اس لڑکی کو دیکھا جو گیٹ کھولنے کے لیے آئی تھی؟'' لیلیٰ نے پوچھا۔

وہ یقیناً غزالہ کی بات کر رہی تھی۔ ''جی ہاں، دیکھا تھا۔ کیا خاص بات ہے اس لڑکی میں؟''

''خاص بات یہ ہے کہ وہ میری بہن ہے۔'' لیلیٰ نے جیسے بم ہی پھاڑ دیا تھا۔

اب یہ کیس سانپ اور سیڑھی کا ہو گیا تھا۔

میں منزل تک پہنچنے لگتا اور سانپ ڈس کر مجھے نیچے لے آتا۔ اب یہ نیا انکشاف ہوا تھا کہ غزالہ لیلیٰ کی بہن تھی۔

''دیکھو لیلیٰ!'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس سے پہلے کہ میں پاگل ہو جاؤں تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ تمہاری بہن کیسے ہو گئی؟''

''اس لیے کہ ڈیڈی نے ایک پاکستانی عورت سے شادی کر لی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''اور یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

اور واقعی یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اب سمجھ میں آ گیا تھا کہ پروفیسر آفندی اس مکان میں کیوں آیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سے ملنے آیا ہو گا۔ پھر ایک خیال کے آتے ہی میں نے پوچھا۔ ''تم یہ بتاؤ، کیا پروفیسر پہلے بھی پاکستان آ چکے ہیں؟''

''کئی بار۔'' اس نے بتایا۔ ''جس وقت تم نے یہ بتایا کہ پروفیسر کسی سے ملنے ناظم آباد گئے ہیں تو میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کس سے ملنے آئے ہوں گے۔''

''اور تم کیوں آئی تھیں؟ کیا ان لوگوں سے ملنے؟''

''یہ بھی ایک مقصد تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کو سمجھایا جائے کہ فی الحال ڈیڈی کو نہ بلایا کریں۔ کیونکہ ان کی زندگی کو خطرہ ہے۔''

''خدا کی پناہ... اب جا کر معاملہ کلیئر ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، شاید اب تمہیں اطمینان ہو گیا ہو۔''

''ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اگر یہ مکان اس لڑکی کا ہے تو پھر یہ کہیں اور کیوں رہتی ہے؟'' میں نے کہا پھر اسے بتا دیا کہ وہ میری بلڈنگ کے سامنے والے فلیٹ میں رہتی ہے۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ گھر اس کے کسی رشتے دار کا ہو۔'' لیلیٰ نے کہا۔ ''اور وہ وہاں رہنے کے لیے چلی جاتی ہو۔''

''تم نے تو سارا معاملہ ہی کلیئر کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہو سکتا ہے کہ ابھی اور بھی بہت کچھ الجھا ہوا ہو۔'' لیلیٰ مسکرا کر بولی۔

ہم نے کافی ختم کر لی تھی۔ میں اس وقت خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا کیونکہ ایک طرف سے الجھن ختم ہو چکی تھی۔

پروفیسر آفندی اس ملک اور اس شہر کے لیے بالکل بھی اجنبی نہیں تھا۔

''لیلیٰ! تم مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟'' میں نے کہا۔ ''اگر تم پسند کرو تو...''

''کیوں نہیں، میں نے تو ایک عام سی زندگی گزاری ہے جس طرح لاکھوں کروڑوں لڑکیاں گزارتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ شروع سے میں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد ضرور بنا رکھا ہے۔''

''اور وہ مقصد کیا ہے؟''

''عالمِ اسلام کی خدمت۔'' اس نے کہا۔

''اوہ، یہ تو بہت بڑا مقصد ہے۔ ویسے ایک بات بتاؤ کہ تم نے اتنی اچھی اردو کہاں سے سیکھی؟''

''ڈیڈی سے۔'' وہ مسکرا دی۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔''

''ہاں، دیر تو ہو گئی ہے۔''

ہم پہنچے تو پروفیسر آفندی لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں بھائی، شہر کی سیر کرا دی میری بیٹی کو؟''

''جی جناب! اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی شہر کی سیر کر ہی چکے ہوں گے۔''

آفندی نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت لیلیٰ کے موبائل کی گھنٹی بول اٹھی۔ وہ کال سننے کے لیے ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کی واپسی فوراً ہی ہو گئی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ نہ جانے اس نے موبائل پر ایسی کون سی خبر سن لی تھی۔

اس نے اضطراب کے عالم میں میرا بازو تھاما اور تقریباً کھینچتی ہوئی ایک طرف لے آئی۔ ''ٹیپو! خدا کے لیے میرے ڈیڈی کو بچاؤ۔'' اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ ''میرے ڈیڈی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔''

''کیسی بات کر رہی ہو۔ تمہارے ڈیڈی تو سامنے بیٹھے ہیں۔''

''نہیں ٹیپو! یہ میرے ڈیڈی نہیں ہیں۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''یہ کوئی اور ہیں۔''

☆☆☆

ایسی الجھی ہوئی کہانی کا یہی انجام ہو سکتا تھا کہ میں اپنا سر پیٹتے ہوئے ایک طرف نکل جاؤں۔ لعنت بھیج دوں اس ساری صورتِ حال پر... جہاں ہر گزرتے..... وقت کے ساتھ ایک نیا انکشاف سامنے آ جا رہا تھا۔

لیکن اب تمام رازوں سے پردہ اٹھنے کا وقت آ گیا تھا

www.kahopakistan.com

اس لیے ہم سب چیف کے کمرے میں جمع تھے۔ ایک ہنگامی قسم کی میٹنگ ہو رہی تھی۔

اس میٹنگ میں چیف کے علاوہ قومی سیکیورٹی کے دو اعلیٰ افسران بھی تھے۔ پروفیسر آفندی بھی تھا اور لیلیٰ بھی تھی جس کی آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔

چیف پوری صورتِ حال بتا رہا تھا۔ ''یہ کہانی کچھ یوں ہے کہ پروفیسر آفندی نے یہ پتا چلایا کہ ہماری زمین کے نیچے قدرت کے بے شمار خزانے پوشیدہ ہیں اور چھ غیر ملکی طاقتیں یہ نہیں چاہتیں کہ ہم ان سے فائدہ اٹھائیں۔ پھر ہماری حکومت نے پروفیسر آفندی سے رابطہ کر کے انہیں پاکستان آ کر سروے کی دعوت دی۔ اس کے ساتھ ہی یہ خطرہ بھی سامنے آ گیا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ سازشی عناصر پروفیسر کو نقصان پہنچا دیں۔ اس لیے ان کی سیکیورٹی کی تدبیر سوچی گئی۔ خوش قسمتی سے پروفیسر ہی کے ایک شاگرد سلمان درانی..... سامنے آ گئے جو بالکل پروفیسر جیسے ہیں اور جن کا تعلق پاکستان ہی سے ہے۔''

اس موقع پر پروفیسر آفندی یعنی سلمان درانی کھڑا ہو گیا۔ ''جی ہاں، میں سلمان درانی ہوں اور بہت قریب سے دیکھنے والے ہی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں پروفیسر آفندی نہیں ہوں۔''

''چیف! کیا یہ بات لیلیٰ کو نہیں معلوم تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم تھی۔'' چیف نے کہا۔ ''لیکن ہم نے انہیں بھی اپنی پلاننگ میں شامل کر لیا تھا اور یہ مسلسل سلمان درانی کی بیٹی کا کردار ادا کرتی رہیں۔''

''اوہ، اب میں سمجھا۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اور وہ لڑکی غزالہ...وہ کون ہے؟''

''وہ میری بیٹی ہے۔'' سلمان درانی نے بتایا۔ ''اور وہ میرا گھر ہے۔ میرے گھر والے ہیں جبکہ میں پروفیسر آفندی کے ماتحت کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے یہاں آ کر لیلیٰ کو اپنے گھر والوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔''

''اسی لیے آپ اپنے گھر والوں سے ملنے چلے گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' سلمان درانی نے کہا۔ ''اور یہ بات لیلیٰ کو معلوم تھی کہ میں کہاں گیا ہوں گا۔''

''اب یہ بھی بتا دیں کہ سلمان درانی صاحب پر حملہ کرنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی نہیں۔'' چیف مسکرا دیا۔ ''وہ ہم ہی لوگ تھے۔''

''کیا؟'' میں نے حیرت سے چیف کو دیکھا۔

''ہاں، ان پر حملے ہم نے کرائے۔ یہ ہماری پلاننگ کا حصہ تھے۔'' چیف نے بتایا۔ ''اس لیے تم نے دیکھا ہو گا کہ کسی حملے میں سلمان صاحب کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔''

''اور میں بے وقوفوں کی طرح ان کی حفاظت میں لگا رہا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کے جعلی حملوں کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''تاکہ ان سازشی عناصر کو یہ یقین ہو جائے کہ جو شخص ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہے، وہی پروفیسر آفندی ہے۔'' چیف نے کہا۔ ''اور وہ یہ سمجھیں کہ کوئی اور پارٹی بھی پروفیسر میں دلچسپی لے رہی ہے جبکہ اس دوران پروفیسر فیلڈ میں اپنا کام کرتے رہے۔ ہم نے انہیں دھوکا دینے کی کوشش کی تھی لیکن سازش کرنے والے ہم سے زیادہ ہوشیار نکلے اور انہوں نے بالآخر پروفیسر کو اغوا کر ہی لیا۔''

''اب ایک بات اور واضح کر دیں کہ جیالوجیکل سروے کا دفتر ہے اس کے باس کو کیوں اغوا کیا گیا ہے؟''

''اس کا جواب میں دے سکتا ہوں۔'' سلمان درانی نے کہا۔ ''میں کچھ عرصے اس فرم میں جیالوجیکل کے طور پر کام کر چکا ہوں اور ابتدائی رپورٹ بنا کر اس فرم کے مالک کے حوالے کر دی تھی جو ایک محبِ وطن انسان ہے...اور میں نے اسی فرم میں اپنی بیٹی غزالہ کی جاب بھی کرا دی تھی لیکن بدقسمتی سے فرم کا مالک بھی اغوا ہو چکا ہے۔''

گویا سارے معاملات کچھ یوں تھے۔

جیلبی اب بالکل سیدھی ہو چکی تھی۔ اب صرف ایک معاملہ تھا کہ اصل پروفیسر آفندی کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد میں نے چیف سے کہا۔ ''چیف! میں اب تک اس پورے کھیل میں صرف ایک ڈمی کا کردار ادا کرتا رہا ہوں۔ میں نے سوائے ریسٹ ہاؤس میں رہنے کے اور کچھ بھی نہیں کیا ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ تمہاری یہ سوچ صحیح ہو۔'' چیف مسکرا کر بولا۔ ''لیکن تمہارا اصل کام تو اب شروع ہونے والا ہے۔''

''اور وہ کیا ہے؟''

''پروفیسر آفندی کا سراغ لگانا۔'' چیف نے کہا۔ ''تمہیں کل صبح ہی وہاں جانا ہو گا جہاں سے اسے اغوا کیا گیا ہے۔''

☆☆☆

یہ ایک طویل اور دشوار سفر تھا۔

پروفیسر آفندی تھر کے ریگستانوں کا جائزہ لیتا پھر رہا تھا۔ اس کے ساتھ پوری ٹیم تھی۔ اس ٹیم نے ریگستان میں خیمے لگا رکھے تھے اور ان کے ساتھ جنریٹرز کے علاوہ ضرورت کی اور بھی بہت سی چیزیں تھیں۔

اس ٹیم میں پروفیسر آفندی کا ہاتھ بٹانے والے سائنس داں بھی تھے...مزدور اور انجینئر بھی۔ ان کے علاوہ کمانڈوز بھی تھے۔ اس کے باوجود پروفیسر کو اغوا کر لیا گیا تھا۔

ٹیم کے ساتھیوں کا یہ کہنا تھا کہ پروفیسر شاید کسی بہت بڑی کامیابی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ انہیں اپنی مکمل رپورٹ مرتب کرنی تھی لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آ سکی اور یہ حادثہ رونما ہو گیا۔

ہم ایک جیپ میں سفر کر رہے تھے۔

میرے ساتھ میرا خاص آدمی نوشاد بھی تھا۔ اس کے علاوہ لیلیٰ بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ تھی۔ اس کا رونا دھونا اگرچہ ختم ہو گیا تھا لیکن اپنے باپ کی طرف سے وہ بہت پریشان تھی۔

میں نے اس سے کہا۔ ''تم نے بھی مجھے اتنے دنوں تک بے وقوف بنائے رکھا۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا، وہ پلاننگ کا حصہ تھا۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں اداکاری کرتی رہی لیکن دادا کاری بھی پلاننگ کا حصہ تھی۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔''

''خدا جانے میرے ڈیڈی کیسے ہوں گے...کس حال میں ہوں گے؟ اغوا کرنے والوں نے ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہو گا؟''

''دیکھو لیلیٰ...ایک بات تو جان لو کہ پروفیسر صاحب کی زندگی کو اغوا کرنے والوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''بہت آسان ہے۔ اگر وہ انہیں مارنا چاہتے تو پھر اغوا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی...اور دوسری بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب جیسے قیمتی انسان کی زندگی ختم نہیں کی جاتی بلکہ ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

''ایسا ہی ہو گا۔ تم فکر مت کرو۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

ہماری گاڑی بہت تیزی سے سفر کر رہی تھی۔ مجھے اب جا کر احساس ہو رہا تھا کہ واقعی میری اصل ذمے داریاں اب شروع ہوئی ہیں...اب تک تو صرف مذاق ہوتا رہا تھا۔

پروفیسر کے اغوا نے ساری سچویشن ہی تبدیل کر دی تھی۔ ابھی تک میرے ذہن میں کلیئر نہیں تھا کہ میں کہاں سے اپنی مہم کا آغاز کروں گا۔ ویسے یہ بات طے تھی کہ یہ مہم آسان نہیں ہوتی۔ ہمیں نہ جانے کتنے مراحل سے گزرنا تھا۔ کتنے لوگوں اور کیسے لوگوں سے ہمارا سامنا ہوتا۔

صحرا میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں ایک چھوٹی سی بستی میں ٹھہرایا گیا۔ لیلیٰ تو باپ کی محبت میں اسی وقت صحرا میں داخل ہو جانا چاہتی تھی لیکن ہم نے کسی طرح اسے سمجھا کر روک لیا۔ ہمیں رات کے وقت صحرا میں داخل ہونا تھا۔ ہمارے آرام کے لیے چار پانچ گھنٹے بہت زیادہ تھے۔

میں اس وقت گہری نیند میں تھا جب کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ وہ لیلیٰ تھی جو بہت پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں بھی اس کے چہرے کی پریشانی دیکھی جا سکتی تھی۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق اپنا ریوالور ہاتھ میں لے لیا۔ ''کیا ہوا لیلیٰ! خیریت تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹیپو! کچھ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔ ''کون لوگ ہیں؟''

''یہ وہ لوگ ہیں جو ڈیڈی کے ساتھ تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ لوگ کسی چیز سے پریشان ہو کر واپس جا رہے ہیں اور جب انہیں یہ بتایا گیا کہ ہم ڈیڈی کو تلاش کرنے آئے ہیں تو ان لوگوں نے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔''

''اچھا، کہاں ہیں وہ لوگ؟''

''باہر برآمدے میں بیٹھے ہیں۔'' لیلیٰ نے بتایا۔

لیلیٰ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو پروفیسر آفندی کے ساتھ تھے۔ سائنس داں، انجینئر اور مزدور وغیرہ۔

میں نے ان کے پاس پہنچ کر ان سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے...آپ لوگ واپس کیوں جا رہے ہیں؟''

''ہم یہی مشورہ آپ کو دینے آئے ہیں۔'' ایک سائنس داں نے کہا۔ ''کیونکہ ہمیں یہ پتا چلا ہے کہ آپ لوگ پروفیسر آفندی کی تلاش میں آئے ہیں۔''

''جی ہاں، ہم اسی لیے آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن آپ ہمیں یہ مشورہ کیوں دے رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ پروفیسر کی گمشدگی میں کسی انسان کا ہاتھ نہیں ہے۔'' دوسرے شخص نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ان کو اغوا کرنے میں کسی انسان کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ کچھ پُراسرار طاقتوں نے انہیں غائب کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

www.kahopakistan.com

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔''

''اس لیے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔'' پہلے والے شخص نے کہا۔ ''جب آپ کے سامنے کسی کو اس طرح اٹھالیا جائے کہ اٹھانے والے ہاتھ دکھائی نہ دیں تو پھر آپ کیا کہیں گے؟''

''کیا؟'' میری حیرت اور بڑھ گئی۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ایسا ہی ہوا ہے صاحب۔'' ایک مزدور بھی بول پڑا۔ ''میں نے خود دیکھا ہے۔ پروفیسر صاحب خود بخود اوپر اٹھ گئے تھے۔ اپنے بستر سے اور تکیے سے اس طرح نکل گئے جیسے ہوا میں تیرتے ہوئے جارہے ہوں۔''

''ہم تو سناٹے اور خوف کے عالم میں بس دیکھتے رہ گئے تھے۔''

''پروفیسر صاحب اس وقت بری طرح چیخ رہے تھے صاحب۔'' ایک اور شخص نے بتایا۔ ''ہم میں اتنی ہمت ہی نہیں رہی تھی کہ ہم ان کو روک سکتے یا پکڑ لیتے۔''

میں یہ سن کر چکرا کر رہ گیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک آدمی فضا میں تیرتا ہوا غائب ہو جائے؟ لیکن اتنے لوگوں کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ یہ سب کے سب پڑھے لکھے اور ذمے دار قسم کے لوگ تھے پھر انہیں یہ کیسا واہمہ ہوا تھا؟

☆☆☆

ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہوا۔

یہ سفر اس بستی سے صحرا کے لیے تھا۔ پروفیسر آفندی کی ٹیم کے کچھ ممبرز واپس چلے گئے تھے۔ چونکہ وہ بہت خوف زدہ تھے اسی لیے میں نے بھی انہیں ساتھ رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ جبکہ دو کمانڈو ہمارے ساتھ ہو گئے ..... میں جن لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا، وہ سب ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے لیلیٰ کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ اس کے ڈیڈی کتنے پُراسرار انداز میں غائب ہوئے ہیں۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ کارنامہ کسی نادیدہ یا مافوق قسم کی مخلوق کا ہوسکتا ہے لیکن اتنی شہادتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بہرحال جو بھی تھا، معاملہ بہت پُراسرار تھا۔

اب صحرا کی طرف وہ گاڑیاں جارہی تھیں کیمپ سے فرار ہونے والے اپنے ساتھ ساز و سامان لے کر نہیں آئے تھے کیونکہ وہ بدحواس ہو کر فرار ہوئے تھے۔ اسی لیے ہمارے قافلے میں زیادہ سامان نہیں تھا۔

البتہ ہم پوری طرح چوکنا ضرور تھے۔

ہمارا ارادہ رات کے وقت سفر شروع کرنے کا تھا لیکن پروفیسر کے ساتھیوں کے آجانے کی وجہ سے ہمیں تاخیر ہوگئی تھی۔ اس لیے علی الصباح سفر شروع کرنا پڑا تھا۔

ابھی سفر کرتے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دو آدمی ہمارے سامنے آگئے۔ وہ ہماری گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میرے کہنے پر گاڑیاں روک دی گئیں۔

وہ دونوں ہندو سادھو تھے۔ ان میں سے ایک گرو معلوم ہو رہا تھا اور دوسرا شاید اس کا چیلا تھا۔ ان علاقوں میں ایسے سادھو بہت دکھائی دیتے ہیں اور ان کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔

وہ دونوں ہماری گاڑی کے پاس آگئے۔ ''کہاں جارہے ہو بچو؟'' گرو نے دریافت کیا۔

''بیلا پور۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہمیں بیلا پور سے آگے جانا ہے۔''

''بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ کیا ہمیں بیلا پور تک پہنچا دو گے؟'' گرو نے پوچھا۔ ''ہم دونوں اسی طرف جارہے تھے۔''

ہماری بڑی گاڑی میں بہت گنجائش تھی اس لیے چیلے کو دوسری گاڑی کی طرف بھیج دیا گیا جبکہ گرو ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ سفر پھر شروع ہوگیا۔

کچھ دیر سفر کے بعد اس نے دریافت کیا۔ ''کیا بات ہے بچو! کیا تم لوگ کسی خاص مہم پر جارہے ہو؟''

''ہاں بابا۔'' میں نے بتایا۔ ''ہم دراصل اپنے ایک آدمی کی تلاش میں جارہے ہیں۔ وہ ریگستان میں کہیں گم ہو گیا ہے۔''

''رام رام... جو ایک بار ریت کے اس سمندر میں گم ہو جائے پھر اس کا پتا نہیں چلتا۔ وہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتا ہے۔ ریت میں اٹھنے والے طوفان اسے اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔''

''بابا! ہمارا وہ آدمی کسی طوفان میں گم نہیں ہوا۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر راستہ بھول کر ادھر ادھر بھٹک گیا ہوگا۔''

''نہیں بابا! یہ بھی نہیں ہوا ہے اس کے ساتھ۔'' میں نے بتایا۔ ''بلکہ کوئی اور بات ہوئی ہے۔'' پھر میں نے مناسب سمجھا کہ اسے بتا ہی دوں۔ دیکھوں کہ وہ کیا خیال ظاہر کرتا ہے کیونکہ وہ بھی انہی علاقوں کا رہنے والا تھا۔ ''بابا! ہمارے ساتھی کو کوئی شکتی اٹھا کر لے گئی ہے۔''

''شکتی اٹھا کر لے گئی ہے؟'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''پوری بات بتاؤ، کیسے اٹھا کر لے گئی؟''

میں نے وہی سب کچھ بتا دیا جو پروفیسر کے ساتھیوں نے بتایا تھا۔ یہ سب سن کر اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

''رام رام... یہ تو بہت عجیب کہانی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہمارے یہاں کسی زمانے میں ایسا ہوا کرتا تھا۔ جب بھوانی زندہ تھی۔ بھوانی بہت طاقت والی دیوی تھی۔ وہ اپنے نہ ماننے والوں کو اسی طرح اٹھالیا کرتی تھی۔ اور آدمی ہوا میں تیرتا ہوا غائب ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ تو صدیوں پرانی باتیں ہیں۔ آج کے دور میں ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

''اسی پر تو حیرت ہو رہی ہے بابا کہ ایسا کیسے ہو گیا؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، یاد آیا۔'' وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تو بھول ہی گیا تھا۔ بیلا پور سے آگے بھوانی کا ایک مندر بھی ہے۔''

''بھوانی کا مندر؟''

''ہاں، ہزاروں سال پرانا... جس پر اب ریت کی چادر چڑھی رہتی ہے لیکن اس کا اس واقعے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟''

''بابا! ایک بات بتائیں۔ کیا ان علاقوں میں ایسی طاقتیں پائی جاتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ نہ جانے ان ریگستانوں میں کیسی کیسی آتمائیں بھٹک رہی ہوں گی۔'' اس نے کہا۔ ''کیسے کیسے پلید ہوں گے۔ بہت کچھ ہوسکتا ہے لیکن مجھے ان کے بارے میں نہیں معلوم۔''

مجھے وہ سادھو اچھا لگا۔ وہ ایک صاف اور کھرا انسان تھا۔ اس نے ہمیں خوف زدہ یا گمراہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو نہ جانے کیسی کیسی کہانیاں سنا دیتا۔

''بابا! اگر آپ کے پاس وقت ہو تو آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔'' میں نے کہا۔ ''کم از کم آپ اس جگہ کو تو دیکھ لیں جہاں یہ واقعہ ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو کچھ اندازہ ہو جائے۔''

''ہاں... ہاں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''اگر میں تمہارے کسی کام آسکتا ہوں تو ضرور آؤں گا۔''

''بہت بہت شکریہ بابا۔''

اب بابا اور اس کا چیلا بھی ہمارے ساتھ چل رہے تھے۔ دھوپ اب اتنی تیز ہو گئی تھی کہ ریت آئینے کی طرح چمکنے لگی تھی اور اس کی طرف دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

ہم نے یہی طے کیا کہ کسی جگہ قیام کر لیا جائے۔ بے پناہ گرمی اور دھوپ میں ہمارے لیے سفر جاری رکھنا دشوار تھا۔ ہمارے پاس خیمے موجود تھے۔ میرے اشارے پر اگلی گاڑی بھی رک گئی۔ ہم نے وہیں پڑاؤ کر لیا۔ ہم اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر آئے تھے اس لیے اس کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

صحرا کی دھوپ اور گرمی کی شدت کا اندازہ شہروں میں بیٹھ کر نہیں کیا جاسکتا۔ سائے تک میں بدن پر آبلے سے پڑ جاتے ہیں۔

مجھے اس سادھو کی باتیں بہت دلچسپ معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے نہ جانے کہاں کہاں کے تجربات سمیٹ رکھے تھے۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جس کی باتوں میں بہت گہرائی تھی۔ میں نے اس سے بھوانی ..... مندر کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا۔ ''دیکھو، انسان جہاں جہاں پہنچا ہے، وہ اپنے دھرم اور اپنے دیوی دیوتاؤں کو اپنے ساتھ لیتا گیا ہے۔ جیسے مسلمان جہاں جاتے ہیں وہ عبادت کے لیے اپنی چھوٹی سی مسجد ضرور بنا لیتے ہیں۔ تو یہ بھوانی کے پجاری بھی اس علاقے میں آئے اور انہوں نے صدیوں پہلے ایک مندر بنالیا۔''

''بابا! کیا ان پجاریوں کے پاس کچھ غیر انسانی شکتی بھی ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے کہ ہو .....'' سادھو نے بتایا۔ ''لیکن تم نے جو واقعہ بتایا ہے، وہ بہت حیرت انگیز ہے۔''

''اچھا، کچھ دوسری طاقتیں بھی ہیں؟ یہ میں اپنے علم کے لیے پوچھ رہا ہوں۔''

''ہاں، بھگوان نے انسان کے ساتھ ساتھ دوسری طاقتیں بھی پیدا کی ہیں۔'' سادھو نے کہا۔ ''جیسے تم جن کو مانتے ہو۔ وہ ایک حقیقت ہے۔ میرا خود کئی بار آمنا سامنا ہو چکا ہے لیکن صرف جن ہی نہیں ہوتے، ان کے علاوہ دوسرے بھی ہوتے ہیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ میرے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس بابا کی باتوں کو بہت سنجیدگی سے سن رہے تھے۔

''اب میں بتاتا ہوں کہ ان کی کتنی قسمیں ہیں۔'' بابا نے کہا۔ ''جو جن آدمیوں کے ساتھ رہتے ہیں، ان کو ہم زاد کہتے ہیں اور جولڑ کے بالوں کو ستاتے ہیں ان کو ارواح، بھوت یا آسیب سمجھ لو۔ اور جو خبیث اور سخت تکلیف دینے والے ہیں ان کو شیطان کہتے ہیں اور جو ان سے بھی زیادہ سرکش ہوتے ہیں وہ مارو کہلاتے ہیں۔ اور جو ان سے زیادہ طاقتور ہیں، ان کو عفریت کہا جاتا ہے، اور جو جنگل میں آواز دیتے اور چیختے پھرتے ہیں ان کو ہاتف کہتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو مسافروں کو راستے سے بھٹکا دیتی ہے۔ ایک وہ ہے جو جنگل

www.kahopakistan.com

بیابانوں میں قافلے کی صورت میں دکھائی دیتی ہے اور جورات میں یا کبھی کبھی دن میں اجاڑ جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کو چھلاوا کہتے ہیں۔ یعنی بھگوان نے ان کی ہزاروں قسمیں بنائی ہیں۔''

''بابا! آپ نے تو ان کے بارے میں بہت کچھ بتادیا۔''

اور اسی وقت ایک طوفان پھٹ پڑا۔

خدا کی پناہ کیسا طوفان تھا۔

اتنا بھیانک، اتنا شدید کہ اس کا تصور بھی محال ہے۔ ہوا کے تیور اچانک بدل گئے تھے۔ ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں، جھنجھوڑ رہی تھیں اور ریت اڑا اڑا کر ہم پر ڈال رہی تھیں۔

ہم اندھے ہو گئے تھے۔

کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے لیلیٰ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا لیکن نہ جانے کس طرح وہ ہاتھ بھی چھوٹ گیا۔ میں نے لیلیٰ کی چیخ سنی۔ گھٹی گھٹی سی... جیسے اس کے حلق میں ریت ٹھونس دی گئی ہو۔

وہ موت کا طوفان تھا۔ ایسا طوفان میں نے شاید کبھی فلموں میں دیکھا ہوگا۔ اس وقت کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہماری آنکھیں بند تھیں اور ہم سوائے اپنے آپ کو چھپائے رکھنے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اس طوفان کا دورانیہ زیادہ سے زیادہ دس منٹ کا ہوگا لیکن یہ دس منٹ قیامت کے تھے اور جب قیامت گزر گئی تو سب کچھ پُرسکون ہو گیا۔

لیکن کہاں... پرسکون کہاں ہوا تھا... بلکہ ایک دوسری بڑی قیامت ہم پر آگئی تھی۔ لیلیٰ غائب ہو چکی تھی۔ صرف لیلیٰ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ دونوں سادھو بھی غائب تھے۔

خدا جانتا ہے کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔

ہم سب لیلیٰ کو پاگلوں کی طرح تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ دونوں سادھوؤں... اور لیلیٰ کو... آوازیں دے رہے تھے، ریت کھود رہے تھے۔

ایک خیال بہت ہی وحشت انگیز تھا کہ لیلیٰ اور دونوں سادھو کہیں ریت میں نہ دب گئے ہوں۔ اگر ایسا تھا تو پھر یقیناً بہت ہی المناک موت ہوئی تھی ان سب کی۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ کہیں دونوں سادھو لیلیٰ کو لے کر فرار ہو گئے ہوں... لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس طوفان میں تو ایک قدم چلنا دشوار تھا پھر وہ دونوں اسے کہاں اور کس طرح لے گئے ہوں گے؟ یہ تو ایک ناممکن سی بات تھی۔

تو پھر... پھر یہی تھا کہ وہ تینوں شاید ریت میں دب کر ہلاک ہو چکے ہیں۔

بہت ہی روح فرسا خیال تھا... رونگٹے کھڑا کر دینے والا!

طوفان تھم چکا تھا اور ہم سب سوچنے پر مجبور تھے۔ اب شام ہونے والی تھی، کچھ دیر کے بعد ہمیں سفر کرنا تھا لیکن کس طرف؟ ہمارے ایک آدمی نے کہا۔ ''سر! میرا خیال ہے کہ اب ہمارے پاس واپس لوٹنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ پروفیسر آفندی بھی نہیں رہے اور اب ان کی بیٹی لیلیٰ بھی غائب ہو چکی ہے۔ ہم آگے جا کر کیا کریں گے؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''بظاہر تو ہم ناکام ہو چکے ہیں۔ میں کیا کر پایا ہوں، کچھ بھی نہیں۔ مجھ سے پوچھا جائے گا کہ میں نے کس طرح حفاظت کی تو میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہی نہیں ہوگا۔ اس لیے اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے میں آخری حد تک جانا چاہتا ہوں۔ وہاں سے ناکام واپس آجاؤں، وہ دوسری بات ہوگی۔''

سب خاموش ہو کر سوچنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ میرا خاص آدمی نوشاد ان باتوں سے بالکل بے تعلق سا تھا۔ میں اس لیے اسے پسند کرتا تھا، وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا۔ اگر میں جہنم میں بھی جانے کا فیصلہ کرتا تو وہ میرے ساتھ ہی چلتا۔

بہرحال، طے یہ پایا کہ ہم میں سے کوئی واپس نہیں جارہا بلکہ ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ اس جگہ تک جانا ہے جہاں پروفیسر آفندی اور اس کے ساتھیوں نے کیمپ لگا رکھا تھا۔

اور واقعی خدا جو کرتا ہے، وہ بہتر کرتا ہے۔ اگر ہم وہاں تک نہیں جاتے تو شاید اس کہانی میں اتنے رنگ بھی پیدا نہیں ہو پاتے۔ میری آنکھوں نے آگے چل کر جو کچھ دیکھا، اس کا مشاہدہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ جلدی جلدی سامان سمیٹا، گاڑیوں کو صاف کیا جو کہ ریت سے اٹ گئی تھیں۔ یہ شکر تھا کہ ہمارے کھانے اور پینے کی چیزیں اتنے محفوظ طور پر پیک کی گئی تھیں کہ ان پر اس طوفان کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

ہمیں رات کا کھانا کھاتے ہوئے لیلیٰ کی یاد آرہی تھی۔ دن میں وہ ہمارے ساتھ تھی اور اب اس کا وجود ہی نہیں تھا۔

پتا نہیں انسان کے ساتھ ایسے حادثے کیوں پیش آتے ہیں۔ وقت ذرا سی دیر میں کیا سے کیا کر دیتا ہے... پھر وہ دونوں سادھو بھی تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دونوں زندہ ہیں یا مر گئے۔ ویسے ان کے بچ نکلنے کا بظاہر کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ہم نے کھانا ختم کیا، اس کے بعد سفر شروع ہو گیا۔ اب یہ سفر چاند کی روشنی میں ہو رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اب سے چند گھنٹوں پہلے یہ صحرا کتنا بے رحم اور بھیانک ہو گیا تھا اور اس وقت کتنا خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔

صحرا کا جادو اسی کو کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ صحرا اور سمندر دونوں میں ایک طرح کا جادو ہوتا ہے... دونوں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

ہم نے ابھی تھوڑا ہی سفر طے کیا ہوگا کہ ایک اونٹنی دکھائی دی۔ وہ اونٹنی شاید بے قابو ہو کر بھاگ نکلی تھی کیونکہ اس کی گردن سے کوئی عورت چمٹی ہوئی زور زور سے چیخ رہی تھی۔

''سر! یہ اونٹنی کسی وجہ سے بھڑک کر بھاگ نکلی ہے۔'' نوشاد نے بتایا۔

''اور اس پر کوئی عورت بھی ہے۔''

''میں اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' نوشاد نے کہا۔ ''ورنہ یہ اونٹنی اس عورت کو مار دے گی۔''

نوشاد نے جیپ اونٹنی کے پیچھے لگا دی۔ یہ ایک عجیب طرح کی دوڑ تھی۔ ایک جانور اور مشین کے درمیان کشمکش ہو رہی تھی۔

وہ عورت شاید چیختے چیختے نڈھال ہو چکی تھی اسی لیے اب اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔ ہم سب کچھ فاصلے پر سے نوشاد کی اس جنگ کو دیکھ رہے تھے۔ یہ خاصی مہارت کا کام تھا لیکن نوشاد نے اونٹنی کو قابو میں کر لیا تھا۔

وہ اونٹنی کو جیپ کے ساتھ باندھ کر ہماری طرف لے آیا تھا۔ اس نے اس عورت کو اونٹنی سے اتار کر جیپ میں لٹا دیا۔

وہ قریب آیا تو ہم سب نے اس کارنامے پر اسے مبارک باد دی۔ ''سر! وہ لڑکی بے ہوش ہو چکی ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

''کیا مطلب؟ وہ کوئی لڑکی ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''یس سر! اور لڑکی بھی ان علاقوں کی نہیں بلکہ شہر کی معلوم ہوتی ہے۔'' اس نے لڑکی کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ لڑکی... وہ لڑکی غزالہ تھی۔ سلمان درانی کی بیٹی... میرے سامنے والے فلیٹ میں رہنے والی۔

☆☆☆

اب اس کہانی میں ایک نیا موڑ آگیا تھا۔

بہت ہی حیرت انگیز موڑ۔ غزالہ یہاں کہاں سے آگئی تھی۔

میں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے شروع کر دیے۔ کچھ دیر بعد وہ کسمسانے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے لٹا دیا۔ ''لیٹی رہو۔ ابھی کچھ دیر بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا اس طرح یہاں پایا جانا انتہائی حیرت انگیز تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی؟ کہاں جارہی تھی؟ بے شمار سوالات تھے لیکن ان کے جواب اس کے حواس بحال ہونے کے بعد ہی مل سکتے تھے۔ بالآخر کچھ دیر کے بعد اس نے ایک گلاس پانی پیا اور اٹھ بیٹھی۔ اب وہ پوری طرح اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔

''ٹیپو! خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے مل گئے اور تم لوگوں نے اس بھڑکی ہوئی اونٹنی کو قابو میں کر لیا ورنہ خدا جانے میرا کیا حال ہوتا۔''

''تم یہ بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم یہاں کس طرح آگئیں؟ تم تو شہر میں تھیں... اپنے مکان میں تھیں؟''

''ٹیپو! کیا تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ میں کس کی بیٹی ہوں اور میرا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، یہ سب مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ تم مجھے یہاں اس طرح پائے جانے کے بارے میں بتاؤ۔''

''میرے ڈیڈی نے مجھے ساری صورتِ حال بتا دی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''یعنی وہ کس کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ پروفیسر آفندی یہاں کسی مشن پر آئے ہوئے ہیں اور مجرموں کو کسی فائل کی تلاش تھی... وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ تم کون ہو اور تمہارے فرائض کیا ہیں پھر انہوں نے پروفیسر آفندی سے ملنے کے لیے صحرا کی طرف آنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ انہیں پروفیسر صاحب سے بہت محبت ہے۔ وہ ان کے ساتھ برسوں کام کر چکے ہیں اسی لیے پروفیسر صاحب کی گم شدگی ان کے لیے بہت پریشانی کا سبب بن گئی تھی۔ انہوں نے کچھ لوگوں کی ایک ٹیم بنالی اور میں بھی ان کے ساتھ ہولی۔ میں نے ضد کی تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھیں۔ اس طرح ہم یہاں پہنچ گئے۔''

''اچھا، اس کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم کل اس جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں پروفیسر آفندی نے اپنا کیمپ لگایا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ، تو تم لوگ ہم سے پہلے پہنچ گئے لیکن ہم نے نہیں دیکھا۔''

''کیونکہ ہم میرپور خاص کے راستے سے آئے ہیں۔'' غزالہ نے بتایا۔ ''جبکہ تم لوگوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔''

''چلو، اس کے بعد کیا ہوا؟''

www.kahopakistan.com

''ہم جب کیمپ پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کیمپ میں تو کوئی نہیں تھا۔ وہ بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ کیمپ والے خوف زدہ ہو کر فرار ہو گئے ہیں۔''

''ہمیں اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ پورا کیمپ کیوں خالی ہو گیا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سب افراتفری کے عالم میں فرار ہوئے ہیں۔ سارا سامان اسی طرح رکھا ہوا تھا۔ ہم نے ایک رات وہیں رکنے کا ارادہ کرلیا۔ اس کے بعد...''

وہ اس طرح خاموش ہو گئی جیسے کسی بھیانک یاد نے اس کی زبان بند کر دی ہو۔ اب خوف اس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا تھا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

''بتاؤ غزالہ! پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''خدا کی پناہ... پھر جو کچھ ہوا وہ بہت بھیانک تھا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ کل رات کی بات ہے۔ سب سوئے ہوئے تھے کہ اچانک کچھ بھوت آ گئے اور ڈیڈی کو اٹھا کر لے گئے۔''

''کیا بکواس ہے... یہ بھوت کہاں سے آ گئے؟''

''ٹیپو! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ بھوت ہی تھے۔ بہت خطرناک... ہزاروں سال پہلے کے لوگ۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ان کے لباس پرانے دور کے تھے جیسے فلموں میں دکھاتے ہیں۔ وہ پتا نہیں کون سی زبان میں کیا گاتے ہوئے آئے اور ڈیڈی کو اٹھا کر لے گئے۔ انہوں نے دوسروں کی طرف توجہ بھی نہیں دی تھی۔''

''کیا کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی؟''

''وہ آدمیوں نے ان پر بدحواسی کے عالم میں گولیاں بھی چلائی تھیں۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح جھوم جھوم کر گاتے رہے اور واپس چلے گئے۔''

''واپس کیسے گئے؟''

''جس طرح آئے تھے۔ ہاں، میں یہ بتانا تو بھول گئی کہ ان کے آنے سے پہلے بہت سی ریت اڑنے لگی تھی۔ ہر طرف ریت ہی ریت۔ جیسے ایک دیوار سی کھڑی ہو گئی ہو۔ وہ اسی ریت کی دیوار سے نکل کر سامنے آئے تھے اور جاتے ہوئے بھی اسی طرح ریت اڑی اور وہ غائب ہو گئے۔ اس کے بعد پھر کون وہاں رک سکتا تھا۔ میں ڈیڈی کو آوازیں دے رہی تھی، پکار رہی تھی اور ہمارے ساتھی فرار ہو رہے تھے۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ اس افراتفری کے عالم میں کس نے مجھے اونٹنی پر بٹھا دیا اور اونٹنی ایک طرف دوڑ پڑی۔ میں اسے قابو نہیں کر سکتی تھی اور اس طرح اونٹنی بھڑک کر اس طرف آ نکلی اور تم لوگوں نے دیکھ لیا۔''

میں نے محسوس کیا کہ ہماری ٹیم کے کچھ لوگ یہ کہانی سن کر خوف زدہ سے ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ انسانوں سے نمٹنے کی تربیت رکھتے تھے۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔

غزالہ اب اپنے ڈیڈی کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ ''نہ جانے وہ بھوت ڈیڈی کو کہاں لے گئے ہیں۔ وہ ملیں گے بھی یا نہیں ملیں گے؟''

میں اپنی اس مہم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ کچھ عجیب مہم تھی، بالکل مختلف انداز کی۔ اب تک صرف واقعات ہی پیش آتے رہے تھے اور واقعات بھی ایسے کہ جن کے تدارک کے لیے میں کچھ نہیں کر سکا تھا۔

''تمہارے ساتھ پروفیسر صاحب کی بیٹی بھی تو تھی؟'' غزالہ نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''اسے ریت کے طوفان نے نگل لیا۔'' میں نے اسے لیلیٰ کے غائب ہونے کی کہانی بتا دی۔

اس کا خوف اور بھی بڑھ گیا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ طوفان میں...''

''نہیں، وہ طوفان بھوتوں کا لایا ہوا نہیں تھا بلکہ قدرتی تھا۔'' میں نے کہا۔

''اب کیا ارادے ہیں سر؟'' کسی نے پوچھا۔

''وہی جو پہلے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں ہر حال میں اس کیمپ تک پہنچنا ہے۔'' پھر میں نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ ''غزالہ! اگر تم چاہو تو میں تمہیں شہر واپس بھیج سکتا ہوں کیونکہ میں تو اسی کیمپ تک جا رہا ہوں۔''

''تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے اپنے ڈیڈی کو تلاش کرنا ہے۔''

☆☆☆

اس بار کیمپ تک پہنچنے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

ہم خیریت کے ساتھ پہنچ گئے۔ اصل حیرت تو وہاں پہنچنے پر ہوئی کہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی قسم کے کیمپ کے کوئی آثار ہی نہیں تھے۔

ہر طرف سناٹا... صرف ریت اڑتی..... رہی تھی۔

احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں انسانوں نے اپنا کیمپ لگایا ہو گا۔ انسان جہاں جاتا ہے، وہاں اپنی کوئی نہ کوئی نشانی چھوڑ جاتا ہے لیکن یہاں کوئی نشان نہیں تھا... یا تو سارے نشان ہوا اور ریت نے مٹا دیے تھے یا پھر یہ انسانی ہاتھوں کا کارنامہ تھا۔

وہ لوگ بھی حیران ہو رہے تھے جو پروفیسر آفندی کے ساتھ تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھے جا رہے تھے۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی جگہ ہے؟'' میں نے ایک آدمی سے پوچھا۔ ''کیونکہ ریت میں تو سب علاقے ایک ہی جیسے دکھائی دیتے ہیں۔''

''نہیں جناب! یہ بالکل وہی جگہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کیونکہ ہم پورے حساب سے یہاں پہنچے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے آلات ہیں جن کی مدد سے جگہوں کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ریڈی ایشن سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہاں انسان نے پڑاؤ کیا تھا۔''

''تو پھر یہ پڑاؤ کہاں غائب ہو گیا؟''

''خدا جانے یہ کیا سلسلہ ہے۔'' غزالہ سخت پریشان تھی۔ ''کیونکہ یہ جگہ تو وہی ہے جہاں سے ڈیڈی غائب ہوئے ہیں اور میں اونٹنی پر بھاگی تھی لیکن خدا جانے وہ کیمپ کہاں چلا گیا۔''

اب یہ ایک نیا بھید سامنے آ گیا تھا۔

اس کیس پر کام کرتے ہوئے مجھے کتنی حیرتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کیسے کیسے واقعات ہوئے تھے اور اب وہ کیمپ ہی اپنا سراغ کھو بیٹھا تھا جہاں پروفیسر آفندی اور ان کی پوری ٹیم موجود تھی۔

ہم ایک بار پھر ہنگامی میٹنگ میں بیٹھ گئے۔ سوال یہی تھا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ یہاں سے پروفیسر آفندی اور سلمان درانی کا سراغ کیسے لگا سکتے ہیں؟

کیا واقعی یہاں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ غیر انسانی مخلوق کی حرکتیں تھیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے تھے؟ پھر میرے ساتھی نوشاد نے شاید پہلی بار اپنی رائے دی۔

''سر! میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے کوئی سراغ نہیں مل سکے گا اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم آگے بڑھ جائیں۔''

''آگے سے کیا مراد ہے تمہاری؟'' میں نے پوچھا۔

''بھوانی کے مندر کی طرف۔'' نوشاد نے کہا۔ ''آپ کو یاد ہو گا، اس ہندو سادھو نے یہ بتایا تھا کہ اس کیمپ سے آگے بھوانی کا صدیوں پرانا ایک مندر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں سے کوئی سراغ مل جائے... کیونکہ یہاں تو سوائے ریت کے اور کچھ بھی نہیں ہے اور ریت تو ویسے بھی سارے سراغ فنا کر دیتی ہے۔''

نوشاد کا مشورہ معقول لگ رہا تھا۔ اس لیے ہم اس پڑاؤ سے آگے بڑھتے چلے گئے... بھوانی کے پرانے مندر کی طرف۔

...اور اس مندر تک پہنچنے سے پہلے اس بے پناہ ریگستان میں کوئی ہمیں دوڑتا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ ریت میں اس کے پاؤں بھی لڑکھڑا جاتے اور وہ ایک طرف گر جاتا۔ کچھ دیر بعد پھر دوڑنا شروع کر دیتا۔

ہمارا قافلہ اس کے سامنے ہی تھا لیکن کمال کی بات یہ تھی کہ اس نے ہماری طرف دھیان ہی نہیں دیا بلکہ وہ کسی اور سمت دوڑ رہا تھا اور جب وہ ایک بار اور لڑکھڑا کر گرا تو غزالہ چیخنے لگی۔ ''اوہ خدا! یہ تو ڈیڈی ہیں۔ میرے ڈیڈی۔''

☆☆☆

''مجھے اس کے پاس جانے دو۔ وہ دیوی ہے۔ آسمانوں سے اتر کر میرے پاس آئی تھی۔ وہ جب چلتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اس کی کنیزیں چلتی ہیں۔ اس کے غلام سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ وہ ہزاروں سال سے زندہ ہے اور ہزاروں سال تک زندہ رہے گی۔ وہ مجھے بھی امر کر دے گی۔ مجھے اس کے پاس جانے دو۔''

سلمان درانی خلا میں ایک طرف دیکھتا ہوا ہذیان بکے جا رہا تھا۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ غزالہ رو رو کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ جیسے غزالہ کی آواز بھی نہیں سن رہا تھا۔

اب یہ ایک نئی پیچیدگی ہمارے سامنے آ گئی تھی۔

سلمان درانی کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا۔ وہ نہ جانے کیا دیکھ کر آیا تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اور اس کو کون لوگ اٹھا کر لے گئے تھے؟ اور جو اٹھا کر لے گئے تھے؟ وہ اسے چھوڑ کیوں گئے؟ یا پھر یہ وہاں سے کیسے نکل بھاگا؟ غرضیکہ سوائے الجھاؤں کے اور کوئی بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔

ہر قدم پر ایک نیا حادثہ ہمارے انتظار میں تھا۔

''سر! سلمان صاحب جو باتیں کر رہے ہیں، وہ غزالہ صاحبہ کے بیان سے ملتی جلتی ہیں کیونکہ انہوں نے بھی کچھ اسی قسم کی چیزیں دیکھی تھیں۔''

''ہاں، میں بھی اسی زاویے سے سوچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''نوشاد! معاملہ بہت پیچیدہ اور پُراسرار ہوتا جا رہا ہے۔ نہ جانے ان ریگستانوں میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟''

''ہمارے لیے تو اب سلمان صاحب کو سنبھالنا دشوار ہو جائے گا سر۔''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ دو چار دنوں کے بعد سلمان صاحب کی ذہنی حالت ٹھیک ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ان پر وقتی اثر معلوم ہوتا ہے۔''

غزالہ اپنے باپ کو ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہی تھی

www.kahopakistan.com

لیکن سلمان ویرانی کی وہی کیفیت تھی جیسے وہ مکمل ٹرانس میں ہو۔ وہ نہ جانے کتنی زبانوں کے انسانوں کی باتیں کر رہا تھا۔

بہرحال، ہم نے اس مندر کی طرف سفر شروع کر دیا۔

یہ سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ دو گھنٹوں کے بعد ہم اس مندر تک پہنچ گئے تھے۔ سادھو کے کہنے کے مطابق وہ واقعی بہت ہی قدیم مندر تھا لیکن ریت نے اس مندر کے نقش و نگار مدھم کر دیے تھے۔

اس کے دروازے پر منوں ریت پڑی ہوئی تھی اور آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ یہاں پہنچ کر سلمان بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ جیسے وہ کچھ سوچنے یا یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہماری گاڑیاں اس مندر کے سامنے جا کر رک گئیں۔

''یہ مندر تو ویران معلوم ہوتا ہے سر۔'' نوشاد نے کہا۔

''ہاں، ہم بھی یہی سوچ کر اس طرف آئے ہیں۔''

''کیوں نہ اندر چل کر دیکھیں؟''

''میرا خیال ہے کہ اندر کوئی نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''کیونکہ سامنے جو ریت پڑی ہوئی ہے، اس پر کسی کے قدموں کے نشان نہیں ہیں۔''

''پھر بھی اندر چل کر دیکھ تو لیں۔''

میں نے اس کی بات مان لی۔ ہمارے پاس ایمرجنسی لائٹ موجود تھی۔ میں، نوشاد اور ٹیم کا ایک اور فرد ٹیل اندر گئے۔ نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد اس ریت پر انسانی قدموں کے نشانات بن رہے تھے۔ مندر کے کمرے میں جنگلی کبوتروں، چمگادڑوں وغیرہ کی بیٹ بھری ہوئی تھی جس کی بدبو سے دماغ خراب ہوا جا رہا تھا۔

ایمرجنسی لائٹ کونے میں رکھے ہوئے ایک بت کو واضح کر رہی تھی۔ یہ بت شاید اسی بھوانی دیوی کا تھا... بہت ہی بھیانک قسم کا لیکن اس پر بھی ریت جمی ہوئی تھی۔ فرش پر چوہے دوڑتے پھر رہے تھے۔

عجیب دہشت ناک ماحول تھا اور ہم اس ماحول میں نہ جانے کس چیز کا جائزہ لیتے پھر رہے تھے۔ ہمیں تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں تلاش کیا کرنا ہے۔

بت کے ایک ہاتھ میں ایک ترشول دبا ہوا تھا جس کا لوہا صدیوں کی مسافت طے کر کے اتنا خستہ ہو چکا تھا کہ جب میں نے ہاتھ لگایا تو اس کے ذرات جھڑنے لگے۔

اور اسی وقت زلزلہ آ گیا۔

ہاں، وہ زلزلہ ہی تھا۔ مندر کا فرش دہل رہا تھا۔ بھوانی کا وہ بت ٹوٹ کر مجھ پر گر گیا۔ کچھ چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں۔ اس کے بعد کوئی ہوش نہیں رہا۔ میں نہ جانے کتنی مٹی اور پتھروں کے نیچے دب گیا تھا۔

☆☆☆

میرے خدا... حقیقت اور واہمے ایک دوسرے کے کتنے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔

اب تک جو کچھ تھا، وہ سچائی یا حقیقت تھی؟ یا جو کچھ اب تھا، وہ سچائی تھی؟ خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا ہوگا۔

بہت دیر تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں... یا مجھ پر کیا گزری ہے پھر آہستہ آہستہ واقعات یاد آتے چلے گئے۔

میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مندر کے کمرے میں تھا جب وہ زلزلہ آیا تھا اور بھوانی کا بت ٹوٹ کر مجھ پر آ گرا تھا... اور میں یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا مر چکا تھا۔

نہیں، میں مرا نہیں... بلکہ زندہ تھا۔ مرے ہوئے لوگ تو تکلیف کا احساس نہیں کر سکتے لیکن مجھے احساس ہو رہا تھا۔ میرا پورا بدن درد کر رہا تھا۔

میں شاید کسی ایسی جگہ تھا۔ جہاں سوائے گھپ اندھیرے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اسی اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹول کر محسوس کیا۔ میرے چاروں طرف پتھر تھے... چھوٹے بڑے پتھر۔

میں نے آوازیں دیں، اپنے ساتھیوں کو پکارا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ پتا نہیں وہ زندہ تھے یا اس زلزلے کی نذر ہو گئے تھے۔

میں نے ایک بار پھر آوازیں دیں۔ اس بار ایک عجیب سا احساس ہوا۔ یہ بہت مختلف سا احساس تھا۔ میری آواز گونج کی صورت میں مجھ تک واپس آ رہی تھی۔

یعنی میں ایسی جگہ تھا جو شاید کوئی ہال تھا یا سرنگ تھی اس لیے میری آوازیں مجھ تک واپس آ رہی تھیں۔ میں ٹٹول ٹٹول کر کسی طرح کھڑا ہو گیا۔

اس وقت میرے ذہن میں کوئی نہیں تھا۔ نہ پروفیسر آفندی، نہ غزالہ، نہ اپنے ساتھی، نہ چیف... کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف ایک بات تھی کہ کسی طرح میں یہاں سے نکل لوں۔ اپنی جان بچا لوں۔

پورے بدن میں درد تو ہو رہا تھا لیکن میں پتھروں کے درمیان سے اس اندھیرے میں ایک ایک قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔

چلنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ قدم قدم پر پتھروں کے انبار تھے اور میں زخمی تھا اور کمزور ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود کوئی طاقت مجھے آگے لیے جا رہی تھی۔

بہت آہستہ آہستہ... ایک ایک قدم سنبھل سنبھل کر رکھنا پڑتا تھا۔ دو چار بار میں پتھروں سے الجھ کر گر بھی پڑا، اس کے باوجود میں نے اپنا یہ ہولناک سفر جاری رکھا۔

نہ جانے میں کتنی دیر تک چلتا رہا لیکن اب راستہ صاف ہوتا جا رہا تھا۔ پتھر اور ملبا بہت کم رہ گئے تھے۔ اگر یہ کوئی راستہ تھا... تو نہ جانے کتنا طویل تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

میں اب ہوا کو بھی محسوس کرنے لگا تھا۔

جی ہاں، تازہ ہوا جو سامنے کی طرف سے بہتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس ہوا کے احساس نے میرے بدن میں ایک نئی توانائی پیدا کر دی تھی۔

میں اس ہوا کے مرکز کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہوا تیز بھی ہونے لگی تھی۔ پھر کچھ آگے روشنی کا ایک نقطہ سا دکھائی دے گیا۔

وہ نقطہ کافی فاصلے پر تھا لیکن میرے لیے زندگی کی نئی امید بن گیا تھا۔

شاید وہ ہوا اسی راستے سے اندر آ رہی تھی۔

اب مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں دراصل ایک سرنگ میں سفر کر رہا تھا۔ یہ خاصی طویل سرنگ تھی اور آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس سرنگ کے راستے بھی صاف ہوتے جا رہے تھے۔

وہ روشنی اور واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ آوازیں آ رہی تھیں... حیرت انگیز آوازیں۔ گانوں کی اور موسیقی کی۔ گانوں کے بول سمجھ میں تو نہیں آ رہے تھے لیکن شاید کسی قسم کا بھجن گایا جا رہا تھا۔

میں آواز اور روشنی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت میں اپنی تکلیف بھول چکا تھا۔ ایک بے پناہ تجسس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

وہ روشنی قریب آتی گئی۔ وہ آوازیں اور واضح ہوتی گئیں۔ اب میں ایک دروازے کے پاس تھا جس کے قریب سیڑھیاں تھیں۔ میں بہت محتاط ہو کر ان سیڑھیوں پر چڑھتا گیا۔ یہ گیارہ سیڑھیاں تھیں اور گیارھویں سیڑھی کے خاتمے پر پریاں رقص کر رہی تھیں۔

یہ پریاں دائرے میں رقص کر رہی تھیں۔

میں جہاں کھڑا تھا، وہ ایک بغلی کمرا تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے کے بعد بڑا ہال تھا جہاں یہ رقص ہو رہا تھا۔ سامنے

www.kahopakistan.com

بھوانی کا ایک بہت بڑا مجسمہ تھا جس کے قدموں میں یہ رقص ہو رہا تھا۔
اردگرد ڈائس سا بنا ہوا تھا جس پر لوگ بیٹھے تھے۔ پتا نہیں کیسا ماحول تھا اور کیا ہو رہا تھا؟ رقص کرنے والی پریاں نہیں تھیں بلکہ خوب صورت لڑکیاں تھیں جن کو پریوں جیسے لباس پہنا دیے گئے تھے۔ ایک طرف سازندے بھی کھڑے تھے جو ساز بجانے میں مصروف تھے۔
یہ جیسے ایک قسم کا ناٹک تھا جس میں بھوانی دیوی کو خوش کرنے کے لیے رقص کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ پھر رقص اچانک ختم ہو گیا۔
موسیقی بھی رک گئی۔ بھجن کی آواز بھی تھم گئی۔ اب ہر طرف صرف خاموشی تھی۔ اس ہال نما کمرے میں پرانے انداز کی مشعلیں جل رہی تھیں لیکن وہ اتنی مشعلیں تھیں کہ ان کی روشنی میں سب کچھ واضح دکھائی دے رہا تھا۔
پھر ایک آدمی کسی طرف سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس کی حیثیت ممتاز معلوم ہوتی تھی اس لیے اس کا استقبال کیا گیا۔ وہ آدمی مجسمے کے برابر والے ایک چبوترے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اسے واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔
یہ وہی سادھو تھا۔
وہی سادھو جو اپنے چیلے کے ساتھ مجھ سے ملا تھا اور جو ریت کے طوفان کے بعد پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔ اس کو دیکھ کر میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں اگر یہ زندہ تھا تو پھر لیلیٰ بھی زندہ ہو گی لیکن یہ کس طرح زندہ رہ گیا تھا؟
میں یہ سب دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ مجھے احساس بھی نہیں ہو پایا کہ کوئی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔
"اے... کون ہو تم؟" کسی نے کہا۔
میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک لڑکی تھی... بہت خوب صورت۔ اس نے ہندووانہ لباس پہن رکھا تھا۔ گھاگھرا اور چولی میں وہ بہت دل کش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر معصومیت بھی تھی۔
میں اسے دیکھ کر بوکھلا گیا لیکن وہ حیرانی سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے دوسرا سوال کیا۔
"ہائے رام... تم تو زخمی معلوم ہوتے ہو؟"
"ہاں، میں زخمی ہوں۔" میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بتایا۔
"چلو میرے ساتھ۔" اس نے کہا۔ "میں تمہاری مرہم پٹی کروا دوں۔"
"نہیں، ایسا غضب مت کرنا۔" میں اس کی نیچر سمجھ گیا تھا۔ وہ ہمدرد قسم کی لڑکی تھی۔ "میں یہاں چھپ کر آیا ہوں۔"
"لیکن تم ہو کون؟ اس علاقے کے تو نہیں معلوم ہوتے۔" اس نے کہا۔
"ہاں، میں اس علاقے کا نہیں ہوں... لیکن اچھی لڑکی! کم از کم یہ تو بتا دو کہ یہ علاقہ کون سا ہے؟"
"یہ گنیش پور ہے۔" اس نے بتایا۔
"گنیش پورا" میں چونک گیا۔ "گنیش پور تو ہندوستان میں ہے۔"
"تو یہ ہندوستان ہی تو ہے۔" وہ مسکرا دی۔ "تم کو اتنا بھی نہیں معلوم۔"
"میرے خدا۔" میں نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ سرنگ مجھے کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ میں اپنے ملک پاکستان سے ہوتا ہوا ہندوستان آ گیا تھا۔
"اچھی لڑکی! میں بھٹک کر اس طرف آ گیا ہوں۔" میں نے بتایا۔
"لیکن کہاں سے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔
"پاکستان سے۔" میں نے اسے بتا دیا۔
"ہائے رام۔" وہ اچھل پڑی۔ "تم پاکستان سے آئے ہو... پاکستانی ہو تم؟"
"ہاں لیکن میں اتفاق سے اس طرف آ گیا ہوں۔"
"لیکن تم آئے کدھر سے؟"
میں نے سرنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔
"میں آیا تو اسی راستے سے ہوں لیکن اس وقت مجھ سے کچھ مت پوچھو۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا۔"
"ہائے رام! تمہاری جان کو تو بہت سے خطرے ہیں۔" اس نے کہا۔ "تم آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گی کیونکہ تم اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔"
"کہاں لے جاؤ گی مجھے؟ کسی نے دیکھ لیا تو۔"
"نہیں، اس وقت پوری بستی ناٹک منڈلی میں ہے۔ اس لیے کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ میں تمہیں بہت اچھی جگہ چھپا دوں گی۔"
میں قسمت پر شاکر ہو کر اس کے ساتھ چل پڑا کیونکہ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔
اس بغلی دروازے کے برابر میں ایک اور کمرا تھا۔ اس کمرے کے باہر ایک اجاڑ سا باغ تھا جس کے دروازے پر اینٹوں کے ڈھیر تھے۔ وہ آگے آگے جا رہی تھی اور میں خدا کا نام لیتا ہوا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔
ہم کھیتوں کے درمیان سے گزر کر ایک کوٹھری کے پاس

آ گئے۔ "یہ تمہارے لیے بہت اچھی جگہ ہے۔ یہاں تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ تم زخمی ہو اور بھوکے بھی ہو گے میں مرہم پٹی کا سامان اور کچھ کھانے پینے کو لے کر آتی ہوں۔"
"اچھی لڑکی! کیا میں تم پر بھروسا کر لوں؟"
"بے وقوف ہو تم۔ بھروسا کر کے تو یہاں آئے ہو۔" وہ مسکرا دی۔ "اب کیوں پوچھ رہے ہو؟ اور ہاں، میرا نام اچھی لڑکی نہیں مالتی ہے۔"
"اور میں ٹیپو ہوں۔" میں نے بتایا۔
"بس تم یہیں رکو اور میرا انتظار کرو۔"
وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اندر ایک لالٹین جل رہی تھی اور اس لالٹین کی روشنی میں کمرے میں رکھی ہوئی چارپائی پر کوئی سوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔
"کون ہے؟" میری آہٹ سن کر سونے والا بیدار ہو گیا تھا۔ اسی وقت اس لڑکی مالتی کی آواز سنائی دی۔ "بابو! پریشان مت ہو، سب ٹھیک ہے۔"

☆☆☆

سب ٹھیک ہی تھا۔
مالتی نے مجھے اس آدمی کے بارے میں بتایا۔ "یہ بڑھئی تھا۔ بہت بڑا کاریگر۔ سخاوت نام ہے اس کا۔ بے چارہ دیکھ نہیں سکتا۔ مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا ہے۔ میں بھی اس کا اسی طرح خیال رکھتی ہوں۔"
میں سخاوت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا جھریوں بھرا چہرہ نہ جانے کتنی داستانیں سنا رہا تھا اور اس کی بے نور آنکھیں نہ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔
"مالتی بیٹی! یہ کون ہے؟" سخاوت نے پوچھا۔
"بابا! یہ ایک مہمان ہے۔ پاکستان سے آیا ہے۔"
"پاکستان سے؟" سخاوت گھبرا گیا۔
"بابا! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کے لیے مصیبت نہیں بنوں گا۔ زخمی ہوں، اسی لیے پناہ لینے چلا آیا تھا۔ یہ مالتی مجھے یہاں لے آئی ہے۔"
"بابا! یہ اب تمہارے حوالے ہے۔" مالتی نے کہا۔ "ویسے اس طرف تو کوئی آتا نہیں ہے۔"
"ہاں، سوائے مالتی بیٹی کے اور کوئی نہیں آتا۔ خدا اس کا بھلا کرے۔ یہ میرے لیے کھانے کو لے کر آتی ہے اور پوری بستی یہ بات جانتی ہے اس لیے جب یہ اس طرف آیا کرے گی تو کسی کو شبہ نہیں ہو گا۔"
"اچھا بابو جی میں جاتی ہوں۔ تم بابا سے باتیں کرو،

کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ

مئی 2011ء
کے سالگرہ نمبر
کی ایک جھلک

ذکیہ بلگرامی کا ناول
اگر ملنا نہیں ہمدم سوچ کی نئی راہوں پر گامزن

شیریں حیدر کا نیا ناول شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

عالیہ بخاری کا ناول خوشبو کا سفر
ایک نئی مہک کے ساتھ

راحت وفا کا نیا ناول ایک تھی نیناں
نفسیاتی احساسات و خیالات سے مزین دوسری قسط

میمونہ خورشید اور رضوانہ پرنس
لبنیٰ عروج کے سچے جذبوں سے مزین پر تاثر ناولٹ

سیما یاسمین مجتبیٰ، ثنا منظر
شمیم فضل خاتون اور ریما سید علی
کے زندگی سے قریب ترین تلخ و شیریں افسانے

آپ کی آرزو نگارشات کے سچے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

www.kahopakistan.com

میں کھانا اور دوسری چیزیں لے کر آتی ہوں۔''

مالنی کے جانے کے بعد بابا نے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ اس بے چارے کے پاس بتانے کے لیے تھا ہی کیا۔ وہ لوگ سالہا سال سے اس بستی میں رہتے آئے تھے۔ سخاوت بابا کا باپ بھی بڑھئی تھا۔ اس بستی میں مسلمانوں کے چار پانچ گھر تھے لیکن دوسرے ہندوؤں کی طرف سے انہیں کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔

یہ علاقہ راجستھان کا تھا اور یہاں سے پاکستان کی سرحد صرف دس میل کے فاصلے پر تھی۔ یہ علاقہ بھی ریتیلا ہی تھا۔

سخاوت نے شادی بھی کی تھی۔ بیوی بچے بھی تھے لیکن ایک وبا میں مر گئے تھے۔ خود سخاوت بھی اسی وبا میں نابینا ہو گیا تھا۔

وہ وبا چیچک کی تھی جس کو ہندو ''ماتا'' کہا کرتے ہیں اور اس بیماری کی باقاعدہ پوجا بھی کی جاتی ہے۔ بابا کی باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ مجھے وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہو سکا اور مالنی ضروری سامان لے کر واپس آ گئی۔

یہ سامان کیا تھا۔ پانچ عدد روٹیاں، اچار، تھوڑا سا مکھن، پانی کی ایک بوتل، نہانے کا صابن اور میرے لیے ایک پینٹ اور دیسی کرتہ جس طرح کی ہندوستان میں عام طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

''مالنی! تم نے تو کمال کر دیا۔'' میں نے اس کی تعریف کی۔ ''اتنی جلدی اتنی چیزوں کا بندوبست کر لیا۔''

''کپڑے تو اس لیے لے آئی ہوں کہ تم کو اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو اپنا ہی آدمی سمجھے گا۔'' مالنی نے کہا۔ ''اور صابن تمہارے نہانے کے لیے لائی ہوں۔ پچھلی طرف ایک کنواں ہے جس کے پاس ڈول اور رسی رکھی ہے۔ نہا کر جلدی سے آ جاؤ۔''

''مالنی! میرا خیال ہے کہ تم واپس چلی جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ تمہاری تلاش شروع ہو جائے۔''

''نہیں، کوئی نہیں ڈھونڈے گا کیونکہ رات بھر کا ناٹک سمیلن ہونے والا ہے۔ پریاں ناچ رہی ہیں۔ گاؤں کے سارے مرد اور عورتیں وہیں لگے ہیں۔ اب تم جاؤ۔ جلدی سے نہا کر آ جاؤ... اور ہاں، یہ میں تمہارے لیے مرہم بھی لے آئی ہوں، اپنے زخموں پر لگا لینا۔''

پندرہ بیس منٹ کے بعد میں ان دونوں کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ''اب تم بھوت نہیں معلوم ہو رہے ہو۔'' مالنی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب بتاؤ، تم یہاں کیسے آ گئے؟ ساتھ ساتھ کھاتے بھی رہو۔''

میں اور سخاوت بابا نے اچار روٹی اور مکھن وغیرہ کھانا شروع کر دیا۔ اس کھانے کی لذت ہی کچھ اور تھی۔

''ہاں، اب بتاؤ۔ کیا کہانی ہے؟''

''مالنی! میں ایک سیاح ہوں۔ سیاح کا مطلب سمجھتی ہو نا۔ بس ادھر ادھر گھومتا رہتا ہوں۔ تو میں اپنے علاقے کے ایک پرانے مندر کے پاس پہنچ گیا۔ یہ ایک اجاڑ مندر تھا، صدیوں پرانا۔ میں اندر کے حالات دیکھنے کے لیے مندر کے اندر داخل ہوا اور اسی وقت زلزلہ آ گیا اور میں منوں مٹی کے نیچے دب گیا۔ جب ہوش آیا تو مندر کا راستہ بڑے بڑے پتھروں سے بند ہو چکا تھا۔ میں نے ایک طرف چلنا شروع کر دیا اور کسی طرح ان سیڑھیوں تک پہنچ گیا جہاں تم سے ملاقات ہوئی تھی۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری طرف کے مندر کا راستہ تمہارے پاکستان کے مندر کی طرف جاتا ہے۔''

''ہاں مالنی... لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ راستہ بند ہو چکا ہے اور میں ہندوستان میں ہوں۔ میں اب واپس بھی نہیں جا سکتا۔ کم از کم اس راستے سے تو نہیں جا سکتا۔''

''یہ تو واقعی بہت بڑی مصیبت ہو گئی ہے تمہارے ساتھ۔'' سخاوت بابا نے کہا۔

''ہاں بابا... لیکن خدا پر بھروسا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔''

''ہاں، کوئی نہ کوئی راستہ تو نکل ہی جائے گا۔'' سخاوت بابا نے اپنی گردن ہلائی۔

''مالنی! تم یہ بتاؤ کیا یہ نوٹنکی ہر سال ہوتی ہے؟'' میں نے مالنی سے پوچھا۔

''نہیں تو... ہر سال تو صرف بھوانی کی پوجا ہوتی ہے۔'' مالنی نے بتایا۔ ''اس بار یہ نوٹنکی والے پندرہ بیس دن پہلے سے اس بستی میں چلے آئے تھے۔''

''پندرہ بیس دن پہلے سے؟''

''ہاں... اور ایک عجیب بات ہوئی ہے ان کے ساتھ۔ پہلے دیوی نہیں تھی، وہ نہ جانے کہاں سے آ گئی ہے۔''

''کون دیوی؟''

''اس نے اپسرا کا روپ دھار رکھا ہے۔'' مالنی نے بتایا۔ ''بہت سندر ہے وہ... پہلے نہیں تھی۔ سادھو مہاراج اس سندری کو نہ جانے کہاں سے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔''

''اوہ گاڈ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''مالنی! تم نے مجھ پر بہت سے احسانات کیے ہیں۔ کیا ایک احسان اور کر سکتی ہو؟''

''کیوں نہیں... بتاؤ۔''

''کیا میں اس سندری کو ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟''

''وہ کیوں؟''

''بس یونہی۔ بس ایک نظر دیکھوں گا اس کو۔'' میں نے کہا۔

''اس کو بہت پہرے میں رکھا جاتا ہے۔'' مالنی نے بتایا۔ ''لیکن تمہارے لیے میں یہ ضرور کروں گی اور ویسے بھی تمہارا حلیہ بدل چکا ہے۔ اس بستی میں پہلے سے درجنوں آدمی آئے ہوئے ہیں۔ کوئی نہیں پہچانے گا۔''

''وہ آدمی یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''پتا نہیں کیا کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ اپنے ساتھ مشینیں لے کر آئے ہیں۔'' مالنی نے بتایا۔ ''کل دس بجے صبح ایک خاص ناچ ہو گا۔ اس میں ایک آدمی کو ہوا میں تیرایا جائے گا۔ وہ ہوا میں ناچ دکھائے گا۔''

یہ ایک نئی لیکن بہت خاص اطلاع تھی۔ پروفیسر آفندی بھی تو اسی طرح ہوا میں تیرتا ہوا غائب ہوا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح میں اسی ہال میں بیٹھا ہوا تھا۔

احتیاط کے طور پر مالنی نے میرے ماتھے پر تلک لگا دیا تھا۔ ورنہ شاید اس کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ مجھے شناخت کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ان لوگوں کے درمیان بیٹھ کر انہی جیسا دکھائی دے رہا تھا۔

کئی طرح کے ناچ دکھائے گئے۔ بھارتی ناٹیم، کتھک اور نہ جانے کیا کیا۔ ہندوستان کے یہ فنکار بہت اچھے رقاص ہوتے ہیں کیونکہ ناچ ان کے دھرم کا ایک لازمی حصہ ہوا کرتا ہے۔

پھر سادھو مہاراج کے آنے کا اعلان کیا گیا۔ ناچ رک گیا۔ سازندوں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ بھجن ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سادھو مہاراج پلیٹ فارم پر نمودار ہو گیا۔ اس بار اس کا چیلا بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس وقت چونکہ دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اس لیے سب ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ سادھو کہیں مجھے نہ پہچان لے۔ میں نے یہاں بیٹھ کر بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ سادھو نے ادھر ادھر نگاہیں گھمائیں اور اس نے مجھے دیکھ لیا۔

اس نے پہچان لیا تھا مجھے۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ کوئی اشارہ نہیں کیا۔ کسی کو خبردار نہیں کیا۔ صرف ایک لمحے تک وہ مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اب وہ لوگوں سے مخاطب تھا۔

وہ بھوانی کی شان میں نہ جانے کیا کیا بول رہا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کا ایک چیلا ہوا میں ناچ کر کے دکھائے گا۔ لوگوں نے جے جے کے نعرے لگائے اور ایک آدمی ہال کے درمیان میں آ گیا۔

اس نے پورے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کے بدن پر ایک جیکٹ بھی تھی۔ اس نے ہوا میں ایک دو بار چھلانگیں لگائیں اور اچانک ہوا میں معلق ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی موسیقی اور بھجن کا شور شروع ہو گیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ آدمی فضا میں معلق ہو کر رقص کے زاویے دکھا رہا تھا۔

سب کی توجہ اس آدمی کی طرف تھی۔ میں نے سادھو کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارہ کیا کہ میں اس ہال سے باہر آ جاؤں۔ وہ ایک طرف جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔

کسی نے میری طرف دھیان نہیں دیا۔ سب کے سب اس معلق آدمی کی طرف متوجہ تھے۔ میں اس ہال سے نکل کر باہر آ گیا۔ سادھو بھی ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے میرے پاس آ گیا۔ ''یہاں نہیں... یہاں خطرہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

ہم دونوں ایک کوٹھری میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''میں تمہیں یہاں دیکھ کر بہت حیران ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''تم آخر یہاں کیسے پہنچ گئے؟''

''مہاراج! یہ بے کار کی باتیں ہیں۔ میں تو خود آپ کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔''

''دیکھو نوجوان... تم مجھے غلط مت سمجھو۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے کہ میں ایک ہندو ہوں، ایک سادھو ہوں۔ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ میرے دھرم کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود میں ایک پاکستانی ہی ہوں اور مجھے بھی اپنی دھرتی سے اتنی ہی محبت ہے جتنی محبت تمہیں ہو سکتی ہے۔''

''جانتا ہوں میں۔'' میرے لہجے میں تلخی تھی۔ ''کیونکہ آپ اس محبت کا ثبوت دے چکے ہیں۔''

''لگتا ہے تمہیں پوری بات بتانی ہو گی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''تب جا کر تمہیں میری بات کا یقین آئے گا۔ میں اور میرا چیلا دونوں ہی پاکستانی ہیں اور محبِ وطن بھی ہیں۔''

''تو پھر جو کچھ ہوا وہ کیا تھا؟''

www.kahopakistan.com

"بتاتا ہوں تمہیں۔" سادھو نے کہا۔ "یہ کہانی اس دن سے شروع ہوتی ہے جب بھارت والوں کو یہ پتا چلا کہ پروفیسر آفندی جیسا ماہر بارڈر کے قریب زمین کا جائزہ لینے آیا ہے۔ انہیں یہ اندازہ تھا کہ پروفیسر پاکستان کی زمین میں پوشیدہ خزانے تلاش کر لے گا اسی لیے اس کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔ اس کو روکنے کے لیے لوگ بھیجے گئے لیکن پاکستانی حکومت نے ایک چالاکی یہ کی کہ شہر میں پروفیسر کی ایک ڈمی بٹھا دی اور توجہ اس کی طرف رکھنے کے لیے اس پر جھوٹ موٹ کے حملے بھی شروع کروا دیے گئے۔"

"لیکن ہمارے اندر کی یہ باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں۔"

"اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ پہلے تم غور سے سنتے رہو۔" مہاراج نے کہا۔ "پروفیسر آفندی نے پلانگ کے تحت صحرا میں آ کر اپنا کام شروع کر دیا اور یہ بات چھپی نہیں رہ سکی کہ شہر میں پروفیسر آفندی کا ہم شکل ہے اور اصل آدمی نے اپنی تلاش شروع کر دی ہے۔ اب پروفیسر کو اغوا کرنے کی سازشیں شروع کر دی گئیں۔ اس کے لیے پورا ماحول ایسا بنایا گیا جیسے جن بھوت پروفیسر کو اٹھا کر لے گئے ہیں جبکہ یہ چھوٹا سا سائنسی کارنامہ ہے۔"

"مہاراج! یہ بھی بتا دیں کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکا؟"

"بہت آسانی سے۔" مہاراج نے کہا۔ "پروفیسر کی ٹیم میں ایک ہندوستانی جاسوس بھی تھا۔ اس نے ایک جیکٹ پروفیسر کو تحفے میں دی۔ اس جیکٹ میں انتہائی قوت کا مقناطیس موجود ہے اور جب کچھ بلندی سے ایک خاص قسم کی کرین کے ذریعے اس جیکٹ کو کھینچا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ جیکٹ کو پہننے والا بھی فضا میں تیرنے لگتا ہے۔ تم نے ہال میں اس آدمی کو ناچتے ہوئے دیکھا ہی لیا ہے۔"

"اب سمجھا۔ اسی لیے اس نے وہ جیکٹ پہن رکھی ہے۔"

"ہاں، اب اگر تم اوپر کی طرف دیکھتے تو وہ کرین بھی دکھائی دے جاتی۔" مہاراج نے کہا۔

"پھر تو یہ ایک سائنسی شعبدہ ہوا۔"

"ہاں، یہ نوٹنکی اسی سازش کا ایک حصہ ہے۔" مہاراج نے بتایا۔ "اس میں ہر قسم کے لباس اور ہر قسم کے گیٹ اپ موجود ہیں۔ وہ لوگ یہ سمجھے کہ جن اور بھوت انہیں ہزاروں سال پہلے کی دنیا میں لے آئے ہیں۔"

"چلیں، یہ سب کچھ تو سمجھ میں آ گیا لیکن آپ کا کردار سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

"میرا کردار یہ ہے کہ مجھے دونوں طرف ایک مقدس حیثیت حاصل ہے۔" سادھو نے بتایا۔ "اگرچہ میں پاکستانی ہوں لیکن مجھے بھوانی کے سالانہ میلے اور پوجا کے موقع پر خاص طور پر پاکستان سے بلایا جاتا ہے۔ اور یہاں تم میری عزت تو دیکھ ہی چکے ہو۔"

"اب یہ بھی بتا دیں کہ آپ وہاں سے... میرا مطلب ہے ریت کے طوفان سے کس طرح نکل آئے؟"

"صرف میں ہی نہیں بلکہ پروفیسر آفندی کی بیٹی بھی نکل آئی ہے۔" سادھو نے بتایا۔ "جس وقت ریت کا طوفان آیا، اس وقت ہندوستانی قافلہ بھی تم لوگوں کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ لوگ اس وقت پہنچے جب طوفان گزر چکا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ میں نے اس لڑکی کا ہاتھ تھام لیا تھا اسی لیے اسے گم نہیں ہونے دیا۔ لیکن مجھے اتنا موقع نہیں مل سکا کہ میں اس لڑکی کو فرار کروا سکتا کیونکہ ان لوگوں نے اسے قابو میں کر لیا تھا۔ اس وقت مصلحت یہی تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ رکھوں... اور میں اسے ایک مقدس روپ دے کر اپنے ساتھ لے آیا۔"

"لیکن کس طرح لائے؟" میں نے پوچھا۔

"اسی مندر کے راستے سے۔" سادھو نے بتایا۔ "جس راستے سے تم اتفاقاً یہاں آئے ہو۔ تم نے غور نہیں کیا ہوگا، مندر کی پچھلی طرف بھی ایک دروازہ ہے جو سرنگ میں کھلتا ہے لیکن صدیوں پرانی اس سرنگ کا راستہ اب بند ہو چکا ہے۔"

"مہاراج! آپ کی ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئی ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ نہیں پتا چلا کہ آپ کا اس کہانی میں کیا کردار ہے؟"

"کیا سچ جاننا چاہتے ہو؟" وہ مسکرا دیا۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "مجھے سچ ہی جاننا ہے۔"

"میں پاکستانی خفیہ ایجنسی کا آفیسر ہوں۔" اس نے بتایا۔

اب یہ ایک نیا انکشاف ہوا تھا۔

یہ انکشاف بھی کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ پاکستانی خفیہ ایجنسی کا آفیسر اور ایک سادھو۔ پھر اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ "میرے دوست! تم مجھے جس حیثیت میں دیکھ رہے ہو، میری وہی حیثیت ہے۔ میں واقعی ایک سادھو ہوں۔ اپنے دھرم کی ایک معزز اور مقدس شخصیت ہوں۔ بارڈر کے دونوں طرف میرا احترام کیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں اپنے ملک کے مفاد کے لیے بھی کام کرتا ہوں۔ اب تو میری حیثیت تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی؟"

"ہاں، اب پتا چل گیا ہے۔"

"اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔" اس نے کہا۔ "اس بستی میں میرے خونی رشتے بھی رہتے ہیں۔"

"آپ کے خونی رشتے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ بھی بہت پرانی بات ہے۔ میں نے پاکستان ہی میں اپنی برادری کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ہمارے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ میں اس زمانے میں سادھو نہیں تھا۔ ایک سیدھا سادہ بیوپاری تھا۔ میں نے جس لڑکی سے شادی کی تھی، اس کے کئی رشتے دار بھارت کی انٹیلی جنس میں کام کرتے تھے۔ وہ ایک بار بارڈر کراس کر کے ہمارے پاس آئے تو میری بیوی ان کے آگے پیچھے ہونے لگی۔ وہ لوگ شاید کوئی پلاننگ لے کر آئے تھے اور ہیڈ کوارٹر میرے گھر کو بنانا چاہتے تھے۔ یہ بات میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کو سختی سے منع کیا تو وہ راتوں رات بچی کو لے کر اپنے رشتے داروں کے ساتھ ہندوستان آ گئی۔ بہت دنوں کے بعد مجھے اپنی بیٹی کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس دوران میں نے دنیا تیاگ دی تھی۔ پورا سادھو ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پاکستانی فوجی آفیسر کی خواہش پر میں نے ایجنسی بھی جوائن کر لی تھی اور اب میں یہاں اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے بھی آیا کرتا ہوں۔"

"کیا آپ کی بیٹی اس بستی میں رہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... اور تم اس سے مل بھی چکے ہو۔ میں مالتی کی بات کر رہا ہوں۔ وہی میری بیٹی ہے۔"

"اوہ خدا! کیسی کیسی باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ کیا مالتی کو یہ معلوم ہے کہ آپ کی دوسری حیثیت کیا ہے؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ صرف مجھے اپنا باپ جانتی ہے اور اسے یہ معلوم ہے کہ میں سرحد پار رہتا ہوں اور ایک مذہبی شخصیت ہوں۔ اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں جانتی۔"

"لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں اس سے مل چکا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔" سادھو نے کہا۔

"ایک بات اور بتائیں۔ ہم سب پروفیسر آفندی کے لیے آئے ہیں، وہی اس کہانی کا سرکڑی کردار ہیں تو انہیں اغوا کر کے کہاں رکھا گیا ہے؟ کیونکہ یہاں تو وہ مجھے دکھائی نہیں دیے۔"

"وہ یہاں دکھائی بھی نہیں دے سکتے۔" سادھو نے بتایا۔ "کیونکہ وہ پاکستان ہی میں ہیں۔"

یہ ایک اور انوکھا انکشاف تھا۔

اگر پروفیسر آفندی پاکستان ہی میں تھے تو پھر یہ لمبا چوڑا کھڑاگ کس لیے پھیلایا گیا تھا۔

"مہاراج! اس سے پہلے کہ میں پاگل ہو جاؤں، آپ یہ بتا دیں کہ پروفیسر آفندی پاکستان میں کہاں ہیں؟"

"موہن نگری پر۔" مہاراج نے بتایا۔

"اور یہ موہن نگری کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک بستی ہے، اسی مندر سے کچھ فاصلے پر... شمال کی طرف۔ پروفیسر کو اغوا کر کے اسی بستی میں رکھا گیا ہے۔ ان کی پلاننگ یہ تھی کہ پروفیسر کو اغوا کر کے انہیں اس حد تک مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال بھارت کے لیے کرنے لگیں۔ انہوں نے پروفیسر کی لڑکی لیلیٰ کو بھی اسی لیے قابو میں کیا تھا کہ وہ اس کے ذریعے پروفیسر پر دباؤ ڈالتے۔"

"اب سمجھ میں آیا... لیکن پروفیسر تو پاکستان ہی میں ہیں۔ وہ ان لوگوں کے کس طرح کام آ سکتے ہیں؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم... لیکن اتنا ضرور سنا ہے کہ ان لوگوں نے پروفیسر کو ہندوستان اسمگل کرنے کی سازش تیار کر لی ہے۔ پہلے تو ان کا ارادہ اسی سرنگ کے راستے لانے کا تھا لیکن سرنگ بند ہو جانے کے بعد وہ اب کسی اور طریقے پر

کشمکش

دو دوست ایک روز ہاتھوں... میں ہاتھ ڈالے صدر سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک دوست ٹھٹک گیا۔ پھر فوراً ہی دوسرے کا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا۔ "جلدی کرو۔ اس ریستوران میں چھپ جاؤ۔"

دوسرا دوست اس کے ساتھ ہی ریستوران میں گھس گیا۔ دروازے کے عقب میں کھڑا ہو کر اس نے پوچھا۔ "بات کیا ہے؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"وہ دیکھو۔" پہلے دوست نے کہا۔ "میری بیوی ملبوسات کی دکان پر کھڑی میری محبوبہ سے بات کر رہی ہے۔"

دوسرے نے غور سے دیکھا۔ "خدا کی پناہ۔" اس نے گھبرا کر کہا۔ "تم درست کہہ رہے ہو۔ فرق بس اتنا ہے کہ ملبوسات کی دکان پر میری بیوی میری محبوبہ سے گفتگو کر رہی ہے۔"

کراچی سے شاہد حسین کی کشمکش

www.kahopakistan.com

عمل کرنے والے ہیں۔"

"مہاراج! یہ تو بہت الجھی ہوئی صورتِ حال ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر پروفیسر یہاں آگئے تو ہم شاید بے بس ہو جائیں۔ ان کی حفاظت ہر حال میں ضروری ہے۔"

"ان کی حفاظت تو ضروری ہے لیکن تم ایک پہلو پر غور نہیں کر رہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ تم خود یہاں سے کیسے نکلو گے؟" مہاراج نے کہا۔ "میری بات اور ہے۔ مجھے کوئی نہیں روکے گا لیکن تم کیسے جاؤ گے؟"

یہ ایک پریشان کن سوال تھا۔

میں یہاں سے کیسے نکل سکتا تھا؟ سرنگ کا خفیہ راستہ بند ہو چکا تھا۔ میری ہندوستان آمد غیر قانونی تھی۔ اب چاہے میں کیسے ہی حالات کا شکار ہو کر یہاں پہنچا ہوں لیکن آمد تو غیر قانونی تھی۔

"فکر مت کرو۔" سادھو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بھگوان کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا۔ اچھا، تم یہیں رہو۔ ابھی باہر مت نکلنا۔ مالتی تمہیں ضرورت کی چیزیں پہنچا دے گی۔"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر باہر جا سکتا، مالتی دوڑتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ "بابو جی... بابو جی!" اس نے سادھو کو مخاطب کیا۔ "بھارتی فوجی بستی میں گھس آئے ہیں۔ گھر گھر تلاشی لی جا رہی ہے۔"

"لیکن کیوں؟" سادھو بھی بوکھلا گیا۔

"وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ پاکستانی جاسوس بستی میں آگئے ہیں۔" مالتی نے بتایا۔

☆☆☆

ہم پاگلوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

یہ ایک ریگستانی علاقہ تھا اسی لیے یہاں دور ہی سے دیکھ لیے جانے کا امکان تھا۔ جن علاقوں میں درخت اور جنگل وغیرہ ہوتے ہیں وہاں چھپ کر رہا جا سکتا ہے لیکن ایسے کھلے ہوئے علاقوں میں پوشیدہ رہنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ میرے اور سادھو کے علاوہ مالتی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ اس کے علاوہ پروفیسر کی بیٹی لیلیٰ بھی تھی۔ سادھو کسی طرح اسے نکال لایا تھا لیکن وہ چیلا ہمارے ساتھ نہیں تھا۔

ہم ایک طرف دوڑے جا رہے تھے۔ میں نے جب اس چیلے کے بارے میں سادھو سے دریافت کیا تو اس نے بتایا۔ "منوہر نے اپنی گرفتاری دے دی ہے۔"

"گرفتاری دے دی ہے... وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ کسی طرح ہم بچ نکلیں۔" سادھو نے بتایا۔ "تم خود دیکھ لو۔ اس وقت کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا ہے کیونکہ منوہر نے انہیں الجھا لیا ہے۔"

واقعی میں نے جب غور کیا تو احساس ہوا کہ فی الحال ہمارا تعاقب نہیں ہو رہا۔ یعنی اس بے چارے نے اپنی قربانی دے کر اپنے گرو کو بچانے کی کوشش کی تھی۔

خدا ہی جانتا ہے کہ انڈین آرمی کو ہمارے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا تھا؟ کس نے مخبری کر دی تھی؟ صورتِ حال اچانک خراب ہو گئی تھی۔

ہم کھلے میدانی علاقے میں دوڑے چلے جا رہے تھے۔ سوال پھر وہی تھا کہ بارڈر کس طرح کراس کریں گے؟

یہ مہم زندگی بھر یاد رہنے والی ایسی مہم ثابت ہو رہی تھی جس میں سکون کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ بس بھاگ دوڑ لگی ہوئی تھی۔

اب دوڑتے دوڑتے ہماری سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ ہم بری طرح نڈھال ہو چکے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے سادھو سے کہا۔ "بچ نکلنے کا ایک راستہ ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"ہم دوبارہ بستی کی طرف چلے جائیں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ ان کا یہ خیال ہو گا کہ ہم بستی سے فرار ہو چکے ہیں۔ وہ ہمیں بستی سے باہر تلاش کر رہے ہوں گے اور ہم بستی ہی میں ہوں گے جس کی طرف ان کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔"

"اس کے بعد کیا ہو گا؟ ہم بستی میں تو رہ نہیں سکتے؟"

"ہمیں اس سرنگ میں ترائی کرنی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ دوسری طرف نکلنے کا کوئی راستہ نکل آئے۔ ورنہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"بابو جی... یہ ٹھیک کہتا ہے۔" مالتی نے کہا۔ "بچپن میں بھی میں ایسا ہی کرتی تھی۔ چھپنے والا کہیں ہوتا تو میں وہیں کہیں آس پاس ہی بیٹھ جاتی اور سب لوگ ادھر ادھر ڈھونڈتے رہتے۔"

اس پریشانی کے باوجود مالتی کی اس بات نے ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دیں۔ ایک نیا ولولہ سا محسوس ہوا تھا۔ "لیکن ایک سوال یہ ہے کہ ہم بستی سے گزر کر اس سرنگ تک کیسے پہنچیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی فکر مت کرو۔" سادھو نے کہا۔ "وہاں تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔"

"ہاں، وہیں چلو۔" اس بار لیلیٰ نے کہا۔ وہ اتنی دیر کے بعد پہلی بار کچھ بولی تھی۔ "ان کے ہاتھ آنے سے تو بہتر ہے کہ ہم جدوجہد کرتے ہوئے مر جائیں۔"

ہم نے واپسی کے لیے دوڑ لگا دی۔ اس بار ہماری یہ دوڑ بستی کے مخالف سمت میں نہیں ہو رہی تھی بلکہ ہم ایک طویل راستے سے گھوم کر بستی ہی کی طرف جا رہے تھے۔

ہم ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اس دروازے تک پہنچ گئے جہاں سے سرنگ میں اترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

ہم نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ کسی کی آواز آئی۔ "رک جاؤ مہاراج! اب ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

گرو کا چیلا اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

ہمیں جیسے سکتا ہو گیا۔ خاص طور پر مہاراج کو۔

ہم پھنس گئے تھے۔ "منوہر! تو... تو نے اپنی گرفتاری نہیں دی؟" سادھو نے حیران ہو کر پوچھا۔

"گرفتاری کس بات کی مہاراج! میرے ہی کہنے پر تو فوجی آئے ہیں۔ میں نے ہی بتایا تھا انہیں۔"

"منوہر! تو نے کتنی بڑی غداری کی ہے۔ میں تو تجھ پر بہت بھروسا کرتا تھا۔"

"یہاں کے لوگوں نے بھی تم کو مہان سمجھ کر تم پر بھروسا کیا تھا مہاراج!" منوہر نے کہا۔ "انہیں کیا معلوم تھا کہ تم پاکستان کے جاسوس ہو۔"

"منوہر! اب تو کیا چاہتا ہے؟"

"میں جانتا تھا مہاراج کہ تم لوگ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اسی راستے کی طرف آؤ گے کیونکہ یہاں سے اس طرف جانے کا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ اسی لیے میں پہلے سے یہاں آ کر کھڑا ہو گیا۔"

"لیکن تو نے ایسا کیوں کیا؟"

"اپنی بھوانی کو بچانے کے لیے... اپنی عزت بڑھانے کے لیے۔" منوہر نے کہا۔ "کیونکہ جب تک میں تمہارے ساتھ رہا ہوں، میری حیثیت کیا تھی؟ بس ایک چیلے کی... جس کا کام تمہاری خدمت کرنا تھا لیکن اب میں خود مہاراج بن کر رہوں گا۔ میری عزت ہو گی، شان ہو گی۔"

"بے وقوف! پاکستان تیرا وطن ہے۔" سادھو نے کہا۔

راستہ

لڑکیاں زبردستی کھینچا تانی کر کے نانی اماں کو پاک بھارت کے درمیان ہونے والا ہاکی میچ دکھانے لے گئیں۔ کھیل شروع ہوا تو دیر تک نانی اماں کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟

"دیکھو نانی اماں!" ایک لڑکی نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "کھیل کا مقصد یہ ہے کہ کسی ایک گول میں... وہ جو دونوں طرف جال لگے ہیں، وہی گول کہلاتے ہیں ہاں تو کسی ایک گول میں گیند ڈال دی جائے۔" "یہ کام تو بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔" نانی اماں نے کہا۔ "بشرطیکہ لوگ خواہ مخواہ بیچ میں آ کر راستہ روکنا بند کر دیں۔"

امرتسر سے بوٹا سنگھ کا مراسلہ

"اب نہیں ہے۔ اب میں ہندوستانی ہو گیا ہوں اور وہاں میرا ہے کون؟ یہ بات تم بھی جانتے ہو، سوائے ایک ماں کے۔ اس کو میں یہاں لے کر آؤں گا۔"

"کس طرح لائے گا؟"

"اسی راستے سے مہاراج!" منوہر ہنس پڑا۔ "یہ بھی بتا دوں کہ یہ راستہ پوری طرح بند نہیں ہوا ہے۔ یہ میں خود جا کر دیکھ چکا ہوں لیکن افسوس کہ اب تم لوگ اس راستے سے نہیں جا سکو گے۔ میں آواز دے رہا ہوں ہندوستانی فوجیوں کو اور..."

لیکن اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی باتوں کے دوران میری طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ میں نے غیر محسوس طریقے سے ایک پتھر اٹھا کر ہاتھ میں رکھ لیا تھا اور وہی پتھر گولی کی سی رفتار اور قوت کے ساتھ اس کی پیشانی پر لگا تھا۔

وہ چیخ مار کر الٹ گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس پوری مہم میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کچھ کر دکھایا تھا۔

"بس اب نکلو یہاں سے۔" میں نے کہا۔

منوہر کی لاش دروازے کے پاس سے ہٹا کر ایک طرف پھینک دی گئی۔ ہم نے سرنگ میں قدم رکھا اور اسی وقت فوجی بوٹوں کی آوازیں گونج اٹھیں۔

☆☆☆

ایک بار پھر یہ سفر شروع ہو گیا۔

اس بار یہ سفر اور بھی بھیانک تھا۔ ہمارے پیچھے فوجی

www.kahopakistan.com

تھے۔ ہندوستانی آرمی کے لوگ جو ہمیں ہر حال میں گرفتار کر لینا چاہتے تھے اور ہمارے سامنے پتھروں سے اٹا ہوا ایک طویل اندھیرا راستہ تھا اور ہم اسی راستے پر دوڑتے چلے جا رہے تھے۔

میں نے لیلیٰ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ سادھو نے اپنی بیٹی مالتی کو پکڑ رکھا تھا اور ہم گرتے پڑتے بھاگے جا رہے تھے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ گولیاں چلانی شروع کر دیں یا ممکن تھا کہ یہ کمزور سرنگ اچانک بیٹھ جائے... یا ہم میں سے کوئی سرنگ میں موجود کسی گڑھے میں گر جائے۔ غرضیکہ کچھ بھی ممکن تھا۔

ہم دوڑ رہے تھے پھر لیلیٰ کی آواز سنائی دی۔ ''خدا کے لیے رک جاؤ۔ میں اب نہیں دوڑ سکتی۔ میری سانسیں پھول رہی ہیں۔''

میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اسے اٹھا کر اپنے شانے پر ڈال لیا۔ وہ ''ارے ارے'' کرتی رہ گئی۔ ہم پھر دوڑ پڑے لیکن دوڑنا میں غلط کہہ رہا ہوں کیونکہ ہم دوڑ کہاں رہے تھے، اس ناہموار سے، گھٹے ہوئے اور تاریک راستے پر تو دوڑنا ناممکن ہی تھا۔

ہم چل رہے تھے۔ پتھروں سے ٹھوکر کھاتے ہوئے، الجھتے ہوئے، گرتے ہوئے۔ ہماری رفتار بہت سست تھی مگر پھر اس وقت تیزی آ گئی جب ہم نے اپنے پیچھے کتوں کی آوازیں سنیں۔

وہ کم بخت ہمیں پکڑنے کے لیے اپنے تربیت یافتہ کتے لے آئے تھے۔

اب ہماری رفتار تیز ہو گئی تھی۔ موت بہت تیزی سے ہمارے قریب آتی جا رہی تھی۔ اول تو وہ کتے ہی ہمیں پھاڑ کر رکھ دیتے پھر اگر ہم ان فوجیوں کے ہاتھ آ جاتے تو ہمارا حشر برا ہو جاتا۔ اسی لیے ہمیں چلتے رہنا تھا۔

ہم چلتے رہے۔ کتوں کی آوازیں قریب اور قریب آتی جا رہی تھیں۔ کسی نے چیخ کر ہم سے کچھ کہا بھی تھا لیکن اس سرنگ میں اس کی گونج ہی سنائی دی تھی۔ اس کی بات سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ ہمیں رکنے ہی کے لیے کہہ رہا ہوگا۔

کتے قریب آ گئے۔ ان کی آوازیں ہمیں بالکل پاس محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے لیلیٰ کو کندھے سے اتار کر اپنے ہاتھ میں دو پتھر لے لیے اور ایک کتے کی آواز کی طرف اسی انداز سے پتھر پھینک دیا۔ میرا نشانہ صحیح لگا تھا۔

کتے کی دردناک آواز سنائی دی۔ ہمیں کچھ دیر کی مہلت مل گئی۔ ہم اور آگے بڑھ چکے تھے۔ پھر اچانک روشنی کا ایک دائرہ سامنے سے دکھائی دینے لگا۔

شاید یہ وہی راستہ تھا جس کے بارے میں منوہر نے بتایا تھا۔ منزل قریب آ چکی تھی۔ بس ذرا سی ہمت اور... اور ذرا سی محنت... پھر ہم اس روشنی میں آ جاتے۔

وہ راستہ ہی تھا۔ وہی راستہ جس سے ہم باہر نکل سکتے تھے اور جس کے بعد ہم آزاد ہوتے۔ کوئی ہمارا تعاقب کرنے والا نہیں ہوتا۔

ہم اس راستے کے پاس پہنچ گئے۔ یہ ایک بہت بڑا سوراخ تھا۔ سب سے پہلے سادھو باہر گیا۔ اس کے بعد مالتی۔ مالتی کے بعد لیلیٰ اور لیلیٰ کے بعد میں لیکن...

گولی چلی۔ صرف ایک گولی جو میرے شانے میں اتر گئی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں دروازے کے اس پار گرا تھا یا اس طرف۔

☆☆☆

نہ جانے کتنی دیر کے بعد مجھے ہوش آیا تھا۔

شاید ایک دن بعد یا ایک ہفتے کے بعد۔ میرے اردگرد کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ جانے پہچانے چہرے تھے۔ سادھو مہاراج، مالتی، لیلیٰ اور ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر لیلیٰ نے اطمینان بھری سانس لی۔ ''خدا کا شکر ہے کہ تم ہوش میں آ گئے۔ ورنہ ہم تو تمہاری طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔''

''میں ڈھیٹ آدمی ہوں۔ اسی لیے مجھے کچھ نہیں ہونے والا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں ہوں کہاں؟''

''میرپور خاص کے ایک اسپتال میں۔'' سادھو نے بتایا۔ ''ہم تمہیں اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔''

''اور ہماری مہم کا کیا ہوا؟''

''کیا ضروری ہے کہ ساری باتیں اسی وقت کرو؟'' لیلیٰ پیار سے بولی۔ ''تم کمزور ہو گئے ہو۔ کچھ دیر آرام کر لو۔''

میں واقعی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ شاید میرا خون زیادہ ہی ضائع ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر نے انجکشن لگا کر مجھے سلا دیا۔ جب دوبارہ بیدار ہوا تو میری حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میں توانائی محسوس کر رہا تھا۔ مالتی میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔

مجھے بیدار دیکھ کر وہ خوش ہو گئی۔ ''بھگوان کی کرپا ہے کہ تم اب ٹھیک معلوم ہو رہے ہو۔''

''دوسرے لوگ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''سب باہر برآمدے میں ہیں۔'' مالتی نے بتایا۔ ''ابھی بلاتی ہوں۔''

سب آ گئے تھے۔ سادھو مہاراج، لیلیٰ اور ان کے ساتھ میرا ماتحت نوشاد۔ نوشاد کے ساتھ سلمان درانی بھی تھا۔

نوشاد نے آ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''سر! نئی زندگی مبارک ہو۔''

''نوشاد! تم یہ بتاؤ کہ اس زلزلے کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں سر! ہم سب وہاں سے چیختے ہوئے باہر آ گئے تھے۔'' نوشاد نے بتایا۔

''کیا کوئی نقصان؟''

''یس سر! بہت بڑا نقصان۔'' نوشاد دھیرے سے بولا۔ ''سلمان صاحب کی بیٹی غزالہ اس زلزلے میں ہلاک ہو گئیں۔''

''اوہ۔'' میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے کیوں غزالہ کو ان لوگوں میں نہ دیکھ کر کچھ اسی قسم کا خدشہ میرے ذہن میں رینگنے لگا تھا۔

وہ لڑکی مر چکی تھی۔ ایک ہنستی کھیلتی، زندگی سے بھرپور لڑکی۔ بے رحم موت اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ بہت دیر تک میں اس کیفیت میں رہا۔ بار بار اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔ وہ بھی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ بہت دیر تک میں اسی کیفیت میں رہا۔ بار بار اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔

میں نے سلمان درانی کی طرف دیکھا۔ اس باوقار شخص کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

''سلمان صاحب! میں... میں کیا کہوں؟'' میں نے سلمان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''غزالہ کی موت نے مجھے بھی توڑ کر رکھ دیا ہے۔''

''ان سے کچھ کہنے کا فائدہ نہیں ہے سر۔'' نوشاد نے کہا۔ ''کیونکہ یہ اب تک اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ انہیں کچھ نہیں معلوم کہ کیا قیامتیں گزر چکی ہیں۔ البتہ یہ بالکل خاموش ہو گئے ہیں۔''

''اوہ... یہ ایک اور بڑا حادثہ ہے نوشاد۔'' میں نے کہا۔

''یس سر! یہ بھی ایک بڑا حادثہ ہے۔''

فضا میں سوگواری تھی۔ سلمان درانی بچوں جیسی معصومیت کے ساتھ پلکیں جھپکا جھپکا کر سب کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسی وقت میرے محکمے کا چیف کمرے میں داخل ہو گیا۔

''ہیلو ینگ بوائے!'' اس نے قریب آ کر کہا۔ ''مجھے ساری رپورٹس مل گئی ہیں۔ تم بہت بڑی مہم سے واپس آئے ہو۔''

دھوتی

میرے بہت سے دوست سارا دن انگریزی سوٹ میں پھنسے پھنسے پھرتے ہیں مگر گھر آتے ہی وہ کافروں کا یہ لباس اتار پھینکتے ہیں اور دھوتی بنیان پہن کر حقہ سامنے رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اطمینان کا لمبا سانس لیتے ہیں۔ یہ دوست انگریزی لباس کی افادیت کے بھی قائل ہیں... ان کے بقول اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ جب اتاریں تو بہت مزہ آتا ہے تاہم دھوتی کی ''فضیلت'' کے یہ زیادہ قائل ہیں، اس لباس کی ایک خصوصیت تو یہ دوست وہی بتاتے ہیں جو میں نے اوپر بیان کی ہے یعنی اس کا کھلا اور ہوادار ہونا۔ اس کی تشریح یہ کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ کام کاج کے دوران پسینے کی نمی اور ہوا کی کھلی ڈلی آمد و رفت سے یہ لباس ایئر کنڈیشنر کا کام دیتا ہے، دوسری خصوصیت ان دوستوں کے نزدیک دھوتی کا کثیر المقاصد ہونا ہے، اس کے پلو سے ناک بھی پونچھی جا سکتی ہے، زمین پر بیٹھنے سے پہلے اسی دھوتی سے زمین کا مطلوبہ ٹکڑا بھی صاف کیا جا سکتا ہے اور اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو اس سے دسترخوان کا کام لینے میں بھی کوئی حرج نہیں!

(عطاء الحق قاسمی کی ''ہنسنا رونا منع ہے'' سے ایک پارۂ انتخاب... ولید بلال)

بیوی کی یاد

دفتر کے بابو صاحب نے کھانے کے وقفے میں کھانے کا ڈبا نکالا اور اسے کھولتے ہوئے بڑبڑانے لگا: ''روز وہی آملیٹ یا آلو کی بھجیا۔ تنگ آ گیا ہوں کھا کھا کر۔''

پاس بیٹھے ہوئے ساتھی نے کہا: ''تم اکثر یہ شکایت کرتے ہو، آخر اپنی بیوی سے کہتے کیوں نہیں کہ بدل بدل کر چیزیں تیار کرے۔''

بابو صاحب حیرت سے بولے۔ ''کیسی بیوی! یہ کھانا تو میں خود تیار کرتا ہوں۔''

معصوم نیاز کی بزلہ سنجی لاہور سے

www.kahopakistan.com

''خدا کا شکر ہے چیف کہ بھیانک خواب والی یہ مہم ختم ہوئی۔''

''ختم کہاں ہوئی؟ اصل کام تو ابھی باقی ہے۔'' چیف نے کہا۔

''وہ کیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''پروفیسر آفندی! وہ ابھی تک نہیں مل سکے ہیں۔'' چیف نے بتایا۔

☆☆☆

صرف دو دنوں کے بعد میں پھر پروفیسر آفندی کی تلاش میں جا رہا تھا۔

اس بار صرف نوشاد میرے ساتھ تھا۔ باقی لوگ وہیں رہ گئے تھے۔ اس بار منزل نامعلوم نہیں تھی بلکہ معلوم تھی۔ یعنی موہن نگری۔

ایک ایسی بستی جہاں صرف ہندو آباد تھے اور سادھو مہاراج کی اطلاع کے مطابق پروفیسر آفندی کو وہیں لے جا کر رکھا گیا تھا اور ابھی تک انہیں ہندوستان نہیں بھیجا جا سکا تھا۔

''چیف! کیوں نہ اس گاؤں کی تلاش لی جائے۔'' میں نے چیف سے کہا تھا۔ ''یہ ایک آسان طریقہ ہے۔''

''طریقہ تو آسان ہے لیکن اس میں کئی اندیشے ہیں۔'' چیف نے بتایا۔ ''ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا کہ پاکستان میں اقلیتوں پر ظلم ہوتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ پروفیسر کو وہیں رکھا گیا ہے۔''

''یعنی ہم صرف شبے کی بنیاد پر وہاں جا رہے ہیں؟''

''ہو سکتا ہے۔'' چیف نے اپنی گردن ہلائی۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ تم وہاں جا کر کامیاب ہو جاؤ۔''

''لیکن ہم اس بستی میں داخل کس طرح ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا بھی بندوبست ہو گیا ہے۔'' چیف نے بتایا۔ ''تمہارے پاس کچھ سامان ہو گا، بے ضرر سا سامان۔ الیکٹرونک کی چیزیں۔ تم وہاں ایک آدمی روپ سنگھ سے ملو گے۔ وہ اسمگلر ہے۔ کمیشن پر ادھر کا مال ادھر اور ادھر کا سامان اس طرف لے کر آتا ہے۔ تمہیں بھی ایک اسمگلر کی حیثیت سے اس بستی میں داخل ہونا ہے اور اپنے معاملات طے کرنے ہیں۔ اس دوران میں تم پروفیسر صاحب کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے رہو گے۔''

''ٹھیک ہے چیف... میں اپنی اس ادھوری مہم کے لیے تیار ہوں۔''

بہت سا سامان ہمارے حوالے کر دیا گیا تھا۔ یہ سب بے ضرر سی چیزیں تھیں۔ جیسے استری، ٹوسٹر، اوون اور اسی قسم کی دوسری چیزیں۔ میں اور نوشاد یہ سامان لے کر موہن نگری پہنچ گئے۔

مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی بڑی بستی ہو گی۔ یہ اچھا خاصا شہر تھا۔ یہاں بازار بھی تھے۔ جن میں ہر طرح کا سامان فروخت ہو رہا تھا۔ بھارت کی بنی ہوئی بے شمار چیزیں مارکیٹ میں تھیں۔ یہاں میں نے کئی مندر دیکھے۔ جگہ جگہ بندر بھی اچھلتے کودتے نظر آ رہے تھے۔ پورا ہندوستانی ماحول تھا۔

ہمیں روپ سنگھ کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اسے ہمارے بارے میں بتا دیا گیا تھا اس لیے وہ ہمارے انتظار ہی میں تھا۔

''اچھا ہوا کہ تم لوگ آج ہی آ گئے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر کل آتے تو شاید ہم تمہیں نہیں ملتے۔''

''وہ کیوں؟''

''ہمیں ہری چند کی ارتھی لے کر ہندوستان جانا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کون ہری چند؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے بہت بڑے پنڈت تھے۔ کل ہی موت ہوئی ہے ان کی۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کا کریا کرم ہندوستان میں ہو گا۔''

''اوہ... تم لوگ جاؤ گے کیسے؟''

''پیدل۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ ایسا سال میں کئی بار ہوتا ہے۔ بس بندوں کی گنتی کر لی جاتی ہے۔ جتنے لوگ جاتے ہیں، اتنے ہی لوگوں کو واپس آنا پڑتا ہے۔ صرف دو دن رکنے کی اجازت ملتی ہے۔''

''پھر تو ہم غلط وقت پر آئے۔''

''نہیں، اب آ گئے ہو تو ایک دن انتظار کرو۔'' اس نے کہا۔ ''کل یہاں سے ارتھی جائے گی۔ دو دنوں کے بعد ہم واپس آ جائیں گے۔ تم جب تک میرے مہمان کی طرح یہیں رہو۔ واپس آ کر تمہارا حساب کتاب کر دیا جائے گا۔''

روپ سنگھ کسی کام سے باہر چلا گیا۔

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی سر۔'' نوشاد نے کہا۔ ''یہاں ہم کس طرح پروفیسر صاحب کو تلاش کریں؟ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتے۔''

''یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''سر! ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔''

''ہاں کہو۔''

www.kahopakistan.com

”سر! کیا ضروری ہے کہ پنڈت کی ارتھی ہندوستان ہی لے جائی جائے...؟ اس کا کریا کرم یہاں بھی ہوسکتا ہے؟“

”تو پھر؟“

”اس کی لاش کسی تابوت میں ہوگی سر۔“ اس نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ...“

”اوہ نوشاد۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”بہت ممکن ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس تابوت میں کوئی لاش نہ ہو بلکہ خود پروفیسر ہوں اور یہ لوگ انہیں اتنی آسانی کے ساتھ بارڈر کے پار لے جائیں گے کہ کسی کے تصور میں بھی نہیں ہوگا۔“

”یس سر! میرے ذہن میں یہی بات تھی۔“

”تو چلو، سب سے پہلے اس تابوت کا سراغ لگاتے ہیں کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔“

ہم نے اس تابوت کا سراغ لگالیا۔

یہ سراغ بھی اتفاقاً ملا تھا۔ ہم روپ سنگھ کے مکان سے باہر نکل کر ادھر ادھر گھوم رہے تھے کہ ہم نے ایک مکان دیکھا۔ اس مکان کے چاروں طرف مسلح افراد اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے اس مکان کی حفاظت کر رہے ہوں۔

”نوشاد! ہم نے اس بستی کے کسی اور مکان میں پہرا نہیں دیکھا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہاں پہرا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ تابوت اسی مکان میں ہے۔“

”ہوسکتا ہے سر۔“

”لیکن اسے دیکھا کیسے جائے؟“

ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ روپ سنگھ سامنے سے آتا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ ہمارے پاس آگیا۔ ”کیا بات ہے... سیر ہو رہی ہے؟“

”بس یونہی، تمہارا شہر دیکھ رہا تھا۔“ میں نے کہا پھر اس مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ”خیریت تو ہے... یہاں کون رہتا ہے؟ بہت پہرے دار لگے ہوئے ہیں؟“

”یہاں پنڈت ہری چند کا تابوت رکھا ہوا ہے۔“ اس نے تصدیق کردی۔

”یار! کیا ہم پنڈت جی کا درشن کرسکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت مشکل ہے۔“ اس نے کہا۔

”یار! تمہارے لیے کیا مشکل ہے۔ تم بس دو منٹ کی اجازت دلوادو۔ ایسے لوگوں کا آخری درشن بہت خوش نصیبی کی بات ہوتی ہے۔“

”اوہ... کیا تم بھی ایسی باتوں کو مانتے ہو؟“

”کیوں نہیں... اچھے اور نیک لوگوں کی قدر تو ہر مذہب کرتا ہے۔“

وہ خوش ہوگیا۔ ”ٹھیک ہے، میں اجازت لے کر آتا ہوں، تم یہیں رکو۔“

وہ دس منٹ کے بعد ہی واپس آگیا۔ ”اجازت تو نہیں مل رہی تھی لیکن رشوت یہاں بھی کام آگئی۔ صرف ایک آدمی اندر جائے گا۔ وہ بھی صرف ایک منٹ کے لیے۔“

میرے لیے ایک منٹ بھی بہت تھا۔

میں اس کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ تابوت رکھا تھا۔ میں نے اندر آتے ہی یہ اندازہ کرلیا تھا کہ اس تابوت کی بناوٹ ایسی ہے کہ ہوا جانے کی گنجائش رہے۔

میں نے آگے بڑھ کر تابوت کا کور ہٹادیا۔

پروفیسر آفندی بے ہوشی کے عالم میں لیٹے ہوئے تھے۔

☆☆☆

وہ تابوت ابھی بستی سے کچھ ہی فاصلے پر گیا تھا کہ آرمی کے جوانوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ میرے بلانے پر آئے تھے۔

تصدیق ہو جانے کے بعد میں نے چیف کو فون کردیا تھا۔ بہت سے لوگ پکڑے گئے۔

پروفیسر آفندی کو بازیاب کرالیا گیا۔ وہ جب سے اغوا ہوئے تھے، انہیں مسلسل بے ہوشی کے عالم میں رکھا جا رہا تھا۔

یہ مہم ختم ہوگئی۔

ایک ہفتے کے بعد پروفیسر آفندی نے اپنی رپورٹ حکومت کے حوالے کردی تھی کیونکہ وہ اپنا کام مکمل کرچکے تھے۔

اب ان کے جانے کا وقت ہوگیا تھا۔ لیلیٰ بہت اداس تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”ٹیپو! میں تمہیں ساری زندگی یاد رکھوں گی۔“

”بہت بہت شکریہ۔ میں بھی تمہیں نہیں بھول سکوں گا۔“

”اب میں ایک بات کہوں... مان لوگے؟“

”ضرور کہو۔“

”مالتی کو اپنا لینا۔ وہ بہت اچھی اور بہت معصوم لڑکی ہے۔“ لیلیٰ نے کہا۔

”لیلیٰ! یہ میں بھی جانتا ہوں لیکن...“

”میں سمجھ گئی کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میری اس سے بات ہوچکی ہے۔ وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے۔“

میں نے قریب کھڑی ہوئی مالتی کی طرف دیکھا۔ اس نے شرما کر اپنی گردن جھکالی۔

یارنی نے اس وقت اپنے آپ کو واقعی خطاوار محسوس کیا جب صبح سویرے اس کی بیوی پیٹریشیا اپنا اوورکوٹ لینے آئی اور اس نے الماری میں ایک دبلے پتلے لڑکے کو سوتا ہوا پایا۔ گو کہ وہ اسے رات کی واردات کی ناکامی کے بارے میں بتا چکا تھا کہ اس نے اپنے ساتھی مونٹی کے ساتھ مل کر زیورات کی دکان لوٹنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ صرف اس لیے ناکام ہوگیا کہ ان سے عقبی گلی کے مین ہول سے اسٹور کے تہ خانہ تک جانے والے سیوریج پائپ کا فاصلہ ناپنے میں غلطی ہوگئی اور وہ زیرزمین پائپ سے گزرتے ہوئے اسٹور کے بجائے ایک مُردہ خانے میں جانکلے جہاں وہ لڑکا ایک تابوت میں سو رہا تھا۔ وہ اس مردہ خانے میں چوکیداری کرتا تھا کیونکہ اس کے پاس سر چھپانے کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ بیوی سے طلاق کے فیصلے کے بعد وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا۔ اس کی اتنی استطاعت نہ تھی کہ وہ کرائے پر ایک چھوٹا سا کمرا بھی لے سکتا۔ اگر وہ ان کی مدد نہ کرتا تو شاید وہ خالی ہاتھ ہی واپس آتے۔

سفر کو یادگار بنا دینے والی محبت کی نشانی کا دلچسپ قصہ

تحفے ہر لحاظ سے قیمتی ہوتے ہیں... لیکن وہ تحفے جو پسندیدہ ہستی سے وابستہ ہوں... اس کا کوئی مول نہیں ہوتا... ماہ و سال کے گزرنے سے بھی اس کی افادیت کم نہیں ہوتی... زندگی کے جھمیلوں سے نبرد آزما شخص کا ماجرا... جو تحفہ دینا نہیں بھولا تھا۔

تحفہ

جمال دستی

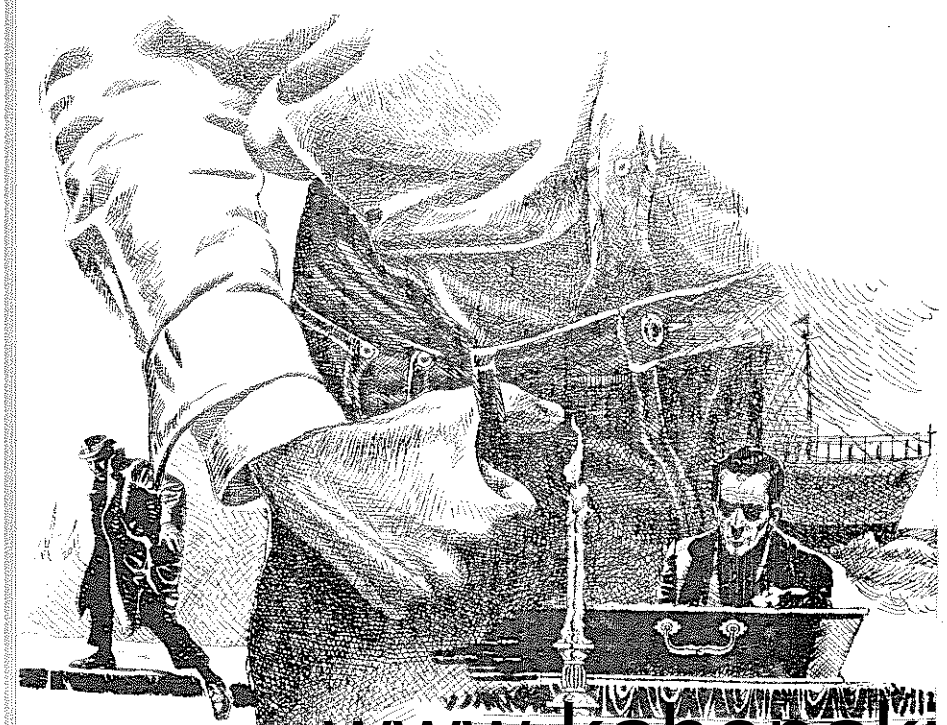

www.kahopakistan.com

''اس شخص نے ہمارے لیے اس شرط پر دفتر کا سیف کھولا کہ ہم نہ صرف لوٹ کے مال میں سے اسے حصہ دیں گے بلکہ اسے چوری کے طریقے بھی سکھائیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ ہمیں بیٹھے بٹھائے ایک شاگرد مل گیا۔'' یارنی نے فخریہ انداز میں کہا۔

''اسی لیے وہ ہماری الماری میں سو رہا ہے؟'' پیٹریشیا نے غصے سے کہا۔

''مردہ خانے کے مالک کو یہ بات معلوم نہیں کہ وہ وہیں چھپ کر سو جاتا ہے لیکن اب اس واردات کے بعد اس کے لیے کسی تابوت میں لیٹ کر سونا ممکن نہیں رہا، لہٰذا اسے ایک نئی جگہ کی ضرورت پیش آئی۔''

''اور اسے سونے کے لیے ہماری ہی الماری نظر آئی؟'' پیٹریشیا نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''پھر وہ کہاں جاتا؟ تم تو جانتی ہی ہو کہ یہ ایک بیڈروم کا فلیٹ ہے اور تمہارے نکھے بھتیجے نے لیونگ روم کے اکلوتے صوفے پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ معاف کرنا، میں اس کی شکایت نہیں کر رہا اور اس فلیٹ میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں یہ رہ سکے۔ ویسے بھی اسے تنگ جگہ میں سونے کی عادت ہے۔''

''تمہارا پارٹنر اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گیا؟'' اس کی بیوی نے جرح کی۔

''اس کے مالی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ آمدنی محدود ہے اور اس کا بڑا حصہ قرض خواہوں کو ادائیگی کرنے میں چلا جاتا ہے۔ اس نے مزید قرض حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے پاس اس کی ادائیگی کا کوئی پلان نہیں تھا۔ اسی لیے وہ ہر بار قرض خواہوں سے منہ چھپانے کے لیے گھر تبدیل کرتا رہتا ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ایک مستقل مہمان کو برداشت کرنا ہوگا۔ اب میں اپنے کپڑے کہاں لٹکاؤں گی؟''

''تم فکر نہ کرو۔ جیسے ہی اس کے پاس کچھ پیسے ہو گئے، وہ یہاں سے چلا جائے گا۔'' یارنی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

پیٹریشیا نے اپنے دونوں بازو سینے کے گرد مضبوطی سے باندھ رکھے تھے اور دائیں جوتے کی نوک سے کچن کے فرش پر مسلسل ٹھوکریں مار رہی تھی۔ یارنی جانتا تھا کہ وہ اس نئی صورتِ حال سے نمٹنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے پھر پیٹریشیا طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تم نے اس شخص کا دھاریوں والا سوٹ دیکھا ہے؟ اسے پہن کر وہ چوکیدار کے بجائے کوئی پرانے زمانے کا بدمعاش دکھائی دیتا ہے۔''

''اس نے یہ سوٹ پرانے کپڑوں کی دکان سے خریدا ہو گا۔ بیوی سے طلاق ملنے کے بعد اس کی ایسی حیثیت نہیں رہی کہ وہ کسی اچھی دکان سے خریداری کر سکے۔''

''مجھے تو اسے اس حالت میں دیکھ کر گھن آ رہی ہے۔'' وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔''

''دیکھو بے بی۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کچھ پیسے بچا کر رکھے ہیں اور سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ اس بار ہم اپنی شادی کی سالگرہ کسی جہاز پر منائیں۔ ویسے بھی ویلنٹائن ڈے قریب ہے، ہم کچھ دنوں کے لیے اس ماحول سے دور جا سکتے ہیں۔ سب کچھ بھول جاؤ اور سارے مسئلے یہیں چھوڑ دو۔''

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس پروگرام پر عمل ہو سکے گا یا نہیں لیکن پیٹریشیا یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑی۔ اس نے ایسے کئی جہازوں کے بارے میں پڑھا تھا جو جوڑوں کو سیر و تفریح کے لیے لے جاتے ہیں۔ وہ یہی سوچتی تھی کہ وہ لوگ ان اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن صرف تین ماہ بعد وہ یارنی کے ساتھ ایک چھوٹے سے بحری جہاز میں سفر کر رہی تھی۔ ابھی ان کے سفر کو دو دن ہی گزرے تھے کہ ایک نئی اور غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ یارنی اپنے کیبن سے باہر نکلا ہی تھا کہ اس کی نظر ایک شخص پر پڑی اور وہ بے اختیار بول اٹھا۔ ''مونٹی!''

اس شخص نے مڑ کر دیکھا تو یارنی بولا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

مونٹی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''یہ میرا نام نہیں ہے۔''

''پھر تم کون ہو؟''

''فی الحال میں کوئی اور نام استعمال کر رہا ہوں۔''

کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پیٹریشیا نے ان کی باتوں کی آواز سنی تو اندر سے چلّاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے کچھ کہا؟''

''لگتا ہے کہ اس عورت کے اندر کوئی ریڈار نصب ہے۔ کسی وقت پیچھا نہیں چھوڑتی۔'' یارنی بڑبڑایا۔

اس پیشے میں رہ کر اسے جھوٹ بولنے میں مہارت ہو گئی تھی اور جب بھی وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا تو اسی جھوٹ کے سہارے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کرتا۔ چنانچہ اس وقت بھی اس نے اسی ہتھیار کا سہارا لیا اور کیبن کی طرف منہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں.... اسٹیوارڈ سے باتیں کر رہا ہوں۔ اسے بتا رہا تھا کہ وہ کتنا اچھا کام کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اس سے کہہ دینا کہ ہماری غیر موجودگی میں جب وہ کیبن کی صفائی کرنے آئے تو بیڈ پر پڑی میری نائٹی کو ہاتھ نہ لگائے۔ تم جانتے ہو نا کہ میں اپنی ذاتی اشیا کے بارے میں کتنی حساس ہوں۔''

یارنی نے اپنی عادت کے خلاف سر ہلا دیا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں اس سے کہہ دیتا ہوں۔''

پھر اس نے آہستہ سے کیبن کا دروازہ بند کیا اور مونٹی سے سرگوشی کے انداز میں مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں کئی ماہ پہلے بتا دیا تھا کہ فروری میں چند دنوں کے لیے کام سے دور رہوں گا تاکہ فیملی کے ساتھ کچھ وقت گزار سکوں۔ اگر میری بیوی نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو وہ یہی سمجھے گی کہ جہاز کی سیر تو ایک بہانہ ہے اور ہم یہاں کسی کام کے سلسلے میں آئے ہیں اور پھر اسے ہمارا شاگرد بھی یاد آ جائے گا۔ تم ہی سوچو کہ میری پوزیشن کتنی خراب ہو جائے گی۔''

''بہتر ہوگا کہ اسے میری موجودگی کے بارے میں کچھ نہ بتاؤ۔'' مونٹی نے اپنی طرف سے بہت سوچ سمجھ کر مشورہ دیا۔

''میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن تمہیں بھی اس کی نظروں سے دور رہنا ہوگا۔''

مونٹی نے اس طرح ظاہر کیا جیسے وہ اس کے مشورے پر غور کر رہا ہے پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں یہ کام خود ہی کر لوں گا۔''

''کیسا کام؟'' یارنی حیرت سے بولا۔

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ گزشتہ رات کپتان نے جو خیر مقدمی پارٹی دی تھی، اس میں خواتین نے کتنے قیمتی زیورات پہن رکھے تھے؟''

''دیکھو، میں یہاں اپنی شادی کی سالگرہ منانے آیا ہوں اور میرا ارادہ کسی دوسرے کام میں ہاتھ ڈالنے کا نہیں ہے۔''

''میں کچھ زیورات چرانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' مونٹی اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ تمہیں لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر خود ہی یہ کام کرنا ہوگا۔''

''یہ مت بھولو کہ تم میرے پارٹنر ہو۔'' وہ ہال وے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بولا۔ ''تم ہمارے شاگرد کو کہاں چھوڑ آئے؟''

''وہ فلیٹ پر ہی ہے۔ میں نے اس کی ذمے داری لگائی ہے کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں پودوں کو پانی دیتا رہے۔ خاص طور پر اس پودے کو جو میں نے پیٹریشیا کو کرسمس پر دیا تھا۔''

''کیا واقعی تم نے کرسمس کے موقع پر اپنی بیوی کو وہ پودا دیا تھا؟''

''ہاں، میں ایک گاہک کی طرح پھولوں کی دکان میں

علاج

ایک صاحب اپنی بیگم کے چہیتے کتے کے رات کو بھونکنے سے سخت عاجز تھے کہ ان کی نیند خراب ہوتی تھی۔ ایک رات انہوں نے کتے کو خواب آور گولی کھلا دی۔ لیکن پھر بھی وہ بھونکتا رہا۔ اگلی رات دو گولیاں کھلائیں تب بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تیسری رات انہوں نے دس گولیاں کھلانے کا پروگرام بنایا۔

بیوی کو علم ہوا تو اس نے چپکے سے ان کی چائے میں خواب آور گولی ملا دی اور وہ رات بھر مزے سے سوتے رہے۔ صبح اٹھے تو بہت خوش تھے کہ گزشتہ دو راتوں کی گولیوں نے کتے پر اثر دکھایا اور وہ رات کو بھونکا نہیں۔

کراچی سے کنزیٰ یونس کا تعاون

گیا اور جائزہ لے رہا تھا کہ وہ لوگ اپنا کیش کہاں رکھتے ہیں پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ یہ تو کرسمس کی شام ہے اور میں نے ابھی تک پیٹریشیا کے لیے کسی تحفے کا بندوبست نہیں کیا۔ بس یوں سمجھ لو کہ آخری منٹوں میں یہ کام ہو گیا۔''

''واقعی تم بڑے خوش قسمت ہو۔'' مونٹی نے اسے رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں اگر دکان کا مالک کیش رجسٹر کی طرف متوجہ نہ ہوتا تو مجھے اس پودے کو باہر لانے میں مشکل پیش آ سکتی تھی کیونکہ اسے کوٹ میں تو نہیں چھپایا جا سکتا تھا۔''

وہ دونوں کافی دیر تک پودوں کی مختلف اقسام کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر اچانک یارنی کو کچھ یاد آ گیا۔ اس نے مونٹی سے کہا۔ ''تم نے مجھ سے یہ کیوں پوچھا کہ وہ لڑکا کہاں ہے؟''

مونٹی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا پھر جیسے اس کا ارادہ بدل گیا اور اس نے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔ ''بس یونہی پوچھ لیا تھا۔''

یارنی ابھی اس جواب پر غور کر ہی رہا تھا کہ مونٹی مڑا اور تیزی سے راہداری میں چلتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یارنی چند لمحوں تک کھڑا خالی کوریڈور کو دیکھتا رہا پھر مخالف سمت میں چلتے ہوئے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ لفٹ میں اوپر جاتے ہوئے بھی اس کا ذہن اپنے پارٹنر کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا تو وہ بھی باہر آ کر وہاں موجود تفریح

www.kahopakistan.com

کے لیے آنے والے ہجوم میں شامل ہوگیا۔

اس رات کھانے پر یارنی اور اس کی بیوی تین دوسرے جوڑوں کے ساتھ ایک بڑی سی گول میز کے گرد بیٹھے تھے۔ وہاں سے یارنی کپتان کی میز کا منظر واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اسے چھت سے لٹکے کپتان کی میز پر موجود فانوس کی روشنی میں ایک ہیروں کا نیکلس جگمگاتا ہوا نظر آرہا تھا جو سفید بالوں والی ایک خاتون کے گلے کی زینت بنا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ مونٹی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ واقعی کسی چور کے لیے اس سے اچھا ماحول اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بہت ہی بُرا ہوا کہ وہ اس وقت چھٹی پر تھا اور پیٹر یشیا نے اسے منع کیا تھا کہ وہ ایک ہفتے تک اپنے آپ کو ان سرگرمیوں سے دور رکھے۔

یارنی سوچنے لگا کہ مونٹی کہاں بیٹھ کر اپنے شکار کا جائزہ لے رہا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا لیکن اسے مونٹی کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ یارنی نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی اور بیوی کو میز پر موجود دوسرے جوڑوں سے باتوں میں مصروف رہنے دیا۔ اسے اجنبیوں سے گھلنے ملنے میں ہمیشہ پریشانی ہوتی تھی حالانکہ اس نے ایک نفسیاتی معالج سے اپنا معائنہ بھی کروایا تھا لیکن اس کی کوئی خاص وجہ معلوم نہ ہوسکی۔ اس کے برعکس اپنے ہم پیشہ لوگوں سے مل کر اسے ہمیشہ راحت ملتی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر وہ پیشہ ورانہ امور پر گفتگو کرتا۔ اس دوران میں معلومات کا تبادلہ بھی ہوتا مثلاً کس اسٹور میں کیا حفاظتی انتظامات ہیں اور وہاں بالکونی کی طرف سے کس حد تک بے پروائی یا بے احتیاطی ہوتی ہے۔ ایک واردات کے نتیجے میں کتنی آمدنی متوقع ہے اور پکڑے جانے کی صورت میں کتنی سزا ہوسکتی ہے۔ اس طرح کی باتیں اجنبی لوگوں سے نہیں کی جاسکتی تھیں۔ نہ ہی وہ دوسرے پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو یہ بتا سکتا تھا کہ وہ ایک پیشہ ور چور ہے۔ ایسی صورت میں وہ اسے اپنے ساتھ بٹھانا بھی گوارا نہ کرتے بلکہ عین ممکن تھا کہ اسے پولیس کے حوالے کردیتے۔

سویٹ ڈش پیش ہونے سے پہلے یارنی کی نظریں ایک بار پھر کپتان کی میز کی جانب اٹھ گئیں۔ وہاں سے وہ بالکل گملے میں رکھے ہوئے پودے کی طرح معلوم ہورہی تھی جس پر لاتعداد چھوٹے چھوٹے سفید پھول کھلے ہوئے ہوں۔ اسے دیکھ کر یارنی کو وہ پودا یاد آگیا جو اس نے کرسمس کے موقع پر اپنی بیوی کو گفٹ کیا تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر پیٹر یشیا کی توجہ اس جانب مبذول نہیں کرائی بلکہ وہ اس کی جانب جھکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''میں واش روم جارہا ہوں۔''

مردانہ بیت الخلا میں اس کے برابر میں ایک شخص کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ منہ ہی منہ میں بولا۔ ''کیا تم نے اسے دیکھا؟''

''کس کی بات کررہے ہو؟'' یارنی نے گردن موڑے بغیر سوال کیا۔

''اسی دبلے پتلے شخص کو جسے تم پودوں کو پانی دینے کے لیے گھر پر چھوڑ کر آئے تھے۔'' مونٹی نے جواب دیا۔

یارنی نے گردن گھما کر پیچھے کی جانب دیکھا۔ وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

''تم کس کے بارے میں کہہ رہے ہو؟''

''میرا خیال تھا کہ تم نے اسے اپنی دائیں جانب بیٹھے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔''

''کب؟'' یارنی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ڈنر کے دوران۔''

''اس وقت تم کہاں تھے؟'' یارنی نے الٹا اس سے سوال کردیا۔

''میری بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ کیا وہ وہی تھا؟''

''اگر تم ہمارے شاگرد کی بات کررہے ہو تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔'' یارنی نے جواب دیا۔ ''اسے تو میرے فلیٹ پر ہونا چاہیے جہاں وہ پودوں کو پانی دینے کے ساتھ ساتھ مُردہ خانے میں صبح کی شفٹ میں کام بھی کررہا ہوگا۔''

''میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس جہاز پر اس کی کئی بار جھلک دیکھی ہے لیکن جب کبھی میں نے اس سے قریب ہونا چاہا، وہ چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا اور میں اسے کہیں نہیں تلاش کرسکا۔''

''کیا تم نے کبھی چشمہ لگانے کے بارے میں سوچا ہے؟''

مونٹی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یارنی سمجھا کہ اسے یہ بات بُری لگی ہے حالانکہ اس نے ہرگز کوئی طنز نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کا مطلب یہ تھا کہ بڑھتی ہوئی عمر کے سبب مونٹی کی بینائی متاثر ہورہی ہے اور اسے چشمہ لگانے کے لیے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ اس نے تو بس یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔ یارنی نے چند سیکنڈ اس کے جواب کا انتظار کیا پھر جب بائیں جانب مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔

یارنی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈائننگ روم میں واپس آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے کپتان کی میز پر نظر ڈالی۔ وہاں سے وہ چھوٹا سا گملا غائب ہوچکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرتا، اس کی بیوی نے مداخلت کی اور بولی۔ ''کیا تمہیں کوئی بُو آرہی ہے؟''

اس نے تنتھنے سکیڑ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور بولا۔ ''کیسی بُو؟''

''کسی ترش پھل جیسی۔ اس بُو کو محسوس کرکے مجھے اپنے گھر کی یاد آرہی ہے۔''

یارنی کو اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بات بدلنا چاہ رہا تھا کہ برابر میں بیٹھی ہوئی عورت بول اٹھی۔ ''یہ لوگ ائر کنڈیشننگ سسٹم میں ایک مخصوص قسم کا اسپرے کرتے ہیں تاکہ ماحول میں تازگی کا احساس رہے۔''

''اوہ ہاں، شاید یہی بات ہے۔'' یارنی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

اگلے دو دن تک یارنی ناشتے، لنچ اور ڈنر کے دوران کپتان کی میز کا جائزہ لیتا رہا لیکن وہ چھوٹا سا گملا اسے دوبارہ نظر نہیں آیا۔ یارنی نے خاص طور پر یہ بات نوٹ کی تھی کہ کپتان کے ساتھ بیٹھنے والے مہمان تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ لگتا تھا کہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ مہمان بدلتے رہتے تھے۔ زیادہ تر ایسے مہمانوں کو یہ اعزاز حاصل ہوتا جو صاحبِ حیثیت ہوں اور جنہوں نے جہاز میں اونچے درجے کا ٹکٹ لیا ہو۔ ایک طرح سے یہ انتظام یارنی کے حق میں بہتر تھا کیونکہ وہ گمنام رہنا پسند کرتا تھا۔ بہرحال اس دوران میں وہ دوسری میزوں کا بھی جائزہ لیتا رہا کہ شاید کہیں وہ گملا نظر آجائے۔

ہفتے کے بقیہ دنوں کے دوران کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ چھٹے روز وہ شام کے وقت کیسینو میں بیٹھا اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلا رہا تھا کہ اسے ایک عورت کے چلّانے کی آواز آئی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ عورت کہہ رہی تھی۔ ''میرے ہیرے گم ہوگئے۔''

یارنی کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ وحشت کے عالم میں اپنی کرسی سے اٹھا اور تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس معاملے سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اس قسم کی واردات میں اپنے آپ کو بے گناہ جانا۔ اس نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ اب وہاں ایک طویل قامت ہیرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ یارنی کو اس طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کا فن خوب آتا تھا۔ وہ تیزی سے بائیں جانب گھوما اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا مجمع کی پشت پر آگیا۔ اس نے وہاں سے جھانک کر دیکھا۔ ایک خوش پوش آدمی جس کا تعلق جہاز کے حفاظتی عملے سے تھا، اس عورت کی جانب متوجہ ہوچکا تھا۔ وہ عورت اب خاموش ہوچکی تھی اور اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے گرد کھڑے ہوئے لوگ قہقہے لگا رہے تھے اور مختلف موضوعات پر تبصرے کررہے تھے پھر آہستہ آہستہ مجمع چھٹنا شروع ہوگیا۔ بیرونی دروازے پر کھڑا ہوا ہیرا ابھی پُرسکون ہوگیا تھا پھر اس نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور دوسرے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

ہیرے کے وہاں سے ہٹ جانے پر یارنی نے بھی سکون کا سانس لیا اور سوچنے لگا کہ آئندہ اسے مزید احتیاط سے کام لینا ہوگا پھر اس نے خود کو یاد دلایا کہ فی الحال وہ کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث نہیں ہے اور نہ ہی چھٹیوں کے دوران میں اس کا ایسا کچھ کرنے کا کوئی ارادہ ہے پھر اسے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ بہرحال اسے یہ تجسس ضرور تھا کہ اگر کچھ نہیں ہوا تو وہ عورت چلّائی کیوں تھی اور یہ سارا تماشا کیوں ہوا تھا؟ اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے بوڑھے کے کندھے پر ہاتھ رکھا جو ایک چھڑی کے سہارے راستہ روکے کھڑا تھا اور اس سے پوچھا۔ ''کیا ہوا، یہ عورت کیوں شور مچا رہی تھی؟''

''کچھ نہیں۔'' اس بوڑھے نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ عورت سمجھ رہی تھی کہ کسی نے اس کے ہیرے چرا لیے ہیں۔''

''کیا ایسا نہیں ہوا؟''

''نہیں، اس کے نیکلس کا ہک ٹوٹ گیا تھا لیکن گرتے وقت اس کا ایک ہیرا بلاؤز میں پھنس گیا اور وہ کرنے سے بچ گیا..... شاید اس عورت کی نظر کمزور ہے جو وہ انہیں نہ دیکھ سکی اور شور مچا دیا۔''

''خوش قسمت تھی ورنہ ہیروں سے واقعی ہاتھ دھو بیٹھتی۔''

بوڑھا تنتھنے پھُلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس نے میرے کان کے پردے پھاڑ دیے۔''

''جس انداز میں وہ چلّائی تھی، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ ہیرے اصلی ہیں۔''

''ہمیں اس سے کیا؟ وہ ہیرے اصلی ہوں یا نقلی۔'' وہ بوڑھا ایک بار پھر تنتھنے پھُلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔'' یارنی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''لیکن اس جہاز پر ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں ان ہیروں سے دلچسپی ہو

www.kahopakistan.com

سکتی ہے۔''

اچانک ہی اسے ماحول میں گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ اسے تازہ ہوا کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر مڑا اور بوڑھے کو ایک طرف کرتے ہوئے دروازے سے باہر آ گیا۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم بالائی عرشے کی جانب اٹھ گئے۔ اسے احساس ہوا کہ مشروب کا گلاس ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک لائف بوٹ کے قریب رک گیا اور عرشے پر لگے جنگلے پر جھک کر اس نے بقیہ مشروب اپنے حلق میں انڈیل لیا۔

گہرے بادلوں سے پورا چاند نمودار ہوا تو سمندر کی لہریں اس کی روشنی سے منور ہو گئیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ماحول کو سرد کر دیا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ بائیں جانب والی لائف بوٹ پر گئی جس پر پڑی ترپال کا ایک کونہ اوپر اٹھ رہا تھا پھر اس کے کانوں میں ایک سرگوشی سنائی دی۔

''ہائے۔''

یارنی نے وہ آواز پہچان لی لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

''یہاں کوئی اور تو نہیں ہے؟'' دوسری سرگوشی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''نہیں، صرف میں ہی ہوں۔'' یارنی بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''اچھی بات ہے۔'' ترپال ہٹ گئی اور اس میں سے مونٹی کا اوپری دھڑ برآمد ہوا۔ ''اِدھر اُدھر دیکھتے رہو۔ میں باہر آ رہا ہوں۔''

یارنی نے ایک قدم آگے بڑھایا اور دور تک نگاہ دوڑائی۔ مونٹی اور قریب آ گیا اور اس نے اپنی کہنیاں جنگلے پر ٹکا دیں۔

''پتا نہیں، تم نے مجھے کس طرح ڈھونڈ لیا لیکن تمہارے لیے یہ بہت ہی مناسب وقت ہے۔''

''تمہارے ذہن میں جو بھی منصوبہ پل رہا ہے، میں اس کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔'' یارنی نے بیزاری سے کہا۔

مونٹی نے اپنی جیکٹ سے ایک رسّی نکالی اور اسے کھولنے لگا۔ ''مجھے تمہاری تھوڑی سی مدد کی ضرورت ہوگی۔''

''بھول جاؤ کہ میں اس جہاز پر تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں۔''

''صرف پانچ منٹ کے لیے۔'' مونٹی نے اصرار کیا۔

''قیامت آ رہی ہے، تب بھی نہیں۔''

مونٹی نے رسّی کا ایک سرا جنگلے سے باندھا اور دوسرے سرے پر پھندا بنانے لگا اور بولا۔

''تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ اگر میں قرض خواہوں کو ادائیگی کرنے کے لیے فوری طور پر رقم کا انتظام نہ کر سکا تو تمہارے گھر میں ایک اور مہمان کا اضافہ ہو جائے گا۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔'' یارنی اسے چڑانے کے لیے بولا۔ ''اس گھر میں تمہارے سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ صوفے پر میری بیوی کے بھتیجے نے قبضہ جما رکھا ہے جبکہ الماری تمہارے شاگرد کے استعمال میں ہے۔''

''ان باتوں کو بھول جاؤ۔ تمہیں میری وہاں موجودگی کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ میری ضرورتیں بڑی محدود ہیں۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ شام کو گھر آؤں تو بتیاں جل رہی ہوں اور ٹی وی کی آواز اونچی نہ ہو۔ ایک بات اور بتا دوں کہ مجھے کبھی کبھی سوتے میں چلنے کی عادت ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تمہارا گھر زیادہ بڑا نہیں ہے۔ اس لیے میں زیادہ دور نہیں جا سکتا۔''

''یہ تو سراسر بلیک میلنگ ہے۔'' یارنی نے غصے سے کہا۔

''کچھ بھی سمجھ لو لیکن تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' مونٹی نے جواب دیا۔ ''تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اس رسّی کے ذریعے دو منزل نیچے واقع برآمدے تک جاؤ گے اور کھلے دروازے سے کیبن میں داخل ہو کر وہ ہیرے چرا لو گے۔ ممکن ہے کہ کچھ نقد رقم بھی ہاتھ آ جائے۔ پھر تم اسی رسّی کے ذریعے واپس آ ؤ گے۔ اس کام میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگ سکتے ہیں۔''

''لیکن تم نے تو پانچ منٹ کا کہا تھا؟''

''ہاں، کہا تو تھا لیکن پانچ منٹ اضافی رکھ لو۔ ممکن ہے کہ ہیروں کو ڈھونڈنے میں کچھ وقت لگ جائے۔''

''تم خود کیوں نہیں چلے جاتے؟'' یارنی نے سوال کیا۔

مونٹی اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ میں تم سے زیادہ وزنی ہوں اور تم مجھے اوپر نہیں کھینچ سکو گے۔ اب تم اپنا پاؤں اس پھندے میں ڈالو اور رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ یقین کرو اگر تم نے یہ کارنامہ انجام دے لیا تو پیٹریشیا تمہاری بہت شکر گزار ہوگی۔''

یارنی نے سوچا کہ یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اگر مونٹی کو ہیرے نہیں ملے تو وہ قرض خواہوں سے چھپنے کی خاطر اس کے گھر میں پڑاؤ ڈال دے گا۔ اس مصیبت سے نجات پانے کا واحد حل یہی تھا کہ اس کی مدد کی جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی ایک ٹانگ جنگلے سے باہر نکالی اور اپنا پاؤں مضبوطی سے پھندے میں رکھ دیا پھر اس نے رسّی پکڑی اور دوسری ٹانگ بھی پھندے میں ڈال دی اور بولا۔ ''بہتر ہے کہ پیٹریشیا کو اس کی خبر نہ ہو۔''

مونٹی نے آہستہ آہستہ رسّی کو ڈھیلا کرنا شروع کیا اور بولا۔ ''نیچے مت دیکھنا۔''

رسّی کے آخری سرے پر جھولتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بالکل کسی پرانے وال کلاک کے پینڈولم کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ تب اسے خیال آیا کہ مشروب کا خالی گلاس ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے ذہن میں سمندر سے متعلق کئی کہانیاں گردش کرنے لگیں اور وہ خود کو نیچے دیکھنے سے باز نہ رکھ سکا۔ جہاز کے عقبی حصے میں لگے ہوئے قوی ہیکل پنکھوں کے چلنے سے سمندر کی لہروں میں جھاگ بن رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ گر پڑا تو اس پنکھے کی لپیٹ میں آ کر اس کا قیمہ بن جائے گا جسے شارک مچھلیاں مزے لے لے کر کھائیں گی۔ اس نے ڈر کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند سیکنڈ بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں کسی ٹھوس سطح پر رک گئے ہیں۔

اس نے دائیں آنکھ کھول کر دیکھا تو اپنے آپ کو ایک مہنگے کیبن کے بیرونی برآمدے پر کھڑا پایا۔ اس کے گھٹنے بُری طرح برآمدے کی ریلنگ سے ٹکرائے تھے اور اگر اس نے رسی کو مضبوطی سے نہ پکڑا ہوتا تو یہی جھٹکا اسے سمندر میں گرا دینے کے لیے کافی تھا۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہوتا جس کا کوئی گواہ نہیں تھا اور پیٹریشیا کبھی نہ جان پاتی کہ اس کا شوہر کھلے سمندر میں کہاں غائب ہو گیا۔

وہ دو منٹ تک اسی پوزیشن میں کھڑا گہری گہری سانس لیتا رہا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ رسّی کے بجائے سیڑھیوں سے اوپر جائے گا۔ گو کہ اس طرح پکڑے جانے کا ڈر تھا لیکن وہ دوبارہ اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے اپنے پیر پھندے سے باہر نکالے اور کیبن کے دروازے میں لگے ہوئے ہینڈل کو گھمایا۔ وہ آسانی سے کھل گیا۔ اس نے شیشے سے اپنے کان لگائے۔ اندر سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی، گویا کیبن کے مکین گہری نیند سو رہے تھے۔

اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ بند کیبن میں بھی ائرکنڈیشنر سے آنے والی مخصوص بُو پھیلی ہوئی تھی جس پر سنگترے کا گمان ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ بُو کہیں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور کیبن کا جائزہ لینے لگا۔ کیبن ..... کے شیشوں سے آنے والی چاند کی روشنی میں وہ یہاں موجود بڑی بڑی چیزوں کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ وہاں ایک کنگ سائز بیڈ ..... ٹی وی، دیوار کے ساتھ رکھی میز اور دیوار گیر درازیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ بستر پر چادر میں لپٹے ہوئے دو افراد لیٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک گہری گہری سانسیں لے رہا تھا جبکہ دوسرے کے خراٹے کیبن میں گونج رہے تھے۔ پھر اچانک ہی اس نے کروٹ لی اور خراٹوں کی آواز آنا بند ہو گئی۔

یارنی فوراً ہی آڑ میں ہو گیا اور اس نے یہی بہتر سمجھا کہ عارضی طور پر دیوار کے ساتھ لگی میز کے نیچے چھپ جائے۔ اس نے اپنی لمبی ٹانگیں پھیلائیں اور اپنے آپ کو آگے کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا، وہ کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہاں بھی وہ گملے میں لگا ہوا پودا موجود تھا۔ اس نے غصے میں آ کر اس کے سفید پھول نوچنا شروع کر دیے۔ اچانک ہی اس کی نظر ایک لمبوترے سفید چہرے پر گئی۔ وہ چونکتے ہوئے بولا۔

''تم...؟''

''شش۔'' سفید چہرے نے سرگوشی کی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' یارنی نے بھی اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو تمہیں پیٹریشیا کے پودے کی دیکھ بھال کے لیے گھر پر چھوڑ کر آئے تھے کہ کہیں وہ مرجھا نہ جائے۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں اسے اپنے ساتھ ہی لے آیا ہوں۔'' اس نے پودے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم جہاز پر کس طرح سوار ہوئے؟''

''میں نے اپنے آپ کو فلاور شاپ کا نمائندہ ظاہر کر کے گارڈ سے کہا کہ میری وین پارکنگ میں کھڑی ہے اور میں یہ پودا دے کر واپس آتا ہوں۔''

''لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''میں تم دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ تمہارا بھتیجا مجھے تنگ کرے گا۔ اس لیے یہاں آ گیا۔''

''یہاں تم اس گملے کے ساتھ کسی دوسرے کے کیبن میں اس میز کے نیچے چھپے ہوئے کیا کر رہے ہو؟''

''میں کسی طرح اس عورت کے کیبن کی چابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اب اس کے زیور چرانے آیا ہوں۔''

یارنی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بیڈ کے چرچرانے کی آواز آئی۔ لگتا تھا کہ کسی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی لڑکے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوئی بستر سے اتر کر باتھ روم کی طرف جا رہا تھا۔

''ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' یارنی نے سرگوشی کی۔

www.kahopakistan.com

''ٹھیک ہے۔ میں پہلے ہی زیور اپنی جیب میں رکھ چکا ہوں۔''

یارنی میز کے نیچے سے باہر نکلا اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا کیبن کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے احتیاط سے ہینڈل گھمایا اور راہداری میں آ گیا۔ لڑکا اس کے پیچھے تھا۔ یارنی نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور کیبن کی دیوار سے پشت لگا کر زور زور سے سانس لینے لگا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' لڑکے نے معصومیت سے پوچھا۔

''اب تم وہیں واپس جاؤ جہاں چھپے ہوئے تھے۔ میں گھر پہنچنے سے پہلے تمہارا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ اور تم اپنی جیولری سمیت میرے گھر سے چلے جانا۔'' یارنی نے ایک لمحے توقف کیا اور بولا۔ ''لیکن تمہیں اس میں سے ایک حصہ موئی کو دینا ہوگا۔ بے شک اسے ادھار سمجھ لینا۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ خود ان زیورات کو چوری کرنے کی کوشش میں تھا اگر اسے رقم نہ ملی تو وہ قرض خواہوں کو ادائیگی نہیں کر پائے گا اور میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا۔''

لڑکے نے اپنے خالی ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ یارنی کو کچھ خیال آیا تو وہ بولا۔ ''وہ پودا کہاں ہے؟''

''وہ تو میں میز کے نیچے ہی چھوڑ آیا۔''

''واپس جاؤ اور وہ پودا لے کر آؤ۔''

''یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ میں نے کیبن کی چابی دراز پر رکھ دی تھی۔ اس کے بغیر دروازہ نہیں کھل سکتا۔''

یارنی کا خون کھول اٹھا۔ وہ پودا اس کے لیے بہت اہم تھا جو اس نے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر کرسمس کے موقع پر بیوی کو گفٹ کیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی پر تشدد کے بارے میں سوچا، گو کہ یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ جب اس کی بڑبڑاہٹ ختم ہوئی اور وہ تین چار بار سانس لے چکا تو اس کا غصہ کچھ کم ہوا۔ وہ مسکرایا اور لڑکے کی گردن میں اس طرح بازو ڈال دیا جیسے وہ دونوں بہترین دوست ہوں۔ لڑکے نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن یارنی کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

''تمہاری جان بخشی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب تم وہ پودا لے کر آؤ، ورنہ میں تمہیں زیورات سمیت کپتان کے حوالے کر دوں گا۔ اندر جانے کا راستہ میں بتا دیتا ہوں۔''

لڑکا اس کی دھمکی سن کر ڈر گیا اور بولا۔ ''میں تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔''

''تم سب سے پہلے عرشے کے اوپری حصہ پر جاؤ گے۔ وہاں تمہیں موئی ملے گا۔ اس نے جنگلے کے ساتھ رسی لٹکا رکھی ہے۔ تم اس رسی کے ذریعے نیچے آؤ گے تو سیدھے اس کیبن تک پہنچ جاؤ گے۔ اس طرف کا دروازہ لاک نہیں ہوتا۔ تم کیبن میں جا کر وہ پودا اٹھانا اور میرے گھر پہنچا دینا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن میں موئی سے کیا کہوں گا؟''

''اسے مختصر لفظوں میں ساری بات بتا دینا۔ مجھے یقین ہے کہ زیورات کے لالچ میں وہ تمہاری مدد کرنے پر تیار ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے تم نے جو کہا ہے میں ویسا ہی کروں گا۔''

''مجھے امید ہے کہ تم کوئی حماقت نہیں کرو گے ورنہ اس کا انجام تم جانتے ہو۔'' یارنی نے آہستہ سے اس کی گردن پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور اسے سیڑھیوں کی طرف دھکیل دیا۔ اسے امید تھی کہ کسی رکاوٹ کے بغیر اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ اسے اس کی الماری اور پرسکون زندگی واپس مل جائے۔

وہ راہداری میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے پھر خیال آیا کہ اس جہاز پر یہ ان کی آخری رات ہے۔ وہ ان لمحات کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے کیبن کی طرف قدم بڑھا دیے۔ سفر کی آخری رات کو وہ پیٹریشیا کے ساتھ یادگار انداز میں منانا چاہتا تھا۔ پھر انہیں رات میں ہی اپنی پیکنگ بھی کرنا تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ صبح ہوتے ہی زیورات چوری ہونے کا ہنگامہ کھڑا ہوگا۔ وہ اس شور شرابے سے پہلے ہی جہاز سے نکل جانا چاہتا تھا۔ پھر اس نے اس گلاس کے بارے میں سوچا جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے وہ گلاس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ آخر اس یادگار سفر کی کوئی نشانی تو اس کے پاس ہونی چاہیے تھی۔

اسے پورا یقین تھا کہ وہ لڑکا اوپری عرشے پر جا کر جونہی موئی کو پورا سچ بتائے گا تو موئی وقت ضائع کیے بغیر اس سے زیورات چھین کر اسے بے رحم سمندر میں پھینک دے گا جہاں جہاز کے پنکھے اس کے جسم کا قیمہ بنا دیں گے۔ لڑکے کے جہاز پر آنے کا کوئی ریکارڈ تھا نہ غائب ہونے پر ہنگامہ ہوتا۔ واپسی پر پیٹریشیا کو اپنے کپڑے لٹکانے کے لیے الماری خالی ملتی، موئی زیورات بیچ کر خوش حال ہو جاتا۔ قرضے اتارنے کے بعد اس کے فلیٹ میں نزول کا کوئی خطرہ باقی نہ رہتا... رہا وہ ایک پودے کا تحفہ جو اس کی محبت کی نشانی تھا تو وہ اپنی بیوی کے لیے اس سے بہتر کوئی اور پودا خرید سکتا تھا۔

رقیب

میر محمد بلوچ

مسائل کو سمجھنے اور درست فیصلے کرنے کی صلاحیت وقت کے ساتھ پروان چڑھتی ہے... ناتجربہ کاری... لاابالی پن اور جلدبازی... عمر کے اس خاص وقت کو جس میں جذبات کی طغیانی عروج پر ہوتی ہے... داغدار بنا دیتی ہے... ایسے ہی چند کرداروں کے گرد گھومتی حساس و پرتجسس کہانی جس کے کردار اپنی اپنی جگہ الجھن کا شکار تھے...

اس لڑکی کی ایثار پسندی جس کی محبت اور زندگی دونوں داؤ پر لگی تھیں

''تم نے میری بیٹی کو دیکھا ہے؟''

کیوبک نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ ٹروسیلا کی بیٹی کو نہیں جانتا تھا بلکہ اس سے پہلے ان دونوں کے درمیان کبھی اس موضوع پر گفتگو بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ تھوڑا سا حیران ضرور ہوا کہ ٹروسیلا کو اچانک ہی اپنی بیٹی کا تذکرہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔

''امبر میری سب سے بڑی بیٹی ہے۔'' یہ کہہ کر ٹروسیلا نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا اور کیوبک کو پکڑا دیا۔ اس میں ایک نوجوان لڑکی کی تصویر تھی جو لان میں کھڑی پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس نے جینز اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نوعمری کے رنگ بکھرے ہوئے تھے اور منہ قہقہہ لگانے کے انداز میں کھلا ہوا تھا۔

www.kahopakistan.com

کیوبک نے تصویر پر ایک نظر ڈالنے کے بعد پرس اپنی بیوی ڈینس کو تھما دیا جو اس کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے غور سے تصویر دیکھی اور پرس ٹروسیلا کو واپس کر دیا۔

''امبر سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہے اور وہ اپنے تعلیمی اخراجات خود ہی برداشت کرتی ہے۔ میں صرف اسے معمولی سا جیب خرچ دیتا ہوں۔'' ٹروسیلا نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ وہ بھاری بھرکم جسامت کا مالک تھا اور اس کی ٹوپی کے نیچے کنپٹیوں کے آس پاس سفید بال جھلک رہے تھے۔ وہ عمر میں کیوبک سے ایک یا دو سال بڑا ہوگا۔ وہ کسی زمانے میں شوقیہ باکسر رہ چکا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ پستہ قد ہونے کی وجہ سے وہ اسے پروفیشن نہ بنا سکا تاہم وہ اب بھی باقاعدگی سے جمنازیم جاتا تھا۔ اس کی رہائش جنوبی علاقے سیسرو میں تھی جہاں وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا اور پارک ٹاور میں شام چار بجے سے رات بارہ بجے تک سیکیورٹی ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔ پچھلے کئی روز سے وہ ڈینس سے کیوبک کے بارے میں پوچھ چکا تھا کیونکہ کیوبک آمدورفت کے لیے عام طور پر عمارت کا مرکزی دروازہ استعمال نہیں کرتا تھا بلکہ اسے گیراج کی طرف سے آنے میں سہولت ہوتی تھی۔ اس طرح وہ لفٹ سے اتر کر سیدھا اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہو جاتا تھا۔ ڈینس کا اصرار تھا کہ کیوبک اسے فون کر کے اپارٹمنٹ میں بلا لے کیونکہ وہ اس کی روز روز کی پوچھ گچھ سے تنگ آ چکی تھی۔ کیوبک کا خیال تھا کہ شاید ٹروسیلا پولیس کے حوالے سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے، گو کہ وہ ریٹائر ہو چکا تھا لیکن بلڈنگ کے سبھی لوگ جانتے تھے کہ اب بھی شکاگو پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اس کے گہرے تعلقات ہیں۔

''اس سیمسٹر میں امبر پر پڑھائی کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ اسی لیے وہ دیر سے گھر آتی ہے جسے میں پسند نہیں کرتا۔''

''ہائیڈ پارک کیمپس کی طرف ٹریفک بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے اسے گھر پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہوگی۔''

''پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن میری پریشانی کی ایک اور وجہ ہے۔'' ٹروسیلا ایک لمحے کے لیے رکا اور آہستہ سے بولا۔ ''گزشتہ گرمیوں میں اس کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی تھی۔''

یہ کہتے ہوئے ٹروسیلا کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ گو کہ اس کا لہجہ نرم تھا لیکن اس کے پیچھے چھپی ہوئی نفرت اور سختی کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''امبر کی بہت سی عادتیں اپنی ماں جیسی ہیں۔ وہ بھی اسکول کے زمانے میں ایسی ہی بے پروا تھی۔ سرِ راہ کوئی اجنبی اسے مسکرا کر دیکھے تو وہ بھی جواب میں مسکرا دیتی ہے۔ اگر کوئی اس سے باتیں کرنا شروع کر دے تو وہ کھڑے ہو کر اسے سنتی ہے۔ یہ لڑکا اسے ایک پارٹی میں ملا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک دو مرتبہ باہر گھومنے بھی گئے۔ شاید اس لیے کہ ان دنوں وہ فارغ تھی۔ امبر کا کہنا ہے کہ وہ اس لڑکے میں بالکل بھی دلچسپی نہیں رکھتی اور میں نے اس کی بات کا یقین کر لیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ لڑکا کسی اور انداز میں سوچ رہا ہوگا۔ اگر کہیں امبر کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملے تو سمجھ جاؤ گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ وہ ہے ہی ایسی کہ لوگ پہلی ملاقات میں ہی اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ وہ میری بیٹی ہے۔''

ٹروسیلا نے لمحہ بھر توقف کیا۔ شاید وہ کیوبک کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا پھر وہ بولا۔ ''گزشتہ اگست میں وہ واپس اپنے اسکول چلا گیا۔ میں بھی یہی سمجھا کہ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ یہ تجھے بعد میں معلوم ہوا کہ پورے سیمسٹر کے دوران وہ ہر ویک اینڈ پر اس سے ملنے کے لیے آتا رہا اور اب وہ موسمِ بہار کی چھٹیاں ہونے کی وجہ سے دو ہفتے سے یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے بیچ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ سیدھی اسکول سے گھر آتی ہے اور ویک اینڈ پر بھی کہیں نہیں جاتی۔ میں نے اس بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہیں بتاتی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ جانتی ہے میں اس لڑکے سے اس وقت سے نفرت کرتا ہوں جب اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے دیکھ کر دانت نکال دیے تھے۔ میں تو اسی وقت گم صم ہو گیا تھا جب یہ معلوم ہوا کہ امبر اسے جانتی ہے۔ تمہاری بھی ایک بیٹی ہے اور تم جانتے ہو گے کہ اس صورتِ حال میں باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔''

کیوبک نے پوچھا۔ ''اس لڑکے کا کوئی نام تو ہوگا؟''

''ہیرالڈ... مسٹر ہیرالڈ والش... لیکن کوئی بھی اسے ہیری کہہ کر نہیں بلاتا۔ بہرحال، جب مجھے ان کے تعلقات کا علم ہوا تو میں سوچ میں پڑ گیا اور مجھے گزشتہ موسمِ گرما کی وہ دوپہر یاد آ گئی جب امبر ساحلِ سمندر سے واپس آئی اور میں نے اس کی کمر اور گردن پر دو نشانات دیکھے تھے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ سافٹ بال کھیلتے ہوئے گر گئی تھی۔ اس وقت تو میں نے اس کی بات کا یقین کر لیا لیکن دوسرے دن میں نے اس کی کلائی پر سیاہ اور نیلے نشانات دیکھے اور اب میری بیوی کوئی نے بتایا ہے کہ اس نے کوئی مہینا بھر پہلے بھی امبر کے بازو پر ایسے ہی نشانات دیکھے تھے۔ ہم نے امبر کے دوستوں کو ٹیلی فون کر کے کچھ معلوم کرنا چاہا لیکن انہوں نے اپنی زبان بند رکھی۔ میں نہیں جانتا کہ اس طرح وہ امبر یا اس لڑکے میں سے کس کا دفاع کر رہے ہیں لیکن فی الوقت میں اور کوئی پہلے سے زیادہ اندھیرے میں ہیں اور اس وجہ سے ہماری پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔''

''امبر کے بہن بھائیوں کو تو کچھ معلوم ہوگا۔ کیا اس نے انہیں اپنا رازدار نہیں بنایا؟''

''نہیں، وہ بہت چھوٹے ہیں اور امبر ان سے آٹھ سال بڑی ہے۔ اس کی بہن بس اتنا جانتی ہے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔''

''کیا تم نے اس سلسلے میں پولیس سے مدد لینے کے بارے میں سوچا؟''

''ہم یہ کام پہلے ہی کر چکے ہیں۔ میں نے انہیں فون کیا تھا لیکن ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا۔ ان کا کہنا تھا کہ امبر بالغ ہو چکی ہے اور جب تک وہ خود مدد کے لیے نہ کہے، وہ اس معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتے... اور اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو ہمیں اس دن کا انتظار کرنا چاہیے جب یہ لڑکا خود ہی اسے دھتکار دے اور وہ مایوس ہو کر ہمارے پاس واپس لوٹ آئے۔ لیکن میں خاموش رہ کر یہ تماشا نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی یہ چاہوں گا کہ امبر اتنی دور چلی جائے کہ اس کے پاس واپسی کا راستہ ہی نہ رہے۔ وہ پہلے ہی بہت کچھ کر چکا ہے۔''

''تم اس کے والدین سے بات کیوں نہیں کرتے؟''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' ٹروسیلا نے کہا۔ ''کوئی بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ اگر دورانِ گفتگو کوئی تلخی ہو گئی تو امبر ہم سے اور دور ہو جائے گی۔ ہم دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس مرحلے پر پسپا ہونے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے لیکن اس لڑکے کو اپنی بیٹی سے دور رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ اسی لیے کوئی نے کہا کہ میں تم سے بات کروں۔ والش کی فیملی اوک پارک میں رہتی ہے۔ میرے پاس ان کا پتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر کیوبک کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ایک نظر اس کاغذ پر ڈالی اور اسے میز پر رکھ دیا۔

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' کیوبک نے اس سے پوچھا۔

ٹروسیلا نے ایک بار پھر ڈینس کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ اگر وہ اس وقت کمرے میں نہ ہوتی تو یہ گفتگو کوئی اور رخ بھی اختیار کر سکتی تھی۔

''تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ پولیس اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی اور تمہاری بیٹی کے تعاون کے بغیر وہ والش کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گی۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ہیرالڈ والش سے مل کر اسے سمجھانے کی کوشش کروں کیونکہ میرا تعلق شکاگو پولیس ڈیپارٹمنٹ سے رہ چکا ہے تو اس کا نتیجہ الٹا بھی ہو سکتا ہے... اور وہ یا اس کے والدین شکایت کر سکتے ہیں کہ انہیں دھمکایا جا رہا ہے۔ اس وقت تمہاری پوزیشن اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔''

ٹروسیلا نے تائید میں سر ہلایا اور اپنی مایوسی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے؟''

کیوبک نے پوچھا۔ ''تمہاری بیٹی کتنی دیر سے گھر آتی ہے؟''

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ بہت دیر سے گھر آتی ہے۔''

''میرا مطلب تھا کہ ایک پیٹرول کار کی ڈیوٹی لگائی جا سکتی ہے کہ وہ یونیورسٹی کے علاقے میں گشت کرتی رہے اور امبر پر نظر رکھے... جب وہ اپنی کار یا بس اسٹاپ تک آ رہی ہو۔''

ٹروسیلا نے کچھ نہیں کہا۔ شاید وہ کسی ایسے اقدام کی توقع کر رہا تھا جس کا تعلق براہِ راست والش سے ہو۔

''مجھے صرف ایک فون کرنا ہوگا۔'' کیوبک نے کہا۔ ''دو پولیس والے اپنے روٹ میں ہلکی سی تبدیلی کریں گے اور امبر کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔''

''وہ پچپن نمبر کی بس سے آتی ہے اور ہر رات اس کے آنے کا وقت ایک ہی ہوتا ہے۔''

''تم مجھے اس کے شیڈول کی ایک کاپی، کلاس روم کا نمبر اور ایک اچھی سی تصویر دے دو۔ کیا تمہارے پاس کار ہے؟ یہ بہت ہی اچھا ہوگا کہ تم کسی بہانے اسے کار استعمال کرنے پر آمادہ کر لو۔ جب تک والش واپس نہ چلا جائے۔''

''ہمارے پاس ایک ہی کار ہے۔ اگر وہ اسے لے گئی تو سارا دن وہ گاڑی کیمپس کی پارکنگ میں کھڑی رہے گی اور اس کے بغیر ہمیں بہت دقت پیش آئے گی۔''

''میں اپنی بات پر اصرار نہیں کروں گا۔ اگر تم ایسا کر سکو تو یہ امبر کے حق میں بہتر ہوگا۔''

www.kahopakistan.com

ٹروسیلا سوچ میں پڑ گیا۔ اب اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے کیوبک کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ اس سلسلے میں اپنی بیوی سے مشورہ کرے گا۔

جب وہ چلا گیا تو ڈینس نے کیوبک سے کہا۔ ''تم مجھے یہ کہہ کر بے وقوف نہیں بنا سکتے کہ محض دو پولیس والوں کو امبر کی نگرانی پر مامور کر دو گے۔ یقیناً تمہارے ذہن میں کوئی اور منصوبہ ہے۔''

''ہاں، میں سوچ رہا ہوں کہ کم از کم آئندہ چھ مہینوں تک آمدورفت کے لیے گیراج والا راستہ استعمال کروں تاکہ دوبارہ اس سے سامنا نہ ہو سکے۔''

''کیوبک! تم جانتے ہو کہ اس کی بیٹی مشکل میں ہے۔''

''مجھے یقین نہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے البتہ اس کا امکان ہے کہ وہ اپنے باپ کے مقابلے میں والش سے زیادہ قریب ہو گئی ہے۔''

''تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو؟''

''یہ تو وہی بتا سکتی ہے کہ خاموش رہ کر وہ والش کو بچانے کی ضرورت کیوں محسوس کر رہی ہے اور اس کے دوستوں کا بھی یہی رویہ ہے۔''

''شاید تم سمجھ رہے ہو کہ وہ اپنے والدین کو اس صورتِ حال سے الگ رکھ کر اس معاملے سے خود ہی نمٹنا چاہتی ہے۔''

''ابھی تک تو اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

ڈینس اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی۔ ''اسی لیے ہم سب تم سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ تمہاری طرح میں گیراج والا راستہ اختیار نہیں کر سکتی۔ کم از کم ایک بار تو مجھے اخبار لینے کے لیے ٹروسیلا کے سامنے سے گزرنا ہوگا۔ تم ہی بتاؤ کہ میں اس کا سامنا کیسے کر سکوں گی؟''

''تم آئندہ دو ہفتوں کے لیے ٹی وی کی خبروں پر گزارہ کر لو۔ اس دوران میں کوشش کرتا ہوں کہ گھر جاتے وقت پولیس والے اس کی نگرانی کرتے رہیں۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ یہ معاملہ کیا صورت اختیار کرتا ہے۔''

☆☆☆

دوسرے روز صبح آٹھ بجے ان کے دروازے پر دن کی ڈیوٹی کرنے والے گارڈ پرسل نے دستک دی اور کیوبک کو ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ ٹروسیلا نے بھیجا ہے اور اس میں وہ تمام معلومات موجود ہیں جو اسے درکار تھیں۔ کیوبک نے وہ لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں امبر کے شیڈول کی ایک نقل، کچھ دوستوں کے نام اور پتے، اس کی ایک تصویر اور ٹروسیلا کا ایک خط تھا جس میں اس نے امبر کو آئندہ دو ہفتوں کے لیے اپنی کار دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹے لفافے میں اس کی بیوی کوئی کا بھی ایک مختصر سا خط رکھا ہوا تھا جس میں اس نے کیوبک کا شکریہ ادا کیا تھا۔ کیوبک نے وہ سب چیزیں دوبارہ لفافے میں رکھ دیں اور ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔

''مجھے امید ہے کہ تم اپنے پرانے دوست کرافورڈ کو فون نہیں کرو گے۔'' ڈینس بولی۔ ''تمہیں یاد ہے کہ گزشتہ بار جب تم نے اسے فون کیا تھا تو اس نے کس بے رخی اور سرد مہری کا مظاہرہ کیا تھا۔''

''مجھے یاد ہے۔ اسی لیے میں ایک دوسرے شخص کو فون کر رہا ہوں جو اس کے مقابلے میں زیادہ لچک دار ہے۔ تمہارا پرانا دوست ڈینی گالے۔''

ڈینس نے بُرا سا منہ بنایا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ڈینی بہت سست بندہ ہے اور اس سے کسی قسم کی مدد کی توقع رکھنا بے کار ہے لیکن اس نے کیوبک کی مخالفت نہیں کی۔ کیوبک کا خیال تھا کہ وہ اتنے سویرے دفتر میں موجود نہیں ہوگا اور اسے اس کے لیے پیغام چھوڑنا پڑے گا لیکن وہ اپنی سیٹ پر آ چکا تھا۔ کیوبک نے مختصر الفاظ میں اسے پوری بات بتائی اور پوچھا کہ وہ یونیورسٹی آف شکاگو کیمپس کے علاقے میں گشت کرنے والوں میں سے کسی کو جانتا ہے۔ ڈینی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ یونیورسٹی کی پولیس پوسٹ سے رابطہ کرے لیکن کیوبک نے کہا کہ یہ ایک دن کی بات نہیں ہے بلکہ اسے ڈیڑھ دو ہفتوں تک ان کی ضرورت ہوگی اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی کہ اس لڑکی کو پولیس والوں کی موجودگی کا علم نہ ہو۔

''گویا تم اس کی نگرانی چاہتے ہو؟'' ڈینی نے پوچھا۔

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب وہ کیمپس سے نکل کر اپنی کار تک جائے تو وہ اس کے قریب ہی موجود رہیں۔ میں ایک فیملی کو مشکلات سے بچانا چاہتا ہوں۔ اس کے باپ کا خیال ہے کہ اس لڑکی کا پرانا بوائے فرینڈ اسے اپنے جال میں پھنسا رہا ہے اور وہ اس سلسلے میں اس سے تعاون نہیں کر رہی... جبکہ مجھے تو اب بھی یقین نہیں ہے کہ وہ اور اس کا دوست اب بھی ایک نہیں ہیں۔''

''یہ لڑکی کون ہے اور تمہاری کیا لگتی ہے؟''

''وہ میری کچھ نہیں لگتی۔ میں تو اس سے ملا بھی نہیں ہوں۔'' کیوبک نے امبر کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف اس کے باپ کی مدد کر رہا ہوں۔''

''تمہیں کتنے عرصے کے لیے پولیس والوں کی ضرورت ہوگی؟'' ڈینی نے پوچھا۔

''تو یا دس دن کے لیے۔ اس کے بعد وہ لڑکا یہاں سے چلا جائے گا۔ وہ ڈاؤن اسٹیٹ میں پڑھتا ہے۔''

''تمہیں یقین ہے کہ معاملہ یہیں تک محدود رہے گا؟ میں نہیں چاہتا کہ پولیس والے کسی ایسی صورتِ حال میں ملوث ہو جائیں جو ان کے گلے پڑ جائے۔''

''بے فکر رہو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔'' کیوبک نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ دیر بعد امبر کی تصویر اور دیگر تفصیلات ہائیڈ پارک پہنچا دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ تم اس وقت تک سارا انتظام کر لو گے۔''

☆☆☆

کیوبک نے گھر سے نکلنے میں جان بوجھ کر تاخیر کی تاکہ ٹریفک کچھ کم ہو جائے۔ وہ گیارہ بجے کے قریب گھر سے نکلا اور اپنی کار میں سوار ہو کر ہائیڈ پارک پہنچ گیا۔ اس نے اپنی کار کیمپس کے وزیٹرز لاٹ میں کھڑی کی۔ تیز اور سرد ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے کیوبک کو شکاگو یونیورسٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ کی سرخ اینٹوں والی عمارت تک کا فاصلہ بھی طویل لگ رہا تھا جو صرف آدھے بلاک کی دوری پر واقع تھی۔ وہ سیدھا استقبالیہ کی کھڑکی پر گیا اور وہاں بیٹھے ہوئے نوجوان شخص کو اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اس نے کیوبک کی بات سننے کے بعد انٹرکام پر کسی سے گفتگو کی اور پھر اس کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا۔ اس نے کیوبک سے امبر ٹروسیلا کے بارے میں معلومات مانگیں تو اس نے اسے امبر کا ٹائم ٹیبل اور اس کی تصویر پکڑا دی۔ اس شخص نے سرسری طور پر ایک نظر ڈالی اور سر ہلا دیا جس کا مطلب تھا کہ ڈینی گالے نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے اور اس کا پیغام متعلقہ افراد تک پہنچ چکا ہے۔

اپنی کار کی طرف واپس جاتے ہوئے کیوبک کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ خود بھی کیمپس کا ایک چکر لگائے، ممکن ہے کہ کلاس کے درمیان ہونے والے وقفے میں امبر اسے نظر آ جائے لیکن اسے اس کا فائدہ نظر نہیں آیا۔ وہ اس سے براہِ راست ملاقات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ٹروسیلا کی خواہش تھی کہ امبر کو ان باتوں کا علم نہ ہو۔ پھر اس نے سوچا کہ کیوں نہ ایک چکر اوک پارک کا لگایا جائے جہاں اس کا بوائے فرینڈ رہتا تھا۔ وہ جگہ وہاں سے بیس منٹ کی ڈرائیو پر تھی لیکن اس نے یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ اگر ہیرالڈ کے والدین نے اس کی بے عزتی کر دی تو بات اور بگڑ جائے گی اور اس کا خدشہ ٹروسیلا پہلے ہی ظاہر کر چکا تھا۔

اس نے لفافہ کھول کر ایک نظر اس کاغذ پر ڈالی جس میں امبر کے دوستوں کے نام اور پتے درج تھے اور جن سے ٹروسیلا اور کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ ان میں رابرٹ فلیمنگ اور چیڈ سلون دو ایسے نام تھے جو ہائیڈ پارک کے قریب ہی رہتے تھے اور وہ جگہ وہاں سے پانچ منٹ کے فاصلے پر تھی۔ کیوبک نے بالائی منزل پر واقع فلیٹ کی گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ دو تین بار گھنٹی بجانے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اس وقت فلیٹ میں کوئی نہیں ہے۔ اگر وہ دونوں لڑکے طالب علم تھے تو اس وقت اپنی کلاس میں ہوں گے اور اگر کہیں کام کرتے تھے تو یقیناً ڈیوٹی پر ہوں گے۔ کیوبک نے سوچا کہ وہ کسی وقت شام میں ان لوگوں سے ملنے کی کوشش کرے گا۔

فہرست میں تیسرا نام جینیفر کا تھا جو سیسرو کے علاقے میں رہتی تھی۔ کیوبک کے پاس کوئی دوسری مصروفیت نہیں تھی اس لیے اس نے جینیفر سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ خوش قسمتی سے وہ گھر پر ہی مل گئی۔ وہ ویٹرس تھی اور نائٹ ڈیوٹی کر کے واپس آئی تھی۔ کیوبک نے اپنا تعارف امبر کے باپ کے دوست کی حیثیت سے کروایا۔ اس وقت جینیفر کی ماں بھی گھر پر موجود تھی۔ اس نے کیوبک کو کرسی پیش کی اور دونوں ماں بیٹی اس کے سامنے موجود کاؤچ پر بیٹھ گئیں۔ جینیفر نے بتایا کہ اس کی امبر سے ملاقات ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔

''شاید تین ماہ سے بھی زیادہ۔'' کیوبک کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ان دونوں نے بیک وقت اسے دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہی تھیں کہ کیوبک کو مدت کا یقین کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

''کیا امبر کے ساتھ تمہارا کوئی جھگڑا ہو گیا تھا؟''

''نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' جینیفر اس کے سوال پر حیران ہوتے ہوئے بولی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ جینیفر اور امبر اسکول کے زمانے سے دوست ہیں اور ٹروسیلا نے بھی امبر کے دوستوں کی فہرست میں اس کا نام سب سے پہلے لکھا تھا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان دونوں میں بہت قربت ہے۔ پھر اتنے عرصے تک نہ ملنے کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔ جینیفر کی ماں اس کے چہرے کے تاثرات بغور پڑھ رہی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

''دراصل امبر کالج میں بہت مصروف ہوتی ہے اور جینیفر کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی ملاقات نہیں ہو پا رہی۔''

کیوبک نے جینیفر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم

www.kahopakistan.com

ہیرالڈ والش کو جانتی ہو؟''

''ہاں، میں اس سے مل چکی ہوں۔''

''تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

جینیفر نے کوئی جواب نہیں دیا، بس کندھے اُچکا کر رہ گئی۔

''جینیفر!'' کیوبک نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''امبر کا باپ ان دونوں کے تعلق کے بارے میں بہت پریشان ہے اور اس نے اپنی پریشانی کا ذکر تم سے بھی کیا ہے۔''

جینیفر اب بھی خاموش رہی۔

''اگر تم سمجھتی ہو کہ اس کی پریشانی بلا جواز ہے اور امبر کو ہیرالڈ سے کوئی خطرہ نہیں تو کم از کم تم اسے اطمینان تو دلا سکتی ہو۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ وہ دونوں...''

جینیفر کی ماں نے ایک بار پھر مداخلت کی اور بولی۔ ''لیکن ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جیسا کہ جینیفر تمہیں بتا چکی ہے کہ کافی دنوں سے ہماری امبر سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' کیوبک سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دراصل ٹروسیلا کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ جینیفر اور امبر میں کافی گہری دوستی ہے اور شاید تم اس بارے میں کچھ جانتی ہو۔''

جینیفر کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری لیکن اس کے باوجود وہ کچھ نہیں بولی۔

''کیا تم کسی ایسے شخص کا نام بتا سکتی ہو جس سے امبر کی اسکول کے زمانے سے دوستی چلی آرہی ہو اور جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہو؟''

''اسکول کے زمانے میں مجھ سے زیادہ امبر کے قریب کوئی اور نہ تھا لیکن اب ہم ہائی اسکول میں نہیں ہیں اور صرف میں ہی نہیں بلکہ امبر بھی کسی پرانے دوست سے نہیں ملتی۔ اس میں ہماری کوئی غلطی نہیں ہے۔''

''کیا تم اس کا ذمے دار امبر کو سمجھتی ہو؟''

''میں یہ نہیں کہہ رہی۔ دراصل اب اس کے کالج میں نئے دوست بن گئے ہیں اور وہ زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزارتی ہے۔''

''تم نے کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی؟''

''اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ وہ جن لوگوں میں اٹھتی بیٹھتی ہے، وہ مجھے پسند نہیں ہیں۔''

''تمہارا اشارہ رابرٹ فلیمنگ اور چیڈ سلون کی طرف ہے؟''

''ہاں۔''

''تم سمجھتی ہو کہ وہ مجھے ہیرالڈ والش کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے؟''

''بالکل، وہ بھی انہی کے گروپ میں شامل ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ اس کے بارے میں کیا رائے دیں گے۔''

☆☆☆

کیوبک نے ایک بار پھر ان لڑکوں سے ملنے کا فیصلہ کیا لیکن وہاں جانے سے پہلے وہ ایک ریستوران میں لنچ کے لیے چلا گیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ لڑکے واپس آچکے ہوں گے تو اس نے ان کی بلڈنگ کا رخ کیا۔ اس بار اسے ناکامی نہیں ہوئی اور پہلی ہی گھنٹی پر دروازہ کھل گیا۔ فلیٹ کی حالت ویسی ہی تھی جیسی کسی طالب علم کے کمرے کی ہو سکتی ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک فلیٹ اسکرین ٹی وی چل رہا تھا لیکن اس کی آواز بند تھی۔ کونے میں ایک اسٹیریو پر بلند آواز میں گانا چل رہا تھا جو اس سے پہلے کیوبک نے کبھی نہیں سنا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک نوجوان لڑکی کاؤچ سے اٹھی اور اس نے اسٹیریو کی آواز کم کر دی۔ اس نے اپنا تعارف برڈگوٹ پیٹرسن کے طور پر کروایا۔ وہ امبر کی دوست تھی اور اس کا نام بھی فہرست میں شامل تھا۔ دروازہ کھولنے والا رابرٹ فلیمنگ تھا۔ کیوبک نے اپنا تعارف کروایا تو وہ بولا۔ ''تم مسٹر ٹروسیلا کے دوست ہو اور امبر کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ خود کیوں نہیں آئے؟''

''اس نے فون پر تم سے اور تمہارے روم میٹ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر تم لوگوں نے اس کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ ان کی نظر میں تعاون کی تعریف کیا ہے۔ میں چیڈ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جب میں نے مسٹر ٹروسیلا سے بات کی تو یوں لگا جیسے وہ میرے جوابات میں دلچسپی نہیں لے رہے۔''

اسی وقت اس کا روم میٹ چیڈ سلون بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بیئر کی بوتل تھی۔ وہ اسٹیریو کے قریب دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا اور ان کی گفتگو سننے لگا۔

''تم نے ٹروسیلا کو کیا جواب دیا تھا؟'' کیوبک نے رابرٹ سے پوچھا۔

رابرٹ نے کچھ کہنے سے پہلے چیڈ کی طرف دیکھا۔ اس لمحے کیوبک کے دل میں خواہش ابھری کہ اسے ان دونوں سے الگ الگ بات کرنا چاہیے تھی لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس نے اس کی ضرورت کیوں محسوس کی۔

''میرا زیادہ وقت اسے خاموش کروانے میں لگ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے سوال جواب کا سیشن چل رہا ہو یا وہ مجھ سے تفتیش کر رہا ہو۔ مجھے اس کا لہجہ پسند نہیں آیا اور میں نے تنگ آکر کہہ دیا کہ اگر وہ امبر کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ امبر سے خود بات کرے۔''

چیڈ نے اس میں اضافہ کیا اور بولا۔ ''اس سے قبل جب اس نے مجھے فون کیا تو وہ باقاعدہ دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔ میں نے بھی جواب میں اسے سنا ڈالیں۔ اس کے بعد سے اس نے مجھے فون نہیں کیا۔''

''کیسی دھمکیاں؟'' کیوبک حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''جب میں نے اس کی باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا تو بولا کہ وہ باکسر رہ چکا ہے اور کسی بھی وقت مجھے سبق سکھا دے گا۔ میں نے بھی جواب میں کہہ دیا کہ میں بھی باکسنگ جانتا ہوں اور وہ کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ تب سے ہی میں اس کا انتظار کر رہا ہوں لیکن اس نے شکل نہیں دکھائی۔''

یہ کہہ کر چیڈ نے میز پر سے ایش ٹرے اٹھائی اور کیوبک پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''لگتا نہیں کہ تم اس کی جگہ مجھ سے مقابلہ کرنے آئے ہو... کیا تم وکیل ہو؟''

''تم مجھے ایک طرح سے ثالث کہہ سکتے ہو۔'' کیوبک نے برڈگوٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم سے کیا بات ہوئی تھی؟''

برڈگوٹ چونکتے ہوئے بولی۔ ''تم نے مجھ سے کچھ کہا؟''

''کیا تمہیں بھی امبر کے باپ نے دھمکایا تھا؟''

''نہیں، تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس نے مجھے فون کیا ہو گا جبکہ میں یہاں رہتی بھی نہیں ہوں۔''

''ٹروسیلا نے تمہارا نام بھی امبر کے دوستوں کی فہرست میں لکھ رکھا ہے۔ کیا واقعی اس نے تمہیں فون نہیں کیا تھا؟''

اس نے مدد کے لیے رابرٹ اور چیڈ کی طرف دیکھا لیکن وہ دونوں خاموش رہے۔ برڈگوٹ بولی۔ ''اس نے مجھے فون تو کیا تھا لیکن کوئی دھمکی نہیں دی۔''

''تم نے اسے کیا بتایا؟''

''کچھ نہیں۔''

''کیوں؟''

اس موقع پر رابرٹ نے مداخلت کی اور بولا۔ ''تم نہیں سمجھ سکتے مسٹر کیوبک! جس انداز میں مسٹر ٹروسیلا نے بات کی، اس سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہم سب اس میں ملوث ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں ہمیں کالج سے بھی نکالا جا سکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم اس بات کو نہیں سمجھ پا رہے کیونکہ تمہاری کوئی بیٹی نہیں ہے۔'' کیوبک نے کہا۔

''مانتا ہوں کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے لیکن میں ایک طالب علم ہوں اور قرضہ لے کر پڑھ رہا ہوں جس کی ادائیگی میں دس سال بھی لگ سکتے ہیں کیونکہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد بھی فوری طور پر کام ملنے کی ضمانت نہیں ہے۔''

''تم نے اس سلسلے میں امبر سے کوئی بات تو کی ہو گی؟''

''امبر جانتی ہے کہ ہم سے رابطے کے لیے تمام لائنیں ہر وقت کھلی ہوتی ہیں۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔''

''اگر تم اسے کافی نہیں سمجھتے تو میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

کیوبک نے ان تینوں کو دیکھا اور بولا۔ ''ہیرالڈ والش کے ساتھی ہونے کی وجہ سے تم تینوں اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہو اور تمہاری خاموشی...''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' چیڈ نے مداخلت کی۔ ''تم ہمیں کس طرح والش کا ساتھی کہہ سکتے ہو؟''

''وہ تمہارا دوست ہے، کیا اتنا کافی نہیں ہے؟''

''وہ ہمارا دوست نہیں ہے۔ ہم نے اسے کئی مہینوں سے نہیں دیکھا۔'' اس نے برڈگوٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ پانچ چھ مہینے تو ہو گئے ہوں گے۔'' وہ اس کی تائید کرتے ہوئے بولی۔ ''ہیرالڈ تو یہاں رہتا بھی نہیں ہے اور کسی دوسرے اسکول میں پڑھتا ہے۔ یہ تمہیں کس نے بتایا کہ وہ ہمارا دوست ہے؟''

''جینیفر نے۔''

''وہ بے وقوف لڑکی امبر کو واپس اپنے گھر لانا چاہتی ہے تاکہ اسے بھیڑیوں سے دور رکھ سکے کیونکہ وہ خود احساسِ محرومی کا شکار ہے۔''

''اگر وہ ایسا کر رہی ہے تو اس میں بُرائی کیا ہے؟''

رابرٹ ایک قدم آگے بڑھا اور جیب سے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے بولا۔ ''بہت ہو چکا مسٹر کیوبک! اب بھی اگر تم نہیں گئے تو میں ''نائن ون ون'' کو فون کر دوں گا۔''

☆☆☆

www.kahopakistan.com

کیوبک چھ بجے کے قریب گھر پہنچا تو ڈینس نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور بولی۔ ''تم آٹھ گھنٹے سے پولیس چوکی میں بیٹھے کیا کر رہے تھے؟ کہیں انہوں نے تمہارے وارنٹ تو جاری نہیں کر دیے؟''

کیوبک کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں وہاں سے فارغ ہو کر لنچ کے لیے چلا گیا پھر بقیہ دوپہر امبر کے دوستوں سے ملنے میں گزر گئی جن کے نام ٹروسیلا نے اپنی فہرست میں دیے تھے۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ اس معاملے میں براہِ راست ملوث نہیں ہو گے؟''

''ہاں، میں نے یہی کہا تھا لیکن اپنے طور پر کچھ معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔''

''پھر کچھ معلوم ہوا؟''

''نہیں، سوائے اس کے کہ میں شاید غلطی پر تھا۔ امبر اور والش ایک نہیں ہیں۔ امبر کے دوستوں کا دعویٰ ہے کہ وہ والش کو نہیں جانتے۔ اگر وہ امبر سے ملنے آتا تو وہ یہ بات بھی نہیں کہتے۔ میں ٹروسیلا کی پریشانی کو سمجھ رہا ہوں۔ اس معاملے میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے جو ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کیا اس کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے جس کے ذریعے تم مسئلے کے حل تک پہنچ سکو؟''

''فی الحال میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہم ہیرالڈ والش کے یہاں سے جانے کی امید کریں۔''

☆☆☆

دوسرے دن وہ صرف اس امید پر عمارت کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا کہ ٹروسیلا سے ملاقات کر کے امبر کے بارے میں کوئی نئی خبر معلوم کی جائے لیکن اس کی جگہ پرسیل کو بیٹھا دیکھ کر اسے سخت حیرانی ہوئی، حالانکہ ٹروسیلا کی شفٹ شروع ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس کے استفسار پر پرسیل نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ وہ مجھے کہیں نہیں دکھائی دیا اور نہ ہی اس کے گھر سے فون پر کوئی جواب مل رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ٹروسیلا کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر اس کے لیے کوئی پیغام ہے تو مجھے دے دو۔ میں اس تک پہنچا دوں گا۔''

کیوبک نے کہا کہ فی الحال اس کے پاس کوئی اطلاع نہیں ہے۔ پرسیل نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔ لیفٹیننٹ کرافورڈ اور اس کا ایک ساتھی تم سے ملنے آئے ہیں۔ انہیں اوپر گئے ہوئے ایک گھنٹا ہو گیا ہے۔''

لفٹ کے ذریعے اوپر جاتے ہوئے کیوبک سوچ رہا تھا کہ کرافورڈ کی آمد اور ٹروسیلا کی غیر حاضری محض اتفاقیہ ہے یا اس میں بھی کوئی مصلحت ہے۔ اپنے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اس کے دوسرے ساتھی کو دیکھتے ہی وہ چونک پڑا۔ وہ ڈینی گائے تھا۔ اسے دیکھتے ہی کیوبک مزاحیہ انداز میں بولا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس کام کے عوض میری بیوی کے ساتھ شام گزارہ گے تو میں تم سے کسی بڑے کام کے لیے کہتا۔''

ڈینی اس جملے سے بالکل بھی محظوظ نہیں ہوا اور منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تم نے پہلے ہی بہت کچھ مانگ لیا ہے۔''

''پھر میں تم دونوں کی آمد کا کیا مقصد سمجھوں؟''

کرافورڈ نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ''آخری بار تمہاری ٹروسیلا سے کب بات ہوئی تھی؟''

''دو دن پہلے... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس کی بیٹی امبر کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''میں اس سے کبھی نہیں ملا۔'' پھر کیوبک نے ڈینی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ وہ ٹھیک تو ہے؟''

''نہیں۔'' ڈینی بولا۔ ''لیکن وہ ہیرالڈ والش کے مقابلے میں بہتر حالت میں ہے۔''

کرافورڈ نے غور سے دیکھتے ہوئے کیوبک کا ردِعمل بھانپنے کی کوشش کی۔ کیوبک ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''آگے بتاؤ۔ یہ میرے لیے ایک خبر ہے۔''

کرافورڈ بولا۔ ''والش مر چکا ہے۔''

''مر گیا... کیسے؟ کب؟''

''صبح تین بجے۔'' کرافورڈ نے کہا۔ ''اس کے سینے پر چاقو کا گہرا زخم ہے۔ انہوں نے یہ چاقو اس کے والدین کے کچن سے حاصل کیا تھا۔''

''یہ قتل کس نے کیا؟ اس کے والدین کہاں ہیں؟''

''وہ شہر سے باہر اپنے رشتے داروں سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔ والش موسمِ بہار کی چھٹیاں گزارنے گھر آیا ہوا تھا۔ یہ بات تو تمہیں معلوم ہی ہے۔''

''ہاں... لاش کو کس نے دریافت کیا؟''

''نائن ون ون پر ایک فون کال موصول ہوئی تھی۔ ہمیں یہ اطلاع اسی کال سننے والے آفیسر نے دی ہے۔''

''گویا والش کو ٹیلی فون کرنے کی مہلت مل گئی۔ اس نے آفیسر کو کیا بتایا تھا؟''

''کچھ نہیں، یہ کال اس نے نہیں بلکہ ٹروسیلا نے کی تھی۔ اس نے بیانگ دہل اعلان کیا کہ اس نے والش کا قتل کیا ہے، وہ اپنے کیے پر خوش ہے اور خاموشی سے بیٹھ کر پولیس کا انتظار کرے گا۔ جب پولیس وہاں پہنچی تو وہ اطمینان سے کچن ٹیبل پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔''

کیوبک نے ڈینس کی طرف دیکھا اور پھر ڈینی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم امبر کے بارے میں بھی کچھ کہہ رہے تھے، اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟''

ڈینی اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''میں بتاتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا، یہ بات صرف تم ہی جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اگر تم یہ بلا ہمارے سر نہ ڈالتے تو ہیرالڈ والش اس پر تشدد نہ کرتا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' کیوبک نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''میں اس شیڈول کی بات کر رہا ہوں جو تم نے مجھے دیا تھا۔ ہم نے اسی کے مطابق کارروائی کی۔ ایک پولیس والا کل شام ساڑھے پانچ بجے امبر کی کلاس کے باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ دس منٹ تاخیر سے باہر آئی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی تھا۔ تمہارے بیان کردہ حلیے کے مطابق وہ ہیرالڈ والش تھا۔ گو کہ اس وقت پولیس والا اسے نہ پہچان سکا اور نہ ہی اس نے ان لوگوں کے سامنے اپنی موجودگی ظاہر کی لیکن ان کا تعاقب کرتا رہا۔ پھر وہ دونوں ایک پیزا شاپ میں چلے گئے۔ لگ رہا تھا کہ وہ وہاں کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں اس لیے ہمارا بندہ وہاں سے ہٹ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اسے امبر کی کار چیک کرنے کا خیال آیا۔ وہ اس وقت تک پارکنگ میں موجود تھی لہٰذا وہ دوبارہ پیزا شاپ کی طرف چلا گیا لیکن وہ دونوں وہاں سے جا چکے تھے۔ تقریباً نو بجے کے قریب کوئی ٹروسیلا نے یونیورسٹی پولیس اسٹیشن فون کر کے بتایا کہ امبر ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔ ہمارا آدمی دوبارہ پارکنگ کی طرف گیا لیکن امبر کی کار وہاں نہیں تھی۔ اس کے بعد ٹروسیلا کے گھر سے مسلسل فون آتے رہے۔ ٹروسیلا بھی ڈیوٹی ختم کر کے آ چکا تھا اور اسے امبر کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ پھر ڈیڑھ بجے شب ان فون کالز کا سلسلہ رک گیا۔ یوں لگتا ہے کہ جب وہ مضروب حالت میں گھر پہنچی تو اس نے اپنے کمرے میں جانے کی کوشش کی ہوگی تاکہ ٹروسیلا اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ٹروسیلا نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اب اسے کسی پولیس والے کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اب ہمارے

دسواں مریض

مریض: ''ڈاکٹر صاحب! میری صحت یابی کے کتنے امکانات ہیں؟''

ڈاکٹر: ''صد فیصد جناب۔''

مریض: ''آپ پوری طرح مطمئن ہیں؟''

ڈاکٹر: ''بالکل، دراصل اس مرض کے شکار دس میں سے ایک زندہ بچتا ہے۔ آپ سے پہلے نو مریض آ چکے ہیں، وہ سب کے سب مر گئے۔ آپ دسویں مریض ہیں لہٰذا آپ یقیناً بچ جائیں گے۔''

بلوچستان سے بابر نعیم کی تسلی

سامنے دو کیسز ہیں۔ ایک انیس سالہ لڑکی پر تشدد کا اور دوسرا ایک طالب علم کی موت کا جبکہ ان دونوں کی نگرانی ہمارے بہترین پولیس آفیسرز کر رہے تھے۔ میں نے تمہیں شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ اس نگرانی کے نتیجے میں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہونا چاہیے جو الٹا گلے پڑ جائے۔''

''ڈینی! میں نے تم سے صرف نگرانی کرنے کے لیے کہا تھا۔ یہ بالکل سیدھی اور آسان سی بات تھی۔ اس سے زیادہ ان پولیس والوں کا کوئی کردار نہ تھا۔''

''یہ معاملہ اتنا سیدھا اور آسان نہیں تھا کیونکہ اس انتظام میں امبر شریک نہیں تھی اور اسے اس بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اگر وہ جانتی کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے تو وہ کبھی والش کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے یوں نہ جاتی۔ اور تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ والش کی جانب سے یہ تشدد محض اتفاق تھا۔ یہ تم بہتر جان سکتے ہو کہ یہ ایک اضطراری عمل تھا یا اس سروس کے شروع ہونے پر والش نے اس کے لیے اپنا ذہن تیار کر لیا تھا۔''

کیوبک کو خیال آیا کہ دوپہر میں وہ یونیورسٹی کیمپس اور امبر کے دوستوں سے ملنے گیا تھا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ پولیس والا کسی کی نظروں میں آ گیا ہو؟''

''وہ حلفیہ کہہ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ میرا اندازہ ہے کہ امبر کے ماں باپ میں سے کسی ایک نے بے دھیانی میں نگرانی والی بات امبر کو بتا دی ہوگی اور جب امبر، والش کے ساتھ بیئر شاپ گئی تو اس نے یہ بات اسے بھی بتائی ہوگی۔ والش یہ سننے کے لیے تیار نہیں تھا لہٰذا اس نے امبر پر حملہ کر

www.kahopakistan.com

دیا۔''

کیوبک کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے دماغ میں بہت سی باتیں چل رہی تھیں۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ اب تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو اور تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟''

کرافورڈ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''میرے یہاں آنے کی صرف ایک ہی وجہ ہے کیونکہ تم نے صرف ڈینی کو ہی نہیں بلکہ پوری شکاگو پولیس کو اس معاملے میں گھسیٹ لیا ہے۔ اب ہمیں اس صورتِ حال سے نکلنا ہے۔ اس میں کچھ الجھنیں ہیں جنہیں تم ہی دور کر سکتے ہو۔''

''مثلاً؟''

''پہلا مسئلہ تو وقت کے تعین کا ہے۔ امبر رات ڈیڑھ بجے گھر پہنچی اور ٹروسیلا اسی وقت وہاں سے روانہ ہو گیا لیکن اس نے والش کے گھر پہنچنے کے بعد تین بجے رات پولیس کو اس قتل کی اطلاع دی حالانکہ اسے ڈرائیونگ کرنے اور والش کے سینے میں چاقو اتارنے میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگے ہوں گے۔ شاید تم سمجھ رہے ہو کہ ان دونوں کے درمیان پہلے کچھ بحث ہوئی ہو گی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ٹروسیلا زبان کے بجائے گھونسا استعمال کرنے کا عادی ہے لیکن ہمیں جدوجہد کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ والش کے جسم پر سر سے پاؤں تک چاقو کے زخم کے علاوہ کوئی نشان نہیں ہے۔''

''ٹروسیلا نے اس کی کیا وضاحت پیش کی؟''

''اس کا کہنا ہے کہ اسے اپنے اعصاب کو مجتمع کرنے میں کچھ وقت لگ گیا لیکن اس کے علاوہ بھی اس نے بہت کچھ کیا۔ والش کے جسم سے خون آلود چاقو نکال کر کچن کی میز پر رکھ دیا اور اس طرح اس نے جائے واردات کو اس طرح تباہ کیا کہ موت کے وقت کا تعین کرنا بھی مشکل ہو گیا۔''

کیوبک بولا۔ ''لیکن وہ تو پہلے ہی اعتراف کر چکا ہے اور اس حرکت سے تو لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر موت کے وقت پر پردہ ڈالنا چاہ رہا تھا۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ اگر اس نے والش کو قتل نہیں کیا تو ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ والش کے کچن میں گیا ہو گا جہاں اس نے والش کو مُردہ حالت میں پایا۔ امبر کچھ دیر پہلے وہاں سے گئی تھی۔ اسے گھر پہنچنے میں دس منٹ لگے ہوں گے اور اتنے ہی وقت میں ٹروسیلا بھی والش کے گھر آیا ہو گا۔ اس وقت تک والش کو مرے ہوئے زیادہ سے زیادہ پچیس منٹ ہوئے ہوں گے۔ اگر ٹروسیلا اسی وقت پولیس کو فون کر دیتا تو موت کے وقت کا تعین کرنے میں آسانی رہتی لیکن اس نے مزید ڈیڑھ گھنٹا ضائع کر دیا۔''

''تم سمجھتے ہو کہ وہ واقعی اتنا ہوشیار ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ فیصلہ کر چکا ہے اور اس کا مطمئن چہرہ دیکھ کر مجھے یہ یقین کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آرہی کہ اس نے نہیں بلکہ امبر نے والش کو قتل کیا ہے۔ لیکن میں یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی پولیس کے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے۔''

''امبر کیا کہتی ہے؟''

''کچھ نہیں۔ اس نے کسی سے بھی ایک لفظ نہیں کہا۔''

''یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔''

''اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے ہم اس سے زیادہ سخت سوالات بھی نہیں کر سکتے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں پھر اپنا سوال دُہراؤں گا کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' کیوبک نے الجھتے ہوئے کہا۔

کرافورڈ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''فی الحال ہماری نظر میں تم ہی ایک ایسے شخص ہو جس پر ٹروسیلا اور کوئی نے اپنی بیٹی کے معاملے میں بھروسا کیا تھا۔ شاید ان دونوں میں سے کوئی تمہاری بات سن لے۔''

''کیا میں اس سے یہ کہوں کہ وہ اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش ترک کر دے؟'' کیوبک نے تلخی سے کہا۔

''ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ سچ بولے۔''

ڈینی نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر ٹروسیلا سچ بیان کر دے تو یہ ہر ایک کے حق میں بہتر ہو گا۔ گو کہ اس کے باوجود ہم تنقید کا نشانہ بنتے رہیں گے لیکن یہ کیس جتنا آسان ہو گا، اتنی ہی تیزی سے ختم بھی ہو جائے گا۔ باپ کا انتقامی کارروائی کرنا زیادہ سنگین جرم ہے جبکہ امبر کو اپنے دفاع میں چاقو استعمال کرنے پر کم سزا ہو سکتی ہے۔ تم اس کی ماں کو قائل کر سکتے ہو کہ امبر کا اعترافِ جرم اس کے باپ کے مقابلے میں کم درجے سنگین ہو گا۔''

اس کی بات سن کر کیوبک سوچ میں پڑ گیا۔

کرافورڈ بولا۔ ''تم سمجھ سکتے ہو کہ جیسے ہی ان کے وکیل اس مقدمے میں شامل ہوئے تو وہ خاندان کے ہر فرد کو اپنے حساب سے بیان دینے کے لیے کہیں گے اور پھر ہمارے لیے مشکل ہو جائے گا کہ کس پر یقین کریں اور کس پر نہیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

کیوبک اب بھی کچھ نہ بولا۔ کرافورڈ نے اپنی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم دیکھنا چاہتے ہو کہ والش نے امبر کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟''

کیوبک نے لفافے پر نگاہ ڈالی۔ وہ جانتا تھا کہ ان تصویروں میں کیا ہو گا لہٰذا اس نے ہچکچاہٹ کے بغیر کہہ دیا۔ ''نہیں۔''

کرافورڈ نے لفافہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ ''یہ تصویریں امبر کے دفاع میں کام آئیں گی۔''

ڈینی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کرافورڈ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا اور دروازے کی طرف مڑتے ہوئے ڈینس سے بولا۔ ''میں نے تمہیں اپنا سیل نمبر دے دیا ہے۔ تم دونوں مجھ سے اس نمبر پر بات کر سکتے ہو لیکن جلدی کرو۔ تمہارے پاس دو گھنٹے ہیں۔''

کیوبک اب بھی خاموش رہا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد ڈینس نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ اگر والش خاموشی سے چلا جائے تو یہ قصہ خود ہی ختم ہو جائے گا۔''

''میں نے خاموشی سے چلے جانے کی بات ضرور کی تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ بولنے کے قابل ہی نہیں رہے۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ کرافورڈ اور ڈینی غلطی پر ہیں اور ٹروسیلا نے ہی یہ قتل کیا ہے؟''

''نہیں، ٹروسیلا کبھی بھی وہ چاقو استعمال نہیں کرتا۔ اس کے بجائے وہ مکوں سے کام لیتا اور اسے قتل کرنے کے بجائے یہ سبق سکھاتا کہ اگر آئندہ وہ امبر کے قریب بھی آیا تو اس سے بھی بُرا انجام ہو گا۔''

''پھر تمہیں کیا ہچکچاہٹ ہے۔ اگر ڈینی یہ کہہ رہا ہے کہ ٹروسیلا کے سچ بولنے کی صورت میں سب کا فائدہ ہے۔''

''لیکن امبر کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ تم جانتی ہو کہ ڈگری حاصل کرنے کے بعد سنہری مستقبل بنانے کے لیے اس کا ریکارڈ صاف ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ میں نہیں سمجھتا کہ ٹروسیلا کو قائل کر سکوں گا، جب تک کہ خود قائل نہ ہو جاؤں۔''

ڈینس نے چند لمحے انتظار کیا کہ شاید وہ مزید کچھ کہے لیکن جب کچھ نہ بولا تو وہ اسے اپنی سوچوں میں الجھا چھوڑ کر چلی گئی۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ کہیں وہ خود اس واقعے کا ذمے دار تو نہیں۔ شاید ڈینی کا کہنا ٹھیک ہی تھا۔ اس نگرانی کے عمل میں کوئی نہ کوئی خامی ایسی رہ گئی تھی جس نے والش کو چوکنا کر دیا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ والش کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ جو پولیس والا اس کی نگرانی کر رہا تھا، اس کے دیکھے جانے کے امکانات بہت کم تھے۔ کوئی پر بھی شبہ کیا جا

یادداشت

مسٹر اور مسز اکرم ایک روز کلفٹن کی سیر کو گئے۔ دیر تک دونوں وہاں گھومتے رہے اور سمندر کی لہروں کی اٹکھیلیاں دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔

شام ڈھلے دونوں واپس ہوئے تو مسٹر اکرم ایک امرود والے کو دیکھ کر رک گئے۔ ''آؤ نجمہ! ایک امرود اور کھالیں۔'' انہوں نے اپنی مسز سے کہا۔

''ایک اور امرود؟'' مسز اکرم نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''ہم جب سے یہاں آئے ہیں۔ ہم نے امرود چکھا تک نہیں اور تم کہتے ہو، ایک اور مرود کھا لیں؟''

''بڑی بھلکڑ ہو، نجمہ!'' مسٹر اکرم نے کہا۔ ''اتنی جلدی بھول گئیں۔ شادی کے بعد جب ہم دونوں یہاں آئے تھے تو اس وقت ہم نے ایک امرود کھایا تھا۔ کہو یاد آیا یا نہیں؟''

جلال پور جٹاں سے اسماوارث علی کی معصومیت

موٹے

موٹے لوگ اپنے موٹاپے کو کم کرنے کے لیے محنت بہت کرتے ہیں۔ آپ صبح کسی بھی پارک میں چلے جائیں وہاں موٹے لوگوں کا ''جمعہ بازار'' لگا ہو گا۔ یہاں ہر قسم اور ہر نسل کا موٹا دستیاب ہوتا ہے جب وہ موٹے سیر کے دوران لڑھکتے لڑھکتے ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے جاپان کے دو روایتی پہلوان ایک دوسرے پر جھپٹنے کی تیاری کر رہے ہوں، ان کی اکثریت گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سیر کے بعد سری پائے، حلوہ پوری یا بونگ کا ناشتا کرتی ہے اور حیران ہوتی ہے کہ اتنی مشقت کے باوجود موٹاپا کم کیوں نہیں ہوا۔ ان میں سے بہت سے لوگ وقفے وقفے کے بعد اسمارٹ ہونے کے ٹوٹکے استعمال کرتے رہتے ہیں مثلاً کھانے کے دوران میں اور کھانے کے بعد پانی نہ پئیں تو چاہے جو کچھ مرضی کھائیں پئیں آپ موٹے نہیں ہوں گے مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ... ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

(''ہنسنا رونا منع ہے'' عطاء الحق قاسمی کی کتاب سے اقتباس۔ ولید بلال کی عرق ریزی)

www.kahopakistan.com

سکتا تھا کہ اس نے امبر کو یہ بات بتا دی ہو لیکن زیادہ قرین قیاس یہ تھا کہ گزشتہ روز کیو بک نے امبر کے دوستوں سے جو ملاقاتیں کی تھیں، اس کا علم والش کو ہو گیا ہو... لیکن چھ گھنٹے سے بھی کم وقت میں یہ کیسے ممکن تھا؟ جبکہ ان سب کا کہنا تھا کہ وہ والش کو زیادہ نہیں جانتے۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس کی اطلاع امبر کو ہو گئی ہو کیونکہ اس وقت وہ یونیورسٹی میں تھی اور کلاس ختم ہونے کے بعد والش کے ساتھ ہی کیمپس سے باہر آئی تھی اور اگر اس کے دوستوں نے فون یا ایس ایم ایس کے ذریعے اسے کیو بک کی آمد کے بارے میں مطلع کیا بھی ہو تو وہ یہ بات والش کو کیوں بتائے گی؟ ماسوائے اسے تنبیہ کرنے کے کہ اس کے باپ نے اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے دوسرے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اسے سن کر والش کا ناراض ہونا فطری امر تھا۔

ان سب باتوں کو سوچنے کے بعد کیو بک کا ذہن ایک بار پھر اس سوال کی جانب چلا گیا جس پر وہ گزشتہ شب غور کر رہا تھا۔ اگر امبر والش کے ساتھ ڈیٹنگ کر رہی تھی تو اس کے دوستوں کے پاس اختیار تھا کہ وہ اس بات کو چھپاتے یا ظاہر کر دیتے لیکن ان کا یہ کہنا کہ وہ والش کو نہیں جانتے، اس امر کی نشان دہی کر رہا تھا کہ وہ کوئی اجنبی ہے جو شخص امبر کو تنگ کر رہا تھا۔ لیکن اگر یہ سچ تھا تو پھر وہ اس کی بانہوں میں بانہیں ڈالے پیزا شاپ تک کیوں گئی اور جب والش نے اس پر ہاتھ اٹھایا تو اس نے پولیس کو فون کیوں نہیں کیا؟

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ ٹروسیلا اور والش کا ٹکراؤ اس کے کچن میں ہوا لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی دوسرے پر حملہ نہیں کیا جبکہ ٹروسیلا اس کی مرمت کرنے کے ارادے سے ہی وہاں گیا تھا اور والش بھی ذہنی طور پر اپنے دفاع کے لیے تیار تھا... اور کرافورڈ نے بھی یہی بتایا تھا کہ والش کے چہرے یا جسم کے دوسرے حصوں پر کوئی ضرب کا نشان نہیں تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جب ٹروسیلا وہاں پہنچا تو والش کی لاش دیکھ کر سمجھ گیا کہ اس کی بیٹی نے والش کو قتل کر دیا ہے۔ ٹروسیلا کو یقیناً یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی ہوگی کہ والش اس کے آنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس طرح اسے اپنی حسرت پوری کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

کیو بک بہت دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ پہلے وہ ایک مفروضے پر سوچتا پھر کوئی نہ کوئی ایسی وجہ سامنے آجاتی کہ اسے اپنے ہی خیال کی نفی کرنی پڑ جاتی۔ البتہ ایک خیال اس کے ذہن میں جم کر رہ گیا اور اس کے پاس ایسی کوئی وجہ نہ تھی جس کی بنا پر اسے رد کر سکتا۔ وہ سوچتے سوچتے تھک گیا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر سیدھا ڈینس کے پاس گیا اور بولا۔ ''مجھے وہ نمبر چاہیے جو کرافورڈ تمہیں دے کر گیا ہے۔''

''کیا تم نے اپنے آپ کو ٹروسیلا سے بات کرنے کے لیے آمادہ کر لیا ہے؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''اس سے پہلے میں وہ تصویریں دیکھنا چاہوں گا جنہیں میں نے پہلے نظرانداز کر دیا تھا۔''

☆☆☆

کیو بک نے کرافورڈ پر واضح کر دیا کہ وہ ٹروسیلا سے کوئی بات کرنے سے پہلے امبر کے دوستوں سے اس کی موجودگی میں ملنا چاہتا ہے۔ کرافورڈ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چنانچہ ان سب کو اوک پارک پولیس اسٹیشن بلا لیا گیا۔ سب سے پہلے آنے والوں میں جینیفر اور اس کے والدین تھے۔ اس کے کچھ دیر بعد ہی برڈگوٹ، رابرٹ اور چیڈ بھی پہنچ گئے۔ کیو بک نے ان سب سے یہی کہا تھا کہ جتنی جلدی اس معاملے کو نمٹا دیا جائے، اتنا ہی ان سب کے حق میں بہتر ہوگا۔ ورنہ اگر بات بڑھ گئی تو اس کا اثر ان کے مستقبل پر بھی پڑے گا۔ خاص طور پر یونیورسٹی کے دوست زیادہ متاثر ہوں گے۔

اوک پارک پولیس اسٹیشن میں انہیں میٹنگ روم دے دیا گیا تھا جس میں تفتیش کے لیے تمام سہولتیں دستیاب تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی میز کے گرد بارہ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں ویڈیو کیمرا اور ایمرجنسی لائٹس بھی نصب تھیں تاکہ تمام کارروائی کو ریکارڈ کیا جا سکے۔ میز کے ایک طرف جینیفر اور اس کے والدین جبکہ دوسری طرف برڈگوٹ، رابرٹ اور چیڈ بیٹھے ہوئے تھے جبکہ میز کے ایک سرے پر کیو بک اور دوسرے سرے پر کرافورڈ براجمان تھے اور ان کے عقب میں ڈینی اور اوک پارک پولیس اسٹیشن کا چیف کھڑا ہوا تھا۔

''ہم امبر سے کب مل سکیں گے؟'' جینیفر نے اپنی جگہ پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا انحصار وقت اور حالات پر ہے۔ میرے خیال میں کل صبح تک ہی ممکن ہوگا۔''

''لیکن تم نے تو ہمیں یہ کہہ کر بلایا تھا کہ ہم معاملے کی وضاحت کریں تاکہ اس کی رہائی ممکن ہو سکے۔''

''ہاں، میں نے یہی کہا تھا کہ کچھ نکات کے واضح ہونے کے بعد ہی ہم اس کی رہائی کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں اور اس کا انحصار اس وقت ہونے والی کارروائی پر ہے۔''

مسٹر ٹکر نے اپنی بیٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ بولنے سے باز نہیں آئی۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم تیار ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی اس سلسلے میں پورا تعاون کرے گا۔''

''چلو، پھر میں تم سے ہی شروع کرتا ہوں۔'' کیو بک نے کہا۔ ''تم چار جولائی کو رابرٹ اور چیڈ کے اپارٹمنٹ پر گئی تھیں؟''

جینیفر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولی۔ ''تم یہ بات کیسے جانتے ہو؟''

''یہ ایک پورچ پارٹی تھی اور وہاں تمہاری ملاقات ہیرالڈ والش سے بھی ہوئی تھی؟''

''ہاں۔''

''کیا تم پہلے بھی اس سے مل چکی تھیں؟''

''نہیں۔''

''اس کے بعد دوبارہ اس سے ملاقات ہوئی؟''

''نہیں، وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں کبھی ان لوگوں سے نہیں ملی۔''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ والش بھی ان کے گروپ میں شامل تھا؟''

اس موقع پر برڈگوٹ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات دوبارہ کیوں پوچھی جا رہی ہے؟ ہم گزشتہ روز تمہیں سب کچھ بتا چکے ہیں۔''

''اب صورتِ حال مختلف ہو گئی ہے کیونکہ کل تک والش زندہ تھا۔''

رابرٹ نے ایک گہری سانس لی اور کرافورڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''برڈگوٹ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسری بار مسٹر کیو بک سے تعاون کر رہے ہیں لیکن وہ اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں کہ ہیرالڈ والش سے ہماری معمولی جان پہچان تھی اور ہم میں سے کوئی بھی اسے اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔''

''اوہ... اب مجھے یقین آگیا۔'' کیو بک نے بے ساختہ کہا۔

چیڈ بولا۔ ''اگر تم نے کل ہی ہماری بات پر یقین کر لیا ہوتا تو شاید والش کی موت واقع نہیں ہوتی۔''

''میرا خیال اس کے برعکس ہے۔'' کیو بک نے کہا۔ ''اگر میں کل ہی تمہارے جھوٹ کو پکڑ لیتا تو شاید اس کی جان بچ جاتی۔ اور یہی بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔''

چیڈ ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ''پریشانی تو ہمیں ہو رہی ہے کہ ہمیں یہاں کس لیے بلایا گیا ہے جبکہ ہم پر کوئی الزام بھی نہیں ہے۔''

''تم لوگوں نے کل جو کچھ بتایا، اسے سن کر اس لیے حیرانی ہوئی کہ اگر تم لوگ والش کو نہیں جانتے تھے اور وہ امبر کا دوست نہیں تھا تو پھر وہ اس کی زیادتیوں پر کیوں خاموش رہی؟ حقیقت یہ ہے کہ امبر نے بھی اپنے باپ کو یہی بتایا تھا کہ والش سے اس کی ملاقات پورچ پارٹی میں ہوئی تھی اور وہ اس پر ایسا فریفتہ ہوا کہ اس سے ملنے ہر ہفتے آنے لگا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ اسے اس شخص سے دور کر دے جس سے وہ ملا کرتی تھی۔''

جینیفر نے کہا۔ ''اگر وہ اس کا دوست نہیں تھا تو امبر نے اس وقت پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کی جب اس نے پہلی بار اس پر حملہ کیا تھا؟''

''یہی بات میں نے بھی سوچی تھی۔'' کیو بک نے کہا۔ ''اور اس کی خاموشی سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اس کا دوست ہے اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں تھا تو پھر اس کے مارنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ وہ کوئی اور شخص ہوگا جس سے وہ قریب تھی اور یہی اس کی خاموشی کی وجہ بھی رہی ہوگی۔ وہ یقیناً اپنے کسی دوست کی پردہ پوشی کر رہی تھی۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور رابرٹ کی کرسی کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ ''مسٹر رابرٹ! کیا تم جیبوں سے اپنے ہاتھ نکالنا پسند کرو گے؟''

رابرٹ نے ایک بار پھر کرافورڈ کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں سرد مہری دیکھ کر پیچھے مڑے بغیر کیو بک سے بولا۔ ''نہیں، تم میرے ہاتھ کیوں دیکھنا چاہتے ہو؟''

''کیونکہ میں اب تک یہ نہیں سمجھ پایا کہ والش کے چہرے اور جسم پر چاقو کے زخم کے علاوہ کوئی اور نشان کیوں نہیں تھا۔ کرافورڈ نے مجھے بتایا ہے کہ اسے کوئی ایسی علامت نظر نہیں آئی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس نے کوئی مزاحمت کی تھی کیونکہ وہ یہ امید نہیں کر رہا تھا کہ تم اس کے سینے میں چاقو اتار دو گے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے امبر کو وحشیانہ انداز میں مارا ہو۔ اس کے جسم پر امبر کے ناخنوں کے نشان یا انگلیوں کے جوڑوں پر کوئی چوٹ ضرور ہوتی۔ مجھے اس پر شبہ ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تفتیشی افسر اس سوال کا جواب ضرور تلاش کریں گے لیکن

www.kahopakistan.com

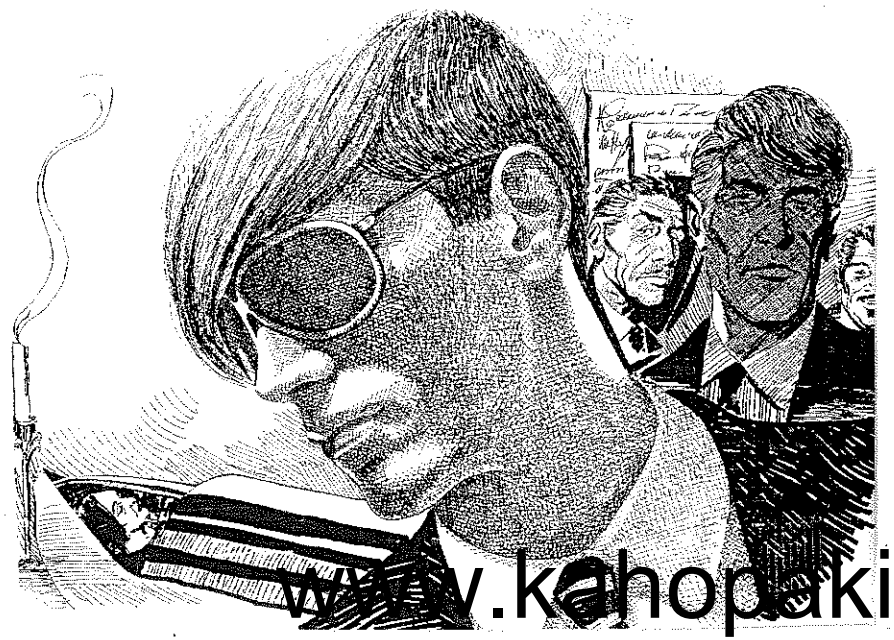

اس میں وقت لگے گا اور ہمارے پاس تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے وقت ضائع کیے بغیر اپنے ہاتھ دکھادو۔“

رابرٹ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ جیبوں سے نکال کر فضا میں بلند کیے اور انہیں دائیں بائیں گھمانے لگا۔ اس کی انگلیاں سوجن کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اعتراف کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس مرحلے پر یہ کہنا حماقت ہوگی کہ میں نے دیوار پر گھونسے مارے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ہی امبر کو مارا تھا۔ مجھے اس پر کوئی فخر نہیں ہے اور اس کے نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں نے والش کو قتل کیا ہے۔ اور اگر تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے تو میں تفتیش کے لیے تیار ہوں۔“

”فی الحال میں کسی ثبوت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ وقت آنے پر سب چیزیں سامنے آجائیں گی۔ تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم اس وقت صرف اس لیے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ پولیس کو ٹروسیلا کے قاتل ہونے کا یقین ہے اور اس نے صرف کرائم سین کو خراب کرنے کی غلطی کی ہے۔ اسی لیے پولیس نے امبر کو حراست میں لے لیا ہے کیونکہ وہ بھی اس کے باپ کی طرح یہی سمجھتے ہیں کہ امبر نے اپنے دفاع میں والش کو قتل کیا ہے، جب وہ اسے مار رہا تھا۔ لیکن اب تم نے اسے مارنے کا اعتراف کرلیا ہے تو پھر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے پاس والش کو قتل کرنے کی کوئی وجہ یا محرک نہیں تھا۔ لہٰذا اسے رہا کردیا جائے گا۔ فی الحال وہ پولیس کو کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں بلکہ وہ تو یہ اعتراف بھی نہیں کرسکتی کہ والش نے اسے مارا تھا کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اس طرح اس کے باپ کے لیے مشکلات میں اور اضافہ ہوجائے گا... اور ایک بے قصور شخص کو قتل کرنے کا ملزم ٹھہرایا جائے گا لیکن جب ایک بار تحقیقات کا رخ تمہاری جانب ہوگیا اور تم اس پر حملہ کرنے کے جرم میں گرفتار ہوگئے تو پھر ہمارے لیے اسے قائل کرنا زیادہ مشکل نہ ہوگا کہ وہ اپنے باپ کو بچانے کے لیے سچ بیان کردے۔

”مجھے اندازہ ہے کہ وہ کیا کہے گی۔ جب میں تم سے ملنے آیا تو تم یہی سمجھے کہ امبر کے باپ نے مجھے بھیجا ہے۔ تم نے امبر کو اس کی اطلاع دی۔ وہ اس وقت والش کے ساتھ پیزا شاپ میں تھی۔ یہ جان کر تمہیں غصہ آگیا اور تم نے فوراً امبر سے ملنے پر اصرار کیا۔ والش کے گھر جانے کے بعد وہ تمہارے اپارٹمنٹ آئی۔ پھر تم نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کی تفصیل تو امبر ہی بتاسکے گی... اور یہ بھی کہ تم سے مار کھانے کے بعد وہ والش کے پاس گئی یا اسے کار فون سے اطلاع دی کیونکہ یہ بات وہ اس سے ہی کہہ سکتی تھی۔ پھر والش نے تمہیں فون کیا۔ یہ ثبوت ہمیں فون ریکارڈ سے مل جائے گا۔ اس نے تمہیں دھمکی دی ہوگی۔ تم نے اسے کہا ہوگا کہ وہ پُرسکون ہوجائے اور یہ کہ تم خود اس سے ملنے آرہے ہو اور اس نے تمہارے پہنچنے سے پہلے امبر کو گھر بھیج دیا ہوگا۔ تم نے اسے منانے کی کوشش کی ہوگی کہ وہ اس واقعے کی رپورٹ پولیس میں نہ کرے ورنہ تمہارا مستقبل تباہ ہوجائے گا لیکن اس نے تمہاری ایک نہ سنی۔ اس پر تم مشتعل ہوگئے اور کچن میں رکھا ہوا چاقو اس کے سینے میں گھونپ دیا کیونکہ تم جیسے لوگ اپنے گھونسوں کا استعمال صرف عورتوں پر ہی کرنا جانتے ہیں۔“

رابرٹ دم سادھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ بھی کیوبک کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔ کیوبک نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اب تم مجھے بتاؤ گے رابرٹ کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس میں کتنا صحیح اور کتنا غلط ہے لیکن اس کا خلاصہ یہی ہے کہ تم ہی وہ شخص ہو جس کے پاس والش کو قتل کرنے کی وجہ تھی اور تم نے ایسا ہی کیا۔ میں نہیں جانتا کہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ اپنے جرم پر پردہ ڈال سکو گے۔ شاید تم جیسا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب امبر جیسی لڑکیاں تمہیں کور دینے کے لیے موجود ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اب وہی کچھ کررہی ہے جس کی تم نے پس پردہ رہ کر منصوبہ بندی کی تھی اور اس کے تحت تم نے اس کے باپ کو قتل کے الزام میں پھنسوا دیا۔ اس وقت تمہارے دوستوں کے چہرے دیکھ کر اندازہ ہورہا ہے کہ وہ اب بھی تمہیں بچانے کی کوشش کررہے ہیں۔“

رابرٹ نے برڈ گوٹ اور چیڈ کے چہرے دیکھنے کے بجائے کیوبک پر نظریں گاڑ دیں۔ اس نے ڈینی کو بھی نہیں دیکھا جو اس کے برابر میں آکر کھڑا ہوگیا تھا کیونکہ رابرٹ کے چہرے پر سختی کے آثار نمایاں ہورہے تھے اور خدشہ تھا کہ کہیں وہ غصے میں آکر کیوبک پر حملہ نہ کردے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ ابھی وہ اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ ڈینی اس کے راستے میں آگیا۔ اس کا ارادہ بھانپ کر کیوبک نے بھی اپنے دفاع میں گھونسا چلا دیا جس کی ضرب رابرٹ کے جبڑے پر لگی۔ یہ اور بات ہے کہ آئندہ چند روز تک وہ اپنی زخمی انگلیوں کو دیکھ کر پچھتاتا رہا۔ رابرٹ جیسے سرکش انسان کو قابو کرنے کی اس سے بہتر ترکیب اور کیا ہوسکتی تھی۔

❀❀

اس کہانی کو آپ تک پہنچانے میں تعاون کیا ہے
ZONG سب کہہ دو

انوکھا طریقہ

تنویر ریاض

ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے...... منصوبہ بندی ہوتی ہے...... جرم کرنے کے بھی کئی طریقے ہوتے ہیں...... اور کوئی بھی طریقہ کتنا ہی انوکھا کیوں نہ اختیار کیا جائے...... اس کا توڑ بھی ضرور ہوتا ہے......

دو نو بیاہتا دلہنوں کا ماجرا جن کی زندگی شاطرانہ چال کی نذر ہوگئی

میں ڈاکٹر کے پاس جانے سے پرہیز کرتا ہوں کیونکہ میرا یقین ہے کہ سورج کی ہر نئی کرن کے ساتھ زندگی کا ایک دن کم ہوجاتا ہے۔ یہ ایک بے رحم اور اٹل حقیقت ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ مجھے دل کی تکلیف ہے لیکن ڈاکٹر نے مجھے بیاری کے

www.kahopakistan.com

بارے میں اس طرح سمجھایا جیسے میں پرلے درجے کا احمق ہوں۔ اس کے خیال میں یہ ذہنی اور پریشانی کی کیفیت تھی۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں تجویز کیں اور سائیکو تھراپی کے لیے کہا۔ دواؤں کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن سائیکو تھراپی میرے بس کی بات نہیں تھی۔

وہاں سے فارغ ہوکر میں اپنے دفتر چلا آیا۔ میز پر ایک لفافہ رکھا ہوا تھا جس کے ساتھ ہی ایک کاغذ چسپاں تھا جس میں یہ لکھا تھا۔۔۔ اس پر ایک نظر ڈال لو۔ میں پاؤلو کی تحریر پہچان گیا۔ واقعی باس کی بھی کیا شان ہوتی ہے۔ کتنے سکون سے ماتحت کی طرف کیس بڑھا دیتے ہیں۔ میں نے جھلائے ہوئے انداز میں لفافہ کھولا۔ اس میں کچھ تصویریں اور دو عدد اخباری تراشے تھے۔ پہلی خبر کی سرخی تھی۔ ’’نئیچر نہانے کے ٹب میں مردہ پائی گئی۔‘‘ خبر کے مطابق بتیس سالہ لوسیا بینوٹ، ہوٹل مرنڈا کے باتھ ٹب میں ڈوب کر ہلاک ہوگئی۔ وہ ہنی مون منانے گئی تھی۔ یہ ایک حادثاتی موت تھی۔ لوسیا نہانے کے ٹب میں مردہ پائی گئی تھی پھر انہوں نے اس کی مختلف تصاویر کہاں سے حاصل کیں؟ ایک تصویر میں وہ ساحل سمندر پر دونوں ہاتھوں کمر پر رکھے کھڑی تھی۔ دوسری تصویر میں وہ اسکول پارٹی میں بچوں کے درمیان گھری ہوئی نظر آرہی تھی۔ تیسری تصویر پاسپورٹ سائز تھی جس میں اس کے خدوخال واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ وہ بلاشبہ بہت حسین تھی۔ اس کی تصویر دیکھ کر میں جذباتی ہوگیا اور میرے دل میں خواہش ابھری کہ کاش میں لوسیا سے محبت کرسکتا۔ میری اس سے شادی ہوجاتی اور میں اس کے ساتھ اچھے سے ہوٹل میں ڈنر کے لیے جاسکتا۔۔۔ لیکن اب ایسی باتیں سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ لوسیا اس دنیا سے جاچکی تھی۔

میں نے اپنے لیے کافی کا ایک کپ بنایا اور دوسرا اخباری تراشہ دیکھنے لگا۔ اس کی سرخی تھی۔ ’’ہنی مون کا اختتام حادثاتی صورت میں۔‘‘ یہ کہانی بھی ویسی ہی تھی۔ نوبیاہتا عورت ہنی مون کے دوران میں ہوٹل کے باتھ ٹب میں ڈوب کر ہلاک ہوگئی جبکہ اس کا شوہر کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ باقی تفصیلات ملتی جلتی تھیں۔ مرنے والی عورت کا نام نورا برانڈ اور شوہر کا نام نیلسن برانڈو تھا۔

میں نے لوسیا کی تصویر ہاتھ میں لی اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ’’میں ہومی سائڈ محکمے میں گزشتہ پندرہ سال سے سراغ رساں کے طور پر کام کررہا ہوں اور اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ تم نے اور نورا نے محبت کے نام پر جان دے دی۔ تم دونوں کو مارنے والا ایک ہی شخص ہے۔ آج سے میرے اور اس کے درمیان شطرنج کا کھیل شروع ہورہا ہے۔‘‘

فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے سوریا بول رہی تھی۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ’’نہیں سوریا! آج میری نائٹ ڈیوٹی ہے۔ میں تمہیں کل فون کروں گا۔‘‘

سوریا کے بارے میں اتنا بتادینا کافی ہے کہ یہ ایک بلا ہے جو ہاتھ دھوکر میرے پیچھے پڑگئی ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ میں نے لوسیا کی تصویر جیب میں رکھی اور تونبو کو گاڑی نکالنے کے لیے کہا۔ کچھ دیر بعد ہم تفتیش کی غرض سے ہوٹل مرنڈا جارہے تھے۔ میں سراغ رساں کا کام کرتے کرتے تھک چکا تھا اور اب میرا دل چاہتا تھا کہ اپنے ذہن کو پرسکون رکھنے کے لیے کوئی ہلکی پھلکی تفریح کروں۔ اس مقصد کے لیے میں چھٹیاں لینے کا پروگرام بنا رہا تھا لیکن لوسیا کی تصویر دیکھنے کے بعد مجھ پر لازم ہوگیا تھا کہ پہلے اس کے قاتل کو کیفرکردار تک پہنچاؤں۔

ہوٹل مرنڈا کی مالکن کا خیال تھا کہ ساری دنیا کی خوب صورتی اس پر ختم ہے۔ اس کے بال سنہری تھے جنہیں اس نے انتہائی بے ڈھب طریقے سے باندھ رکھا تھا اور باربی ڈول نظر آنے کی کوشش کررہی تھی۔ مجھے ایسی عورتوں سے ہمدردی ہے جو اپنی عمر سے کم نظر آنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کمرے میں آگئے جہاں لوسیا کا قتل ہوا تھا۔ جی ہاں، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اتنے چھوٹے ٹب میں کوئی بھی ڈوب نہیں سکتا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا۔ وہ یقیناً چیخی چلائی ہوگی۔ اس سے بھی زیادہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ وہ ہنی مون کے نام پر اسے اذیت دے رہا تھا۔ ان کی آخری لڑائی باتھ ٹب کے کنارے ہوئی اور اس کے بعد قاتل نے اپنا کام دکھادیا۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا کہ اخبار میں اس بدنصیب عورت کے بارے میں پڑھ کر میری کیا کیفیت ہوئی۔ میرے ذہن میں قاتل کا حلیہ ابھر آیا۔ وہ ایک گنجا اور بدصورت شخص تھا اور

میں اسے دیکھتے ہی پہچان لیتا۔ ابھی دوپہر ہوئی تھی اور میں اب تک نصف درجن کافی کے کپ اپنے حلق میں انڈیل چکا تھا۔ اس دوران سوریا کا دوبارہ فون آیا۔ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میں ڈیوٹی پر ہوں۔ لوسیا کے بارے میں رپورٹ میری میز پر آچکی تھی اور میں نے موت کے سرٹیفکیٹ کو متعدد بار پڑھا تھا۔ ان کے خیال میں یہ ایک حادثاتی موت تھی۔ میں نے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ مقتولہ کے جسم پر کسی طرح کے نشانات نہیں پائے گئے۔ اس کے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور نہ ہی جدوجہد کی کوئی علامت نظر آئی تھی۔ یہ بہت ہی عجیب بات تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ قاتل نے اسے کس طرح مارا ہوگا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ اس بار ہملٹن لائن پر تھا۔ اس نے میری آواز سنتے ہی کہا۔

’’تونبو نے مجھے لوسیا بینوٹ کے کیس کے بارے میں بتایا تھا۔‘‘

’’پھر۔۔۔؟‘‘ میں نے بیزاری کے عالم میں کہا۔ اس وقت میرا کسی سے بات کرنے کا موڈ نہیں تھا۔

’’پھر یہ کہ اس سے سن کر مجھے وہ کہانی یاد آگئی جو کچھ عرصہ قبل میری سالی نے سنائی تھی۔ وہ موکا میں ایک چھوٹا سا ہوٹل چلاتی ہے۔ ایک دن کوئی بندہ کمرا کرائے پر لینے کے لیے آیا۔ اس نے نہ تو کرائے کے بارے میں پوچھا اور نہ ہی یہ جاننے کی کوشش کی کہ ہوٹل میں منی بار، ائرکنڈیشننگ اور دوسری سہولتوں کا انتظام ہے یا نہیں۔ اس نے صرف نہانے کے ٹب کے بارے میں پوچھا اور جب وہ اسے کمرا دکھانے لے گئی تو وہ شخص کپڑوں سمیت ہی ٹب میں لیٹ گیا۔ میری سالی سمجھی کہ وہ کوئی پاگل شخص ہے چنانچہ اس نے اسے کمرا دینے سے انکار کردیا۔‘‘

میں نے جیسے تیسے اس بے سروپا کہانی کو برداشت کیا اور فون رکھنے کے بعد دوبارہ لوسیا کے کیس کی گتھیاں سلجھانے لگا۔ صبح آٹھ بجے گھر جارہا تھا کہ مجھے اپنے سینے میں درد محسوس ہوا۔ کہیں یہ دل کا دورہ تو نہیں؟ کیا میں مرنے والا ہوں؟ میں اپنی کار سے اتر کر باہر آگیا اور ایک ٹیکسی کو روک کر اسے اسپتال چلنے کے لیے کہا۔ میرا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ مجھے وہ سب لوگ یاد آنے لگے جو دل کے دورے کے سبب انتقال کرگئے تھے۔ اوہ خدا۔۔۔ مجھے خدا بھی اس وقت یاد آتا ہے جب لگتا ہے کہ میری موت واقع ہونے والی ہے یا جب کبھی ہوائی جہاز سے سفر کرتا ہوں۔ کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہوگیا۔ دس، نو، آٹھ، سات، چھ۔۔۔ ایمرجنسی روم آگیا تھا۔ گنتی ختم ہوچکی تھی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں ڈاکٹر کی طرف دیکھنے سے گریز کررہا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کہہ دے۔ البتہ اس کے جانے کے بعد میں ان نرسوں پر ضرور چیخا جو میری دیکھ بھال کر رہی تھیں۔

’’میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی تھراپسٹ کو دکھانا چاہیے۔ اس طرح کا حملہ اچانک نازل ہونے والی موت کا پیش خیمہ بھی ہوسکتا ہے۔‘‘ ڈاکٹر نے اپنے طور پر مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسپتال سے باہر آگیا۔ میں نے آسمان کی طرف منہ کرکے لوسیا سے کہا۔ ’’آئندہ مجھے اس طرح بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں فی الحال ایسا نہیں چاہتا۔‘‘

گھر پہنچا تو سوریا صوفے پر لیٹی سو رہی تھی۔ یقیناً اس نے چوکیدار سے کوئی سودے بازی کررکھی ہوگی جبھی وہ اتنی آسانی سے عمارت میں داخل ہوجاتی تھی۔ میری آہٹ سن کر وہ اٹھ گئی اور ایک سگریٹ سلگانے کے بعد اپنے بیگ سے کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔ وہ کالج کی طالبہ تھی اور ابھی اس کی عمر صرف چوبیس برس تھی۔ وہ مجھے کچھ پڑھ کر سنانا چاہ رہی تھی لیکن میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں چنانچہ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

دس گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو وہ صوفے پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس وقت مجھے میریل اسٹریپ یاد آگئی جو مجھے بہت بری لگتی تھی۔ سوریا نے مجھے لوسیا کی تصویر دکھائی جو اس نے میری جیب سے نکالی تھی اور بولی۔ ’’یہ عورت کون ہے؟‘‘

’’میری محبوبہ۔‘‘ میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

’’سوریا! میں نے یہ بات ہمیشہ تم سے چھپائی لیکن اب تمہیں معلوم ہوہی گیا ہے تو اسے برداشت کرلو۔‘‘

وہ دروازہ دھڑام سے بند کرکے چلی گئی۔ میں نے بال وے میں میریل اسٹریپ کے رونے کی آواز سنی جو لفٹ کے آنے کا انتظار کررہی تھی۔

www.kahopakistan.com

دفتر پہنچ کر مجھے ایک فون کال موصول ہوئی جو کسی مورس کیوفراگا نامی شخص کی تھی۔ ''میں ڈیلٹا انشورنس کے قانونی شعبے میں کام کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوسیا بینوٹ کے قتل کی تحقیقات کر رہے ہو؟''

اس کی زبانی یہ انکشاف سن کر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ لوسیا کی موت سے چند گھنٹے پہلے اس کے نام سے ایک بھاری انشورنس پالیسی لی گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ محبت کے نام پر عورت کو کس طرح بے وقوف بنایا جا سکتا ہے... خواہ وہ لوسیا ہو، نورا یا سوریا۔ تینوں ہی بے وقوف تھیں۔

مجھے یہ کام پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا لیکن کام کا دباؤ، میری طاقت اور برداشت سے باہر ہو گیا تھا لیکن پھر بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ مورس۔ کا فون سننے کے بعد میرے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔ میں نے رینا ٹو کو فون کیا جو نورا کی موت کی تحقیقات کر رہا تھا اور اس سے اس کیس کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کو کہا۔ اگلے کے روز میں دفتر سے نکلنے ہی والا تھا کہ وہ رپورٹ مجھے موصول ہو گئی۔ میں نے راستے سے پیزا، کولڈ ڈرنک اور سگریٹ لیے اور گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

میں نے کاغذات کا پلندا کھولا اور انہیں پڑھنے لگا۔ چھ سال پہلے نیلسن برانڈو، کوپاکابان کے ہوٹل پہنچا۔ اس کی حال ہی میں تیس سالہ نورا سے شادی ہوئی تھی۔ شوہر نے ایک ایسے سوئٹ کی فرمائش کی جس میں نہانے کا ٹب ہو۔ دوسرے دن یہ جوڑا کرائسٹ کا مجسمہ دیکھنے چلا گیا اور ان کی واپسی سہ پہر کے بعد ہوئی۔ نورا غسل کے لیے چلی گئی جبکہ شوہر اسپرین خریدنے کے لیے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو دیکھا کہ اس کی بیوی نہانے کے ٹب میں مردہ پڑی ہوئی ہے۔ اس سے معمول کی پوچھ گچھ ہوئی اور نورا کی موت کو حادثاتی قرار دے دیا گیا۔

وہ لوسیا کی طرح خوب صورت نہیں تھی۔ البتہ نیلی آنکھوں کی وجہ سے پرکشش نظر آتی تھی۔ وہ کسی دفتر میں سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتی تھی اور نیلسن سے اس کی ملاقات ایک پیزا ہاؤس میں ہوئی تھی۔ شادی سے ایک دن پہلے اس کے نام سے بھی انشورنس پالیسی لی گئی تھی اور یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کی موت کے بعد وہ کس کے حصے میں آئی ہوگی۔

یہ ایک انتہائی دلچسپ کیس تھا اور اسے تفصیل سے پڑھنے کے بعد جب میں نے اس کا موازنہ لوسیا کے کیس سے کیا تو بہت سی گتھیاں سلجھنے لگیں۔ میں بستر پر دراز ہو گیا اور تقریباً سونے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری جانب سے تو نہو بول رہا تھا۔

''میں نے اس شخص کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اس کا نام ارنیسٹو یا نیلسن نہیں بلکہ وہ گلبرٹو سانٹوس ہے۔ لگتا ہے کہ عورتوں کو ورغلا کر ان سے شادی کرنا اس کا کاروبار ہے اور اسے اس کام میں خاصی مہارت ہو گئی ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق مزید تین عورتیں اس کی فہرست میں موجود ہیں جن سے وہ کیے بعد دیگرے شادی کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دے گا۔''

''تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہی ہے جس کی بنیاد پر ہم اس پر ہاتھ ڈال سکیں؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''یہی تو مسئلہ ہے۔ ابھی تک کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔''

سوموار والے روز میں دفتر پہنچا تو مجھے شدت سے کافی کی طلب ہو رہی تھی لیکن آس پاس کوئی شاپ یا ریستوران نہیں تھا جہاں کافی مل سکے۔ لفٹ کا دروازہ بند تھا اور میرے اردگرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ مجھے اس بھیڑ سے وحشت ہونے لگی۔ مجھے پسینے آنے لگے۔ لگتا تھا کہ لوسیا مجھے فوراً بلانا چاہ رہی ہے لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ میں بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ تو نہو میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو بھی بلا لیا تھا۔

''میں نے تم سے سائیکو تھراپسٹ کے پاس جانے کے لیے کہا تھا۔'' اس نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ میرے پاس اس کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ مجسٹریٹ سے دہری شخصیت رکھنے والے ارنیسٹو یا نیلسن کی گرفتاری کے وارنٹ حاصل کر لیے۔ کسی بھی سراغ رساں کے لیے یہ مرحلے طے کرنا ایک بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔ میں مجسٹریٹ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ کوئی تیسرا شخص فرضی نام اختیار کر کے دھوکا دہی اور قتل کا مرتکب

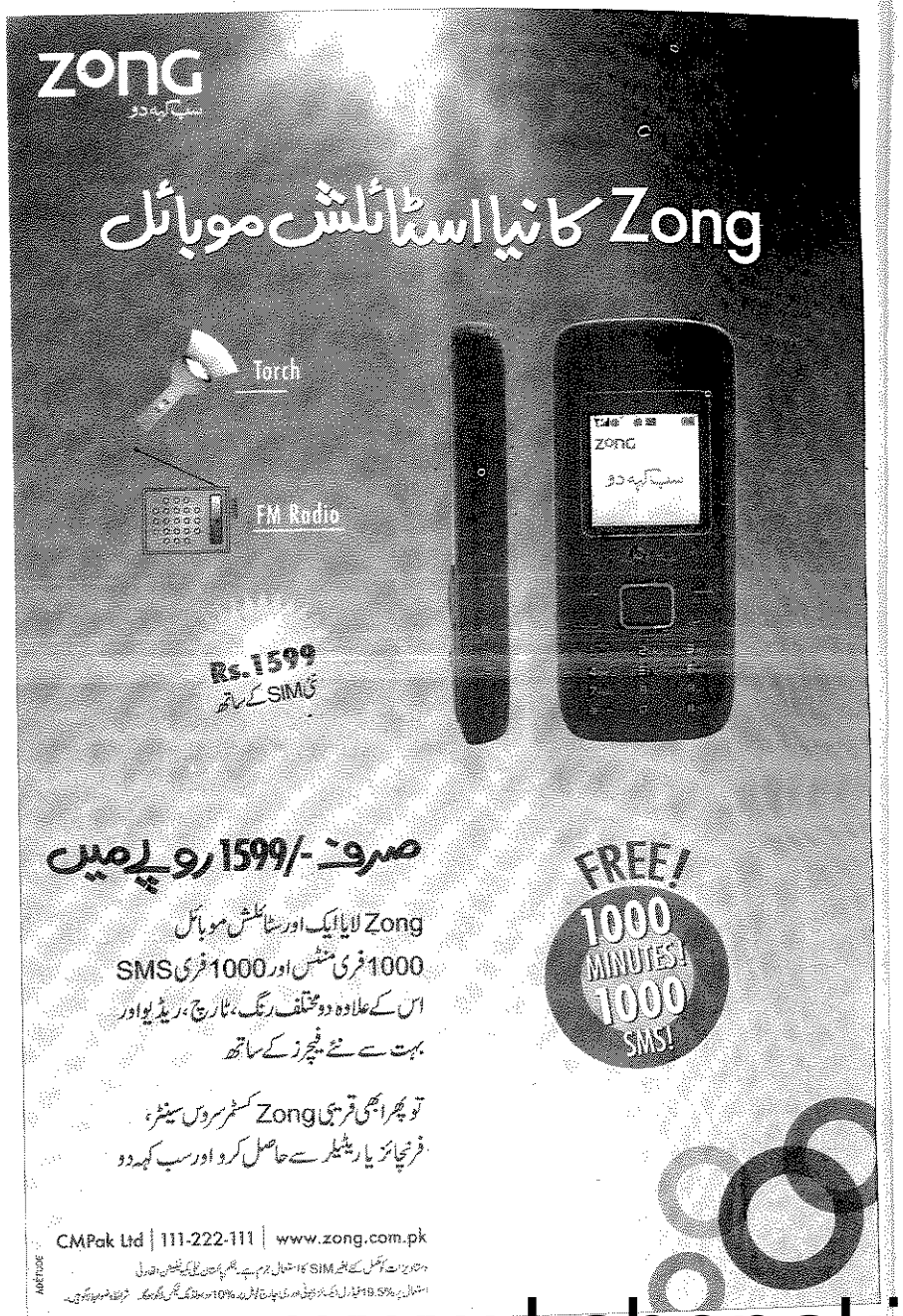

www.kahopakistan.com

ہو رہا ہے اور حقائق تک پہنچنے کے لیے اس کی گرفتاری ضروری ہے۔

میں ہمیشہ اپنے پیشے کو قاتلوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے کے مترادف سمجھتا ہوں۔ چال تیار تھا اور اب میں پوری تیاری کے ساتھ ڈیلٹا انشورنس کمپنی کے دفتر جا رہا تھا جہاں لوسیا کے شوہر سے میرا سامنا متوقع تھا۔

''میرا تعلق ہومی سائڈ سے ہے اور میرے پاس تمہاری گرفتاری کا وارنٹ ہے۔''

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے اس کی شان میں بہت بڑی گستاخی کر دی ہو۔ نہ جانے وہ کیوں اپنے آپ کو مجھ سے برتر سمجھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوسیا جیسی بہترین عورت نے اس فضول سے شخص سے کیوں شادی کر لی تھی؟ کیا اس بے وفا شخص میں کوئی ایسی خوبی تھی کہ کوئی عورت اس سے شادی کر سکے؟

میرے پاس وقت بہت کم تھا اور مجھے صرف پانچ دنوں میں اسے قاتل ثابت کرنا تھا۔ ورنہ وہ رہا ہو جاتا کیونکہ ہمارا قانونی نظام اسی طرح کام کرتا ہے۔ میں نے لوسیا کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کا تفصیلی معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں گریگوریو کا نام آیا جو فارنسک ایکسپرٹ تھا۔ کسی زمانے میں ہم ساتھ ہی کام کرتے تھے لیکن اس کی مالی حالت اچھی نہیں تھی لہٰذا اس نے یونیورسٹی میں پروفیسر کی ملازمت چھوڑ کر ایک نجی فارنسک لیبارٹری میں کام شروع کر دیا جہاں سے اسے اچھی خاصی آمدنی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے فون کیا تو وہ فوراً ہی میری مدد پر آمادہ ہو گیا۔

جب تابوت کا ڈھکنا اٹھایا گیا تو لوسیا پر نظر پڑتے ہی میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ وہ اس حال میں بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ گریگوریو کو اس کے جسم پر تشدد کی کوئی علامت نظر نہیں آئی جبکہ مجھے یقین تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ گزشتہ تین ماہ میں اس طرح کے بارہ واقعات ہوئے تھے لیکن ہماری پولیس کچھ نہیں کر سکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ قاتل دندناتا پھر رہا ہے لیکن یہ سب لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ ان کا کام صرف کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے ورنہ کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا۔

گریگوریو کی رپورٹ کے مطابق لوسیا کا ہارٹ فیل نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اسے زہر دیا گیا تھا۔ وہ نہانے کے ٹب میں بے ہوش بھی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس کی کھال سکڑ گئی تھی اور ڈوبنے کی صورت میں موت واقع ہونے کے سبب ایسا ہونا ممکن تھا۔ بہرحال، کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں ہو رہا تھا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔

گریگوریو میرے ساتھ ہی دفتر آ گیا اور ہم اسی موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔ اسی وقت سوریا بھی چلی آئی۔ اس نے منی اسکرٹ پہن رکھا تھا اور اس کے لمبے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ گریگوریو نے اس پر پسندیدگی کی نگاہ ڈالی۔ وہ خوب صورت عورتوں کا رسیا تھا اور سوریا بھی ایسے لوگوں کو پسند کرتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر ان دونوں میں دوستی ہو جائے تو سوریا سے میری جان چھوٹ سکتی ہے۔

میں نے تونہو کو ہدایت کی کہ وہ ہوٹل مرنڈا کے اس خونی باتھ ٹب کی ہو بہو نقل بنوا کر گریگوریو کی لیبارٹری میں بھجوا دے۔ وہ اس پر کچھ تجربات کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے مجھے فون کر کے تازہ ترین رپورٹ دی اور بتایا کہ اس نے ان تجربات کے لیے یونیورسٹی کی کچھ لڑکیوں کو آزمایا تھا (حیرت ہے کہ اسے سوریا کا نمبر کہاں سے ملا) اور ان تجربات کے نتیجے میں اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ تشدد کے بغیر اس ٹب میں کسی کو ڈبونا ممکن نہیں۔

اب ہماری منزل لایا قبرستان تھا اور ہمیں یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی نورا کی لاش اچھی حالت میں تھی۔ گریگوریو نے بتایا کہ جب ایک لاش کو دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے تو اس پر ایک خاص قسم کا کیمیکل لگا دیا جاتا ہے تاکہ وہ جلدی خراب نہ ہو۔

ہماری یہ کوشش بھی رائگاں گئی اور لاش کے تجزیے سے کوئی نئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ نورا کو بھی لوسیا ہی کی طرح ٹب میں ڈبویا گیا تھا۔ اس کے جسم پر بھی تشدد کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ ہمیں ابھی تک قاتل کے خلاف کوئی چھوٹا سا ثبوت بھی نہیں مل سکا تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ دونوں عورتیں کسی سمندر، دریا یا تالاب میں ڈوب کر ہلاک نہیں ہوئیں بلکہ ان کی لاشیں نہانے کے ٹب سے ملی تھیں اور یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کے ساتھ زبردستی نہ کی گئی ہو۔

گھر پہنچ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ کہیں سوریا کا فون نہ آ جائے کیونکہ میں سونا چاہ رہا تھا لیکن انسان کی ساری خواہشیں کہاں پوری ہوتی ہیں۔ میں گہری نیند میں تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے سوریا پر لعنت بھیجی۔ اس کم بخت کو رات میں بھی چین نہیں تھا... لیکن وہ گریگوریو تھا۔

''تم فوراً میرے پاس آ جاؤ۔''

''اس وقت؟'' میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ ساڑھے چار بجے میں اس کے پاس تھا۔ حالانکہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کے سات بچے ہیں۔ مجھے یہ بات سوریا کو بتا دینی چاہیے۔ کتنا مزہ آئے گا جب ایک نو بیاہتا دلہن سات بچوں کے پیچھے دوڑ لگائے گی۔ گریگوریو مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں اور کمرے کے وسط میں پانی سے بھرا ہوا ایک ٹب رکھا ہوا تھا۔

''اپنے کپڑے اتارو اور اس میں لیٹ جاؤ۔'' گریگوریو ٹب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''کیوں؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے اس طرح دیکھا جیسے اسے اپنے حکم کی تعمیل میں تاخیر گوارا نہ ہو۔ مجھے ایسے لوگ بہت برے لگتے ہیں جو دوسروں پر اپنی مرضی مسلط کریں۔ اس وقت میری پوزیشن بڑی مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ میں ایک ٹی شرٹ اور جانگیا پہنے اس ٹب میں لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ سوریا بھی اس نامعقول شخص سے ملنا پسند نہیں کرے گی۔

''میں نے جان لیا ہے کہ لوسیا اور نورا کو کس طرح قتل کیا گیا ہو گا۔ اپنے پاؤں یہاں رکھو۔'' میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی... حالانکہ میں پہلے سے زیادہ جھنجلایا ہوا تھا۔

''ان کے پاؤں بھی اسی طرح ٹب کے باہر رکھے گئے تھے۔ جانتے ہو کیوں؟''

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ گریگوریو نے میرے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور بولا۔

''میں بتاتا ہوں۔ دیکھو، قاتل یہاں کھڑا ہوا تھا اور اس نے دونوں عورتوں کے پاؤں اسی طرح پکڑ رکھے تھے۔''

میں نے محسوس کیا کہ پانی میری ناک میں تیزی سے جا رہا ہے۔ مجھے چکر آنے لگے۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ مارنا شروع کر دیے۔ پھر اس نے میرے پیر چھوڑ دیے اور میرا سر پانی سے باہر آ گیا۔ گریگوریو نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جب میں نے تمہارے پاؤں پکڑ کر اپنی طرف کھینچے تو پانی فوراً ہی تمہاری ناک کے اندر چلا گیا اور تمہارا اعصابی نظام جواب دے گیا۔ تم بے ہوش ہو گئے۔ اگر میں تمہیں یونہی چھوڑ دیتا تو تم اس ٹب میں ڈوب جاتے اور کسی کو بھی تمہارے جسم پر تشدد کا ہلکا سا نشان بھی نہیں ملتا۔ قاتل نے بھی لوسیا اور نورا کو ڈبونے کے لیے یہی کیا تھا جو میں ابھی ابھی تمہارے ساتھ کر چکا ہوں۔''

میں بہت تھک چکا تھا۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔ گریگوریو نے مجھے پہننے کے لیے دوسرا لباس دیا۔ اس قمیص میں سے مجھے سوریا کی مہک آئی۔ غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا، یہ وہی شرٹ تھی جو میں نے کرسمس کے موقع پر اسے تحفے میں دی تھی۔

''تم نے یہ تجربہ یونیورسٹی کے طالب علموں پر کیوں نہیں کیا؟'' میں نے گریگوریو سے پوچھا۔

''یہ خیال مجھے تھوڑی دیر پہلے ہی آیا تھا جبکہ وہ تو کل شام ہی چلے گئے تھے۔''

ہم دونوں ہنس پڑے۔ میں نے دل ہی دل میں سوریا سے دستبرداری اختیار کر لی۔ گریگوریو کی خدمت کا اس سے اچھا معاوضہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ پھر میں نے لوسیا کا تصور کیا اور خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''میری جان! میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ تمہارا قاتل اب سزا سے نہیں بچ سکتا۔ ہو سکے تو مجھے بھول جانے کی کوشش کرنا کیونکہ میں ابھی کچھ دن اور اس خوب صورت دنیا میں رہنا چاہتا ہوں۔''

☆☆☆

ZONG
سب کہا دو

www.kahopakistan.com

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبار خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا
پھرتا ہے ۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار
کے طواف میں محو رہتا ہے ..... مگر آج عشق کی اقدار
میں تبدیلی ..... وقت کی ضرورت اور حالات کا
تقاضا ہے ..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل
ڈالا ہے ..... کرداروں میں بھی تبدیلی
آچکی ہے ..... سر پھرے عاشق نے اب
ایسے شخص کا روپ دھارا جو
اپنے جذبے اور شعور سے کام
لے کر محبت اور محبت
کے ساتھ ساتھ دیگر
فرائض و منصب
کو بھی پیش نظر
رکھتا ہے ..... ایسے ہی
عاشقوں کے گرد گھومتی
داستان محبت جہاں ایک عاشق
عشق پیشہ ہے ..... عشق میں اس کی
زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے
..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے
زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر .....
عقل و شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے
..... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ..... ایک للکار ہے

للکار

طاہر جاوید مغل

سولھویں قسط

ان عاشق پروانوں کا ماجرا [illegible]

www.kahopakistan.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آ گئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر سیٹھ سراج نے مجھے زدوکوب کیا اور میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صنوبرا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ نیکلس، ہیرے وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صنوبرا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ وہ عمران کو حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سردمہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی موت کا بدلہ لینے کے لیے عمران نے نادیہ کو گولی مار دی۔ میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ میرے اہل خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو موقع سے بھگا دیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیر سے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسد خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی تل پانی میں آ گئی۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کارمختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں مجھے زرگاں میں پگوڈا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صنوبرا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے پگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ مجھ پر تشدد کر کے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر میں بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج گورا کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ سلطانہ بھی یہیں تھی۔ میں وہاں کے تین افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا مگر جارج نے اپنا راستہ بدل دیا۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب و الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ماریا کے اغوا کا مقصد اپنی بہت ساری باتیں منوانا تھا۔ پھر چوہان اور میں نے یہ پتا لگا لیا کہ میرے جسم میں ایک چپ نصب کی گئی ہے۔ ماریا کے وارثوں کو دی گئی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمارے سات افراد کو رہا بھی کیا گیا۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر غار سے نکلنے سے پہلے جیکی وہاں سے غائب ہو گیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چوکی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں احمد اور بخش سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے اور ایک جگہ گھنے سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ میں خاموشی سے وہاں سے نکل پڑا۔ دوسرے دن چلتے چلتے اچانک مجھے زمین پر بیساکھی کے نشانات ملے اور میں انہیں کھوجتا ہوا باروندا جیکی تک جا پہنچا۔ پھر دشمن یہاں بھی پہنچ گئے اور انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہاں مقابلہ شروع ہو گیا۔ دشمن کو وہاں سے مار بھگایا گیا۔ مجھے اور جیکی کو تل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ کی ذہنی حالت خراب تھی۔ ایک دن وہ خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تل پانی پہنچنے والوں میں شگفتا بھی شامل ہے۔ سلطانہ کے غیاب کے بعد اس کی تلاش جاری تھی۔ اسی تلاش کے دوران ہم سلطانہ کے دھوکے میں شگفتا تک پہنچ گئے۔ شگفتا کو دیوان لے آیا گیا۔ میں نے شگفتا کو جیکی کے بارے میں نہیں بتایا مگر ایک رات شگفتا جیکی کے کمرے میں پہنچ گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ صبح ڈاکٹر لی وان کو بلایا گیا۔ اس نے جیکی کو اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا مگر راستے میں ہی جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ پر شک کیا جا رہا تھا۔ میں ایک روز اچانک اپنی نگرانی پر مامور لوگوں کو چکمہ دے کر دیوان سے نکل پڑا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ کٹر ہندو تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ سلطانہ کو اپنے طور پر سزا دینا چاہتے ہیں لیکن ان کے پنڈت کے مطابق وہ سزا ایک خاص آدمی دیتا جو وہ مجھے سمجھ رہے تھے۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ انہوں نے سلطانہ کو جارج اور حکم جی کے لوگوں سے چھڑا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے اور اسے سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ وہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے گیا۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ میرے ہاتھ میں مشعل نما لکڑی تھما دی گئی۔ پھر ایک نوجوان اس پر تیل ڈالنے آیا۔ اس نے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا۔ اس نے عمران کا ذکر کیا تو میں ساکت رہ گیا۔ پھر وہ ہنسا تو اس کے ہموار دانتوں کی قطار نظر آئی۔ وہ عمران تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رات کو وہ مجھ سے ملنے آیا لیکن اپنے بارے میں زیادہ کچھ نہیں بتایا مگر اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ اس نے بتایا کہ مہا گرو اور اس کی بیوی اس کے قبضے میں ہیں۔ گرو نے سلطانہ کی سزا تین دن کے لیے ملتوی کر دی۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھر عمران نے مہا گرو کے ذریعے تاڑی میں دھتورا ملا دیا اور وہاں موجود تمام پہرے دار بے ہوش ہو گئے۔ ہم ایک سکھ سردار کی گھوڑا گاڑی میں وہاں سے فرار ہوئے۔ اچانک درختوں سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ یہ آواز راہول کی تھی جسے ایک ریچھ بھنبھوڑنے میں مصروف تھا۔ عمران نے اس ریچھ کو بھگایا اور راہول کی جان بچائی۔ ہم ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے اور تاؤ افضل نامی شخص کے مکان میں ٹھہرے۔ وہاں قیام کے دوران گروسو بھاش وہاں سے بھاگ نکلا۔ یہ صورت حال تشویشناک تھی۔ ہم نے تاؤ افضل کا گھر چھوڑ دیا اور جنگل میں سفر کرنے لگے۔ ہمارا وہاں مزید ٹھہرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ تاؤ افضل اور اس کی بیٹیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ جنگل میں ہمیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ میں نے عمران سے کہا کہ وہ مجھے کچھ کرنے دے تاکہ سلطانہ کا مجھ پر اعتماد بحال ہو۔ میں نے ایک ڈاکو سے دوبدو مقابلہ کیا اور اس مقابلے کو تماشے کی شکل دے دی۔ مجھے کئی چوٹیں آئیں مگر میں نے اپنے مدمقابل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکوؤں کی فائرنگ سے راہول مارا گیا۔ ہم واپس بستی میں آئے مگر ہم نے ایک مندر کے تہ خانے میں قیام کیا۔ ہمارا وہاں قیام آفتاب خاں نامی شخص کے تعاون سے ہوا۔ رات کو آفتاب باہر سے کوئی بری خبر لایا۔ اس نے بتایا کہ حالات ٹھیک نہیں۔ وہاں کافی ہندو جمع تھے۔ ہم نے ہوادان سے مندر کا منظر دیکھا۔ جنونی ہندوؤں نے گروسو بھاش کا سر کاٹ دیا تھا اور پوجا پاٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے تاؤ افضل کے چچیرے بھائی کی فیملی کو بھی یرغمال بنا لیا تھا۔ انہوں نے باقی لوگوں کو تو چھوڑ دیا مگر کلثوم نامی جوان لڑکی کو پکڑ لیا تھا۔ میں رات کو آفتاب کی مدد سے مندر کے تہ خانے سے باہر نکل پڑا اور مکھیا کے مکان میں گھس گیا اور مکھیا کے بیٹے سے لڑکی کا پتا پوچھا۔ اس دوران میں وہ مجھ پر حملہ آور ہوا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میں نے اس کی لاش گھر میں موجود کنوئیں میں پھینک دی۔ میں اس مکان تک پہنچ گیا اور کلثوم کو وہاں سے نکال لایا۔ ہم واپس تہ خانے میں پہنچ گئے۔ سب میری اس دلیری پر حیران تھے۔ گروسو بھاش کی موت کے بعد جنونی ہندوؤں کے دو گروہ بن گئے تھے اور ان میں کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی تھی۔ کلثوم کے فرار کے بعد مہندر نے اس کا الزام رام پرشاد کی بہو پر لگایا اور فیصلہ ہوا کہ رام پرشاد جلتے تیل میں ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے گا۔ پھر پرکھشا کا وقت آ گیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل میں ہاتھ ڈال دیے۔ وہ چلانے لگا۔ اس کے ہاتھ جل گئے تھے پھر جنونی ہندوؤں نے رام پرشاد کو ہلاک کر دیا اور مالا کو پکڑ لائے۔ اب اسے جلتے تیل میں پھینکا جانے والا تھا۔ پھر عمران نے کچھ کرنے کا کہا اور گولی چلا دی۔ مہندر مارا گیا۔ ستیش کے آدمیوں نے بھی گولیاں چلا دیں اور وہ لوگ مالا کو نکال لے گئے۔ مندر میں آگ لگ گئی تھی۔ ہم واپس تہ خانے میں آ گئے۔ میں رات میں دوبارہ مندر سے نکلنا چاہتا تھا مگر عمران نے مجھے روک لیا۔ میری گردن کے زخم سے خون کا رساؤ پھر شروع ہو گیا تھا اور تکلیف بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں درد سے لڑتا رہا۔ درد شدید تھا۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ سلطانہ نے مجھے آواز دی۔ وہ بھی اٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ تشویش تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

درد کی ٹیسیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے سلطانہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”کچھ نہیں۔ بس زخم میں تھوڑا سا درد ہے۔“ کوشش کے باوجود میری آواز تھرا گئی۔

سلطانہ چونک کر کھڑی ہو گئی اور سیدھی میری طرف آئی۔ اس کے چہرے کی تشویش کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اب چھوٹی موٹی تکالیف کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ میری غیر معمولی جسمانی قوت برداشت کی بھی قائل ہو چکی تھی۔ وہ بہت ذہین تھی۔ سمجھ گئی کہ اگر اتنی برداشت کے باوجود میرے چہرے پر تکلیف کے آثار ہیں اور میں نے درد کی بات کی ہے تو پھر یہ کوئی معمولی درد نہیں ہے۔

وہ پلٹ کر میرے عقب میں آئی۔ اس نے میری گردن پر ہاتھ رکھا۔ اس کا ہاتھ مجھے ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا محسوس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری گردن اور شاید پورا جسم ہی بری طرح تپ رہا ہے۔ اس نے منہ سے چچ چچ کی آواز نکالی اور سراسیمہ لہجے میں بولی۔ ”مہروج! لگتا ہے کہ زخم خراب ہو رہا ہے۔ ساری جگہ سرخ ہو رہی ہے۔ سوجن بھی جیادہ ہو گئی ہے... میں عمران کو بلا کر لاتی ہوں۔“

میرے روکتے روکتے وہ باہر نکل گئی۔ ذرا دیر بعد عمران اور اقبال بھی میرے کمرے میں تھے۔ میری صورت دیکھتے ہی وہ دونوں سمجھ گئے کہ میں بے پناہ تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ عمران نے بھی میرے زخم کا معائنہ کیا۔ بے شک زخم کی حالت اچھی نہیں تھی لیکن میرا درد زخم کی نوعیت سے زیادہ تھا۔

جلد ہی عمران بھی اس نتیجے پر پہنچ گیا جس پر تھوڑی دیر پہلے میں پہنچا تھا۔ وہ دبے دبے لہجے میں بولا۔ ”یہ معاملہ کچھ اور لگ رہا ہے...“

سلطانہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید وہ وضاحت چاہ رہی تھی لیکن عمران نے وضاحت نہیں کی۔ اس نے ایک طرف جا کر اقبال سے کچھ کہا۔ اقبال کمرے سے باہر گیا اور چند ہومیوپیتھک دوائیں لے کر آیا۔ یہ وہی دوائیں تھیں جو وہ استھان میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے ستیش اور گروسو بھاش وغیرہ کے سامنے خود کو ہومیوپیتھک ڈاکٹر ظاہر کیا ہوا تھا اور اس طرح گروسو بھاش کی نگاہوں میں اہمیت حاصل کر رکھی تھی۔ حالانکہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا اور ہومیوپیتھی کے بارے میں بھی معمولی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ ان دواؤں میں ایک دو درد کش ادویات موجود تھیں۔ عمران اور اقبال نے ان دواؤں کے ذریعے میرا درد کم کرنے کی کوشش کی۔ کچھ فرق نہیں پڑا۔ میرا بالائی دھڑ سُن ہوتا جا رہا تھا۔ سلطانہ کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اگر درد کوئی چھین لینے والی چیز ہوتی تو وہ کسی کو خاطر میں لائے بغیر اور اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے یہ درد مجھ سے چھین لیتی اور کسی صورت واپس نہ کرتی۔

بے پناہ درد اور میری قوت برداشت کے درمیان پانی پت کی لڑائی جاری رہی۔ ہم میں سے کوئی بھی ہارا نہیں۔ میں نے اپنی ہر کراہ کو اپنے ہونٹوں کے اندر محصور رکھا پھر قدرت کو مجھ پر ترس آ گیا۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہوش

www.kahopakistan.com

سے بے ہوشی کی سرحد میں داخل ہوتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا ہے اور کپڑے بھیگ چکے ہیں۔ سلطانہ میرے چہرے پر ہاتھ پھیر رہی ہے اور کرب ناک انداز میں کچھ کہہ رہی ہے۔ عمران کی آواز بھی مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

...دوبارہ ہوش آیا تو میں کروٹ لیے بستر پر لیٹا تھا۔ سر بھاری تھا اور ہلکا سا خمار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میری نگاہ سامنے بیٹھے اقبال پر پڑی۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اب طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

میرا دھیان فوراً اپنی گردن کے درد کی طرف گیا۔ درد کی لہریں اب بھی اٹھ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی جس کے سبب میں ان لہروں کو زیادہ شدت سے محسوس نہیں کر رہا تھا۔

”میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تاؤ افضل نے تمہیں افیم کھلانے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ مشورہ کامیاب رہا ہے۔ تم پچھلے آٹھ پہر اطمینان سے سوئے رہے ہو۔“ اقبال نے اطلاع دی۔

میں حیران رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ میں اپنی صورتِ حال سے بے خبر رہا ہوں۔ متلی کی سی کیفیت محسوس ہوئی، اس کے علاوہ مثانے پر بوجھ بھی محسوس ہوا۔

”سلطانہ کدھر ہے؟“ میں نے اقبال سے دریافت کیا۔

اقبال نے انگلی سے دائیں طرف اشارہ کیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا، سلطانہ ایک گوشے میں گدیلے پر کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ نڈھال ہو کر سوئی ہے۔

اقبال نے بتایا۔ ”بھابی، کل رات پچھلے پہر سے مسلسل جاگ رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ ایسے تو آپ خود بیمار ہو جاؤ گی۔ بڑی مشکل سے کہہ سن کر تھوڑی دیر کے لیے لٹایا ہے۔“

”عمران کہاں ہے؟“

”وہ کہیں گیا ہے۔ کل صبح سویرے نکل گیا تھا۔“

”اب کیا وقت ہوا ہے؟“

”صبح کے چار بجنے والے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ عمران کو نکلے تقریباً چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں... اس نے بتایا نہیں کہ کدھر جا رہا ہے؟“ میرے لہجے میں تشویش داخل ہو گئی۔

”تمہیں تو پتا ہی ہے، اس سے کچھ پوچھنا کتنا مشکل ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے لیے ہی گیا ہے۔ شاید کوئی ڈاکٹر یا حکیم وغیرہ ڈھونڈنے کے لیے۔“

ہم بہت مدھم آواز میں بات کر رہے تھے لیکن جب بات کرتے کرتے میں کھانسا تو سلطانہ ذرا سا کسمسائی۔ چند لمحے کے لیے لگا کہ وہ جاگ جائے گی مگر پھر کمبل اپنے جسم پر درست کرتے ہوئے دوبارہ بے حرکت ہو گئی۔

میرا گلا خشک ہو رہا تھا اور جسم کی حدت بتا رہی تھی کہ بخار بھی جوں کا توں موجود ہے۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی مگر پانی پینے سے پہلے میں اس پانی کا بوجھ کم کرنا چاہتا تھا جو میرے مثانے میں موجود تھا۔ میں بستر سے اٹھا تو یوں لگا جیسے گردن کے عقبی حصے پر کسی نے ہتھوڑا رسید کر دیا ہو۔ ایک بار پھر کند حسن ہونا شروع ہو گئے۔ اقبال نے سہارا دینا چاہا مگر میں جیسے تیسے خود ہی غسل خانے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو درد کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر میں نے اپنی قوتِ برداشت کو آواز دی۔ کتنی ہی دیر تک درد سے لڑتا رہا۔ اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا رہا اور اس کے سامنے جھکنے سے انکار کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے آنکھیں پھر بوجھل ہو گئیں، احساس کند ہونے لگا۔ میں پھر سو گیا یا شاید نیم بے ہوش ہو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو سلطانہ میرے پاس موجود تھی۔ غالباً اس نے ہولے ہولے آواز دے کر مجھے جگایا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر اپنے کپڑوں پر پڑی۔ یہ کپڑے وہ نہیں تھے جو میں نے پہلے پہن رکھے تھے۔ ”میرے کپڑے کس نے بدلے؟“ میں نے سلطانہ سے پوچھا۔

”میں نے... آپ کے زخم کو صاف کر کے نئی پٹی کی تھی۔ کپڑوں کو خون وغیرہ لگ گیا تھا۔“ سلطانہ نے سادگی سے جواب دیا۔

زرگاں کے حجام عبدالرحیم نے کچھ عرصے پہلے مجھے سلطانہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ماضی میں جب میں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا، وہ بچوں کی طرح میری دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی۔ میرا منہ ہاتھ دھلاتی تھی، غسل کراتی تھی، میرے کھانے پینے اور سونے جاگنے کا دھیان رکھتی تھی۔ شاید آج اس نے جو کچھ کیا، وہ اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

میں اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک وہ بات کی تہ تک پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ اس نے بند کمرے میں میرا پورا لباس تبدیل کیا تھا۔ وہ اکثر بہت سنجیدہ رہتی تھی لیکن جب وہ کسی بات پر شرماتی تھی تو اس کے چہرے پر عجیب سے دلکش رنگ

بکھر جاتے تھے۔ ان رنگوں کو چھپانے کے لیے وہ دائیں بائیں ہو جاتی تھی۔ آج بھی اس نے یہی کیا۔ ”میں تمہارے لیے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

اسی دوران میں آفتاب خاں کمرے میں داخل ہو گیا۔ گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ”اب آپ کا حالت پہلے سے کچھ اچھا لگتا ہے۔“ اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، کچھ فرق تو ہے۔“

”اصل میں کل شام آپ کی بی بی نے اقبال بھائی کے ساتھ مل کر آپ کا زخم اچھی طرح صاف کیا ہے اور پٹی وغیرہ بھی باندھا ہے۔“

”عمران واپس آیا یا نہیں؟“ میں نے آفتاب سے پوچھا۔

”آ گیا جی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی ساتھ لے کر آیا ہے۔“

”کہاں ہے ڈاکٹر؟“

آفتاب خاں چند سیکنڈ تک چپ رہا پھر سرگوشی میں بولا۔ ”اگر آپ اٹھ کر آ سکتا ہے تو آئیں... ام آپ کو دکھاتا ہے۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”کہاں جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خو، زیادہ دور نہیں۔ بس عمران بھائی کے کمرے تک۔“

میں اٹھا اور آفتاب کے ساتھ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر عمران کے کمرے تک پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ آفتاب خاں مجھے ایک جانب سے گھما کر کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف لے گیا۔ اس نے ادھ کھلے پٹ میں سے مجھے اندر کا منظر دکھایا۔ منظر دیکھنے سے پہلے ہی مدھم آوازیں میرے کانوں میں پڑنا شروع ہو گئیں۔ ان میں سے عمران کی آواز کو میں نے بہ آسانی پہچان لیا۔ اندر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر ایک جانے پہچانے چہرے پر پڑی۔ یہ ڈاکٹر لی وان تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے جاپانی خدوخال صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس نے فر کا کوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے کھچڑی بالوں کا ہم رنگ تھا۔ وہ اپنے دبلے پتلے جسم کے ساتھ کرسی پر تن کر بیٹھا تھا۔ طیش کے سبب اس کی آنکھوں سے شرارے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

”...تم علاج کی بات کرتے ہو، میں تم لوگوں کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ تم لوگ مجھے زبردستی لے کر آئے ہو۔ مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کیا ہے تم لوگوں نے۔ میں تمہارے خلاف مقدمہ کروں گا۔ تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔“ وہ غصے کے سبب کرسی سے اچھل پڑ رہا تھا۔

عمران نے انگریزی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں ڈاکٹر! لیکن میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ آپ میری بات سمجھ نہیں پا رہے تھے اور میرے پاس وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ یقین کریں ڈاکٹر...“

”میں تمہاری کوئی بکواس سننا نہیں چاہتا۔“ ڈاکٹر لی وان دہاڑا... ”تم میری آنکھوں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ... میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ۔“ ڈاکٹر نے طیش میں سالن سے بھری ہوئی ایک پلیٹ اٹھا کر عمران کو دے ماری۔ عمران نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ کر خود کو پلیٹ کی زد سے بچایا۔

عمران کے بچ جانے سے ڈاکٹر کے طیش میں مزید اضافہ ہوا۔ اس نے ٹرے میں سے دو تین برتن اٹھا کر عمران پر کھینچ مارے، آخر میں اسٹیل کی وزنی ٹرے بھی عمران کی طرف روانہ کر دی۔ عمران نے اچھل کود کر یہ سارے وار بچائے۔ عمران پر چیزیں پھینکنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر چلا بھی رہا تھا۔ ”دفع ہو جاؤ... مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“

عمران کو نشانہ بنانے کی کوششوں میں ناکام ہو کر ڈاکٹر نے دیوار پر سے کالے رنگ کا چھاتا اتار لیا۔ اس چھاتے کو چھڑی کی طرح پکڑ کر وہ عمران پر پل پڑا... وہ عمران جیسے برق رفتار کو کیسے نشانہ بنا سکتا تھا... یہ عمران کی مہربانی تھی کہ اس نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے دو چار چوٹیں ڈاکٹر سے کھا لیں۔ اس سے ڈاکٹر کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ اس مارا ماری میں چھاتا بھی ٹوٹ گیا۔ ڈاکٹر نے پھنکارتے ہوئے چھاتا ایک طرف پھینکا اور پھر نیم جان سا ہو کر بستر پر گر گیا۔ اس کا سینہ بری طرح پھول پچک رہا تھا۔ ”دفع ہو جاؤ۔“ وہ ایک بار پھر چنگھاڑا اور اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ عمران اور اقبال پر نہ پڑے۔ سرہانے کی طرف ڈاکٹر کا جہازی سائز میڈیکل باکس بھی نظر آ رہا تھا۔

چھاتے کی چوٹیں عمران کے کندھوں پر لگی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کندھوں کو ذرا سا سہلایا پھر اس کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے چند سیکنڈ تک ڈاکٹر کے مزید ردِعمل کا انتظار کیا پھر ہولے سے اس کے پاؤں کی طرف چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر بدستور آنکھوں پر

www.kahopakistan.com

بازو رکھے لیٹا تھا...عمران نے ہولے ہولے اس کے پاؤں دبانا شروع کر دیے۔ غیر متوقع طور پر ڈاکٹر نے کوئی خاص ری ایکشن نہیں دکھایا۔ موقع بہتر جان کر عمران نے اقبال کو بھی آنکھ سے اشارہ کیا۔ اقبال بھی خاموشی سے ڈاکٹر کے سرہانے بیٹھ گیا اور نرمی سے اس کے کندھے دبانے لگا۔

آفتاب نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''عمران بھائی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے لگتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کسی کو گولی مار دے گا یا پھر اپنے آپ کو شوٹ فرما لے گا۔''

تین چار منٹ اسی طرح گزر گئے۔ ڈاکٹر لی وان چارپائی پر چیت لیٹا رہا اور عمران اور اقبال خشوع و خضوع سے اس کی مٹھی چاپی کرتے رہے۔ آخر ڈاکٹر لی وان کی بھرائی ہوئی ناراض آواز سنائی دی۔ ''کہاں ہے تمہارا مریض؟''

عمران بولا۔ ''میں آپ کو بتاتا ہوں لیکن پہلے آپ کو مجھے معاف کرنا پڑے گا۔ یہ دیکھیں، میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں اور سچے دل سے معافی مانگتا ہوں۔'' اس نے دونوں ہاتھ ڈاکٹر کے سامنے جوڑ دیے۔

ڈاکٹر نے منہ پھیر لیا۔ عمران اٹھ کر گیا اور قریبی دیوار سے ایک اور چھاتا اتار کر لے آیا اور ڈاکٹر کے پاس رکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ کا غصہ کم نہیں ہوا تو مزید مار لیں لیکن پلیز آخر میں معاف ضرور کر دیں۔''

اس نے اتنی مسکین صورت بنا رکھی تھی کہ ڈاکٹر کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا...اس نے گہری سانس لی اور اٹھ کر چارپائی پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ قدرے نرم آواز میں بولا۔ ''اب خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے بتاؤ مریض کہاں ہے؟''

عمران نے بڑے جذباتی انداز میں ''تھینک یو ڈاکٹر'' کہا پھر اسے بتایا کہ مریض یہاں پاس ہی ایک کمرے میں ہے۔

میں اور آفتاب کھڑکی کے سامنے سے ہٹے اور تیزی کے ساتھ واپس کمرے میں پہنچ گئے۔ سلطانہ گرم دودھ لیے میری چارپائی کے قریب کھڑی تھی اور کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

میں اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ نقل و حرکت کی وجہ سے گردن میں اٹھنے والی ٹیسیں شدید تر ہو گئی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی چند سیکنڈ میں اس راجواڑے کا قابل ترین ڈاکٹر کمرے میں قدم رکھنے والا ہے۔ میں اس کے لیے نیا مریض نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی تل پانی کے مضافات میں اپنے اسپتال کے اندر میرا تفصیلی معائنہ کر چکا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر چوہان بھی میرے ساتھ تھا۔ میرے معائنے کے بعد ڈاکٹر لی وان نے یہ حتمی رائے دی تھی کہ راجواڑے میں سہولتیں ناکافی ہیں۔ ان ناکافی سہولتوں کے ساتھ میرا آپریشن ایک بہت بڑا رسک ہو گا۔

سوچنے کی بات تھی کہ کیا اب یہاں ڈاکٹر لی وان اپنی رائے تبدیل کر سکے گا جبکہ یہاں اتنی سہولتیں بھی نہیں تھیں جتنی تل پانی کے اسپتال میں تھیں۔

میں نے سلطانہ کو دودھ سمیت کمرے سے باہر بھیج دیا۔ حسب توقع چند سیکنڈ بعد عمران اور اقبال ڈاکٹر لی وان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنی تفصیلی روداد میں عمران کے سامنے ڈاکٹر لی وان کا ذکر تو کیا تھا مگر اب یوں لگ رہا تھا کہ عمران اور اقبال اس امر سے بے خبر ہیں کہ یہی وہ ڈاکٹر ہے جس کے پاس چوہان مجھے لے کر گیا تھا۔

مجھے بغور دیکھ کر ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے اپنی عینک درست کی اور ایک بار عمران کی طرف دیکھنے کے بعد دوبارہ مجھ پر نظر جما دی۔ ''تو یہ ہے مریض؟'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا...اور ڈاکٹر کا میڈیکل باکس تپائی پر رکھ دیا۔

''ہم ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہارا نام تابش ہے نا...جیکی کی ڈیتھ کے بعد تم ڈاکٹر چوہان کے ساتھ میرے پاس آئے تھے۔''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ٹھیک پہچانا ہے ڈاکٹر۔''

''تمہیں یہاں اتنی دور دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہو رہی ہے۔ بہرحال، یہ باتیں تو بعد میں بھی پوچھی جا سکتی ہیں۔ فی الحال تمہارا فوری مسئلہ کیا ہے؟''

میں نے گردن گھماتے ہوئے کہا۔ ''چند روز پہلے یہاں پیچھے کی طرف مجھے زخم آیا تھا۔ یہ زخم اب بہت تکلیف دینے لگا ہے...بہت زیادہ۔''

ڈاکٹر نے اپنے میڈیکل باکس میں سے ایک ٹارچ اور دو چار اوزار نکالے۔ اس کے بعد بڑی توجہ سے میرا زخم دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ سیٹی کی سی آواز نکلی اور وہ میرے زخم پر کچھ اور بھی جھک گیا۔

''یہ تو بہت سیریس معاملہ ہے۔'' چند سیکنڈ بعد جاپانی ڈاکٹر نے لرزاں آواز میں کہا۔

''اسی لیے تو آپ کو یہاں لائے ہیں۔'' عمران نے گہرے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

ڈاکٹر نے تفتیشی خیز نظروں سے پہلے مجھے اور پھر عمران کو دیکھا۔ تب عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟''

''ہم بہت قریبی دوست ہیں۔''

''اپنے قریبی دوست کے بارے میں تم کیا کچھ جانتے ہو؟ خاص طور سے اس کے اس زخم کے بارے میں؟''

''آپ کس حوالے سے پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے اس موقع پر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''عمران! ڈاکٹر لی وان ہی وہ ڈاکٹر ہیں جن کے پاس چوہان مجھے لے کر گیا تھا۔ انہوں نے اپنے اسپتال میں میرے ٹیسٹ لیے تھے اور تفصیلی معائنہ بھی کیا تھا۔ اتفاق ہے کہ آج تم ڈاکٹر لی وان کو ہی میری مدد کے لیے لائے ہو۔''

عمران نے ہونٹ سکیڑے اور ایک بار پھر غور سے لی وان کو دیکھنے لگا۔ یقیناً اسے اور اقبال کو وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جو میں نے انہیں اس ماہر ڈاکٹر کے بارے میں بتائی تھیں۔

آخر عمران نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ہمیں اب ڈاکٹر صاحب کو زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''ہاں، تمہیں زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور نہ ہی مجھے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت پڑے گی۔'' ڈاکٹر کا لہجہ ایک بار پھر ترش ہو گیا۔

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر نے ایک بار پھر ٹارچ روشن کی اور میری گردن کے عقبی حصے کا بغور معائنہ کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ایک لفظ کہے بغیر اپنے اوزار وغیرہ واپس میڈیکل باکس میں رکھ دیے اور گمبھیر انداز میں بولا۔ ''میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ اس مریض کا جلد سے جلد اسٹیٹ سے باہر جانا ضروری ہے تاکہ الٰہ آباد یا جھانسی وغیرہ میں اس کا آپریشن ہو سکے۔ اب تم لوگوں نے معاملہ بہت خراب کر لیا ہے۔''

''آپ...کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ زخم تمہیں کیسے لگا؟'' ڈاکٹر لی وان نے پوچھا۔

''ہم جنگل سے گزر رہے تھے۔ ڈکیتوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان کے ساتھ لڑائی ہوئی جس میں یہ چوٹ لگی۔'' میں نے سچ بتا دیا۔

''یہ چوٹ تمہیں ایسی جگہ پر لگی ہے جہاں ہرگز ہرگز نہیں لگنی چاہیے تھی۔ تمہارا اندر کا نظام گڑبڑ ہو گیا ہے۔''

''آپ چپ کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر لی وان نے تاسف سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''چپ کے اردگرد کا ایریا متاثر ہو گیا ہے...تمہارے کندھے اور کمر کا اوپر والا حصہ تو سن نہیں ہو رہے؟''

''ہاں، ایسا تو اب بھی محسوس ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

ڈاکٹر لی وان کے نہایت تجربہ کار چہرے کی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ وہ عمران اور اقبال کو لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ ان کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں ناقابل برداشت درد سے میری طویل جنگ جاری رہی۔ ڈاکٹر کمرے میں واپس نہیں آیا تھا۔ عمران اور اقبال کے چہرے ستے ہوئے تھے۔

میں سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''پریشانی کی بات نہیں۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''یار! یہ رسمی باتیں مت کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ، ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟''

وہ چند لمحے تک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''ڈاکٹر کہتا ہے کہ معاملہ اور بگڑ سکتا ہے۔ فوری آپریشن ضروری ہے...اور یہ آپریشن یہاں کسی صورت نہیں ہو سکتا۔''

''...اور اس کے لیے اسٹیٹ سے باہر جانا ہو گا۔'' میں نے عمران کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اب وہ یہ نہیں کہہ رہا۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ زیادہ دیر انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ہم کسی طرح تل پانی پہنچ سکیں تو وہ وہاں اپنے اسپتال میں یہ آپریشن کر دے گا...لیکن...''

''لیکن کیا؟'' میں نے پوچھا۔

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ کہہ رہا ہے کہ اس میں بھی کچھ نہ کچھ خطرہ تو ہے۔''

میں جانتا تھا کہ عمران صورتِ حال کی سنگینی کو بہت کم کر کے بیان کر رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر نے پہلے کی طرح اس آپریشن کے سلسلے میں خاصے خدشات کا اظہار کیا ہو گا۔

''پھر کیا خیال ہے؟'' میں نے اپنی کراہیں سینے کے اندر ہی گھونٹتے ہوئے کہا۔

''کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا پڑے گا اور جلد ہی نکالنا

www.kahopakistan.com

پڑے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں تکلیف بہت زیادہ ہے۔“

عمران بہت کم پریشان نظر آتا تھا مگر اس وقت وہ پریشان تھا۔ کچھ یہی کیفیت اقبال کی بھی تھی۔ صورتِ حال واضح تھی۔ اگر ہم اس تین منزلہ تہ خانے سے نکل کر تل پانی پہنچنے کی کوشش کرتے تو زیادہ دور نہ جا سکتے۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ حکم کے لوگ اردگرد موجود ہیں اور پوری جاں فشانی سے چپ کے سگنل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ہم اس تہ خانے کے اندر رہتے تو بھی نتیجہ سامنے تھا... میری تکلیف ہر گھڑی بڑھتی جا رہی تھی۔

ابھی ہم تینوں کی بات چیت جاری تھی کہ آفتاب خاں اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ”عمران بھائی! آپ یہ کیا چیز پکڑ لایا ہے۔ آپ اس کو ڈاکٹر کہتا ہے لیکن ام کو تو یہ خود مریض لگتا ہے۔ ایسا چڑ چڑا بندہ تو ام نے پورے انڈیا میں نہیں دیکھا۔“

”ایسے بندے انڈیا میں نہیں جاپان میں ہوتے ہیں لیکن ہوا کیا ہے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”بس ایک دم آگ بگولا ہو رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ ام کو واپس چھوڑ کر آؤ۔ ام ایک منٹ یہاں نہیں رکے گا۔ ام اس کا دل بہلانے کے لیے چائے لے کر گیا لیکن اس نے چائے کا پیالی ام پر پھینک دیا۔ یہ دیکھیں، سارا کپڑا خراب ہو گیا امارا۔ یہ آپ کا لحاظ ہے کہ ام چپ رہا۔ ورنہ ایسے چڑی جیسے بندے کو تو ایک دم مسل کر رکھ دے۔“

”خبردار! کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنی۔“ عمران نے اسے جھاڑا۔ ”اس کے چڑی جیسے جسم پر نہ جاؤ... وہ ایک بہت بڑا ڈاکٹر ہے اور اس وقت ہمیں اس کی بہت سخت ضرورت بھی ہے۔ اس کی ہر بات برداشت کرنی ہوگی۔“

”نن... نہیں جی... ام نے اس کے سامنے تو کوئی بات نہیں کہی۔ صرف آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ اب وہ مسلسل آپ کو بلا رہا ہے۔ اب کیا کہوں اس سے؟“

”ٹھیک ہے، میں خود دیکھتا ہوں۔“ عمران نے کہا اور اٹھ کر ڈاکٹر کی طرف چلا گیا۔

دوپہر تک میری حالت مزید بگڑ گئی۔ بخار 104 تک چلا گیا اور کمر کا بالائی حصہ بالکل سُن ہونے لگا۔ سلطانہ مسلسل میرے سرہانے بیٹھی تھی اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں میری پیشانی پر رکھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے وہ گیلا کپڑا میرے پورے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر بھی پھیر دیتی تھی۔ عمران نے ڈاکٹر لی وان کی ہدایت کے مطابق مجھے کچھ پین کلرز دی تھیں، تاہم محسوس ہوتا تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان دواؤں کا اثر ختم ہوتا جا رہا ہے... اب تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں طویل سفر کے قابل ہی نہیں رہا... اگر عمران وغیرہ مجھے تل پانی لے جانا چاہیں تو میں جا نہیں پاؤں گا۔ مجھے گاہے بگاہے غشی کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی تھی اور یہ میری تکلیف کے لیے خطرناک علامت تھی۔

سہ پہر کے وقت جب میری طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو عمران اور ڈاکٹر ایک بار پھر میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے دوبارہ میرے زخم کا معائنہ کیا... تب وہ دونوں بغیر کچھ کہے سنے واپس چلے گئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد اقبال اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر امید کی ہلکی سی کرن تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا... ڈاکٹر لی وان آپریشن کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔“

”کہاں؟“

”یہیں پر... وہ کہتا ہے کہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تیاری کر لیتا ہوں۔ پھر ”لوکل انستھیسیا“ دے کر آپریٹ کر دوں گا۔ ابھی اس نے تمہارے زخم کو اچھی طرح دیکھا ہے... اس نے امید دلائی ہے کہ وہ چپ علیحدہ کر لے گا۔“

اقبال میرے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ سلطانہ کو حوصلہ دینے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ وہ اصل صورتِ حال بتا نہیں سکتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ اصل صورتِ حال کہیں زیادہ سنگین ہے۔

ڈاکٹر لی وان تو تل پانی میں بھی آپریشن کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس تہ خانے کے نامناسب ترین حالات میں کیسے تیار ہو گیا؟ اس سوال کا ایک ہی جواب تھا... اور وہ یہ کہ میری جان خطرے میں تھی۔ تاخیر کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ”کوشش“ کے بغیر ہی مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیا جائے۔

عمران اور جیکی جیسے لوگوں کے ساتھ رہنے کے بعد میں بہت بدل چکا تھا۔ میری کم ہمتی ایک خاص قسم کی بے خوفی اور دلیری میں ڈھل چکی تھی۔ مگر زندگی کی خواہش تو انسان بلکہ ہر جان دار کی فطرت میں شامل ہے۔ میں بھی یوں مرنا نہیں چاہتا تھا... میں ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ ابھی میرے کندھوں پر کچھ ”بوجھ“ تھے۔ اگر میں یہ بوجھ لے کر راہی ملکِ عدم ہو جاتا تو شاید مر کر بھی میری روح بے قرار بھٹکتی رہتی۔

کچھ دیر بعد مجھے کسی قریبی کمرے میں طبی اوزاروں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اسپرٹ اور پائیوڈین وغیرہ کی بو بھی نتھنوں میں گھسنے لگی۔ غالباً میرے آپریشن کی تیاری

ہو رہی تھی۔

کمرے میں، میں اور میرا درد تنہا تھے... اگر کوئی اور تھا تو وہ سلطانہ تھی۔ وہ مسلسل میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ دیوانوں کی طرح میری تیمارداری میں مصروف تھی۔ کبھی میرا سر تکیے پر رکھتی۔ کبھی آغوش میں لے لیتی۔ کبھی گیلے کپڑے سے میرے چہرے اور ہتھیلیوں کو تر کرنے میں مصروف ہو جاتی۔

میں نے کہا۔ ”سلطانہ! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو... میں ایک شکوہ اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو مہروج!“ وہ سسک پڑی اور میرا سر آغوش میں دبا لیا۔

میں نے کہا۔ ”پوچھو گی نہیں، کیا شکوہ ہے؟“

”تم کیا کہہ رہے ہو مہروج؟“

”میں تمہاری من مانی کی بات کر رہا ہوں سلطانہ... میں نے تمہاری منت کی تھی کہ آئندہ مجھے اس طرح کا دکھ نہ دینا جیسا تل پانی میں دیا تھا۔ مجھے بتائے بغیر کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھانا... لیکن تم نے بڑی بے حسی کے ساتھ میری بات رد کی...“ تکلیف اور دکھ کے بوجھ سے میری آواز بھرا گئی۔

”میں نے ایسا نا ہیں کیا مہروج! تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہوئیں گی۔ کیا میں اس جگہ سے باہر کہیں گئی ہوں؟“

”تم نہیں گئیں... لیکن جانے کا ارادہ تو رکھتی تھیں اور مجھے پتا ہے تم نے چلے جانا تھا۔“

”نا ہیں مہروج! میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تم خود کو خوامخواہ کیوں پریشان کر رہے ہو؟“ وہ مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر بولی۔

میں نے درد کی بے پناہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو، اب تم مجھے دہرا دکھ دے رہی ہو۔ مجھ سے جھوٹ بھی بول رہی ہو۔ تم مجھ سے بہت کچھ چھپا رہی ہو اور یہ دیکھو اس کا ثبوت۔“ میں نے اپنی جیب سے نیلے تھوتھے والی پڑیا نکال کر سلطانہ کو دکھائی۔

اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ وہ بے ساختہ بولی۔ ”یہ... یہ تمہیں کہاں سے ملی؟“

”جہاں تم نے چھپائی تھی۔“

میں نے طلال کے حوالے سے ساری باتیں اسے بتائیں اور دو تین منٹ کے اندر لاجواب کر دیا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس کی نگاہیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”سلطانہ! میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میں ایسی جگہ کھڑا ہوں جہاں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تم سے جدا ہو جاؤں۔ کیا آج بھی تم میرا شکوہ دور نہیں کرو گی؟“

ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ناک سرخ ہو گئی۔ وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ”ایسی باتیں مت کرو مہروج! میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتی ہوں...“

”تو پھر مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

وہ سرتاپا لرز گئی۔ اس نے ڈری ڈری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ایک دو لمحوں کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنا ہاتھ میرے سر پر سے کھینچنا چاہتی ہے لیکن پھر اس نے ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا اور نڈھال لہجے میں بولی۔ ”کہو مہروج! کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”مجھ سے وعدہ کرو سلطانہ! میری زندگی میں، تم میری مرضی کے بغیر، میری چار دیواری سے باہر قدم نہیں نکالو گی اور جارج گورا والا معاملہ مکمل طور پر... مکمل طور پر مجھ پر چھوڑ دو گی۔“

وہ کچھ دیر آنسو بہاتی رہی۔ پھر دل دوز آواز میں بولی۔ ”ٹھیک ہے مہروج! میں وعدہ کرتی ہوں۔“

”اس طرح نہیں سلطانہ! یہ سارے الفاظ دہرا کر وعدہ کرو۔“

وہ کچھ دیر جھجکتی رہی پھر اس نے میرے کہے ہوئے تمام الفاظ دہرا دیے اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے ذرا جھک کر اپنا سر میرے سینے سے ٹکا دیا۔ اس نے اپنا ”سر“ نہیں جیسے اپنا دکھ میرے سینے پر رکھا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اس انداز سے روئی تھی۔ وہ دل فگار لہجے میں بولی۔ ”وہ شیطان جندہ رہنے کے قابل نا ہیں ہے مہروج! اسے ماف نہ کرنا... اسے ماف نہ کرنا۔“

...ایک گھنٹے کے اندر اندر میری حالت مزید خراب ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ فالج کس طرح اور کس انداز میں حملہ آور ہوتا ہے مگر لگ یہی رہا تھا کہ میرا بالائی دھڑ مفلوج ہوتا جا رہا ہے۔ اب میں ڈاکٹر لی وان کی ”آپریشن ٹیبل“ پر تھا۔ یہ آپریشن ٹیبل بھی عجیب تھی... لکڑی کا ایک بوسیدہ تخت تھا جس کے نیچے کچھ اینٹیں رکھ کر آفتاب خاں نے اسے کچھ اونچا کر دیا تھا۔ روشنی بڑھانے کے لیے اقبال نے ان تہ خانوں کی تقریباً ساری لالٹینیں اس کمرے میں جمع کر دی تھیں۔ اسٹیل کی ایک دیگچی میں ڈاکٹر لی وان کے چند سرجیکل آلات

www.kahopakistan.com

ابل رہے تھے۔ عمران، ڈاکٹر لی وان کے معاون کا کردار ادا کر رہا تھا۔ عمران کی موجودگی سے مجھے ایک عجیب طرح کا حوصلہ مل رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی جسے میں کبھی سمجھ نہیں سکا اور نہ بیان کر سکا... اور شاید اس طرح کی حوصلہ بخش کیفیت ہر وہ شخص محسوس کرتا جو اس کے اردگرد موجود ہوتا تھا اور اس سے محبت کا تعلق رکھتا تھا...

شروع میں آگ بگولا ہونے کے بعد ڈاکٹر لی وان ایک بار پھر پُرسکون تھا۔ آپریشن پر رضامند ہونے کے بعد اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز کر لی۔ وہ اور عمران آپس میں گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر لی وان نے کہا۔ ''ریڑھ کی ہڈی میں انجکشن دے کر اوپر والے حصے کو سن کیا جا سکتا ہے... لیکن اس میں تھوڑا بہت خطرہ موجود رہے گا۔ میرے ذہن میں آرہا ہے کہ کیوں نہ انجکشن کے بغیر ہی کام چلایا جائے۔''

''یہ زیادہ تکلیف دہ تو نہیں ہوگا؟'' عمران نے پوچھا۔

''تکلیف تو ہوگی... لیکن تمہارا یہ دوست اس حوالے سے کافی ہمت دکھا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ برداشت کر لے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ پچھلے تین دن سے یہ بغیر کسی خاص پین کلر کے اتنی تکلیف جھیل رہا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس کی برداشت دیکھ کر مجھے امید ہے کہ یہ بغیر انجکشن کے بھی آپریشن کروا لے گا۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری رائے لی۔ میں نے کہا کہ میں تیار ہوں۔

آپریشن کا عمل شروع ہوا۔ میرے جسم کو زیادہ کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ یہاں زخم تو پہلے سے ہی موجود تھا۔ بس ڈاکٹر نے اپنے میڈیکل کٹر سے اس زخم کو تھوڑا کشادہ اور گہرا کر لیا۔ اصل مسئلہ چپ کی ''سیپریشن'' کا تھا۔ جب ڈاکٹر لی وان کے باریک نشتر نے چپ کو چھونا شروع کیا تو میری گردن کے پچھلے حصے اور دونوں کندھوں میں جیسے آگ سی بھر گئی۔ میں درد کے ایک نئے بھنور میں گھر گیا۔

اس نئے درد سے لڑنے کے لیے میں نے اپنے پردۂ تصور پر بارونداجیکی کی شبیہ کو نمایاں کیا۔ وہ برداشت کا پیکر، ... درد کا خوگر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ اپنے فلسفے کے حوالے سے بڑی وزنی دلیلیں دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا... جب ہمارے جسم کے کسی سنگین زخم کو مرہم پٹی کے لیے چھیڑا جاتا ہے تو ہم شدید تکلیف محسوس کرتے ہیں مگر اس تکلیف میں سے پچھتر فیصد تکلیف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم اپنے زخم کو دیکھ رہے ہوتے ہیں یا کم از کم اس کی نوعیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اگر وہی زخم ہماری نظر کے سامنے نہ ہو اور نہ ہی ہمیں اس کی نوعیت کا پتا ہو تو یہ تکلیف صرف پچیس فیصد رہ جائے گی یا شاید اس سے بھی کم۔

میں نے بھی اپنا دھیان اپنے زخم کی طرف سے ہٹا لیا۔ تمام واہمے، خدشات اور اندیشے ذہن سے نکال دیے۔ ڈاکٹر لی وان ایک ماہر ترین سرجن تھا اور سرجن کا بیشتر کمال اس کے ہاتھوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جیسے ایک مصور یا ہیرا تراش کے ہاتھوں کی معمولی سی لرزش اس کے کام کو تباہ کر سکتی ہے، سرجن کے ہاتھ کی لرزش بھی اس کے مریض کو زیرِ زمین پہنچا سکتی ہے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کی بے پایاں مہارت ہی تھی کہ وہ لالٹینوں کی روشنی میں بغیر کسی تھیٹر کے یہ نازک آپریشن کرنے پر تیار ہو گیا۔

''او گاڈ... او مائی گاڈ'' ڈاکٹر نے لرزاں لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ روک لیے۔

کیا ہوا؟'' عمران نے ٹھٹک کر پوچھا۔

ڈاکٹر لی وان نے چہرے سے ماسک ہٹایا۔ اپنی عینک اتاری اور ایک جانب رکھی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ماتھا پکڑ لیا تھا۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر؟'' عمران نے پھر پوچھا۔

''یہ بہت خبیث لوگوں کا کام ہے۔ بہت عیار اور... بے رحم۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہو ڈاکٹر؟''

''ہم یہ نہیں کر سکیں گے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔'' ڈاکٹر لی وان نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں کروٹ لے کر لکڑی کے تختے پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا سردی کے باوجود ڈاکٹر کے ماتھے پر پسینے کی چمک تھی۔

''آپ کچھ وضاحت تو کریں۔'' عمران نے کہا۔

ڈاکٹر کچھ دیر خاموش رہا، جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے میرے سامنے اپنی مشکل بیان کرنی چاہیے یا نہیں۔ پھر اس نے وہی فیصلہ کیا جو آج کل عام معالج کرتے ہیں... یعنی مریض کو اندھیرے میں نہ رکھنے کا فیصلہ۔

وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے دوبارہ عینک لگائی اور ماسک چڑھایا پھر عمران کے ساتھ

میرے عقب میں آن کھڑا ہوا۔ اس نے کسی اوزار کی مدد سے میرے جسم میں لگی ہوئی چپ کو آہستہ سے چھوا۔ ایک بار پھر میرے پورے جسم میں درد کی لہریں دوڑنے لگیں۔

ڈاکٹر نے نہایت بے بسی سے بتایا۔ ''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اگر ہم نے اس چپ کو اسپائنل کینال کی ہڈی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی تو اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''اگر واقعی ایسا ہے تو یہ بہت خطرناک ہے۔'' عمران نے زیرِ لب کہا۔

ڈاکٹر اور عمران پھر نشستوں پر جا بیٹھے۔ میں بھی چند تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پورے کمرے میں اسپرٹ اور دیگر ادویات کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ سرجن اسٹیل شیطان صفت بندہ ہے۔ میرے خیال میں تو ایسے شخص کے نام کے ساتھ ڈاکٹر یا سرجن وغیرہ کے الفاظ لگانا ہی گناہ ہے۔ یہ قاتل شخص ہے۔ طب کے شعبے پر ایک بدنما دھبا ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ چپ اسی شخص نے پلانٹ کی ہے۔ اس قسم کا گھناؤنا کام وہی کر سکتا ہے۔''

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' عمران نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اب ہم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ زخم کو صاف کریں اور ٹانکے لگا کر بند کر دیں۔ باقی خدا پر چھوڑ دیں۔'' ڈاکٹر کے لہجے سے مایوسی اور نقاہت جھلک رہی تھی۔

''لیکن تھوڑی دیر پہلے آپ نے خود ہی کہا تھا کہ فوری آپریشن کے سوا کوئی راستہ نہیں۔'' عمران نے کہا۔

''اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے نکالنا اس قدر خطرناک ہوگا۔'' ڈاکٹر نے جھلائی ہوئی بلند آواز میں کہا۔

ان مشکل ترین حالات میں بھی عمران کا حوصلہ برقرار تھا۔ اس نے تسلی بخش انداز میں میرا شانہ دبایا اور ڈاکٹر کے پیچھے باہر نکل گیا۔

میں سناٹے میں تھا۔ ڈاکٹر اسٹیل، جارج گورا اور اس کی بہن ماریا وغیرہ کے منحوس چہرے میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ماریا، ڈاکٹر اسٹیل کی بیوی تھی۔ یہ وہی ماریا تھی جس کی انگلی اسحاق نے کاٹی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی بے رحمی و بے حسی میں یکتا تھے۔ آج ڈاکٹر لی وان نے جو انکشاف کیا، وہ دہلا دینے والا تھا۔ اسٹیل نے میرے سر کے پچھلے حصے میں جو چپ ڈال رکھی تھی، وہ پھٹ سکتی تھی اور اس کے پھٹنے سے میرا اسپائنل میرو یعنی حرام مغز ختم ہو سکتا تھا۔ حرام مغز ختم ہونے کا مطلب فوری موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

کسی قریبی کمرے سے بحث و تکرار کی مدھم آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ بحث اور تکرار یقیناً عمران اور ڈاکٹر لی وان کے درمیان ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کسی وقت بہت بلند آواز میں بولتا تھا اور اس کے لہجے سے غصہ چھلکا پڑتا تھا۔

پین کلرز کا اثر کم ہو رہا تھا۔ درد کی ٹیسیں پھر بلند ہونے لگیں۔ بہت ضبط کے باوجود میں ایک بار پھر ہولے ہولے کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی دوران میں ادھ کھلے دروازے سے میری نگاہ سلطانہ پر پڑی۔ اس نے سہمے سہمے انداز میں کمرے میں جھانکا۔ اس کے گداز ہونٹ خشک تھے اور دنیا جہان کے اندیشے اس کی سیاہ آنکھوں میں سمٹے ہوئے تھے۔ اسے دروازے میں کھڑے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ عمران کی آواز آئی۔ وہ سلطانہ کو بلا رہا تھا۔ شاید وہ ڈاکٹر کو قائل کرنے کے لیے سلطانہ کی مدد بھی چاہتا تھا۔

میرے حواس پر ایک بار پھر غشی کی دھند چھانے لگی۔ اردگرد کے مناظر مدھم ہونے لگے، آوازیں جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دینے لگیں۔ نہ جانے کتنا وقت اسی کیفیت میں گزرا۔ شاید پچیس تیس منٹ... یا شاید ایک ڈیڑھ گھنٹا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ عمران اور ڈاکٹر لی وان ایک بار پھر میرے قریب موجود ہیں۔ وہ دونوں ایک بار پھر میری زخمی گردن پر جھکے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں مجھے ایک دو انجکشن بھی دیے گئے۔ ان انجکشنز کے بعد میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند قدرے چھٹ گئی اور درد میں بھی عارضی افاقہ محسوس ہونے لگا۔ میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر! جو بھی کرنا ہے جلدی کرو...''

ڈاکٹر نے میرے کندھے پر تھپکی دی مگر کہا کچھ نہیں۔

کچھ دیر بعد میں نے ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل کیمرا دیکھا۔ اس جدید کیمرے سے ڈاکٹر نے میری گردن کے عقبی حصے کی کئی تصویریں اتاریں۔ یہ کیمرا ان تصویروں کو بیس تیس گنا بڑا کر کے دکھا سکتا تھا۔ ان تصویروں میں، میں نے پہلی بار وہ منحوس چپ دیکھی جس نے ایک طویل عرصے سے مجھے پابہ زنجیر کیا ہوا تھا۔ کیمرا اپنی اسکرین پر اس چپ کو کئی گنا بڑا کر کے دکھا رہا تھا اور اس کی سنہری مائل سطح کی ساری جزئیات نظر آرہی تھیں۔

''پلیز ڈاکٹر! آپ رسک لیں۔ اگر میری زندگی ہے تو کچھ نہیں ہوگا اور اگر نہیں ہے تو پھر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔''

ڈاکٹر ایک بار پھر بڑی باریک بینی سے چپ کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ یہ معائنہ ڈیجیٹل تصویروں کے ذریعے کر رہا

www.kahopakistan.com

اہل رہے تھے۔ عمران، ڈاکٹر لی وان کے معاون کا کردار ادا کر رہا تھا۔ عمران کی موجودگی سے مجھے ایک عجیب طرح کا حوصلہ مل رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی جسے میں کبھی سمجھ نہیں سکا اور نہ بیان کر سکا... اور شاید اس طرح کی حوصلہ بخش کیفیت ہر وہ شخص محسوس کرتا جو اس کے اردگرد موجود ہوتا تھا اور اس سے محبت کا تعلق رکھتا تھا...

شروع میں آگ بگولا ہونے کے بعد ڈاکٹر لی وان ایک بار پھر پُرسکون تھا۔ آپریشن پر رضامند ہونے کے بعد اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز کر لی۔ وہ اور عمران آپس میں گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر لی وان نے کہا۔ ''ریڑھ کی ہڈی میں انجکشن دے کر اوپر والے حصے کو سن کیا جا سکتا ہے... لیکن اس میں تھوڑا بہت خطرہ موجود رہے گا۔ میرے ذہن میں آرہا ہے کہ کیوں نہ انجکشن کے بغیر ہی کام چلایا جائے۔''

''یہ زیادہ تکلیف دہ تو نہیں ہو گا؟'' عمران نے پوچھا۔

''تکلیف تو ہو گی... لیکن تمہارا یہ دوست اس حوالے سے کافی ہمت دکھا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ برداشت کر لے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ پچھلے تین دن سے یہ بغیر کسی خاص پین کلر کے اتنی تکلیف جھیل رہا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس کی برداشت دیکھ کر مجھے امید ہے کہ یہ بغیر انجکشن کے بھی آپریشن کروا لے گا۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری رائے لی۔ میں نے کہا کہ میں تیار ہوں۔

آپریشن کا عمل شروع ہوا۔ میرے جسم کو زیادہ کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ یہاں زخم تو پہلے سے ہی موجود تھا۔ بس ڈاکٹر نے اپنے میڈیکل کٹر سے اس زخم کو تھوڑا کشادہ اور گہرا کر لیا۔ اصل مسئلہ چپ کی ''سپرپوزیشن'' کا تھا۔ جب ڈاکٹر لی وان کے باریک نشتر نے چپ کو چھونا شروع کیا تو میری گردن کے پچھلے حصے اور دونوں کندھوں میں جیسے آگ سی بھر گئی۔ میں درد کے ایک نئے بھنور میں گھر گیا۔

اس نئے درد سے لڑنے کے لیے میں نے اپنے پردۂ تصور پر بارونداجیکی کی شبیہہ کو نمایاں کیا۔ وہ برداشت کا پیکر، ... درد کا خوگر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ اپنے فلسفے کے حوالے سے بڑی وزنی دلیلیں دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا... جب ہمارے جسم کے کسی سنگین زخم کو مرہم پٹی کے لیے چھیڑا جاتا ہے تو شدید تکلیف محسوس کرتے ہیں مگر اس تکلیف میں سے کچھ فیصد تکلیف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم اپنے زخم کو دیکھ رہے ہوتے ہیں یا کم از کم اس کی نوعیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اگر وہی زخم ہماری نظر کے سامنے نہ ہو اور نہ ہی ہمیں اس کی نوعیت کا پتا ہو تو یہ تکلیف صرف پچیس فیصد رہ جائے گی یا شاید اس سے بھی کم۔

میں نے بھی اپنا دھیان اپنے زخم کی طرف سے ہٹا لیا۔ تمام واہمے، خدشات اور اندیشے ذہن سے نکال دیے۔ ڈاکٹر لی وان ایک ماہر ترین سرجن تھا اور سرجن کا ہنر کمال اس کے ہاتھوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جیسے ایک مصور یا مجسمہ تراش کے ہاتھوں کی معمولی سی لرزش اس کے کام کو تباہ کر سکتی ہے، سرجن کے ہاتھ کی لرزش بھی اس کے مریض کو زیرزمین پہنچا سکتی ہے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کی بے پایاں مہارت ہی تھی کہ وہ لالٹینوں کی روشنی میں بغیر کسی تھیٹر کے یہ نازک آپریشن کرنے پر تیار ہو گیا۔

''اوگاڈ... او مائی گاڈ۔'' ڈاکٹر نے لرزاں لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ روک لیے۔

کیا ہوا؟'' عمران نے ٹھٹک کر پوچھا۔

ڈاکٹر لی وان نے چہرے سے ماسک ہٹایا۔ اپنی عینک اتاری اور ایک جانب رکھی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ماتھا پکڑ لیا تھا۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر؟'' عمران نے پھر پوچھا۔

''یہ بہت خبیث لوگوں کا کام ہے۔ بہت عیار اور... بے رحم۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہو ڈاکٹر؟''

''ہم یہ نہیں کر سکیں گے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔'' ڈاکٹر لی وان نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں کروٹ لے کر لکڑی کے تختے پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا سردی کے باوجود ڈاکٹر کے ماتھے پر پسینے کی چمک تھی۔

''آپ کچھ وضاحت تو کریں۔'' عمران نے کہا۔

ڈاکٹر کچھ دیر خاموش رہا، جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے میرے سامنے اپنی مشکل بیان کرنی چاہیے یا نہیں۔ پھر اس نے وہی فیصلہ کیا جو آج کل عام معالج کرتے ہیں... یعنی مریض کو اندھیرے میں رکھنے کا فیصلہ۔

وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے دوبارہ عینک لگائی اور ماسک چڑھایا پھر عمران کے ساتھ میرے عقب میں آن کھڑا ہوا۔ اس نے کسی اوزار کی مدد سے میرے جسم میں لگی ہوئی چپ کو آہستہ سے چھوا۔ ایک بار پھر پورے جسم میں درد کی لہریں دوڑنے لگیں۔

ڈاکٹر نے نہایت بے بسی سے بتایا۔ ''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو گی کہ اگر ہم نے اس چپ کو اسپائنل کینال کی ہڈی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی تو اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''اگر واقعی ایسا ہے تو یہ بہت خطرناک ہے۔'' عمران نے زیرلب کہا۔

ڈاکٹر اور عمران پھر نشستوں پر جا بیٹھے۔ میں بھی چند تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پورے کمرے میں اسپرٹ اور دیگر ادویات کی پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ سرجن اسٹیل شیطان صفت بندہ ہے۔ میرے خیال میں تو ایسے شخص کے نام کے ساتھ ڈاکٹر یا سرجن وغیرہ کے الفاظ لگانا ہی گناہ ہے۔ یہ قاتل شخص ہے۔ طب کے شعبے پر ایک بدنما دھبا ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ چپ اسی شخص نے پلانٹ کی ہے۔ اس قسم کا گھناؤنا کام وہی کر سکتا ہے۔''

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' عمران نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اب ہم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ زخم کو صاف کریں اور ٹانکے لگا کر بند کر دیں۔ باقی خدا پر چھوڑ دیں۔'' ڈاکٹر کے لہجے سے مایوسی اور نقاہت جھلک رہی تھی۔

''لیکن تھوڑی دیر پہلے آپ نے خود ہی کہا تھا کہ فوری آپریشن کے سوا کوئی راستہ نہیں۔'' عمران نے کہا۔

''اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے نکالنا اس قدر خطرناک ہو گا۔'' ڈاکٹر نے جھلائی ہوئی بلند آواز میں کہا۔

ان مشکل ترین حالات میں بھی عمران کا حوصلہ برقرار تھا۔ اس نے تسلی بخش انداز میں میرا شانہ دبایا اور ڈاکٹر کے پیچھے باہر نکل گیا۔

میں سناٹے میں تھا۔ ڈاکٹر اسٹیل، جارج گورا اور اس کی بہن ماریا وغیرہ کے منحوس چہرے میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ماریا، ڈاکٹر اسٹیل کی بیوی تھی۔ یہ وہی ماریا تھی جس کی انگلی اسحاق نے کاٹی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی بے رحمی و بے حسی میں یکتا تھے۔ آج ڈاکٹر لی وان نے جو انکشاف کیا، وہ دہلا دینے والا تھا۔ اسٹیل نے میرے سر کے پچھلے حصے میں جو چپ ڈال رکھی تھی، وہ پھٹ سکتی تھی اور اس کے پھٹنے سے میرا اسپائنل میرو یعنی حرام مغز ختم ہو سکتا تھا۔ حرام مغز ختم ہونے کا مطلب فوری موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

کسی قریبی کمرے سے بحث و تکرار کی مدھم آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ بحث اور تکرار یقیناً عمران اور ڈاکٹر لی وان کے درمیان ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کسی وقت بہت بلند آواز میں بولتا تھا اور اس کے لہجے سے غصہ چھلکا پڑتا تھا۔

پین کلرز کا اثر کم ہو رہا تھا۔ درد کی ٹیسیں پھر بلند ہونے لگیں۔ بہت ضبط کے باوجود میں ایک بار پھر ہولے ہولے کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی دوران میں ادھ کھلے دروازے سے میری نگاہ سلطانہ پر پڑی۔ اس نے سہمے سہمے انداز میں کمرے میں جھانکا۔ اس کے گداز ہونٹ خشک تھے اور دنیا جہان کے اندیشے اس کی سیاہ آنکھوں میں سمٹے ہوئے تھے۔ اسے دروازے میں کھڑے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ عمران کی آواز آئی۔ وہ سلطانہ کو بلا رہا تھا۔ شاید وہ ڈاکٹر کو قائل کرنے کے لیے سلطانہ کی مدد بھی چاہتا تھا۔

میرے حواس پر ایک بار پھر تشنجی کی دھند چھانے لگی۔ اردگرد کے مناظر مدھم ہونے لگے، آوازیں جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دینے لگیں۔ نہ جانے کتنا وقت اسی کیفیت میں گزرا۔ شاید پچیس تیس منٹ... یا شاید ایک ڈیڑھ گھنٹا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ عمران اور ڈاکٹر لی وان ایک بار پھر میرے قریب موجود ہیں۔ وہ دونوں ایک بار پھر میری زخمی گردن پر جھکے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں مجھے ایک دو انجکشن بھی دیے گئے۔ ان انجکشنز کے بعد میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند قدرے چھٹ گئی اور درد میں بھی عارضی افاقہ محسوس ہونے لگا۔ میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر! جو بھی کرنا ہے جلدی کرو...''

ڈاکٹر نے میرے کندھے پر تھپکی دی مگر کہا کچھ نہیں۔

کچھ دیر بعد میں نے ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل کیمرا دیکھا۔ اس جدید کیمرے سے ڈاکٹر نے میری گردن کے عقبی حصے کی کئی تصویریں اتاریں۔ یہ کیمرا ان تصویروں کو بیس تیس گنا بڑا کر کے دکھا سکتا تھا۔ ان تصویروں میں، میں نے پہلی بار وہ منحوس چپ دیکھی جس نے ایک طویل عرصے سے مجھے پابہ زنجیر کیا ہوا تھا۔ کیمرا اپنی اسکرین پر اس چپ کو کئی گنا بڑا کر کے دکھا رہا تھا اور اس کی سنہری مائل سبز کی ساری جزئیات نظر آرہی تھیں۔

''پلیز ڈاکٹر! آپ رسک لیں۔ اگر میری زندگی ہے تو کچھ نہیں ہو گا اور اگر نہیں ہے تو پھر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔''

ڈاکٹر ایک بار پھر بڑی باریک بینی سے چپ کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ یہ معائنہ ڈیجیٹل تصویروں کے ذریعے کر رہا

www.kahopakistan.com

تھا۔ وہ ماہر ترین سرجن تھا۔ نہ جانے کتنے نازک مرحلوں سے گزر چکا تھا... اس کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا۔ بالآخر فیصلہ کن مرحلہ آ گیا۔ ڈاکٹر لی وان نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک حوصلہ مند شخص ہو مسٹر تابش! میں نے تم سے کچھ بھی چھپایا نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ کرنا پڑ رہا ہے، یہ میرا جاب نہیں ہے۔ میں ایک سرجن ہوں لیکن یہاں مجھے سرجری کے ساتھ ساتھ دوسری کارروائی بھی کرنا پڑ رہی ہے۔ اب یہ سارا قسمت کا کھیل بن گیا ہے، اس میں کسی طرح کی مہارت یا صلاحیت کو عمل دخل نہیں ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر! آپ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں۔ میں ہر صورت میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ اگر آپ کو کسی طرح کی تحریری اجازت چاہیے تو وہ بھی میری طرف سے عمران آپ کو دے سکتا ہے یا میری بیوی دے سکتی ہے۔''

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے دستانے پہننے میں مصروف ہو گیا۔ کوئی نصف درجن لالٹینیں میرے اردگرد روشن تھیں۔ عمران کے ہاتھ میں ایک بڑی ٹارچ بھی تھی جو اسے بوقتِ ضرورت روشن کرنا تھی۔ اس بند کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ تاہم اس کمرے سے باہر جس طرح کی ہلچل مچی ہوئی تھی، وہ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔ سلطانہ اور میرے سارے ساتھی یقیناً میرے لیے دست بہ دعا تھے اور بڑی بے قراری سے اس انوکھے آپریشن کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس ہنگامی آپریشن کا نتیجہ کیا نکلنا تھا، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

پھر ایک اور اندیشہ میرے ذہن میں سر اٹھانے لگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس چپ کو ہلانے یا نکالنے کے سبب دوبارہ میری یادداشت کے ساتھ کوئی معاملہ ہو جائے۔ میں ایک بار پھر اپنے اردگرد کو فراموش کر کے کسی بے نام تاریکی میں کھو جاؤں۔

ڈاکٹر اور عمران میری گردن کے زخم کے ساتھ مصروف ہو گئے، میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے پیاروں کے چہرے تصور میں بسا لیے۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ آخر عمران کی گمبھیر آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''ہمت کریں ڈاکٹر! جو سمجھ میں آتا ہے کر گزریں۔'' یکایک میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ میری پائنتی کی طرف اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا اس کے دستانہ پوش ہاتھوں میں ایک سرجیکل قینچی تھی مگر ابھی تک ڈاکٹر یہ کام کر نہیں سکا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر نظر آیا۔ آنکھیں زرد ہو رہی تھیں۔

''یہ کیمبلنگ ہے۔ یہ میں نہیں کر سکوں گا۔ بہت بڑا رسک ہے یہ۔'' ڈاکٹر عجیب اضطراب کے عالم میں بولا۔

یکایک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کمرے میں ایک اور شخص موجود تھا جو بڑے بڑے رسک لے سکتا تھا۔ وہ قسمت کا دھنی تھا، تقدیر اس کا ساتھ دیتی تھی۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر کا چہرہ تک رہا تھا...

میں نے ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر! میری ایک خواہش ہے... میں چاہتا ہوں کہ یہ کام، میرا یہ دوست کرے۔''

عمران اور ڈاکٹر نے ایک ساتھ چونک کر مجھے دیکھا۔

''... ہاں ڈاکٹر! مجھے یقین ہے... یہ جو کرے گا میرے لیے بہت اچھا ہوگا۔'' میں نے اپنی بات دہرائی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' عمران نے حیران ہو کر کہا۔

''کیا یہ کوئی بہت مشکل کام ہے؟''

''لیکن...''

''پلیز عمران! تم یہ کام کرو۔ ڈاکٹر صاحب تمہاری مدد کریں گے۔''

ڈاکٹر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔

''کیا تم ایسا کرو گے؟'' ڈاکٹر نے عمران سے پوچھا۔

''ہاں، یہ کرے گا۔'' عمران کے بجائے میں نے جواب دیا۔ ''آپ دستانے، سرجیکل اوزار اس کو دے دیں۔''

میرے لہجے میں چھپے ہوئے یقین کو محسوس کرنے کے بعد عمران کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ لیکن پھر وہ ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''یار! کیوں مروانا ہے مجھے۔ اگر میں ناکام ہو گیا تو...''

''مذاق نہیں عمران! تم یہ کام کرو... اور جلدی کرو۔''

''بڑی بھاری ذمے داری ڈال رہے ہو۔'' عمران کا لہجہ پھر گمبھیر ہو گیا۔

''کسی نہ کسی کو تو یہ ذمے داری اٹھانی ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ تم اٹھاؤ۔''

... کچھ ہی دیر بعد عمران میڈیکل باکس میں سے سرجیکل دستانے نکال کر پہن رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔ عمران اور ڈاکٹر میری پشت پر آن کھڑے ہوئے۔ لالٹینوں کی لو اونچی

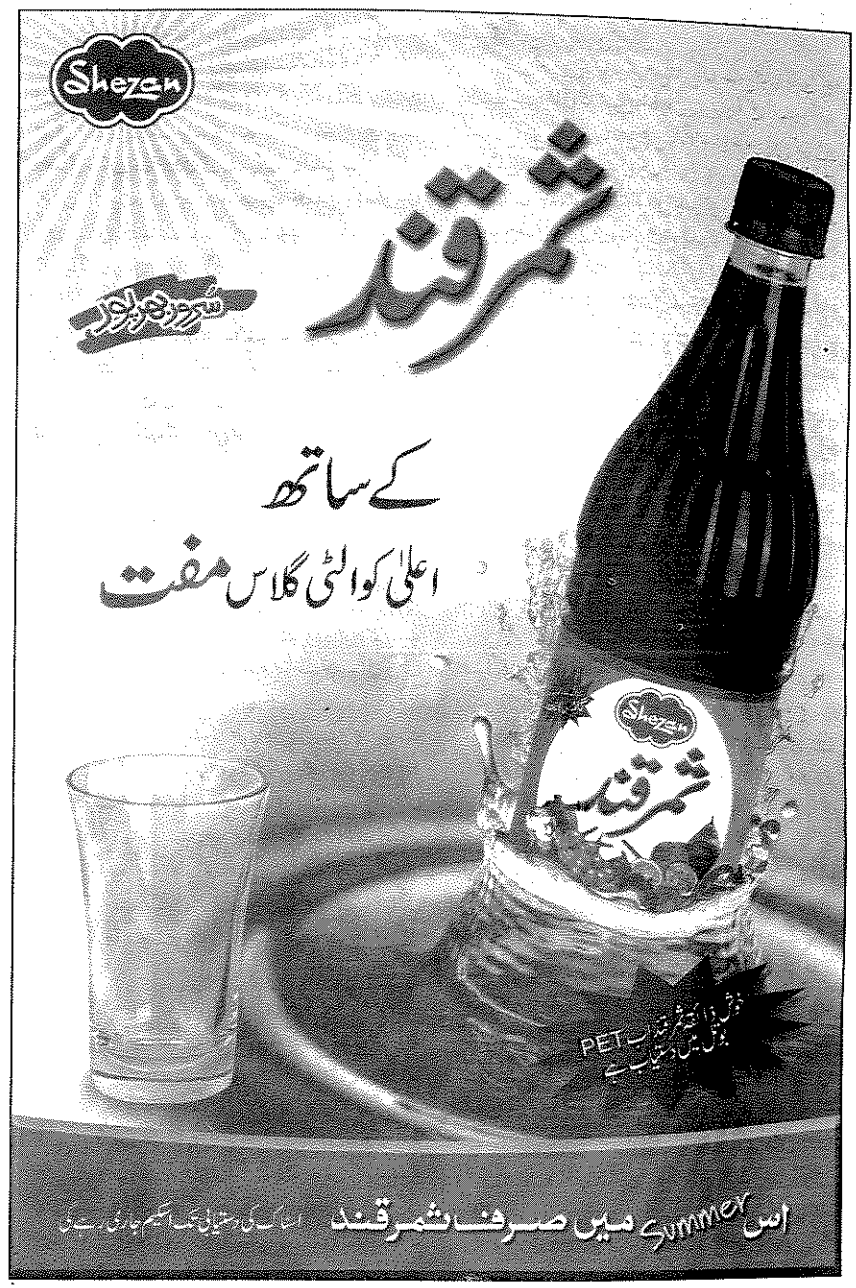

www.kahopakistan.com

کر دی گئی۔ بڑی ٹارچ اب ڈاکٹر لی وان کے پاس تھی۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے عمران کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دائیں ہاتھ میں قینچی لے کر عمران میری گردن پر جھک گیا۔ میرے اردگرد ایک اذیت ناک دھند تھی۔ میں نے غنودگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ مشکل نہیں عمران! تم پہلے بھی بہت دفعہ کر چکے ہو... دو خانے میں گولی... چار خانے خالی...'' عمران نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

عمران کا حوصلہ اکثر ''دو... چار'' کے کھیل میں جیت جاتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ اس مرتبہ بھی جیت جائے گا؟

''اوگاڈ!'' ڈاکٹر لی وان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس آواز میں اطمینان اور خوشی کی لہر تھی۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ میرے عقب میں عمران اور ڈاکٹر بغل گیر ہو گئے ہیں۔ عمران نے جھک کر میرے سر کو بوسہ دیا اور کندھا تھپکا۔ پھر مقامی لہجے کی نقل کرتے ہوئے بولا۔ ''وشواس ناہیں ہووت ہے کہ میں نے اس منحوس چپ کو اپنی جگہ سے ہلا دیا ہے۔ یہ تو چمتکار ہے۔ نیا جیون مبارک۔''

ڈاکٹر لی وان نے ہلکے ہلکے جوش کے ساتھ کہا۔ ''اچھا مسٹر عمران! اب تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ مجھے باقی کا کام کرنے دو۔ اب مجھے چپ کو ٹشوز سے علیحدہ کرنا ہے اور یہ بھی مشکل کام ہے۔''

اگلے دس منٹ تک ڈاکٹر لی وان بڑے انہماک سے اس کام میں مصروف رہا۔ اس کام میں کچھ وقفے شدید درد کے بھی آئے، بالآخر عمران نے اسٹیل کا باؤل آگے کیا اور اس میں ''ٹن'' کی آواز سے چپ گری۔ ''تمہیں مبارک ہو مسٹر تابش! تم اب ایک آزاد شخص ہو۔''

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ ابھی مجھے لیٹے رہنا ہے۔ میرے زخم کو ٹھیک سے صاف کر کے اسٹیچز لگائے گئے اور پٹی باندھ دی گئی۔

میں نے واقعی خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میرا دل چاہا کہ ابھی اس تین منزلہ تہ خانے کی گہرائی سے نکلوں اور کھلی جگہ پر پہنچ جاؤں۔ پوری آزادی سے سانس لوں اور ہر اندیشے سے بے نیاز ہو کر کھیتوں کھلیانوں میں اور آبی گزرگاہوں کے کناروں پر بھاگوں دوڑوں۔ خوشی سے چلاؤں... آج میں آزاد ہوں۔ آج مجھے اپنے ہر ارادے کو پورا کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ مجھے لگا کہ اب میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ سلطانہ کے لیے، اپنی کچلی مسلی ہوئی عزتِ نفس کے لیے اور پھر اس اسٹیٹ کی حدوں سے پار نکلنے کے لیے بھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسٹیل کے باؤل میں اس چھوٹے سے دھاتی ٹکڑے کو دیکھا جس نے ماضی قریب میں مجھے اَن گنت زخموں سے دوچار کیا تھا۔ سلطانہ، چوہان اور دیگر لوگ مجھے بتاتے تھے کہ میں اس اسٹیٹ سے نکل جانے کے لیے ان تھک کوششیں کرتا رہا ہوں اور ناکامیاں جھیلتا رہا ہوں۔ بہت دنوں بعد مجھے ثروت کی یاد بھی آئی۔ وہ کہاں تھی؟ کس حال میں تھی؟ عمران کی مبہم باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شاید اس کی شادی ہو چکی ہے۔ لیکن جو کچھ بھی تھا، میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر وہ واقعی آباد ہو چکی تھی اور خوش تھی تو پھر اسے اچھے طریقے سے خیر آباد کہنا چاہتا تھا۔

ایک دم میرا دھیان سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ آپریشن سے پہلے وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے اس کی سیاہ آنکھوں میں دنیا جہان کے اندیشے سمٹے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کے خشک ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔ ''وہ بہت پریشان ہو گی۔ اسے بتا دو اور اقبال کو بھی...''

عمران چہکا۔ ''اقبال کا نام تو تم بس یونہی لے رہے ہو۔ اصل میں تو سلطانہ بھابی کو اطلاع دینا چاہ رہے ہو۔ ویسے یہ بیویاں اتنی پریشان ہوتی نہیں جتنی نظر آتی ہیں۔''

''کیوں، تمہارا کوئی ذاتی تجربہ ہے؟'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''کوئی ایک تجربہ ہے... میں تو اس پر پوری کتاب لکھ سکتا ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے اپنے چینل فساد پلس پر اس حوالے سے پچاس پچاس منٹ کے کوئی دس پروگرام پیش کیے ہیں۔ پروگرام کا عنوان تھا ''بیویوں کے اصل چہرے...'' اس پروگرام کو دیکھ کر بیویاں اتنا سٹپٹائیں کہ انہوں نے چینل کے دفتر پر چڑھائی کر دی۔ پروگرام کے پروڈیوسر صاحب ایک باتھ روم میں سے زندہ پکڑ لیے گئے۔ مظاہرین کا خیال تھا کہ انہیں دفتر کے سامنے گولی مار دی جائے لیکن مظاہرین کی لیڈر رآنسہ شاہ زوری نے کہا کہ مار دینا کوئی سزا نہیں۔ آج کل پروڈیوسر صاحب شاہ زوری صاحبہ کے شوہر ہیں...''

''اس چپ کا اب کیا کرنا ہے؟'' ڈاکٹر لی وان نے باؤل میں پڑی خون آلود چپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عمران نے اپنی زبان پھر متحرک کر دی۔ ''دل تو چاہتا ہے کہ یہ چپ کسی نیولے کے جسم میں رکھ دی جائے۔ وہ سارے جنگل میں بھاگتا پھرے اور حکم کے کارندے اس کے پیچھے ہلکان ہوتے رہیں۔ کتنا مزہ آئے کہ جب دو تین مہینے کی بھاگ دوڑ کے بعد نیولا پکڑا جائے تو حکم کے کارندے فرطِ حیرت سے بے ہوش جائیں اور پھر نیا محاورہ وجود میں آئے... کھودا پہاڑ نکلا نیولا۔''

ڈاکٹر لی وان نے کہا۔ ''واقعی کوئی ایسا کام کیا تو جا سکتا ہے جس سے اس بدمعاش سرجن اسٹیل کو عبرت حاصل ہو۔''

چپ نکلتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میری گردن اور کندھوں میں کبھی درد ہوا ہی نہیں، جسم کے اس حصے میں فالج کا سا احساس بھی ناپید ہو گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد سب میرے اردگرد جمع تھے۔ سلطانہ، اقبال، ہوشیار سنگھ، تاؤ افضل اور شکیلہ وغیرہ۔ سب خوش تھے۔ ڈاکٹر لی وان کا خیال تھا کہ ابھی مجھے آرام اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ اس کے کہنے پر عمران نے ایک ایک کر کے سب کو باہر بھیج دیا۔ آخر میں وہ اور سلطانہ رہ گئے۔ سلطانہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ وہ بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب تو ہمارے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اور ایک اور فرشتہ یہاں تمہارے پاس بھی تو کھڑا ہے۔''

وہ حیرت سے عمران کو دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اس نے دوسری مرتبہ میری جان بچائی ہے۔ آج اس نے آپریشن میں ڈاکٹر کی مدد کی ہے۔ اس کی مدد کے بغیر شاید یہ آپریشن مکمل نہ ہو سکتا۔ اور آج سے کچھ سال پہلے بھی اس نے ایسا ہی ایک کام کیا تھا۔ تب میں اپنی جان کا خود دشمن بنا ہوا تھا۔ خودکشی کی حرام موت مرنے کے لیے گندم کی گولیاں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور واپس جینے کے راستے پر کھینچ لایا تھا۔''

عمران بولا۔ ''اب مجھے اوتار ہی نہ بنا دینا۔ یہ نہ ہو کل یہاں کے لوگ میرا مجسمہ بنا کر پوجنا شروع کر دیں... اور مجسمہ بنانے کے سلسلے میں یہ لوگ بڑے بے صبرے ہیں۔ بعض اوقات زندہ اوتار کو ہی گردن توڑ کر مار دیتے ہیں اور پھر مسالے وغیرہ لگا کر اس کا مجسمہ بنا دیتے ہیں۔'' وہ ہنستا ہوا اور ہمیں خدا حافظ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں خالی خالی نظروں سے دروازے کو دیکھتا رہا۔ سلطانہ بولی۔ ''عمران بھائی بہت اچھے ہیں، پر ان کے بارے میں مجھے جیادہ پتا ناہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں... کون ہیں؟ آپ دونوں کا ملنا کیسے ہوا؟''

''مجھے ابھی تک خود اس کے بارے میں زیادہ پتا نہیں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔''

''اچھا مہروج! ابھی تم جیادہ باتیں ناہیں کرو۔ ڈاکٹر جی نے آرام کا کہا ہے... لیکن یہ گندم کی گولیوں والی کیا بات تھی؟''

''زبردست۔ ایک طرف باتیں نہ کرنے کا کہہ رہی ہو اور دوسری طرف اتنی لمبی چوڑی داستان بھی پوچھ رہی ہو؟''

''کتنی لمبی ہوئیں گی؟'' وہ سادگی سے بولی۔

''جتنی لمبی تمہاری، نیلے تھوتھے کی پڑیا والی داستان ہے۔'' وہ ایک دم خجل سی ہو گئی۔

وہ تھوڑی دیر سر جھکا کر بیٹھی رہی پھر میرے گھٹنے کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ''مجھے ماف کر دینا مہروج! میں نے تم سے وعدہ کر لیا ہے۔ اب ایسا ناہیں ہوئیں گا۔ میرے من پر جو کچھ بھی بیتے، پر میں اپنا وعدہ ناہیں توڑوں گی۔''

''ایک وعدہ میں نے بھی تم سے کیا ہے اور میں بھی وہ نہیں توڑوں گا۔ جب تک جارج گورا سے بدلہ نہیں لے لیتا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔''

وقتِ رخصت ڈاکٹر لی وان کے گلے شکوے کافی حد تک دور ہو چکے تھے۔ عمران نے اس سے دست بستہ معافی مانگ لی تھی اور ڈاکٹر نے اسے معاف بھی کر دیا تھا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوا، اس کے مطابق عمران نے ڈاکٹر تک پہنچنے کے لیے نل پانی کے نواح تک سفر کیا تھا۔ ہوشیار سنگھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں کھیت مزدوروں کے روپ میں نکلے تھے۔ ان کے پاس ایک ایسا چھکڑا تھا جس پر ترپال ڈالی گئی تھی اور ترپال کے نیچے سبزیاں تھیں۔ پُرخطر سفر کے بعد عمران نے ڈاکٹر کو اس کے بیڈ روم میں جا پکڑا تھا۔ ڈاکٹر اپنے اصولوں کا پابند تھا۔ کسی صورت اسپتال سے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجبوراً عمران کو دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس نے گن پوائنٹ پر ڈاکٹر کو زبردستی چھکڑے میں بٹھایا۔ عمران اور ہوشیار سنگھ ویران لیکن دشوار راستوں پر سفر کرتے ہوئے بصد مشکل یہاں تک پہنچے۔ کم از کم دو مقامات ایسے تھے جہاں ان کی مڈبھیڑ حکم کے کارندوں سے ہوتے ہوتے رہی۔ چھکڑا ہوشیار سنگھ نے ہانکا تھا۔ عمران ریوالور سمیت ڈاکٹر لی وان کے ساتھ موجود رہا تھا۔ فتح پور پہنچنے سے کافی پہلے ہی ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

اب یہ سب کچھ ماضی قریب کا حصہ بن چکا تھا۔ میرے آپریشن کو دو روز ہو چکے تھے۔ اس کامیاب آپریشن کے بعد ڈاکٹر لی وان اب نل پانی واپس جا رہا تھا۔

www.kahopakistan.com

ڈاکٹر کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس علاقے میں اور کس مقام پر ہے اور اس نے پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اب پروگرام یہ تھا کہ عمران پہلے کی طرح ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھے گا اور اسے چھکڑے کے ذریعے قریباً پندرہ میل دور ایک ایسی جگہ تک چھوڑ آئے گا جہاں سے اسے آگے جانے کے لیے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی یا پھر وہ معقول معاوضہ دے کر کسی کسان کو اپنے ساتھ سفر کرنے پر تیار کر لے گا۔

عمران نے انگلش میں کہا۔ ”ڈاکٹر! آپ کو ہمارے لیے جو تکلیف اٹھانا پڑی ہے اس کی کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر بھی ہم سب چاہتے ہیں کہ...“

”نہیں مسٹر آمران! اس سے آگے ایک لفظ نہیں بولنا۔ ورنہ ہمارے درمیان پھر دشمنی شروع ہو جائے گی۔ اگر تم مجھے کچھ دینا چاہتے ہو تو بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس نیپالی باروندا کے لیے کچھ نہ کر سکا... مگر خوشی ہے کہ میں یہاں باروندا اور ڈاکٹر چوہان کے اس ساتھی کی مدد کر سکا ہوں۔“

”لیکن ڈاکٹر...“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ ڈاکٹر کا لہجہ حتمی تھا۔ ”جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔“

عمران نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اچھا ٹھیک ہے ڈاکٹر! لیکن کم از کم اتنے پیسے تو لے لیں کہ آپ کو آگے سفر کرنے میں آسانی ہو اور خدانخواستہ راستے میں کوئی دشواری ہو تو اس کا سامنا کیا جا سکے۔“

اس کے ساتھ ہی عمران نے کرنسی نوٹوں کی ایک گڈی ڈاکٹر لی وان کے سامنے کر دی۔ ڈاکٹر نے اس میں سے صرف چار پانچ نوٹ اٹھائے اور جیب میں رکھ لیے۔

ڈاکٹر لی وان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر تابش! کیا تمہارے دوستوں، ڈاکٹر چوہان وغیرہ کو پتا ہے کہ تم کہاں اور کن لوگوں کے ساتھ ہو؟“

”نہیں ڈاکٹر! انہیں ابھی پتا نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میری وجہ سے انہیں بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔ وہ مجھے ڈھونڈتے رہے ہوں گے اور شاید اب بھی ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ لیکن اب میں زیادہ دیر انہیں اس پریشانی میں نہیں رکھوں گا۔ بہت جلد ان سے رابطہ کروں گا۔“

”کیا تم ان تک کوئی پیغام پہنچانا چاہتے ہو؟“

”میں یہ تو نہیں چاہتا کہ آپ انہیں براہِ راست کوئی پیغام دیں۔ اس طرح آپ کے لیے مشکل ہو سکتی ہے۔ ہاں، اگر آپ کسی گمنام ذریعے سے انہیں میری خیر خیریت ر... آگاہ کر دیں تو اور بات ہے۔“

ڈاکٹر لی وان نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جیکی کی حسین بیوا... شکنتلا بیمار ہے اور وہ ایک دن مشورے کے لیے اس کے پا... آئی تھی۔

میں نے ڈاکٹر لی وان کے سامنے وضاحت کی کہ... جیکی کی بیوی نہیں۔ ان دونوں کے درمیان محبت کا تعلق تھا او... یہ اتنا قریبی تعلق تھا کہ شکنتلا نے جیکی کی موت کو ایک بیوی... کی طرح محسوس کیا۔

روانگی کے وقت عمران نے بڑی معذرت کے سا... ڈاکٹر لی وان کی آنکھوں پر پٹی باندھی پھر وہ عمران اور ہوشیا... سنگھ کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

میرے آپریشن کو دس روز گزر چکے تھے۔ اب میں ... کو بالکل صحت مند اور چوکس محسوس کرتا تھا۔ یہ ایک تاریک... رات تھی۔ تاریک اور یخ بستہ۔ میں اور عمران قدیم مندر ... عقبی دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے سرد تازہ... کو اپنے جسم پر محسوس کیا اور ایک میٹھا میٹھا جوش سا پورے سر... میں دوڑ گیا۔ آج میں قریباً ایک ماہ بعد سہ منزلہ تہ خانوں ... نکلا تھا۔ مجھے لگا کہ میں زمانوں بعد کھلی فضا میں پہنچا ہوں... میں نے تاروں بھرے آسمان کو دیکھا، درختوں کو دیکھا،... پور کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھا۔ اور یہ سب کچھ بالکل نیا لگا... شاید یہ اس لیے بھی نیا تھا کہ آج میں آزاد تھا۔ اپنی مرضی ... بلاخوف جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ نادیدہ نگاہیں میرا تعاقب... نہیں کر سکتی تھیں۔

”یہ دیکھو جگرا!“ عمران نے دائیں طرف اشارہ کیا۔

مجھے قدیم مندر کا جلا ہوا حصہ نظر آیا۔ کوئلہ شہتیر، ج... ہوئی لکڑیاں اور ملبہ وغیرہ ابھی تک ایک بڑے ڈھیر... صورت میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس ڈھیر کو دیکھ کر... سارے پُرہنگام منظر میری نگاہوں میں گھوم گئے جو چند... پہلے ہم نے اس مندر میں دیکھے تھے۔ ان میں سے رام پرتا... کی موت کا منظر سب سے دردناک تھا۔

آفتاب خاں کی ہدایت کے مطابق ہم نے قد... دروازے پر کھڑے ہو کر اچھی طرح قرب و جوار کا جائزہ... پھر شکستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ اس طرف آبادی... ہونے کے برابر تھی۔ ایک بڑا جوہڑ تھا اور اس کے کنارے... گھاس اگی ہوئی تھی اور کائی بھی موجود تھی۔ ہم تھوڑی ہی د... گئے تھے کہ ایک سایہ سا ایک دیوار کی اوٹ سے نکلا ا...

ہمارے آگے آگے چل دیا۔ یہ آفتاب خاں تھا۔ حسبِ معمول اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی تھی۔ ہمارے اور آفتاب خاں کے درمیان قریباً تیس قدم کا فاصلہ تھا۔

ہم آفتاب کے پیچھے چلتے چلتے دو تین سنسان گلیوں سے گزرے اور خالی احاطے میں داخل ہو گئے۔ اس احاطے کے چاروں طرف چھ سات فٹ اونچی پکی دیواریں تھیں۔ شاید یہ جگہ مویشیوں کو باندھنے کے لیے استعمال ہوتی تھی مگر سردی کی وجہ سے اسے وقتی طور پر ترک کر دیا گیا تھا۔ یہاں ایک ٹوٹے پھوٹے چھپر کے نیچے ایک چھکڑا کھڑا تھا۔ چھکڑے کو ترپال سے اچھی طرح ڈھانپ دیا گیا تھا۔ چھکڑے کے آگے دو تازہ دم گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ عمران نے ترپال اٹھا کر ٹارچ جلائی اور چھکڑے کے اندر جھانکنے کے بعد مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

عمران نے ابھی تک مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ چھکڑے میں تازہ سبزیاں ہیں اور ہم انہیں زرگاں لے کر جائیں گے۔ اس چھکڑے اور سبزیوں وغیرہ کا سارا انتظام آفتاب خاں نے ہی کیا تھا۔ اس سے پہلے اسی آرام دہ چھکڑے پر عمران، ڈاکٹر لی وان کو یہاں لانے کے لیے نل پانی بھی جا چکا تھا۔

وقتِ رخصت عمران نے آفتاب خاں کو کچھ ضروری ہدایات دیں پھر ہم دونوں آفتاب خاں سے گلے ملے اور چھکڑے میں آ بیٹھے۔ ہم دونوں دیہاتی لباس میں تھے۔ سروں پر بڑے بڑے پگڑ تھے۔ ہم دونوں کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ سخت سردی سے بچنے کے لیے ہم نے چادروں کی بکلیں بھی مار رکھی تھیں۔ مقامی رواج کے مطابق بکل اس طرح ماری جاتی تھی کہ اس میں سر کے علاوہ دو تہائی چہرہ بھی چھپ کر رہ جاتا تھا۔

چھکڑے میں نہایت اعلیٰ قسم کے لیموں اور صحت مند قسم کی سبز مرچیں لدی ہوئی تھیں۔ عمران نے مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے میں لیموں، سبز مرچوں اور لہسن کی بڑی شان دار فصل ہوتی ہے۔ خاص طور سے لیموں اور سبز مرچوں کا تو جواب ہی نہیں۔ اس علاقے سے لیموں اور سبز مرچوں کی فصل منڈی تک پہنچتی ہی نہیں۔ اردگرد کے زمیندار اور کھاتے پیتے لوگ فصل تیار ہونے کے انتظار میں رہتے ہیں اور منہ مانگے داموں خرید لیتے ہیں۔ اس چھکڑے میں ہم قریباً ایک من نہایت اعلیٰ قسم کی سبز مرچ اور قریباً اتنے ہی لیموں لے کر زرگاں جا رہے تھے۔ یہ سوغات مختلف مرحلوں سے گزر کر حکم جی کے راج بھون تک پہنچتی تھی۔

عمران نے گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں۔ آفتاب نے احاطے کا دروازہ کھول دیا۔ ہم اپنے طویل سفر پر روانہ ہو گئے۔

لیموں زبردست خوشبو دے رہے تھے، مرچوں کی بھی اپنی ایک مہک ہوتی ہے۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ”اتنے زیادہ لیموؤں کا حکم کرے گا کیا؟“

”بھئی، اس کے بہت سے استعمال ہیں۔ سنا ہے کہ حکم کی پانچ پتنیاں اور کافی رکھیلیں وغیرہ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے دو چار کو ہر وقت کھٹائی کی ضرورت پیش آتی رہتی ہو۔“

”بس تمہارا ذہن تو ہر وقت اسی طرح کی باتیں سوچتا ہے؟“

”اور تمہارا ذہن کیا سوچتا ہے اس بارے میں؟“

”میرا تو خیال ہے کہ ان دونوں چیزوں کا اچار بنایا جاتا ہو گا اور بڑے بڑے مرتبانوں میں سنبھال لیا جاتا ہو گا۔“

”جب تم خود اتنے سمجھ دار ہو تو خوامخواہ اپنے سوال ضائع کیوں کرتے ہو؟ یہ چیزیں واقعی اچار بنانے میں استعمال ہوں گی۔ دنیا کے ہر خطے کی طرح یہاں بھی بہترین چیزوں پر طاقتور لوگوں اور حکمرانوں کا حق ہی ہے۔ ہر اچھی چیز کا رخ ان لوگوں کے گھروں کی طرف رہتا ہے۔ بہترین خوراک، شراب، عورتیں، معالج، ہنرمند سب کچھ ایک ہی سمت میں دوڑتا چلا جاتا ہے۔“

”یہ تو ناانصافی ہے۔“

”ہے تو ناانصافی لیکن قدرت کبھی کبھی حساب برابر بھی کر دیتی ہے۔ کسی وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ بری چیزیں بھی ان لوگوں کے گھروں کی طرف دوڑ پڑتی ہیں۔“

”بری چیزیں؟ کیا مطلب؟“

”یار! ہم کوئی اچھی چیزیں ہیں؟ اور جس ارادے سے ہم تشریف لے جا رہے ہیں وہ بھی خاصا خراب ہے۔ اللہ ہمیں اس خراب ارادے میں کامیاب کرے اور اس خرابی میں اتنا اضافہ کر دے کہ یہاں کے لوگ مدتوں یاد رکھیں۔ بلکہ اگر کسی نے کسی سے کہا ہو کہ تمہیں عبرت ناک سزا ملے گی تو یہ کہے کہ تمہیں ’جارج ناک‘ سزا ملے گی۔“

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”ہم کب تک پہنچ جائیں گے زرگاں؟“

”اگر حالات ہمارے حق میں رہے اور کالی بلیوں نے رستہ نہ کاٹا تو کل رات کسی وقت۔“

www.kahopakistan.com

''اگر کالی بلیوں نے راستہ کاٹا تو پھر؟'' کالی بلیوں سے مراد حکم کے ہرکارے تھے۔

''پھر ان سے وہی کچھ کہنا ہے جو طے کیا ہے... وہی پہلے والے فرضی نام ہیں ہمارے۔ میرا نام امیت اور تمہارا گوپال۔ ہم کھیا عبدالرشید کی طرف سے یہ سامان لے کر زرگاں کے راج بھون جارہے ہیں۔''

ہم نے اپنا اسلحہ اور ایمونیشن سبزی کے اندر اس طرح چھپایا تھا کہ سخت کوشش کے بعد ہی اسے تلاش کیا جا سکتا تھا لیکن اگر ہم چاہتے تو دو تین سیکنڈ کے اندر ان اشیا تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔

عمران کے ساتھ نے میرے اندر ایک عجیب سا جوش بھر دیا تھا۔ کل شام جب ہم اس کارروائی کی منصوبہ بندی کر رہے تھے تو عمران نے کہا تھا۔ ''بے شک یہ خطرناک کام ہے لیکن ہمیں اس کے تناؤ اور خطرناکی کو خاطر میں لائے بغیر اسے انجوائے کرنا ہے۔'' اور واقعی آج یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی خطرناک مشن پر نہیں، سیر و تفریح کے لیے جارہے ہیں۔ عمران گاہے بگاہے کوئی فلمی گانا گنگنانے لگتا تھا یا پھر اپنی کسی فرضی محبوبہ کو یاد کر کے آہیں بھرنے لگتا۔ پیاز کی طرح اس کے اوپر تہ در تہ چھلکے تھے۔ اس کے اندر کیا ہے؟ کچھ خبر نہیں ہوتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''بس مجھے ایک ہی فکر ہے عمران! ہماری غیر موجودگی میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے۔ میرا مطلب ہے کہ آفتاب کا تہ خانوں میں آنا جانا کہیں بھانڈا نہ پھوڑ دے۔''

''لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ میں نے آفتاب کو منع کر دیا ہے۔ وہ ہماری واپسی تک تہ خانوں میں نہیں جائے گا۔''

''تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''بس یونہی۔ جب تم مجھ سے سوال پوچھتے ہو تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ میں خود کو باس باس محسوس کرنے لگتا ہوں۔''

''اور میرا خیال ہے کہ تمہارے دماغ میں کیڑا ہے۔ تم دوسروں کو الجھن میں رکھ کر خوشی محسوس کرتے ہو۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ میں دوسروں کو بے خبر رکھ کر انہیں پریشانیوں سے بچاتا ہوں۔ اب یہی دیکھو۔ نالا پار کرنے کے بعد پچھلے ایک گھنٹے تک ہم سخت خطرے میں رہے ہیں لیکن تم مزے سے جمائیاں لیتے رہے ہو اور میرے گانے سنتے رہے ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''نالا پار کرتے ہی ''کلرے'' کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں کے سرکنڈوں میں بے تحاشا سانپ ہیں۔ ہوشیار سنگھ نے بھی کہا تھا کہ یہ چار پانچ میل کا راستہ ہمارے سفر کا سب سے خطرناک حصہ ہے۔ سانپ گھوڑا گاڑیوں میں گھس آتے ہیں اور سواری کے جانوروں کو ڈس لیتے ہیں۔ اگر میں تمہیں بتا دیتا تو اس کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہونا تھا کہ پچھلا ایک گھنٹا تم بھی سخت ٹینشن میں گزارتے۔''

''لیکن اس سے میرا اعتماد تو گڑبڑ ہوا ہے نا۔ اب آئندہ بھی تم مجھ سے پتا نہیں کیا کیا چھپاؤ گے۔''

''نہیں... باقی سب کچھ تمہارے علم میں ہے۔ سوائے ایک بات کے۔'' اس نے آخری الفاظ عجیب سے لہجے میں کہے۔ اس کے لہجے میں یہ عجب پن بس تین چار سیکنڈ پہلے ہی آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، اس نے بیٹھے بیٹھے جست لگائی اور سبزیوں کے اوپر جا گرا۔ میں نے گھبرا کر ٹارچ جلائی اور یہ دیکھ کر رہ گیا کہ عمران کے ہاتھ میں ایک سانپ کی گردن ہے۔ یہ درمیانے سائز کا سانپ تھا اور اس کے جسم پر گول داغ سے تھے۔ سانپوں کے بارے میں میرا علم زیادہ نہیں تھا۔ بس یہی سنا تھا کہ ایسے سانپ کو ''کوڑی والا'' سانپ کہا جاتا ہے اور یہ بہت زہریلا ہوتا ہے۔ گردن پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے سانپ کا منہ پورا کھل گیا تھا اور اس کے نکیلے دانت دکھائی دینے لگے... عمران نے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر سبزیوں کے نیچے سے موٹے کینوس کا وہ چھوٹا بیگ نکالا جس میں ریوالورز کے راؤنڈز رکھے تھے۔ عمران کے اشارے پر میں نے بیگ کو الٹا کر خالی کیا۔ عمران نے بڑی چابک دستی سے سانپ کو بیگ میں ڈال کر اوپر سے زپ کھینچ دی۔

اب ہمیں شک ہو گیا تھا کہ گاڑی میں کوئی اور سانپ بھی نہ ہو۔ ہم نے گاڑی روک دی اور ٹارچ کی مدد سے اچھی طرح تلاشی لی۔ سبزیوں کو بھی الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔

''لگتا ہے کہ یہ اکیلا ہی تھا۔'' میں نے کہا۔

''تم اتنے یقین سے ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہ اکیلا تھا۔''

''کیا مطلب... گاڑی کا ایک ایک انچ تو دیکھ لیا ہے۔''

''تم ایک ایک ملی میٹر بھی دیکھ لو تو یہ نہیں کہہ سکتے۔''

''بھئی، کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''یار! ہو سکتا ہے کہ یہ اکیلا نہ ہو بلکہ اکیلی ہو۔ ہم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نر ہی ہے۔ اس کے لیے تو دن کی روشنی میں تفصیلی معائنے کی ضرورت پڑے گی اور اگر یہ سانپ نہیں سانپنی ہے تو ہو سکتا ہے کہ ہم مردوں سے معائنہ کرانے سے ہی انکار کر دے۔ آخر ''ناگنی حقوق'' بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔''

''ناگنی حقوق؟''

''بھئی جس طرح انسانی حقوق ہوتے ہیں...''

وہ پٹری سے اتر گیا تھا پھر بولتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چھکڑا بھی چلتا رہا۔ دور جنگل کی گہرائی سے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی رہیں۔

☆☆☆

یہ اگلی رات، گیارہ بارہ بجے کا عمل تھا۔ ایک طویل اور پُرخطر سفر طے کر کے ہم زرگاں کی بھری پری آبادی میں داخل ہو چکے تھے۔ زرگاں میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں کم از کم تین جگہ روکا گیا تھا اور باقاعدہ سوال جواب کیے گئے تھے۔ چھکڑے میں رکھی سبزیوں کا بھی سرسری معائنہ ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ فتح پور اور اس کے گرد و نواح سے اس طرح کی سوغاتیں اکثر راج بھون کے لیے آتی رہتی ہیں۔ زرگاں کے مسلح محافظوں نے ہمیں زیادہ شک و شبہے کا نشانہ نہیں بنایا۔ بہرحال، اگر ہمارا خیال یہ تھا کہ ہم اسی طرح چھکڑا ہانکتے ہانکتے راج بھون میں داخل ہو جائیں گے تو یہ ہماری غلط فہمی تھی۔ راج بھون سے کچھ فاصلے پر ہی مسلح محافظوں نے ہمیں روک لیا اور چھکڑا ایک طرف لگانے کا حکم دیا... یہاں پہلے سے کئی چھکڑے، گھوڑا گاڑیاں اور لوڈر وغیرہ کھڑے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر پر وہ سامان خورونوش تھا جو راج بھون میں جانا تھا۔ سبزیاں، دودھ، پھل اور اس قسم کی دیگر اشیا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک گھوڑا گاڑی میں شراب کی بہت سی بوتلیں لدی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ خوبرو طوائفیں اور ان کے سازندے وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب لوگ منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ راج بھون میں جانا چاہتے ہیں مگر انہیں اس کی اجازت نہیں مل سکی۔ راج بھون کی شان دار عمارتیں ایک اونچی فصیل نما دیوار کے اندر محفوظ تھیں۔ میں یہ دیوار پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن اب یہ پہلے سے زیادہ اونچی نظر آرہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے زرگاں میں ہونے والے پے در پے خونی واقعات کے بعد ہی اس دیوار کو مزید بلند کیا گیا ہے۔ اس طرح کے اضافی حفاظتی انتظامات ہر جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ بھی تھی کہ سامان

خاکم بدھن

ایک نیگرو کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ عدالت الٰہیہ میں پیش ہوا تو اس نے فریاد کی۔

''خدایا! کیا تو یہ بتا سکتا ہے کہ تو نے میری جلد کا رنگ اس قدر سیاہ کیوں بنایا تھا؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، تاکہ تو افریقہ میں سورج کی شدید تمازت کا مقابلہ کر سکے۔''

''تو میری ٹانگیں اتنی لمبی کیوں بنائی تھیں؟''

''اس لیے کہ جب جنگلی درندے تیرا پیچھا کریں تو تو تیز بھاگ سکے۔''

''میرے بال اتنے گھونگریالے کیوں بنائے تھے؟''

''تاکہ وہ لمبے نہ ہونے پائیں اور جنگل میں بھاگتے وقت درخت کی شاخوں میں نہ الجھیں۔''

سیاہ فام نیگرو نے سر جھکا لیا اور بولا۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ بتا کہ ان تمام صفات کے ساتھ تو نے مجھے شکاگو میں کیوں پیدا کر دیا؟''

لیاری سے قادر بلوچ کی فریاد

خورونوش والی گاڑیاں اب براہِ راست راج بھون کی حدود میں نہیں جا سکتی تھیں۔ یہ سارا سامان اب یہاں سے خاص شاہی گھوڑا گاڑیوں میں منتقل کیا جا رہا تھا اور ان گاڑیوں کو راج بھون کے باوردی کوچبان چلا رہے تھے۔

راج بھون کی قریباً ایک درجن عمارتوں میں وہ عمارت بھی شامل تھی جہاں جارج گورا آج کل رہتا تھا۔ اس سے پہلے جارج گورا، راج بھون کی حدود سے باہر رہائش پذیر تھا مگر جب سے سلطانہ والا واقعہ ہوا تھا اور بپھرے ہوئے لوگوں نے اس کی رہائش گاہ پر دیوانہ وار چڑھائی کی تھی، وہ اپنی رہائش راج بھون کی حدود کے اندر لے آیا تھا۔ وہ آہنی رکاوٹوں، بلند دیواروں اور مسلح محافظوں کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ ہمیں یہ سارے گھیرے توڑ کر اس تک پہنچنا تھا۔ مارنا تھا یا مر جانا تھا۔

''تم نے ایک خاص چیز نوٹ کی؟'' عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ہم دونوں اپنے چھکڑے کے قریب ہی کھڑے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ بولا۔ ''راج بھون میں ضرورت سے زیادہ روشنی

www.kahopakistan.com

نظر آرہی ہے۔''

''اور میرے خیال میں آتش بازی بھی ہورہی ہے... وہ دیکھو ایک اور ہوائی گئی۔'' میں نے انگلی سے اشارہ کیا۔

''اس کا مطلب ہے، کوئی جشن وغیرہ ہے۔''

عمران نے قریب کھڑے ایک گاڑی بان سے پوچھا تو اس نے مقامی لب و لہجے میں بتایا۔ ''آج بڑا شبھ دن ہے۔ بھگوان نے ہمیں خوشی دکھائی ہے۔ حکم جی کے ہاں بیٹے نے جنم لیا ہے...''

دو اور گاڑی بان بھی وہاں آگئے اور اس پُرمسرت موقع کے حوالے سے باتیں کرنے لگے۔ عمران نے مجھے ٹھوکا دیا اور ہم اپنے چھکڑے میں چلے آئے۔ سب سے پہلے ہم نے سبزیوں کے نیچے سے اپنا اسلحہ نکالا۔ یہ دو ریوالوروں اور دو عدد شکاری چاقوؤں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ گولیاں وغیرہ تھیں۔ یہ سب کچھ ہم نے موٹے پولیتھین میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا تاکہ بارش یا پانی وغیرہ سے محفوظ رہے۔ ایک ریوالور، ایک چاقو اور تھوڑا سا ایمونیشن میں نے اپنے لباس میں رکھ لیا اور اوپر سے گرم چادر کی بکل مار لی۔ باقی اشیا عمران نے سنبھال لیں۔ ان میں وہ کینوس بیگ بھی تھا جس میں ایک آوارہ سانپ استراحت فرما رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''اس چھکڑے کے ساتھ راج بھون میں گھسنے کی امید تو ختم ہوگئی ہے۔ اب دوسرے آپشن پر عمل کرنا ہوگا۔ دوسرا آپشن پتا ہے نا؟''

''اتنا ہی پتا ہے جتنا تم نے بتایا تھا۔ راج بھون کی شمالی دیوار کی طرف ایک جھیل ہے جس میں سے گزر کر دیوار تک پہنچا جاسکتا ہے۔''

''بندے کو جتنا تھوڑا پتا ہوتا ہے، وہ اتنا ہی سکون میں رہتا ہے۔ اب اگر میں تمہیں یہ بتا دیتا کہ جھیل کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہے اور اس میں سے گزرتے ہوئے ہمیں دیوار پر سے دیکھا جاسکتا ہے اور ہم پر چاند ماری ہوسکتی ہے... اور جھیل پار کرنے کے بعد ہمیں بغیر کسی سیڑھی کے قریباً پینتیس فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا ہوگا تو یقیناً تمہاری صحت پر بہت بُرے اثرات پڑتے۔''

''میری صحت کا اتنا خیال رکھنے کا بہت شکریہ... ٹھنڈے پانی اور چاند ماری کی زیادہ فکر نہیں۔ جو کچھ ہوگا، دونوں کے ساتھ ہوگا لیکن یہ جو دیوار کی بات کر رہے ہو، اس کا کیا کریں گے...؟''

''یہ بڑا اور بجنل سوال ہے اور اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تم بالغ ہوگئے ہو۔ اب تم وہ ساری فلمیں دیکھ سکتے ہو... جو پہلے بھی دیکھ لیتے تھے... اور جن میں قابلِ اعتراض بات صرف یہی ہوتی تھی کہ ان میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں تمہارے اس اور یجنل سوال کا جواب دیتے ہوئے بہت مسرت محسوس کر رہا ہوں۔''

''فرماؤ... کیا جواب ہے؟''

''اوئے گھامڑ! تمہارے ساتھ سرکس کی دنیا کا نمبر ون جمناسٹر موجود ہے... یہ دیوار پینتیس فٹ کے بجائے پینتیس میٹر بلند بھی ہوتی تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میری معلومات کے مطابق یہاں ہمارے لیے ایک بونس سہولت بھی موجود ہے۔ ایک رسّی اس دیوار پر چڑھنے کے لیے پہلے سے لٹک رہی ہے اور امید ہے کہ وہ اب تک لٹک رہی ہوگی۔''

''کس نے لٹکائی ہے؟''

''جادو برحق ہے یار۔'' اس نے بات کو گول کیا اور مجھے لیتا ہوا چھکڑے سے باہر آگیا۔ راج بھون کے اردگرد رات میں بھی دن کا سماں تھا۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ کھا پی رہے تھے اور ہلا گلا کر رہے تھے۔ کہیں سے طربیہ ساز بجنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے راج بھون کے اردگرد بھی آتش بازی شروع ہوگئی۔ ہم راج بھون کی بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ ایک طویل چکر کاٹ کر شمال کی جانب آگئے۔ یہاں نسبتاً سکون تھا۔ روشنیاں بھی بس کہیں کہیں دکھائی دیتی تھیں۔

جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، خاموشی مزید گہری ہوتی گئی۔ یہاں دور تک برفیلی جھیل کا پانی چمک رہا تھا۔ قریباً دو سو میٹر چوڑی جھیل کے آخری سرے پر راج بھون کی بلند فصیل تھی اور فصیل کے اندر چراغاں اور آتش بازی کی روشنی تھی۔ فصیل نما دیوار کے اوپر بھی کہیں کہیں مشعلیں اور قندیلیں روشن نظر آتی تھیں۔ ہم دونوں نے خود کو زمانۂ قدیم کے جنگجوؤں کی طرح محسوس کیا جو دشمن کے کسی اہم قلعے پر شب خون مارنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک پُرخطر تاریکی میں اترے تھے۔

ہمارے ہتھیار موٹے پولیتھین میں لپٹے تھے اور بالکل محفوظ تھے۔ ہم نے میچ کا آغاز کرنے والے پُرجوش کھلاڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور یخ بستہ پانی میں اتر گئے۔ اس پانی کو صرف یخ بستہ کہنا کافی نہیں تھا۔ یہ سیال برف تھی جو ہمارے جسم سے ٹکرائی اور اپنی ٹھنڈک کو ہماری ہڈیوں تک لے گئی۔ پانی ہماری کمر تک پہنچ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سینے تک چلا گیا پھر ہم تیرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ جہاں جھیل ختم ہوگی اور دیوار شروع ہوگی، وہاں اِکّادُکّا محافظ موجود ہوں گے۔ ہماری خواہش یہی تھی کہ پانی کی گہرائی جلد از جلد کم ہوجائے تاکہ ہم تیرنے کے بجائے چل سکیں۔ تیرنے سے شور پیدا ہوتا تھا اور یہ ہمارے لیے خطرناک تھا۔

جلد ہی ہماری پریشانی اطمینان میں بدل گئی۔ ہمارے پاؤں پھر سے زمین سے لگنا شروع ہوگئے۔ اب پانی پر ہاتھ پاؤں چلنے کی آواز معدوم ہوگئی اور ہم خاموشی سے آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے صرف سر ہی پانی سے باہر تھے۔ اب ہمیں فصیل کے اندر کا بلند و بالا شور بھی ایک بھنبھناہٹ کی صورت سنائی دینے لگا تھا۔ گاہے بگاہے تاریک آسمان پر آتش بازی کے رنگ بکھرتے تھے اور ان کا مدھم عکس جھیل کے پانی پر جھلک دکھاتا تھا۔

ابھی ہم پانی کے اندر ہی تھے کہ ہمیں دیوار نما فصیل کے پاس پہرے داروں کی موجودگی کا احساس ہوگیا۔ ایک کیبن نما جگہ پر ہلکی سی روشنی دکھائی دی اور قہقہوں کی آواز آئی۔ کیبن زیادہ بڑا نہیں تھا، اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں تین چار افراد موجود ہوں گے۔ عمران اور میں انتہائی خاموشی کے ساتھ پانی سے باہر نکلے اور یخ بستہ ریت پر اوندھے لیٹ گئے۔ تیز ہوا ہمارے تربتر کپڑوں سے ٹکرائی اور یوں لگا کہ جھیل سے باہر کی سردی جھیل کی سردی سے زیادہ ہے۔ عمران نے کمال مہارت کے ساتھ لکڑی کے کیبن کی طرف رینگنا شروع کیا۔ میں نے بھی جیسے تیسے اس کی تقلید کی۔ ہم ہر طرح کے خطرے اور مار دھاڑ کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ہم کیبن کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے جب اچانک لکڑی کا دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ ایک ہٹا کٹا پہرے دار جو واضح طور پر نشے میں تھا، کندھے سے رائفل لٹکائے باہر نکلا۔ ہمیں دیکھے بغیر وہ ہم سے صرف دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوگیا اور ایک پتھر کی طرف منہ کرکے پیشاب کرنے لگا۔ اس کی حاجت ابھی آخری مراحل میں تھی کہ عمران کسی عفریت کی طرح اس پر جا پڑا۔ یہ ایک پرفیکٹ حملہ تھا۔ ہٹا کٹا پہرے دار ہلکی سی آواز بھی نہیں نکال سکا۔ فقط اس کے گرنے سے مدھم آواز پیدا ہوئی... عمران نے اس کا سر اتنی شدت کے ساتھ پتھر سے ٹکرایا کہ اس نے ایک لحظے میں ہاتھ پاؤں پھینک دیے۔ عمران نے پھرتی سے اس کی رائفل کندھے سے اتار لی۔

ہٹے کٹے پہرے دار کے گرنے سے جو مدھم آواز پیدا ہوئی تھی، اس نے کیبن تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ ''کانتے! یہ کیا آواج ہے بھائی؟''

عمران نے تیزی کے ساتھ بے ہوش پہرے دار کو گھسیٹ کر پتھر کی اوٹ میں کیا۔ اسی دوران میں کیبن کا دروازہ پھر چرچرایا۔ دوسرا پہرے دار باہر نکلا۔ اس نے ہاتھ میں بوتل پکڑ رکھی تھی۔ اس نے کھوجی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور ایک بار پھر اپنے ساتھی کانتے کو آواز دی۔

میں تاریکی میں کیبن کی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور اس سے فقط چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا۔ میں نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ میرا ریوالور والا بازو اس کی گردن سے لپٹ گیا اور خالی ہاتھ سے میں نے اس کا منہ ڈھانپ لیا۔ اس کی خاردار مونچھیں میری ہتھیلی پر چبھیں۔ اس کے منہ سے الکحل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ بارونداجیکی نے مجھے انسانی گردن کے ان نازک حصوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا جن پر خاص انداز میں دباؤ ڈالنے سے انسان ہوش و حواس سے بیگانہ ہوسکتا ہے۔ میں نے اس تربیت کو آزمانے کی کوشش کی لیکن صرف جزوی کامیابی حاصل ہوسکی۔ میرے شکار کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور نرم ریت پر گری۔ میں نے تب تک اس کی گردن پوری طاقت سے دبائے رکھی جب تک وہ میرے ہاتھوں میں چھپکلی کی طرح جھول نہیں گیا۔ میں نے اسے آرام سے ریت پر لٹا دیا۔ عمران نے ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھا اور دونوں انگوٹھے اوپر اٹھا کر ''ویلڈن'' کا اشارہ دیا۔

اندر فقط ایک اور پہرے دار موجود تھا مگر اس کے خلاف کسی طرح کی کارروائی کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ شراب کے نشے میں اتنا ٹن تھا کہ بس نیم مردہ ہی نظر آتا تھا... ایک آہنی انگیٹھی کے قریب وہ بے سدھ پڑا تھا۔

عمران نے اس باوردی پہرے دار کو ہلکی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ حکم کے گھر پلا پیدا ہونے کی خوشی میں یہ فوت ہوچکا ہے یا صبح تک ہوجائے گا۔''

کیبن میں سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے اور یہاں وہاں تاش کے پتے پڑے تھے۔ کیبن کی کھونٹیوں پر پہرے داروں کی تین چار وردیاں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں مزید افراد بھی متعین ہیں لیکن فی الحال وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ گشت پر ہوں یا پھر راج بھون کے جشنِ طرب میں شریک ہونے کے لیے فصیل کے اندر چلے گئے ہوں۔

ہمارے کپڑے بُری طرح بھیگ چکے تھے۔ سرد ہوا

www.kahopakistan.com

کے سبب عمران جیسا شخص بھی کپکپانے پر مجبور ہو رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اس سردی کو خوش دلی سے برداشت کر رہا ہوں۔

میں نے کیبن کی کھڑکی میں سے باہر نظر دوڑائی۔ دور جھیل کے کنارے پر ایک روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ یقیناً یہ بھی کوئی ایسا ہی کیبن تھا۔ بہرحال، وہ ہم سے خاصی دوری پر واقع تھا۔ میں نے دیکھا کہ عمران وردیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ پھر ایک وردی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے جسم پر فٹ آئے گی۔''

''اور تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بھی کوئی ڈھونڈ لیتا ہوں یار۔'' اس نے کہا۔

کیبن میں نظر دوڑانے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پتھر کے قریب بے ہوش پڑے شخص کے جسم سے وردی اتار رہا ہے۔

صرف چار پانچ منٹ بعد وہ نئے روپ میں میرے سامنے آ گیا۔ اب وہ وردی اور سرخ پگڑی کے ساتھ حکم کا ایک چوکس محافظ نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی عمران کی تقلید کی اور باہر تاریکی میں جا کر کپڑے تبدیل کر آیا۔ ایک ایک رائفل بھی ہم نے اپنے کندھوں سے لٹکا لی۔

یہ بات ہمیں بڑی اچھی طرح معلوم تھی کہ اس جانب سے راج بھون کی فصیل میں سے گزرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس حوالے سے عمران نے بس ہلکا سا اشارہ دیا تھا کہ کوئی رسّی یہاں لٹک رہی ہے جس کے ذریعے بتیس پینتیس فٹ اونچی دیوار پر چڑھا جا سکتا ہے۔ ہم کیبن سے نکلے اور فصیل نما دیوار کے ساتھ ساتھ رسّی کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ ہمیں زیادہ آگے نہیں جانا پڑا... ہمیں وہ رسّی نظر آ گئی۔

راج بھون کی فصیل اور جھیل کے درمیان ریت کی ایک تنگ پٹی سی تھی۔ کہیں یہ پٹی دس پندرہ فٹ چوڑی تھی اور کہیں دو تین فٹ رہ جاتی تھی۔ کئی جگہیں ایسی تھیں جہاں یہ پٹی موجود ہی نہیں تھی اور جھیل کا پانی فصیل نما دیوار کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ یہ رسّی ایک ایسی ہی جگہ پر جھول رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ چمڑے کی ایک مضبوط بیلٹ ہے۔ اس کے بالائی سرے پر لکڑی کی ایک بڑی چرخی تھی اور نچلے سرے سے ربر کا ایک تھیلا سا بندھا ہوا تھا۔ کھلے منہ والے اس لچکیلے تھیلے کو عام طور پر ''بوکا'' کہا جاتا ہے اور اس سے کنوئیں کے اندر سے پانی کھینچا جاتا ہے۔

اب ساری صورتِ حال سمجھ میں آ رہی تھی۔ فصیل کے اوپر لگی ہوئی چرخی کے ذریعے جھیل میں سے پانی کھینچا جاتا تھا۔ یہ انتظام کرنے والوں نے شاید سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کوئی اس طرف سے برفاب جھیل کو پار کرے گا اور اس چرخی اور رسّی کو کمند کے طور پر استعمال کرنے کا پروگرام بنائے گا۔

رات کے اس پہر فصیل کا یہ حصہ بالکل تاریک اور بڑی حد تک خاموش نظر آتا تھا... چرخی کے اردگرد کسی طرح کی نقل و حرکت کے آثار نہیں تھے۔

''میں کیسے چڑھوں گا؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''تم چڑھو گے نہیں، چڑھائے جاؤ گے۔'' وہ ترت بولا۔

اس کے بعد اس نے اپنے کندھے سے رائفل اتار کر ربر کے بوکے میں رکھ دی اور مجھے بھی ایسا کرنے کی ہدایت کی۔ پھر سرگوشی میں کہنے لگا۔ ''میں اوپر جا رہا ہوں۔ اوپر پہنچ جاؤں تو تم بوکے میں بیٹھ جانا۔ میں چرخی گھما کر تمہیں اوپر کھینچ لوں گا۔''

وہ اتنے اطمینان سے بات کر رہا تھا جیسے تیس پینتیس فٹ اونچی فصیل پر نہیں، کسی گھر کی قدِ آدم باؤنڈری وال پر چڑھنے کا ارادہ کر رہا ہے... اور وہ ایسا انداز اختیار کر بھی سکتا تھا۔ کودنا، پھلانگنا اور چڑھنا اترنا اس کے پیشے کا حصہ تھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر اوپر جاتے جاتے تم زیادہ اوپر چلے گئے تو؟''

''تو تم میری ساری بیویوں سے شادی کر لینا... اور میرا لاہور والا مکان بیچ کر میرے حلقے کے ایم این اے کو دے دینا۔ بے چارہ بڑا غریب سیٹھ ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی مہارت سے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ فقط ایک منٹ میں وہ فصیل پر تھا۔

اس کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق میں ربر کے بوکے میں بیٹھ گیا۔ عمران نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ فصیل پر کھڑے ہو کر میں نے راج بھون کی وسعت میں جھانکا تو وہاں رنگ و نور کا سیلاب نظر آیا۔ کچھ رنگین ہوائیاں ہمارے سروں کے اوپر سے اڑتی ہوئی گئیں اور جھیل کے پانی میں گم ہو گئیں۔

عمران ہانپ رہا تھا۔ ''یار! تمہاری باتوں میں تو اتنا وزن نہیں لیکن خود کافی وزنی ہو۔''

''اور تم دونوں طرف سے ہلکے ہو۔''

''تمہیں بھی زبان لگ گئی ہے۔ کوئی بات نہیں، اگلے آدھ پون گھنٹے میں تمہاری بولتی ضرور بند ہو جائے گی۔''

''بے فکر رہو۔ اگر ہو گی تو دونوں کی ہو گی۔''

''لو... لگ رہا ہے کہ کام شروع ہونے والا ہے۔'' عمران نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ دو پہرے دار چوڑی فصیل پر چلتے ہوئے سیدھا ہماری طرف آ رہے تھے۔ ہم دونوں نے چہرے ایک دوسرے کی طرف کر لیے اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔ عین ممکن تھا کہ یہ پہرے دار ہماری طرف توجہ دیے بغیر گزر جاتے۔

یقیناً گزر جاتے مگر یہاں ہم سے ایک غلطی ہوئی جس کا پتا ہمیں بعد میں چلا۔ ان پہرے داروں کی سرخ پگڑیوں میں ایک نیلی دھاری تھی جس کا مطلب تھا کہ یہ ہم سے سینئر ہیں۔ مروجہ اصول کے مطابق ہمیں ان کو نمستے کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے خاموش رہنے کے سبب وہ ٹھٹک گئے۔ انہوں نے مڑ کر ہمیں دیکھا اور پھر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے ٹارچ کی روشنی ہم پر پھینکی۔ ''تمہاری ڈیوٹی کہاں ہے؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ بُری طرح چونکا۔ غالباً وہ یہاں موجود پہرے داروں کو صورتوں سے پہچانتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے... وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ حرکت اس کی موت پر مہرِ تصدیق لگا چکی ہے۔ عمران کی بھرپور لات اس کے سینے پر پڑی۔ پیچھے کی طرف لڑکھڑانے کے لیے اس کے پاس ڈیڑھ دو فٹ سے زیادہ جگہ نہیں تھی۔ وہ پیچھے گیا اور پھر دیوار پر سے جھیل کی طرف پرواز کر گیا۔ دیوار یعنی فصیل کی موٹائی نیچے سے زیادہ تھی۔ وہاں ایک کنارہ سا بن گیا تھا۔ بدقسمت شخص پہلے اس کنارے سے ٹکرایا پھر جھیل کے برفاب میں چلا گیا۔ دوسرا شخص کافی قوی ہیکل تھا۔ اس نے مجھ پر اندھا دھند ہاتھ چلایا... وزنی مکا میری ٹھوڑی پر لگا۔ گردن کو لگنے والے دھچکے کے سبب میرے نیم مندمل زخم میں ٹیسیں اٹھیں اور دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ اس ہٹے کٹے شخص کا دوسرا وار میں نے جھک کر بچایا اور اس کے سر پر ایک زوردار جوابی مکا رسید کیا۔ وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میں نے اندھا دھند دو اور مکے اس کے کھوپڑے پر ہی رسید کیے۔ وہ پیٹ سے گرا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ میرے زوردار مکوں کا یہ وہی نتیجہ تھا جو اس سے پہلے کھیا عبدالرشید کی حویلی میں نکلا تھا۔ میں نے پورے طیش سے سلمان سلو کے سر پر دو تین ضربیں لگائی تھیں اور اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا تھا۔

اسی دوران میں ایک قریبی برجی کے پیچھے سے ایک نہایت جوشیلا پہرے دار نکل کر عمران پر جھپٹا۔ غالباً اس کے جوش و خروش میں کچھ حصہ شراب نوشی کا بھی تھا۔ وہ بھی یہ بات فراموش کر گیا کہ اگر اس کا وار خالی گیا تو انجام کیا ہوگا۔ عمران نے پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر خود کو اس کی اندھی زد سے بچایا۔ وہ ریپٹ کر گرا۔ ایک سیکنڈ کے لیے فصیل کے کنارے پر نظر آیا۔ پھر ڈکراتا اور ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا جھیل کی طرف پرواز کر گیا۔

''بچہ ابھی سیکھ رہا تھا۔'' عمران نے گہرائی میں دیکھتے ہوئے تاسف سے کہا۔ پھر گھوم کر ٹارچ کی روشنی اس پہرے دار کے چہرے پر پھینکی جو ابھی تک دیوار کے اوپر ہی تھا۔

اس کا سامنا مجھ سے ہوا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ کر اس کی گھنی مونچھوں کو بھگو رہا تھا۔ ''زندہ ہے یا مر گیا؟'' میں نے پوچھا۔

اصول

نقب لگانے کے بعد اچانک چوروں کو پتا چلا کہ جس مکان میں وہ لوگ گھسے تھے، وہ مشہور و معروف مکے باز محمد علی کلے کا مکان تھا۔ سارے چور یہ معلوم ہوتے ہی تھرتھر کانپنے لگے۔

ایک نے کہا: ''چپکے سے کھسک لو، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔''

دوسرا بولا: ''ہائے! محمد علی مکے مار مار کر ہماری ہڈی پسلی ایک کر دے گا۔''

تیسرے نے جو معمر اور تجربے کار تھا، ساتھیوں کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں یارو۔ میں محمد علی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ جب تک کم سے کم پچاس ہزار ایڈوانس نہ لے لے، ایک مکا بھی نہیں مارے گا۔''

منظر خان کی تحقیق... ہری پور ہزارہ سے

لفٹ کا جادو

دیہات کا ایک لڑکا شہر میں لفٹ چلانے پر ملازم ہو گیا۔ اتفاقاً اس کا چچا اس سے ملنے آیا اور دیکھا کہ بھتیجے کی لفٹ میں ایک بوڑھی عورت سوار ہو رہی ہے۔ لفٹ بڑی بی کو اوپر لے گئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک نوجوان لڑکی لفٹ میں سوار ہو گئی اور نیچے لڑکے کے چچا کے سامنے باہر نکلی۔ چچا نے فوراً بھتیجے سے کہا: ''بیٹے میں اب کے آؤں گا تو تمہاری چچی کو ساتھ لاؤں گا تم ایک چکر اسے بھی لگا دینا۔''

لورالائی سے کشمالا کا انتخاب

www.kahopakistan.com

''سر کی ہڈی ٹوٹ کر مغز میں گھس جائے تو اکثر لوگ زندہ رہنا پسند نہیں کرتے۔'' عمران نے کہا اور مجھے ذرا حیرت سے دیکھ کر ٹارچ بجھا دی۔

یہ فصیل قریباً تین فٹ چوڑی تھی۔ کہیں کہیں باقاعدہ برجیاں تھیں اور وہاں اس کی چوڑائی چھ سے آٹھ فٹ تک تھی۔ ہم دونوں نے مُردہ پہرے دار کی لاش گھسیٹ کر پینتیس فٹ نیچے یخ بستہ جھیل میں پھینک دی اور محافظوں کے انداز میں اکڑ کر چلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ سیڑھیاں زیادہ دور نہیں تھیں۔ ہم نے تقریباً پچاس عدد سیڑھیاں طے کیں اور ایک کھلے احاطے میں داخل ہو گئے۔ یہاں راج بھون کے بیسیوں ملازم اور محافظ وغیرہ جمع تھے۔ کچھ ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے۔ کچھ ساز بجا رہے تھے۔ یہاں وہاں مٹھائی بھی تقسیم ہو رہی تھی۔ عمران نے سرگوشی میں کہا۔ ''ایک نئے آقا کے نئے ظلم سہنے کا کتنا چاؤ ہے ان لوگوں کو۔''

عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ظالم ابنِ ظالم اور مظلوم ابنِ مظلوم کی روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ ہم نے تھوڑی سی مٹھائی لی اور ہلا گلا کرتے لوگوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ہمارا رخ سنہری کلسوں والی اس بلند و بالا عمارت کی طرف تھا جو جنریٹرز کی روشنی سے پوری طرح جگمگا رہی تھی۔ سیکڑوں رنگ برنگے قمقمے تھے اور ابھی مزید لگائے جا رہے تھے۔ یہی عمارت اس اسٹیٹ کے طاقتور فرماں روا رائے وشوا ناتھ عرف حکم جی کی جائے رہائش تھی۔ عمران کی معلومات کے مطابق سفید چمڑی والے جارج کا عشرت کدہ بھی اسی عمارت کے ساتھ تھا۔

یہاں آ کر میں نے اور عمران نے نوٹ کیا کہ جن پہرے داروں کی پگڑیوں میں دھاریاں تھیں، وہ سینئر تھے اور عام پہرے دار پاس سے گزرتے ہوئے انہیں باقاعدہ سر جھکا کر تعظیم پیش کرتے تھے۔ ہم نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا۔ اس کے علاوہ ہم کوشش کر رہے تھے کہ ہمارا آمنا سامنا باوردی افراد کے ساتھ کم سے کم ہو۔ فصیل کے عظیم الشان مین دروازے سے وہ خاص خاص مہمان اندر داخل ہو رہے تھے جنہیں اس پُر مسرت موقع پر اندر آنے کی اجازت ملی تھی۔ ان معزز مہمانوں کی شان دار گاڑیاں اور بگھیاں باہر ہی روک لی گئی تھیں۔ وہ پیدل اندر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ بیگمات بھی تھیں... کچھ مقامی طوائفیں سنگِ مرمر کے ایک چبوترے پر رقص کر رہی تھیں۔ ان کا لباس، رقص سے بڑھ کر اور رقص، لباس سے بڑھ کر ہیجان خیز تھا۔ وہ گانا بھی گا رہی تھیں۔ یماں یماں... بس آج کی رات ہے زندگی۔ کل ہم کہاں تم کہاں... کچھ اس طرح کا گیت تھا۔ گیت کی لہریں، موسیقی، پھڑکتے جسم اور آتش بازی... یہ سب مل جل کر عجیب سماں باندھ رہے تھے۔ اور اس صورتِ حال میں... ہم دونوں ایک نہایت خطرناک ارادے کے ساتھ دھیرے دھیرے حکم جی کی رہائش گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''وہ دیکھو، ادھر ہجوم ہے۔'' عمران نے ایک جانب اشارہ کیا۔

یہ جگہ حکم جی کی عالی شان رہائش گاہ کے عین سامنے تھی۔ ہم لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس ہجوم کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک جگہ رنگ برنگے فواروں کے درمیان کھلے احاطے میں پُر جوش لوگوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، ملازم پیشہ افراد بھی اور محافظ بھی۔ کسی مقامی رسم کے مطابق یہ لوگ ایک دوسرے پر چینی پھینک رہے تھے اور چہروں پر رنگ مل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہولی کے بغیر ہی ہولی منائی جا رہی ہے۔

عمران نے آگے بڑھ کر ایک محافظ کے چہرے پر رنگ ملا تو جواباً اس نے بھی بہت سا رنگ عمران کو مل دیا۔ عمران نے گیلے رنگ کی مٹھی بھری اور میرا چہرہ بھی رنگ دیا۔ اس کوشش میں ہم دونوں کی مخصوص پگڑیاں گر گئی تھیں۔ ہم نے یہ پگڑیاں پھر سروں پر رکھیں۔ پہلے تو میں نے عمران کی اس حرکت کو صرف اس کی شوخی سمجھا لیکن پھر اندازہ ہوا کہ اس ''شوخی'' کی آڑ میں ہم دونوں کافی حد تک اپنی شناخت چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ اپنی رنگ برنگی پگڑیاں لہرا رہے تھے۔ ان میں راج بھون کے گارڈز اور سپاہی بھی شامل تھے۔ عمران نے بھی پگڑی اتار کر لہرانی شروع کر دی۔ کسی طرف سے نعرہ بلند ہوا۔ ''ہمارے حکم جی کی...'' سیکڑوں لوگوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ''جے۔''

''ہمارے ولی عہد کی...''

سیکڑوں لوگوں نے کہا۔ ''جے۔''

ہم بھی ان نعروں میں شریک ہو گئے اور قدم قدم آگے بھی بڑھتے رہے۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''لو... آج حکم جی کو بھی دیکھ لو۔''

''کہاں؟''

''وہ دائیں طرف دیکھو، بالکونی میں۔''

اور پھر واقعی میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ مجھے پہلی بار نظر آیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں جو تصور قائم کر رکھا تھا، وہ اس سے زیادہ بارعب اور اونچا لمبا تھا۔ اس کے قد و قامت میں کچھ عمل دخل شاید اس چمک دار پگڑی کا بھی تھا جو اس نے بڑے شاہانہ ٹھاٹ سے باندھ رکھی تھی۔ وہ کافی دوری پر تھا۔ اس کے گلے کی نہایت قیمتی مالائیں اور انگشتریاں وغیرہ پھر بھی چمک دکھا رہی تھیں۔ بالکونی میں اس کے ساتھ شاہی خاندان کے اور بھی کئی مرد و زن موجود تھے۔ ان میں زرق برق لباسوں والی چار رانیاں بھی موجود تھیں۔ تاہم مہارانی رتنا دیوی یقیناً ان میں نہیں تھی کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق بچہ اسی کو تولد ہوا تھا۔

یکا یک مجھے لگا کہ میرے جسم کا سارا لہو میرے سر کو چڑھ رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑنے لگیں۔ دل اتنی شدت سے دھڑکا کہ لگا، پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بالکونی میں معزز افراد کے درمیان میری نگاہ شیطانِ اعظم جارج گورا پر پڑی۔ اپنے نہایت سرخ و سپید چہرے اور نمایاں قد کاٹھ کے سبب وہ علیحدہ پہچانا جا رہا تھا۔ ہاں، یہی تھا وہ شخص جس کے خون کی پیاس روز و شب میرے اندر بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ اسی نے میری سلطانہ کو روندا تھا، اسی نے اسے توڑ پھوڑ کر ناقابلِ شناخت بنایا تھا۔ اسے کوئی حق نہیں تھا مسکرانے کا، شاہی بالکونی میں کھڑے ہو کر چہکنے کا... سانس لینے کا اور زندہ رہنے کا... ہاں، کوئی حق نہیں تھا۔

عمران نے بھی جارج گورا کو بالکونی میں دیکھ لیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے نگاہ ملائی اور اس بے پناہ حرارت کو محسوس کیا جو گورا کی شکل دیکھنے کے بعد ہمارے رگ و پے میں دوڑی تھی۔ لیکن ہمارے اور اس شیطان کے درمیان بہت فاصلہ تھا، بہت سی رکاوٹیں تھیں۔ بالکونی خاصی بلندی پر تھی اور بالکونی کے آگے ایک وسیع رقبے کو بالکل خالی رکھا گیا تھا۔ اس رقبے کے گرد آہنی باڑوں اور محافظوں کی دُہری تہری قطاروں نے حد بندی کر رکھی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ بس ایک حد تک ہی آگے جا سکیں گے۔ زیادہ آگے گئے تو مشکوک قرار پائیں گے...

پھر بھی ہم کوشش کرنا چاہتے تھے، شاید کوئی راہ مل جاتی اور شاید ہم کسی ایسی جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے جہاں سے جارج گورا پر رائفل کا فائر کیا جا سکتا۔ حالانکہ کسی ایسی کوشش کی کامیابی کا امکان بہت کم اور پکڑے جانے کا اندیشہ بہت زیادہ تھا۔ تب میری نظر جارج گورا کے ساتھ کھڑے دو دوسرے افراد پر پڑی۔ ان میں سے ایک مرد تھا اور دوسری عورت۔ اس عورت کو بھی میں سیکڑوں میں پہچان سکتا تھا۔ یقیناً یہ ماریا تھی۔ اسے ہم نے اپنی شرائط منوانے کے لیے اغوا کیا تھا لیکن یہ ہمارے گروپ کے ایک غدار کو ''ایک رشوت'' پیش کر کے فرار ہو گئی تھی۔ ماریا کے ساتھ جو شخص کھڑا تھا، وہ بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ سرجن اسٹیل تھا، ماریا کا شوہر نامدار... اسی نے میرے جسم میں وہ منحوس چپ رکھی تھی جس نے ایک طویل عرصے تک مجھے پابندِ سلاسل کیا اور میں مسلسل کوششوں کے باوجود اس اسٹیٹ کی حدود سے نکل نہ سکا۔

ہم آگے کو کھسکتے رہے لیکن پھر ایک جگہ ہمیں رکنا پڑا۔ ہمیں لگا کہ اب اس سے آگے نہیں جا سکیں گے۔ یہاں طوائفیں اور راج بھون کی خدمت گار عورتیں بھی ہجوم میں گھسی ہوئی تھیں۔ بدمست مرد ان سے چھیڑ خانیاں کر رہے تھے۔ کہیں کہیں یہ چھیڑ خانیاں دست درازیوں میں بدل چکی تھیں، تاہم خوشی کے اس موقع پر یہ عورتیں کچھ زیادہ معترض نہیں تھیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس صورتِ حال کو نظر انداز کر رہی تھیں۔

اس سے پہلے میں نے حکم جی کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ صرف ایک مرتبہ بارو تدا جیکی کے پاس چند تصویریں دیکھی تھیں۔ یہ تصویریں دراصل جیکی کی محبوبہ شکنتلا کی تھیں۔ ان میں حکم جی بھی موجود تھا، تاہم جیکی نے اظہارِ نفرت کے طور پر حکم جی کے چہرے اور جسم کے دیگر حصوں پر سیاہی پھیر دی تھی... آج حکم میرے سامنے تھا۔ بے شک وہ آج بھی کافی فاصلے پر تھا مگر میں کم از کم اسے دیکھ تو سکتا تھا۔ اسے حکمراں کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی راہنما کا درجہ بھی دیا جاتا تھا... اور میں دیکھ رہا تھا کہ بالکونی میں اس کا انداز مذہبی راہنماؤں جیسا ہی ہے۔ ایک زرنگار چوغہ اس کے کندھوں پر تھا اور وہ گاہے بگاہے بڑے ''برگزیدہ'' انداز میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے لگتا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہم اس سے آگے نہیں جا سکیں گے۔'' میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

''اور ہمارے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''جھیل کے کنارے بے ہوش پڑے پہرے داروں کو کسی بھی وقت دیکھا جا سکتا ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''چڑی بے چاری کی کرے... ٹھنڈا پانی پی مرے۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

اچانک وہ کچھ ہوا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔

www.kahopakistan.com

بالکونی میں کھڑے شاہی افراد کی سخاوت اور دریا دلی نے جوش مارا۔ حکم جی نے وہی کچھ کیا جو قدیم زمانوں سے پُرشکوہ حکمران اپنی نیچ ''رعایا کو خوش کرنے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ اس نے مٹھیاں بھر بھر کر کچھ چیزیں نیچے نچھاور کرنا شروع کر دیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، ان میں کرنسی نوٹوں کے علاوہ سونے چاندی کے سکے اور قیمتی پتھر وغیرہ بھی شامل تھے۔ حکم جی کے ساتھ ہی ان کی رانیاں اور دو چار دیگر افراد بھی اس شاہانہ سخاوت میں شریک ہوئے۔ جب بالکونی کے سامنے خالی احاطے میں قیمتی اشیا کی غیر متوقع بارش ہوئی تو کوئی رکاوٹ رُکاوٹ نہ رہی۔ لوگ ایک سیلاب کی طرح امڈے اور ان اشیا پر جھپٹے۔ باڑیں اکھڑ گئیں، محافظوں کا حصار تتر بتر ہو گیا...

یہ ایک نادر موقع تھا۔ ''چلو۔'' عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ہم بھی اس انسانی ریلے کا حصہ بن گئے جو احاطے کی طرف لپک رہا تھا۔ اس اچانک بھگدڑ کے سبب کئی لوگ گر گئے تھے۔ دوسرے انہیں روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے... میں نے دیکھا کہ باوردی محافظ بھی اپنے اہم فریضے کو لات مار کر قیمتی اشیا پر جھپٹنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ منظر دیدنی تھا۔ میں اور عمران باڑیں پھلانگتے ہوئے احاطے میں پہنچے... کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ لوگ بھوکے جانوروں کی طرح قیمتی سکوں پر جھپٹ رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے اور چلا رہے تھے۔

ہم نے بھی چند اشیا اٹھائیں اور جھک کر دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب ہم نے بھری ہوئی رائفلیں اپنے ہاتھوں میں لے لی تھیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم بالکونی کے عین سامنے تھے۔ یہ سنگِ سرخ کی شان دار بالکونی زمین سے کم و بیش تیس فٹ بلند تھی۔ اوپر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس طرف سے اوپر جانے کا راستہ تھا ہی نہیں... فقط ایک جانب ایک چھوٹی سی گلی نظر آ رہی تھی۔ یہ گلی غالباً محل کے اندرونی حصوں کی طرف جانے کے لیے تھی۔ تاہم اس گلی کے سامنے حکم جی کے خصوصی محافظوں کا دستہ چوکس کھڑا تھا۔

''کیا کریں؟'' میں نے قریباً چلا کر عمران سے پوچھا۔

''یہیں سے فائر کرو۔'' اس نے ہانپتی آواز میں کہا۔

ہمیں بالکونی میں حکم، جارج گورا، سرجن اسٹیل اور ماریا وغیرہ کے بس بالائی دھڑ نظر آ رہے تھے۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی ہم نے رائفلیں سیدھی کیں۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی ٹریگر دباتا، لوٹ مار میں مصروف ایک ہٹا کٹا شخص توپ کے گولے کی طرح عمران سے ٹکرایا۔ عمران لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کی رائفل کا میگزین علیحدہ ہو کر دور جا گرا۔

میں نے ایک سیکنڈ کے نصف حصے میں یہ سب کچھ دیکھا اور سمجھ گیا کہ اب عمران فائر نہیں کر سکے گا۔ میں نے رائفل اندازے سے جارج گورا کی طرف سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔ رائفل میڈیم برسٹ پر سیٹ تھی۔ خوفناک تڑتڑاہٹ سے فضا گونجی اور بالکونی کی ریلنگ کے آس پاس چنگاریاں چھوٹ گئیں۔ میں نے فوراً ہی دوسرا برسٹ مارا۔ بالکونی میں نظر آنے والی چمکیلی پگڑیاں اور رنگین آنچل ایک دم ہی اوجھل ہو گئے۔ میں لوگوں سے ٹکراتا اور انہیں پھلانگتا ہوا واپس پلٹا۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ دور ہٹ کر بالکونی پر مزید برسٹ ماروں لیکن پھر میری نظر ایک چہرے پر پڑی اور میرا جسم سنسنا گیا۔ یہ رنجیت پانڈے تھا۔ وہ مجھ سے قریباً بیس میٹر کی دوری پر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے فائر کرتے دیکھ لیا تھا۔

''پکڑو... پکڑو...'' وہ میری طرف انگلی اٹھا کر دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی برق رفتاری سے میری طرف آیا۔

اب رکنا فضول تھا۔ میں اور عمران پلٹ کر دوڑے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس جگہ یہ نہایت خطرناک شخص ہمیں نظر آئے گا۔ وہ نہ صرف نظر آیا تھا بلکہ اب پوری رفتار سے ہمارے پیچھے بھی آ رہا تھا۔ عمران نے ابھی تک رنجیت پانڈے کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس لیے اسے علم نہیں تھا کہ ہمارے پیچھے کون سی بلا لگ گئی ہے۔

ہم شاہی بالکونی کے سامنے جو کچھ زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے، وہ کر چکے تھے۔ اب ہمیں یہاں سے کسی طرح بھاگنے کی کوشش کرنا تھی۔ ہم باڑیں پھلانگ کر واپس بڑے ہجوم کے اندر گھس گئے۔ یہاں ابھی تک بیشتر لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ بالکونی کے سامنے کیا ہوا ہے... فائرنگ کی تڑتڑ آتش بازی کی آوازوں میں گم ہو گئی تھی اور ہلچل تو ویسے بھی ہر طرف مچی ہوئی تھی۔ ہم ہجوم کو چیرتے ہوئے فصیل کے جنوبی دروازے کی طرف بڑھے مگر جب ادھر سے بھی گارڈز کو حرکت کر کے اپنی طرف آتے دیکھا تو رخ بدل لیا۔ سامنے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا، ہم اس میں گھس گئے۔ یہ راج بھون کا وسیع و عریض باورچی خانہ تھا۔ ایک قطار میں درجنوں دیگیں آگ پر دھری تھیں۔ ہم ان دیگوں کو پھلانگتے ہوئے ایک بڑے ہال کمرے میں گھس گئے۔ یہاں بہت سی عورتیں دو رویہ بیٹھی تھیں، ان کے سامنے قالینوں پر بڑے بڑے تھال تھے۔ وہ پکوانوں میں ڈالنے کے لیے خشک میوہ جات کاٹ رہی تھیں۔ ہم تند بگولوں کی طرح ان کے درمیان سے گزر گئے، وہ چلائی اور ہڑبڑائی رہ گئیں۔ ایک طویل برآمدے میں سفید وردیوں والے درجنوں خانساماؤں نے ہمیں حیرت اور خوف کے عالم میں دیکھا۔ عمران کا دھکا لگنے سے ایک گیم شحیم باورچی اوندھے منہ ایک بڑے دیگچے میں گرا اور ہمیں صرف اس کی اوپر اٹھی ہوئی ٹانگیں نظر آئیں۔

ہمارے عقب میں ہوائی فائرنگ ہو رہی تھی اور رنجیت پانڈے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آندھی کی طرح اڑا چلا آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پانڈے مجھے پہچان نہیں سکا ہو گا۔ میرے چہرے پر رنگ ملا ہوا تھا۔ اس نے مجھے صرف فائرنگ کرتے دیکھا تھا اور مجھے پکڑنے کے لیے جھپٹ پڑا تھا۔ اس حوالے سے اس کی تیز نگاہی کی داد دینا پڑتی تھی۔ اندرونی دروازے سے بیس تیس قدم پہلے تین چار گارڈز ہمارے راستے میں آئے مگر وہ شدید تذبذب میں تھے۔ جیسے سمجھ نہ پا رہے ہوں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ہمیں روکنا ہے یا کسی اور کو روکنا ہے۔ ایک گارڈ نے عمران کا راستہ روکا تو عمران نے اس کے چہرے پر رائفل کے دستے سے طوفانی ضرب لگائی۔ ایک دوسرے گارڈ کو میں نے دھکا دے کر دور پھینکا... کچھ فاصلے پر ایک لوڈر حرکت کرتا ہوا فصیل کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں ترپال تنی ہوئی تھی۔ عمران مجھ سے آگے تھا، وہ دوڑتا ہوا لوڈر کے بائیں طرف والے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ایک سیکنڈ بعد میں نے لوڈر کے ڈرائیور کو اچھل کر دوسرے دروازے سے باہر گرتے دیکھا۔ یقیناً عمران ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں بھی عمران کے ساتھ جا کر بیٹھ سکتا۔ میں نے جست لگائی اور چلتے ہوئے لوڈر کے عقب میں سوار ہو گیا۔ تاہم اس کوشش کے دوران میں میری رائفل گر گئی۔

عمران نے مجھے سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گیئر بدلا اور یکایک لوڈر کی رفتار بڑھا دی۔ مجھے درمیانی شیشے میں سے ونڈ اسکرین دکھائی دے رہی تھی۔ بیرونی دروازے پر بیریئر تھا اور مسلح گارڈز تھے۔ عمران ایک دھماکے سے بیریئر کو توڑتا ہوا نکل گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ نصف درجن گارڈز ہکا بکا رہ گئے۔ ان میں سے شاید ایک دو گارڈز نے گولی چلائی ہو گی لیکن تب تک ہم مین راستے پر آ چکے تھے۔ یہاں بھی بہت سی گھوڑا گاڑیاں اور چھکڑے وغیرہ موجود تھے۔ عمران ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

''ٹھیک ہو؟'' اس نے لوڈر کے کیبن میں سے ہانک لگائی۔

''ہاں ٹھیک ہوں۔ پر رائفل گر گئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں... اللہ اور دے گا۔''

''لگتا ہے کوئی پیچھے آ رہا ہے۔'' میں نے اطلاع دی۔

''کون ہے؟''

''یہ وہی ذلیل رنجیت پانڈے ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ واقعی کسی بلا کی طرح ہمارے پیچھے تھا۔ وہ پوری رفتار سے ہمارے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھی کافی پیچھے رہ گئے تھے۔ شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ میری رائفل گر گئی ہے۔ اسے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ میں اس پر فائر کر سکتا ہوں۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لوڈر کی رفتار تیز ہونے سے پہلے وہ چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو جائے۔ لوڈر سے اس کا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میں نے وردی کے نیچے سے اپنا لوڈڈ ریوالور نکال لیا۔ میں مکمل تاریکی میں تھا۔ آندھی کی طرح لوڈر کے پیچھے آتا ہوا رنجیت پانڈے میری حرکات و سکنات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ریوالور دونوں ہاتھوں میں تھاما اور پانڈے کا نشانہ لے لیا۔ لیکن پھر پتا نہیں کیوں... میں نے اس پر گولی نہیں چلائی... میں نے اسے جست کر کے لوڈر پر چڑھنے دیا۔

وہ کسی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ چنگھاڑتا ہوا میرے اوپر آ پڑا۔ تاریکی میں مجھے بس اس کی آنکھیں ہی چمکتی ہوئی دکھائی دیں۔ غالباً اس کے چہرے پر بھی کسی نے تھوڑا سا رنگ مل دیا تھا۔ ہم اوپر نیچے لوڈر کے دھاتی فرش پر گرے۔ گرتے گرتے پانڈے نے میری ٹھوڑی پر زوردار ٹکر رسید کی اور اپنی طبع کے مطابق ایک غلیظ گالی دی... اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا سرکاری پستول نکال کر میری کنپٹی پر رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے راستے میں ہی اس کی کلائی پکڑ لی اور پوری طاقت سے مروڑ کر جوابی ٹکر اس کے تھوبڑے پر رسید کی۔ وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو میں نے اسے ٹانگوں پر اچھال کر لوڈر کی سائڈ سے دے مارا۔ جب وہ گھوما تو اس کی کلائی بدستور میری گرفت میں تھی۔ کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح سنائی دی۔ پانڈے کی کراہ کرب ناک تھی۔ پستول پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہو گیا۔ اس نے تلملا کر میرے چہرے پر گھونسا رسید کیا۔ دیوان کی طرح ایک بار پھر مجھے اس کی بے پناہ جسمانی قوت کا اندازہ ہوا۔ یہ ایک گھونسا کسی بھی شخص کو ہوش و حواس سے

www.kahopakistan.com

بیگانہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ میری برداشت نے میرا ساتھ دیا۔ میں نے اس مہلک گھونسے کو برداشت کرتے ہوئے جوابی وار کیا... اور یہ کوئی معمولی وار نہیں تھا۔ یہ پانڈے جیسے خطرناک غنڈے اور قاتل کے شایانِ شان تھا۔ یہ اس دس انچ لمبے پھل والے شکاری چاقو کا وار تھا جو میں نے دو تین سیکنڈ پہلے اپنی پنڈلی میں سے کھینچا تھا۔ یہ چاقو پورے کا پورا پانڈے کے پہلو میں گیا۔ وہ بڑے دردناک انداز میں چلایا۔ اس کی آنکھیں تکلیف اور حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے بے رحمی سے چاقو کو اوپر کی طرف کھینچتے ہوئے باہر نکالا۔ پانڈے کا پیٹ کئی انچ تک پھٹ گیا۔

آخری کوشش کے طور پر اس نے میرا چاقو والا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اب اس کے فولادی جسم کی طاقت نصف بھی نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دوسرا وار اس کی ناف سے ذرا اوپر پیٹ میں کیا۔ چاقو پھر اس کی انتڑیوں میں چلا گیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور اس نے بائیں ہاتھ سے میری آنکھیں نوچنے کی کوشش کی۔ وہ نزع کے عالم میں داخل ہو گیا تھا... بی ایس ایف کا درندہ صفت افسر، دہشت و بربریت کا نشان، حکم جی کی مونچھ کا بال... اس تیز رفتار لوڈر کی تیزگی میں آناً فاناً اپنے سارے منافع بخش عہدوں سے ''مستعفی'' ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب وہ موت کے روبرو تھا۔ میں نے پے در پے تین اور وار اس کے پیٹ اور سینے پر کیے... اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا... اچانک لوڈر کو ایک شدید ترین جھٹکا لگا۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ لوڈر کی بائیں جانب والی دیوار نے ایک مقناطیس کی طرح تڑپا اور اس نے بائیں ہاتھ سے میری آنکھیں نوچنے کی کوشش کی۔ وہ نزع کے عالم میں داخل ہو گیا تھا... بی ایس ایف کا درندہ صفت افسر، دہشت و بربریت کا نشان، حکم جی کی مونچھ کا بال... اس تیز رفتار لوڈر کی تیزگی میں آناً فاناً اپنے سارے منافع بخش عہدوں سے ''مستعفی'' ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب وہ موت کے روبرو تھا۔ میں نے پے در پے تین اور وار اس کے پیٹ اور سینے پر کیے... اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا... اچانک لوڈر کو ایک شدید ترین جھٹکا لگا۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ لوڈر کی بائیں جانب والی دیوار نے ایک مقناطیس کی طرح مجھے اپنے ساتھ چپکا لیا ہے۔ لوڈر الٹ رہا تھا۔ تب ایک خوفناک گڑگڑاہٹ ہوئی اور سب کچھ تہ و بالا ہو گیا۔ میں نے پانڈے کے جسم کو اچھل کر چھت سے ٹکراتے دیکھا۔ خود میں بھی اسی طرح چھت سے ٹکرایا... تب کئی لڑھکنیاں کھا کر کسی نرم چیز پر گرا۔ میرے چاروں طرف نیم تاریکی تھی اور گرد و غبار تھا۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ لوڈر کسی گھر کی دیوار توڑ کر کسی کمرے میں گھسا ہے۔ جونہی میں گرا تھا، میرے کانوں سے کسی کے چلّانے کی سریلی آواز بھی ٹکرائی تھی۔ یہ آواز میرے نیچے سے بلند ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ میں ایک قالین پر گرا تھا اور میرے نیچے ایک جواں سال لڑکی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو ذرا سا ہاتھ یا ؤں چلا کر میرے نیچے سے نکل جاتی مگر وہ اتنی وحشت زدہ تھی کہ مسلسل چلّانے کے سوا کچھ بھی کر نہیں پا رہی تھی۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اس وقت میں نے عمران کو بھی سڑک کے کنارے سے اٹھتے دیکھا۔ لوڈر ایک طرف الٹا پڑا تھا۔ اس کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے، ہیڈ لائٹس ابھی تک روشن تھیں۔ جونہی میں پیچھے ہٹا، لڑکی اٹھ کر کسی نامعلوم سمت میں بھاگ گئی۔ تب میں نے ایک فربہ اندام ہندو عورت کو بھی ملبے سے نکل کر بھاگتے اور تاریکی میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ میں نے نیم تاریکی میں دائیں بائیں ہاتھ چلایا اور خوش قسمتی سے اپنا ریوالور ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔

یہ دراصل سڑک کے بالکل کنارے پر ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ لوڈر اس کی بیرونی دیوار توڑتا ہوا اندر گھس گیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ چائے خانہ ایک ہندو بیوہ اور اس کی بیٹی کا تھا اور وہ بند چائے خانے کے اندر ہی سو رہی تھیں۔

''وہ آ رہے ہیں؟'' عمران نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

راج بھون سے ہمارے پیچھے لگنے والی گھوڑا گاڑیاں سرپٹ بھاگی چلی آ رہی تھیں۔ ہمارے پاس صرف چند سیکنڈ کا وقت تھا۔ ہم ملبے میں سے نکلے اور جس طرف رخ تھا، اسی طرف دوڑ نکلے۔ ہمارے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ عمران بھی اپنی ناکارہ رائفل راج بھون میں ہی چھوڑ آیا تھا۔

''پکڑو... پکڑو۔'' کئی آوازیں ہمارے کانوں سے ٹکرائیں۔

ہم نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے نہر کا چوبی پل پار کیا اور ایک آبادی میں گھس گئے۔ ہمارے عقب میں فائرنگ بھی ہوئی لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ ایک بھری پُری آبادی تھی لیکن اس وقت گلیاں سو رہی تھیں اور ہر طرف سناٹا تھا۔ ہم ایک طویل خم دار گلی میں دوڑتے چلے گئے۔ ہمارے عقب میں بہت سے بھاگتے قدموں کی آوازیں تھیں۔

''مارے گئے۔'' عمران کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

آگے گلی بند تھی۔ ہم واپس پلٹے۔ وہ بڑے نازک لمحے تھے۔ عمران کے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔ اس نے دو تین قریبی دروازوں کو اپنے کندھے سے زوردار ضربیں لگائیں۔ جس تیسرے دروازے کو اس نے کندھے سے ضرب لگائی، اس کے اندر کی چٹخنی ٹوٹ گئی۔ ہم پلک جھپکتے میں اندر داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں تاریکی تھی۔ غور سے دیکھنے پر ایک بڑا کمرا نظر آیا۔ عمران نے اور میں نے گلا گھسیٹ کر دروازے کے سامنے کر دیا۔ یوں چٹخنی نہ ہونے کے باوجود دروازہ بند ہو گیا۔

کوئی بڑی عمر کا شخص زور سے کھانسا۔ کسی قریبی کمرے سے اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے بھیا؟''

تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ابھری، وہ ڈیوڑھی کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے دائیں جانب والے ایک دروازے کو دھکیلا، وہ کھل گیا۔ ہم ایک نیم گرم کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہاں لالٹین کی بہت مدھم روشنی میں ایک جواں سال لڑکی ریشمی بستر پر نظر آئی۔ یقیناً چند سیکنڈ پہلے وہ سو رہی تھی۔ اب آوازیں سن کر جاگ گئی تھی مگر ابھی پوری طرح جاگی بھی نہیں تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے حیرت سے آنکھیں کھولیں۔ اس سے پہلے کہ وہ چلّاتی اور کسی کو مدد کے لیے بلاتی، میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کے ہونٹ پوری سختی سے بند کر دیے تھے۔ وہ میری گرفت میں بس تڑپ پھڑک کر رہ گئی۔ جب میں نے اس کی نازک گردن پر اپنے بازو کا دباؤ بڑھایا تو اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اگر وہ زیادہ مزاحمت کرے گی تو اس کی کوئی ہڈی چٹخ جائے گی۔ وہ ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اس دوران میں عمران کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر چکا تھا۔ پھر اس نے لالٹین بھی بجھا دی۔

''کون ہے بھیا۔'' گھر کے مالک کی بھرائی ہوئی آواز پھر ابھری۔

جواب میں خاموشی تھی۔ وہ شخص ڈیوڑھی تک آیا۔ چند سیکنڈ تک سن گن لیتا رہا۔ غالباً تاریک ڈیوڑھی میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ واپس چلا گیا۔ عمران نے خوفناک پھل والا شکاری چاقو نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''اگر شور مچاؤ گی تو ایک سیکنڈ میں اس چاقو سے شہ رگ کاٹ ڈالوں گا۔ اگر چپ رہو گی تو وعدہ کرتا ہوں تمہیں خراش تک نہیں آئے گی... ہاتھ تک نہیں لگائیں گے تمہیں۔''

دھیرے دھیرے اب ہماری آنکھیں کمرے کی تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو رہی تھیں۔ یہ درمیانے سائز کا کمرا تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا بانس کا دروازہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی اسٹور نما جگہ تھی۔ ایک طرف طاق میں مورتیاں وغیرہ سجی ہوئی تھیں۔ ہم ایک ہندو گھر میں داخل ہوئے تھے۔

لڑکی ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے رویّے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سمجھ دار ہے۔ صورتِ حال کو سمجھ گئی ہے اور ہمارے ساتھ، کم از کم وقتی طور پر تعاون کرنے کو تیار ہے۔ عمران نے چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھی اور میں نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ گھگھیائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہم کو کچھ نا ہیں کہنا... جو جی چاہتا ہے یہاں سے لے لو... اور چلے جاؤ... بھگوان کے لیے...'' اس نے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''چلے جاتے ہیں... لیکن تھوڑی دیر بعد... اس سے پہلے اگر تم نے کوئی حرکت کی تو تمہارا جیون تو جائے گا ہی... باقیوں کے لیے بھی بہت بُرا ہو گا۔''

''بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں، کچھ نا ہیں بولوں گی۔''

''آہستہ بولو۔'' عمران پھنکارا۔

''بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں، کچھ نا ہیں بولوں گی۔'' اس نے اتنی باریک آواز میں اپنے الفاظ دہرائے کہ ایسے گمبھیر موقع پر بھی صورتِ حال میں مزاح کی جھلک محسوس ہوئی۔

عمران نے اسے بازو سے پکڑا اور کہا۔ ''چلو... اس چھوٹے کمرے میں چلو۔''

وہ پہلے تو جھجکی لیکن جب عمران نے تحکم سے کہا تو وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی ہمارے ساتھ چھوٹے دروازے میں داخل ہو گئی۔ میرے اندازے کے عین مطابق یہ ایک بالکل چھوٹا سا اسٹور روم تھا۔ عمران نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر جلائی۔ یہ اسٹور کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ اس کی عمر بیس بائیس سال رہی ہو گی۔ وہ ہلکی پھلکی گھریلو ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ لڑکی نے ہمارے جسموں پر سرکاری وردی دیکھی اور اس کا زرد چہرہ کچھ اور زرد ہو گیا۔ اس کی حیرت کی وجہ یہ بات بھی تھی کہ ہمارے چہرے رنگ سے لتھڑے ہوئے تھے۔ لوڈر الٹنے سے ہمارے جسم پر خراشیں بھی آئی تھیں۔ ایسی ہی ایک بڑی خراش عمران کے بازو پر تھی۔ وہاں سے جرسی پھٹ گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ میری وردی پر پانڈے کے خون کے دھبے تھے۔

''تمہارا نام؟'' عمران نے پوچھا۔

''و... وجنتی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''اس گھر میں تمہارے علاوہ اور کون کون ہے؟''

''میرے ماتا پتا اور چھوٹا بھائی جگدیش۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

اسی دوران میں باہر گلی سے شور شرابا بلند ہونے لگا۔ دروازے کھٹکھٹائے جا رہے تھے اور گرجتی برستی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

اب عمران کے ہاتھ میں شکاری چاقو کی جگہ ریوالور نظر آ رہا تھا۔ ایسا یقیناً اس نے وجنتی نامی اس لڑکی پر دباؤ ڈالنے

www.kahopakistan.com

کے لیے کیا تھا۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''دیکھو، کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ وہ جب تک یہاں آس پاس ہیں، ہم تمہارے گھر میں رہیں گے، اس کمرے میں۔ تم اپنے گھر والوں کو بھی ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔ اگر تم نے ہمیں چھپا لیا تو ہم وچن دیتے ہیں کہ تمہیں کچھ بھی کہے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''مم... میں کسی کو کچھ نا ہیں بتاؤں گی۔'' وہ ایک بار پھر گھگیائی۔

''اور تم سارا وقت ہماری آنکھوں کے سامنے رہو گی۔ میرا مطلب ہے کہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلو گی۔'' عمران نے ریوالور کو ہاتھ میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''نا ہیں نکلوں گی۔ وچن دیوت ہوں، نا ہیں نکلوں گی۔'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

''ہم یہاں اس اسٹور روم میں رہیں گے۔ تم اس ریوالور کے نشانے پر رہو گی... اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوا کہ تم چالاکی دکھا رہی ہو تو میں گولی چلا دوں گا۔ ہم دو خون ابھی تھوڑی دیر پہلے کر چکے ہیں، تیسرا اور چوتھا کرنے میں بھی ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔'' عمران کے آخری الفاظ نے لڑکی پر خاطر خواہ اثر کیا اور وہ بالکل زرد نظر آنے لگی۔

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے پھر قدموں کی چاپ ابھری۔ وجنتی کا پتا اب پھر ڈیوڑھی کی طرف جا رہا تھا۔ شاید اس نے بھی گلی سے ابھرنے والا شور سن لیا تھا۔ ڈیوڑھی کی طرف والے دروازے کی نچلی درز سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اب بوڑھے کے ہاتھ میں لالٹین ہے۔ کچھ دیر بعد بوڑھے کے بڑبڑانے کی آوازیں آئیں۔ یقیناً اس نے دیکھ لیا تھا کہ بیرونی دروازے کی چٹخنی ٹوٹی ہوئی ہے اور دروازے کو بند کرنے کے لیے اس کے آگے گملا رکھا گیا ہے۔

عمران نے تیز سرگوشی میں لڑکی سے کہا۔ ''دروازے کے آگے گملا ہم نے رکھا ہے۔ اگر تمہارا پتا پوچھے تو اس سے کہنا کہ یہ تم نے رکھا ہے کیونکہ دروازے کی چٹخنی خراب ہو گئی ہے۔''

لڑکی زود فہم تھی۔ فوراً ہی عمران کی بات سمجھ گئی۔ اتنے میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ''جی پتا جی۔'' لڑکی وجنتی نے نیند میں ڈوبی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''دروازے پر گملا تم نے رکھا تھا؟''

''ہاں پتا جی... گواڑ نا ہیں لگ رہے تھے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' بڑی عمر کے شخص کی آواز آئی۔

اسی دوران میں دروازے کے عین سامنے کچھ لوگوں کے بولنے کی بھاری آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً یہ راج بھون کے گارڈز تھے۔ وجنتی کے پتا نے دروازہ کھولا۔ ایک کرخت آواز نے پوچھا۔ ''تم لوگن خیریت سے ہو؟''

''جج... جی ہاں۔''

''دو خطرناک بندے یہاں کہیں آس پاس چھپے ہوئے ہیں۔ پوری طرح چوکس رہو۔ اگر کوئی شک ہو تو فوراً اطلاع کرو۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وجنتی کے پتا نے پریشان آواز میں کہا۔

بھاری آوازوں والے افراد آگے چلے گئے۔ وجنتی کے پتا نے دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد وجنتی کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ عمران نے وجنتی کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ وجنتی نے بڑے کمرے میں جا کر دروازہ کھولا۔ ہم چھوٹے سے اسٹور میں موجود رہے۔ وجنتی کا پتا لالٹین تھامے اندر آ گیا۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا پچاس ساٹھ سالہ شخص تھا۔ اس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا اور گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ ہراساں لہجے میں بولا۔ ''محلے میں کوئی ڈکیت گھس آئے ہیں۔ سپاہی آئے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہے ہیں، سب کو ہوشیار رہنا چاہیے۔''

اتنے میں باہر کے کسی کمرے سے کسی عورت کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ''کیا بات ہے جگدیش کے پتا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نا ہیں... سو جاؤ۔'' بوڑھے نے وہیں سے کہا۔

اپنے لب و لہجے سے یہ شخص ذرا سخت مزاج دکھائی دیتا تھا۔ اس نے وجنتی سے کہا۔ ''آ جاؤ... تم ہمارے کمرے میں آ جاؤ۔''

''نن... نا ہیں پتا جی... کوئی بات نا ہیں۔'' وجنتی بولی۔

''اچھا پھر دروازہ اندر سے بند کر لو۔'' اس کے پتا نے کہا۔

وجنتی نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ باہر ڈیوڑھی میں کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ وجنتی کا پتا ہتھوڑی کے ساتھ، اکھڑی ہوئی چٹخنی کو پھر سے اس کی جگہ پر جما رہا تھا۔ گلی میں گاہے بگاہے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجنے لگتی تھیں اور اہل کاروں کی بلند آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس علاقے کو گھیرے ہوئے ہیں۔

دس پندرہ منٹ بعد قدرے سکون ہو گیا۔ وجنتی کا پتا چٹخنی مرمت کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ گلی میں بھی نسبتاً خاموشی تھی، ہاں کچھ دوری سے مدھم آوازیں ضرور سنائی دیتی تھیں۔ غالباً یہ آوازیں جائے حادثہ سے آ رہی تھیں۔ یعنی جس جگہ لوڈر الٹا تھا۔

عمران کی ہدایت پر لڑکی وجنتی نے لالٹین پھر سے روشن کر دی تاہم اس کی لَو اتنی دھیمی رکھی کہ کمرے میں ہلکی سی روشنی ہی پھیل سکی۔ عمران نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔ ''لوڈر پر کون چڑھا تھا؟''

''وہی پانڈے تھا اور کون؟''

''مار دیا؟''

''پتا نہیں۔ زخمی تو اچھا خاصا ہوا ہے۔''

''تم کچھ زیادہ ہی کھلتے جا رہے ہو۔'' عمران نے ناراضی سے کہا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ مصنوعی ناراضی ہے اور اندر سے وہ خوش ہے۔

''اور تم نے لوڈر کی قلابازی کیوں لگوائی؟'' میں نے پوچھا۔

''آگے دو بندے آ گئے تھے، انہیں بچانے کی کوشش کی۔'' عمران نے مختصر جواب دیا۔

وجنتی انگریزی نہیں جانتی تھی۔ وہ منہ کھولے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ بہرحال، وہ اب پہلے سے کچھ کم خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کی وجہ بھی تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آ گئی۔

میں نے وجنتی سے پوچھا۔ ''تمہارا پتا کیا کام کرتا ہے؟''

''وہ لکڑی کا کام کرت ہیں۔''

''لکڑی کا کیا کام؟'' عمران نے ذرا تلخی سے وضاحت چاہی۔

''بندوقوں کے دستے وغیرہ بناوت ہیں۔ اس سے پہلے...'' وہ رک گئی۔

''اس سے پہلے... کیا؟''

''پہلے وہ راج بھون کی فوج میں تھے۔ دو سال پہلے ہی ان کی ملازمت پوری ہوئی ہے۔ ملازمت ختم ہونے پر راج بھون سے پیسا ملتا ہے، اسی سے پتا جی نے اپنا کاروبار شروع کیا ہے۔''

گھر کی ظاہری حالت اچھی تھی۔ عمران نے در و دیوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ حکم جی رحم دل واقع ہوا ہے۔ ملازموں کو کافی پیسا دیتا ہے۔''

''آپ بھی تو فوجی ہو۔ کیا آپ کو پتا نا ہیں؟'' وہ ہمیں ذہین نظروں سے سرتاپا دیکھ کر بولی۔

عمران نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اگر ہم کہیں کہ ہم فوجی نہیں ہیں تو پھر؟''

''مم... مجھے پہلے ہی لگ رہا ہے جی کہ... آپ وہ نا ہیں ہو جو نظر آوت ہو۔''

''یہ بات تمہارے دماغ میں کیوں آئی؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس لیے کہ آپ کو راج بھون کے فوجی ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''ہم باغی فوجی بھی تو ہو سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''پر آپ کی بولی اور طرح کی ہے۔ آپ کے پاس جو پپ... پستول ہیں، وہ بھی اور طرح کے ہیں۔''

''بچی سیانی ہے بھئی۔'' عمران نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

میں نے اسے پھر دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اگر تم ہمارے کہنے پر چلو گی تو ہم کسی کو بغیر کوئی نقصان پہنچائے یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم سے ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ خود کو پُرسکون رکھو۔''

''مم... مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا لیکن اب کم لگ رہا ہے۔'' وہ صاف گوئی کے انداز میں بولی۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ آپ حکم جی کے سپاہی نا ہیں ہو۔''

''تو تم حکم کے سپاہیوں سے ڈرتی ہو؟''

''ہر کوئی ڈرتا ہے۔''

''لیکن مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی خاص معاملہ ہے۔'' عمران نے کھوجنے والے لہجے میں پوچھا۔

''نن... نا ہیں۔ ایسی تو کوئی بات نا ہیں۔''

''اگر ہے تو بتا دو۔ ہو سکتا ہے ہم تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔''

وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم ایک آدھ دن کے لیے تمہارے اس اسٹور میں محفوظ ہیں؟''

''پتا جی اور جگدیش کی تو خیر ہے... لیکن ماتا جی کسی کام سے اسٹور میں آ سکت ہیں۔''

''تو پھر؟''

''یا پھر میں دروازے کو تالا لگا دوں گی اور کہوں گی کہ چابی گم ہو گئی ہے۔'' وہ روانی میں کہہ گئی۔

''کیا ہم تمہیں شکلوں سے اتنے ہی بے وقوف نظر

www.kahopakistan.com

آتے ہیں کہ تمہیں تالا لگانے دیں گے؟'' عمران نے کہا۔

وہ سٹپٹا گئی۔ ''نن... نا ہیں۔ میرا یہ مطلب نا ہیں تھا۔ میں... میں ماتا جی کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لوں گی۔''

اب سپیدۂ سحر نمودار ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''اگر تم تھوڑی دیر کے لیے سونا چاہتی ہو تو بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ ہم یہاں اسٹور میں رہیں گے۔''

وہ تذبذب میں تھی۔ کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ تو گئی لیکن اس نے اپنی آنکھیں بند نہیں کیں۔ عمران کی جادوئی شخصیت کی وجہ سے اس کا خوف کافی حد تک کم ہو گیا تھا مگر اب وہ اتنی بھی بے خوف نہیں ہوئی تھی کہ ہماری موجودگی میں آرام کرنے کے بارے میں سوچتی۔

ہم اسٹور میں موجود رہے۔ یہاں دیگر چیزوں کے ساتھ بندوقوں کے کئی مکمل اور نامکمل دستے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک دیوار پر ایک پرانی تصویر بھی لگی تھی جس میں وجنتی کا پتا فوجی وردی میں تھا اور باقاعدہ حکم جی کی قدم بوسی کر رہا تھا۔ حکم نے کسی مذہبی پیشوا کی طرح اس کے سر پر اپنے ہاتھ کا سایہ کیا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ستیش کے پتا آنجہانی رام پرشاد کی طرح یہ شخص بھی ایک کٹر مذہبی شخص ہے۔ ایک عیاش حکمران سے اس طرح کی عقیدت دقیانوسیت ہی کہلا سکتی تھی۔

میں اور عمران بیٹھے رہے، ہم دونوں کے ذہنوں میں راج بھون میں پیش آنے والے ہنگامہ خیز واقعات کسی فلم کی طرح چل رہے تھے... میں نے بالکونی کی طرف دو برسٹ چلائے تھے۔ تاہم ان برسٹوں کا رزلٹ مجھے معلوم نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر بعد کھڑکیوں سے مدھم روشنی نظر آنے لگی۔ ایک پُرہنگام شب کی صبح ہونے والی تھی۔ تاہم اس صبح میں بھی اَن گنت اندیشے تھے۔ وجنتی کا پتا جاگ گیا تھا... اور صحن میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا... پھر وہ بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے وجنتی سے پوچھا تو اس نے مدھم آواز میں بتایا کہ پتا جی اس وقت دودھ لینے جاوت ہیں۔ پھر وہ بولی۔ ''اگر ماتا جی یہاں آ گئیں اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ابھی تک یہاں کیوں بیٹھی ہوں اور باہر نکل کر منہ ہاتھ کیوں نا ہیں دھوتی؟''

''لحاف اوڑھ کر لیٹی رہو۔ ان سے کہنا میری طبیعت خراب ہے۔''

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ ریوالور مسلسل عمران کے ہاتھ میں تھا اور وہ وجنتی کو باور کرا رہا تھا کہ کسی بھی ایسی ویسی حرکت کا نتیجہ خطرناک نکلے گا۔

وجنتی کے پتا نے گھر واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس نے زور زور سے وجنتی کے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ وجنتی نے لحاف سے نکل کر دروازہ کھولا۔ وجنتی کے پتا نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے بٹیا! رات کو راج بھون میں زبردست گولی چلی ہے۔ بڑے ڈاکٹر اسٹیل کے بھائی صاحب مارے گئے ہیں۔ ایک دو بندے زخمی بھی ہوئے ہیں۔ چھوٹا پانڈے بھی بہت زیادہ زخمی ہے۔ کہوت ہیں کہ وہ بچ نا ہیں پائے گا۔''

''ہائے رام۔'' وجنتی نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

اسی دوران میں وجنتی کی فربہ اندام ماتا بھی اندر آ گئی۔ اس نے بھی اپنے پتی کی بات سن لی تھی اور اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ''ہائے بھگوان! یہ کیا کلجگ ہوا ہے، کیا واقعی بڑے ڈاکٹر صاحب...؟''

''ہاں بھاگوان! وہ دورا کھشس تھے۔ پتا نا ہیں کس طرح راج بھون میں گھس گئے۔ نہ صرف گھس گئے بلکہ اس جگہ تک بھی پہنچ گئے جہاں حکم جی رانیوں کے ساتھ کھڑے تھے اور بالک کے جنم کی خوشی میں دان کر رہے تھے۔ ان دونوں نے فوجی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس سرکاری رائفلیں بھی تھیں۔ انہی رائفلوں سے انہوں نے فائرنگ کی ہے۔''

''وشواس نا ہیں ہو رہا...'' وجنتی کی ماں نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''وہاں تو اتنا کڑا پہرا ہووت ہے۔ چڑیا بھی پر نا ہیں مارتی۔''

''کچھ لوگن کہتے ہیں کہ وہ دو یا تین بندے تھے اور راج بھون کے پچھواڑے جھیل کی طرف سے اندر گھسے ہیں۔ وہاں جھیل کے کنارے بھی ایک سپاہی کی ہتھیا ہوئی ہے اور ایک سخت گھائل ہوا ہے۔ راج بھون کی باہری دیوار کے اوپر سے بھی دو سینکوں کو نیچے گرا کر مارا گیا ہے... باہر ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی ہے۔''

''یہ کون ہو سکت ہیں؟'' فربہ اندام عورت نے کہا۔

''یہ مختار راجپوت کی لونڈیا کے ساتھی بھی ہو سکت ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکت ہے کہ یہ حمیدہ کے دیور کو پھانسی سے بچانے کے لیے کوئی کوشش کرنا چاہت ہوں۔''

وجنتی کی ماں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''ہائے رام! اب کیا ہووے گا؟ حالات دن بدن بگڑتے چلے جاوت ہیں۔ ہم جیسے لوگن تو کسی گنتی میں نا ہیں آتے، اب تو راج بھون بھی ان سے بچا ہوا نا ہیں ہے۔''

''میں نے تو سنا ہے کہ وہ دونوں بدمعاش رات کو ہماری گلی تک بھی پہنچے ہیں... اور کیا پتا کہ اب تک یہاں کسی گھر میں ہی چھپے ہوئے ہوں۔''

وجنتی کی ماں رام رام کرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وجنتی کے پتا نے وجنتی سے کہا۔ ''آج بالکل گھر سے قدم باہر نا ہیں نکالنا۔ تم کل کہہ رہی تھیں کہ بازار جانا ہے۔''

''نا ہیں پتا جی... ویسے بھی طبیعت ذرا خراب ہے۔ ٹھنڈ لگ رہی ہے۔''

''بس ٹھیک ہے۔ شانتی سے لیٹی رہو۔ آج سردی ہے بھی بہت۔''

سخت نقوش والا ادھیڑ عمر شخص باہر چلا گیا۔ ہم یہ سارا منظر اسٹور روم کی گہری تاریکی میں سے دیکھتے رہے تھے۔ عمران نے اسٹور کا دروازہ بند کر دیا تھا تاہم اس میں ایک دو انچ کی جھری رہنے دی تھی۔

کچھ دیر بعد وجنتی کی ماں پھر آئی اور بیٹی کا حال چال پوچھنے لگی۔ وہ لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ اس نے ماں سے کہہ دیا کہ کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا اس لیے وہ ناشتا بھی نہیں کرے گی۔ اس کی ماں باتیں کرتی کرتی اسٹور روم کی طرف آئی۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ شاید اس سارے ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے لگا ہے لیکن پھر وہ دہلیز سے ہو کر واپس چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وجنتی کا چھوٹا بھائی جگدیش ناشتا کر کے اسکول چلا گیا اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہی وجنتی کا پتا بھی باہر نکل گیا۔ اب گھر میں وجنتی اور اس کی ادھیڑ عمر والدہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ والدہ نے ایک بار کمرے میں جھانکا اور یہ دیکھ کر کہ بیٹی لحاف اوڑھے سو رہی ہے، سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی گئی۔ غالباً وہاں اسے صفائی ستھرائی کرنا تھی۔ اس کے جانے کے بعد عمران کی ہدایت پر وجنتی نے اندر سے دروازے کو کنڈی لگا لی۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر دبا دبا ہراس نظر آ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ''تو آپ دونوں نے بڑے ڈاکٹر کے بھائی کو مارا ہے اور پانڈے صاحب کو بھی؟''

''اس کے علاوہ دو تین گارڈز کو بھی جہنم واصل کیا ہے۔ کیا تم نے اپنے پتا سے سنا نہیں؟''

''ہائے رام... یہ تو بہت بڑا جرم ہے۔ راج بھون والے آپ لوگن کو زمین کی ساتویں تہ سے بھی نکال لیویں گے۔'' اس کے چہرے پر خوف کم اور پریشانی زیادہ تھی۔

''کیا تم ہمارے لیے پریشان ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے صاف سیدھے انداز میں کہا۔

''کیوں؟ ہم نے تو تم پر ریوالور تانا ہوا ہے... تمہیں یرغمال بنایا ہوا ہے؟''

''میں جانت ہوں۔ مجھ سے آپ کی کوئی دشمنی نا ہیں۔ آپ حکم جی کے سپاہیوں سے بچنا چاہت ہیں اور واقعی آپ کو بچنا چاہیے۔ یہ بہت کٹھور لوگ ہیں۔ بہت ہی پتھر دل...''

''اچھا، ابھی تمہارے پتا نے کسی کی پھانسی کا ذکر کیا ہے، وہ کون ہے؟'' عمران نے سوال کیا۔

''ہے ایک بدقسمت۔''

''کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''اسے تو نا ہیں لیکن اس کی بھابی کو جانت ہوں... وہ... وہ...'' وجنتی کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ اس کی آواز میں گہرا درد اتر آیا تھا۔

''لگتا ہے کہ تم ہم سے کچھ چھپا رہی ہو۔ تم بتاؤ، ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری مدد کر سکیں یا کوئی مفید مشورہ ہی دے سکیں۔'' عمران نے اپنے مخصوص پُراثر لہجے میں کہا۔

ایک دم وجنتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب اس کے چہرے پر ہمارے حوالے سے خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ ہم حکم اور جارج وغیرہ کے دشمن ہیں۔ شاید اس ناتے سے وہ ہمیں اپنا ہمدرد سمجھنے لگی تھی۔

''بتاؤ وجنتی... تم ہمیں بتا کر کسی طرح کا نقصان نہیں اٹھاؤ گی، ہو سکتا ہے کہ کوئی فائدہ ہو جائے۔'' عمران نے شفقت آمیز محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

وہ سسک کر بولی۔ ''آپ لوگن کون ہیں؟ آپ نے ابھی تک مجھے اپنے بارے میں کچھ نا ہیں بتایا۔''

''اس سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ شاید تم مزید الجھ جاؤ۔ بس اتنا جان لو کہ ہم انسان دوست ہیں اور حکم جیسے انسان دشمنوں کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے کفن باندھ کر نکلے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ ہم تمہیں وچن دیتے ہیں کہ جو تم کہو گی، وہ صرف اور صرف ہم تک ہی رہے گا۔ ہم وچن پر جان دینے والے لوگ ہیں۔''

چند منٹ کی مزید کشمکش کے بعد وجنتی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''کل جس بندے کو راج بھون کے سامنے چوک میں سرعام پھانسی دی جا رہی ہے، اس کی بھابی حمیدہ میری گہری سہیلی ہے۔ وہ مجھ سے تھوڑی سی بڑی ہے لیکن ہم نے بچپن اور لڑکپن اکٹھے ہی گزارا ہے۔ آج کل میری یہ سہیلی بڑی مشکل میں ہے... بھگوان اس پر اپنی کرپا کرے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' عمران نے بات آگے بڑھانے کے لیے کہا۔

www.kahopakistan.com

''حمیدہ خوب صورت ہے۔ ایک سال پہلے اس کا پتی فوت ہوگیا تھا۔ اب وہ راج بھون میں ہے... اور جارج گورا صاحب کے پاس ہے۔ وہ اس سے بیاہ کرنا چاہت ہے... زبردستی اسے پتنی بنانے پر تلا ہوا ہے۔''

''کیا علاقے کے لوگ اور خاص طور سے مسلمان اندھے بہرے ہیں... کیا انہیں یہ زبردستی نظر نہیں آرہی؟''

''آتو سب کو رہی ہے جی... پر اصل میں... حمیدہ کے دیور سے بھی ایک دوش ہوا ہے۔ پتا ناہیں یہ دوش ہے بھی یا ناہیں لیکن بہت سے لوگن اسے دوش ہی کہتے ہیں۔ کچھ مہینے پہلے حمیدہ کے دیور نے اپنے کچھ مسلمان ساتھیوں کے ساتھ مل کر گورا صاحب کی بہن ماریا کو اغوا کرلیا تھا۔ وہ اسے نل پانی کی طرف لے جانا چاہت تھے۔ انہوں نے اسے ایک سرنگ میں رکھا تھا اور وہاں اس کی انگلی بھی کاٹ ڈالی تھی۔ بعض لوگ یہ الزام بھی لگاوت ہیں کہ... ان لوگن نے ماریا کے ساتھ... ماریا کے ساتھ... بُرا سلوک کیا تھا۔ بعد میں ماریا کسی طرح جان بچا کر ان لوگن کی قید سے بھاگ نکلی تھی...''

عمران اور میں وجنتی کی باتیں سن کر سناٹے میں رہ گئے۔ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''جارج گورا صاحب نے اسی کا بدلہ لیتے ہوئے حمیدہ کو گھر سے اٹھوایا ہے اور راج بھون میں رکھا ہے۔ وہ کہوت ہیں کہ اگر آنکھ کے بدلے آنکھ کے قانون پر عمل کیا جاوے تو پھر یہ قانون بھی بنایا جاسکتا ہے کہ اغوا اور زیادتی کے بدلے اغوا اور زیادتی ہو۔ لیکن وہ ایسا ناہیں کررہے۔ انہوں نے حمیدہ کو اغوا ناہیں کیا، بس اپنے پاس اپنی حفاظت میں رکھا ہے۔ اگر حمیدہ کا کوئی پیارا اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہت ہے تو وہ اپنے بازو کے زور پر ایسا کرسکت ہے۔''

''بازو کے زور پر؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں جی... آپ کو یہ بات کچھ عجیب سی لگے گی۔ لیکن ہمارے اس راجواڑے میں ایسی اور بھی بہت سی عجیب باتیں ہیں۔ ہم بچپن سے بہت کچھ دیکھتے اور سنتے آئے ہیں۔''

''اچھا، ایک منٹ۔'' میں نے اسے ٹوکا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ پھانسی کس کو دی جارہی ہے؟ میرا مطلب ہے اس کا نام؟''

''اس کا نام اسحاق ہے جی۔ وہ بڑا دیور ہے حمیدہ کا۔''

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ اسحاق میرا، انور خاں اور چوہان کا ساتھی تھا۔ ہم نے مل کر بہت سی مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ نل پانی کی طرف سفر کرتے ہوئے بے شمار سختیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ میں جب سلطانہ کی مدد کے لیے چوری چھپے نل پانی سے نکلا تھا تو اسحاق اس وقت انور اور چوہان وغیرہ کے ساتھ دیوان میں ہی تھا۔ وہ کب وہاں سے نکلا، کب یہاں پہنچا اور اب کن حالات میں تھا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ اور اب یہ وجنتی نامی لڑکی اسحاق کے حوالے سے ایک خوفناک بات بتا رہی تھی۔

عمران بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ''کیا یہ تمہارے ساتھیوں میں سے ہے؟'' اس نے انگریزی میں پوچھا۔

''ہاں، یہ وہی ہے جس نے ماریا کی انگلی کاٹی تھی۔'' میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا پھر وجنتی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''کیا اسحاق نام کے اس بندے کو پکڑ کر یہاں لایا گیا ہے؟''

''ناہیں جی... وہ خود آیا تھا... مجبور ہوکر۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ گورا صاحب نے کیا اعلان کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ حمیدہ کا جو دعوے دار اسے چھڑانا چاہت ہے، وہ آئے اور اسے چھڑا کر لے جائے۔ بس اسے گورا صاحب کے ساتھ سامبر کرنا پڑے گا... اور یہ پورے انصاف کے ساتھ ہوگا۔''

''یہ سامبر کیا ہے؟''

''یہ بھی سویمبر کی طرح ایک رسم ہے جی۔ سویمبر میں تو کسی ناری کا چاہنے والا ہی اس کے لیے لڑتا ہے لیکن سامبر میں ناری کا کوئی بھی ہمدرد اس کو کسی کے قبضے سے نکالنے کے لیے کوشش کرسکت ہے۔ اس کا پتا، بھائی یا بیٹا وغیرہ بھی...''

میں نے پوچھا۔ ''تو تمہارا مطلب ہے کہ یہ جو اسحاق نام کا بندہ یہاں پکڑا گیا ہے، وہ اپنی بھابی حمیدہ کو چھڑانے کے لیے یہاں آیا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''اسے دھوکے سے پکڑ لیا گیا؟''

''ناہیں جی... یہ جارج گورا صاحب ایسے معاملوں میں دھوکا ناہیں کرت ہے۔ وہ جو کہتا ہے، وہی ہووت ہے۔ سامبر کی اس رسم کے مطابق اگر کوئی بندہ کسی سے لڑنا چاہت ہے تو پھر ایک کا مقابلہ ایک سے ہووت ہے۔ باہر سے کوئی لڑنے والوں کی مدد ناہیں کرسکتا اور گورا صاحب بھی ایسا ہی کرت ہے۔ اس کو اپنے اوپر بہت وشواس ہے جی۔ اب پتا ناہیں کہ اس کو بہادری یا جواں مردی کہنا چاہیے یا ناہیں، پر سچ یہی ہے کہ گورا صاحب ایسے کاموں کے لیے خود کو خطرے میں ڈالنے کے لیے ہر سمے تیار رہوت ہے۔ وہ اتنا بڑا آدمی ہوکر بھی اپنے ساتھ سامبر کرنے والے کسی بھی منش کو پورا پورا موقع دیوت ہے۔''

''تو اس نے اسحاق کے ساتھ لڑائی کی؟''

''جی ہاں، اس نے اعلان کروایا تھا کہ اگر اس مہینے کی دس تاریخ تک کوئی سامبر کے لیے آنا چاہت ہے تو آجاوے۔ نو تاریخ کو حمیدہ کا دیور یہاں پہنچ گیا تھا۔ سنا ہے کہ گورا صاحب نے اس سے صاف کہا تھا کہ وہ اس کی بہن ماریا کے اغوا کا ذمے دار ہے لیکن اگر وہ سامبر جیت گیا تو وہ اسے کچھ ناہیں کہے گا بلکہ وہ اپنی بھاوج کو بھی یہاں سے لے جاسکے گا۔ دوسری صورت میں اس کو پوری پوری سزا ملے گی اور یہ سزا موت سے کم ناہیں ہووے گی۔ اسحاق کو یہ شرطیں ماننا پڑی تھیں...''

''تو وہ ہار گیا؟'' عمران نے پوچھا۔

وجنتی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے تھے۔

''کس قسم کا مقابلہ ہوا تھا؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''مجھے اس بارے میں کچھ جانکاری ناہیں۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ ہار گیا تھا۔ گورا صاحب سے جیتنا کوئی آسان کام ناہیں ہے۔ وہ بہت زیادہ سخت جان ہے۔ پھر لڑنے والے پر لڑنے سے پہلے ہی اس کا بہت رعب پڑ جاتا ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی اس طرح کے بہت سے مقابلے کرچکا ہے اور کبھی ہارا ناہیں۔ وہ تلوار بازی بھی کرلیوت ہے، خالی ہاتھوں سے بھی لڑتا ہے۔ کبھی کسی کے سامنے چاقو یا پستول پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اسے اس سے پہلے اٹھا کر دکھائے اور وار کرے...''

میری آنکھوں کے سامنے ماضیِ قریب کا وہ دردناک نقشہ گھوم گیا۔ جارج نے اس رات میرے سامنے بھی تو پستول پھینکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دھندسی پھیلنے لگی۔

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/350
سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو ... اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم ... کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا ... نے تیشہ اٹھایا اور اس نے جواب دیا ''میں بت فروش ... بت شکن کہلانا چاہتا ہوں'' نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر -/325
... میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی ... مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت ... کی الم ناک داستان

... ثقافت کی تلاش -/150
... ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر ... ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں ... کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ -/380
... اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی ... تہذیبی اور مذہبی حالات، زندگی اور فرزندان ... کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی -/350
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

گمشدہ قافلے -/350
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستانِ مجاہد -/200
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر سے راجپوت مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت -/325
اسلام دشمنی پر تلی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین -/325
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی -/325
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون -/350
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ -/300
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز -/350
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم -/300
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی -/180
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں نیتاؤں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا -/280
برہمن سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/160
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان -/325
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیلِ رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد -/150
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ -/225
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین -/325
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781 022-2780128 051-35539609 021-2765086 042-37220879 041-2627568

www.kahopakistan.com

میں نے خود کو بمشکل سنبھالا اور وجنتی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یعنی اسحاق ہار گیا اور اب اسے پھانسی دی جا رہی ہے؟''

وجنتی نے گردن جھکا کر ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو اس کی جھولی میں گرے۔ وہ سسک کر بولی۔ ''اس پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ کل پتاجی بتا رہے تھے کہ اس کے ایک ہاتھ کی ساری انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ اس طرح سے اس سے گورا صاحب کی بہن ماریا کی انگلی کا بدلہ لیا گیا ہے۔ کل یہاں چھٹی کا دن ہے۔ کل راج بھون کے سامنے چوک میں اس کی ہتھیا کر دی جاوے گی۔''

''اور تمہاری سہیلی حمیدہ؟'' عمران نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

''وہ جارج گورا صاحب کے پاس ہی ہے۔''

''ابھی اس سے بیاہ نہیں کیا گیا؟''

''ناہیں... گورا صاحب کہتے ہیں کہ وہ ابھی اس کے وارثوں کو ایک اور موقع دینا چاہت ہیں۔''

یہ سب کچھ دل دہلا دینے والا تھا۔ خاص طور سے میرے رگ و پے میں آگ سی بہنے لگی تھی۔ سارے زخم تازہ ہو گئے تھے۔

وجنتی اپنی سہیلی کے لیے مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ عمران نے اس سے کچھ مزید تفصیلات پوچھیں۔ کہیں کہیں میں نے بھی سوالات کیے۔ آخر میں عمران نے بڑی نرمی سے وجنتی کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اپنے مخصوص پُراثر لہجے میں بولا۔ ''وجنتی! ہم اس پوزیشن میں تو نہیں کہ تم سے کوئی وعدہ کر سکیں لیکن اتنی تسلی ضرور دیتے ہیں کہ ہم ابھی یہاں زرگاں میں ہی ہیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکا، ضرور کریں گے۔''

''ہم... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں اس معاملے میں میرا نام آ گیا تو ہمارے پریوار کے لیے بڑی مصیبت ہو جاوے گی۔ حکم جی کے کچھ لوگن کو میں پہلے ہی بہت بُری لگ رہی ہوں۔''

''وہ کس طرح؟''

''جس دن حکم جی کے سپاہی حمیدہ کو اس کے گھر سے لینے کے لیے آئے، میں بھی اس کے پاس ہی تھی۔ وہ حمیدہ کو زبردستی لے جانے لگے تو میں نے اور اس کی ساس نے انہیں روکا۔ میں سپاہیوں سے جھگڑ پڑی۔ میں نے ایک کی وردی پھاڑ دی۔ انہوں نے مجھے دھکے مارے اور دھمکیاں دیں۔ اب اگر پھر کہیں میرا نام اس معاملے میں آ گیا تو وہ لوگن میرے پیچھے پڑ جاویں گے۔''

عمران نے پھر محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''اس بارے میں بے فکر رہو۔ ہم نے تم سے کہا ہے نا کہ ہم وچن توڑنے والے نہیں، جان دینے والے لوگ ہیں۔''

''میں بھی آپ کو وچن دیوت ہوں کہ اس گھر میں جو کچھ ہو سکا آپ کے لیے کروں گی۔''

میں نے عمران کی طرف اور عمران نے میری طرف دیکھا۔ وجنتی کے لہجے میں سچائی تھی۔ وہ بہت حد تک دلیر اور سمجھ دار بھی تھی۔ اس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے وجنتی! اگر تم چاہو تو ضرورت پڑنے پر اس کمرے سے باہر جا سکتی ہو... ہم امید کرتے ہیں کہ تم ہمارے وشواس پر پوری اترو گی۔'' اس کے ساتھ ہی عمران نے ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی تو ہم جلدی سے تاریک اسٹور روم میں چلے گئے۔ وجنتی کی فربہ اندام والدہ کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وجنتی نے دروازے کی چٹخنی اتار دی اور واپس آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ وجنتی کی والدہ نے اس کا احوال دریافت کیا پھر اس سے کہا کہ وہ منہ ہاتھ دھو لے اور تھوڑا سا کھا پی لے۔

اس مرتبہ وجنتی نے انکار نہیں کیا اور ماں کے ساتھ باہر چلی گئی۔

ہم نے وجنتی کو باہر بھیج کر بے شک رسک لیا تھا لیکن ہم جس راستے پر چلے تھے، اس پر خطرات، اندیشوں اور خدشوں سے واسطہ تو قدم قدم پر پڑتا تھا۔ ہم اسٹور روم کے اندر ہی رہے۔ ہم نے اپنے رنگین چہرے گیلے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر اچھی طرح صاف کر لیے تھے۔ عمران کے بازو پر گہری خراش آئی تھی۔ اس نے وہیں اسٹور روم سے ایک پٹی لے کر بازو پر باندھ لی تھی۔ درحقیقت کل شام سے اب تک ہم نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ بھاگ دوڑ بھی بہت ہوئی تھی، نہایت سرد پانی میں تیرنا پڑا تھا... اب بھوک اور نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک کا تھوڑا سا ذکر عمران نے وجنتی سے بھی کیا تھا۔ اس بات کی امید تھی کہ شاید وہ کچھ کھانے کو لے آئے۔ اسے واپس آنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ تاخیر سے پریشانی تو تھی لیکن نہ جانے کیوں یقین سا تھا کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔

کل رات کے واقعات ایک بار پھر ہماری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ کئی سال پہلے جب لاہور میں اس طرح کی ہنگامہ آرائیاں ہوئی تھیں تو میں نے خود کو عمران کے ساتھ ایک عضوِ معطل کی طرح محسوس کیا تھا... لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ میں نے ہر جگہ عمران کے شانے سے شانہ ملائے رکھا تھا اور ایک دو موقعوں کے سوا کہیں بھی اس سے پیچھے نہیں رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''لاہور میں، میں نے تمہاری زبردست ڈرائیونگ دیکھی تھی۔ کل مجھے توقع نہیں تھی کہ تم لوڈر کو الٹا دو گے۔''

وہ مسکرایا۔ ''اپنی ڈرائیوری کو بے داغ رکھنے کے لیے میں دو بے گناہوں کی جان لے لیتا تو تم نے ہی مجھے لعنت ملامت شروع کر دینی تھی... ویسے اس موقع پر کام تم نے بھی کمال کا کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں تو تمہیں پرہیزگار سمجھتا تھا، تم بڑی تیز نظر رکھتے ہو۔''

''کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔''

''لوڈر الٹنے کے بعد گرے بھی تو ایک جوان لڑکی پر... حالانکہ وہاں گرنے کے لیے کئی اور جگہیں بھی تھیں۔ اور اگر کسی نرم نرم جگہ پر ہی گرنا تھا تو لڑکی کی ادھیڑ عمر والدہ بھی تو وہیں تھی۔ مجھے وہ محاورہ یاد آ رہا ہے کہ بنیا اگر گرتا ہے تو کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے۔''

''چلو اگر پھر ایسا موقع آیا تو تم اپنی من پسند جگہ پر گر لینا۔ میں بعد میں گر لوں گا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں ہاں بھئی! آہستہ آہستہ زبان لگ رہی ہے تمہیں۔ اور مجھے لگ رہا ہے کہ اندر سے تم کافی کھوچل بھی ہو۔ سلطانہ بھابی کے سامنے تو یونہی سائیں چپ شاہ بنے رہتے ہو۔ بہرحال، کچھ بھی ہے میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ سچی کھری بات کرنے سے باز نہیں رہوں گا۔ میں کنوارا ہوں اور تم شادی شدہ ہو۔ میری موجودگی میں تم نے ایک جوان لڑکی کے اوپر گر کر میرا استحقاق مجروح کیا ہے۔ کچھ لک مکا کر لو ورنہ میں اس معاملے کو اوپر تک لے جاؤں گا۔''

''کیا کرو گے؟''

''سب کچھ سلطانہ بھابی کو بتاؤں گا۔ فساد کراؤں گا۔ چھ گنجے دانشور اسٹوڈیو میں بلاؤں گا۔ تین تمہاری طرف سے، تین سلطانہ بھابی کی طرف سے۔ انہیں اتنا لڑاؤں گا... کہ باقی سارے قومی اور بین الاقوامی معاملات اس ''اہم موضوع'' کے سامنے پانی بھرتے نظر آئیں گے۔''

بیس مزدوروں نے تین دن کی لگاتار محنت کے بعد جوزف فیلڈ مین کے چار کمروں والے اپارٹمنٹ سے ایک لاکھ پندرہ ہزار مجلد کتابیں سات ٹرکوں پر لاد کر دوسری جگہ منتقل کیں..... ان کتابوں کا پتا اس وقت چلا جب اپارٹمنٹ کی نچلی منزل میں آگ لگی اور اوپر سے پانی پھینکنے کے لیے کچھ فائر مین جوزف فیلڈ مین کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ کتابیں دنیا کے ہر موضوع پر تھیں اور سب سے زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ ان میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں تھی جو جوزف فیلڈ مین نے جیب سے رقم خرچ کر کے خریدی ہو۔ کچھ کتابیں ایسی تھیں جو دوستوں سے مستعار مانگ کر واپس نہیں کی گئی تھیں جبکہ زیادہ تر کتابیں وہ تھیں جنہیں شہر کی مختلف لائبریریوں سے چوری کیا گیا تھا۔

جوزف فیلڈ مین سے دریافت کیا گیا کہ اس نے اتنی بڑی تعداد میں کتابوں کا ذخیرہ کیوں اکٹھا کر رکھا تھا تو اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''مجھے مطالعے کا شوق ہے۔'' اور جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں کتابیں چرانے میں کس طرح کامیاب ہوا تو پہلے تو اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا اور بعد میں جب بہت زیادہ اصرار کیا گیا تو بتایا کہ ''میں ایک معزز شخص ہوں اور سب ہی لائبریرین مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔''

لاہور سے کاشان قاسمی کی اعتماد پسندی

''لیکن یہ سب تو تب ہو گا جب ہم یہاں سے زندہ نکل سکیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، یہ مسئلہ تو بہرحال ہے۔'' اس نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔

اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہم الرٹ ہو گئے۔ عمران نے ریوالور پھر ہاتھ میں لے لیا۔ اندر آنے والی وجنتی ہی تھی۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ وہ کسی رومال وغیرہ میں کوئی چیز چھپا کر لائے گی لیکن وہ تو باقاعدہ ٹرے اٹھائے چلی آ رہی تھی۔ اس میں پراٹھے اور انڈوں کا نمکین آملیٹ نظر آ رہا تھا۔

وہ اسٹور میں چلی آئی۔ ''تمہاری ماں جی نے نہیں

www.kahopakistan.com

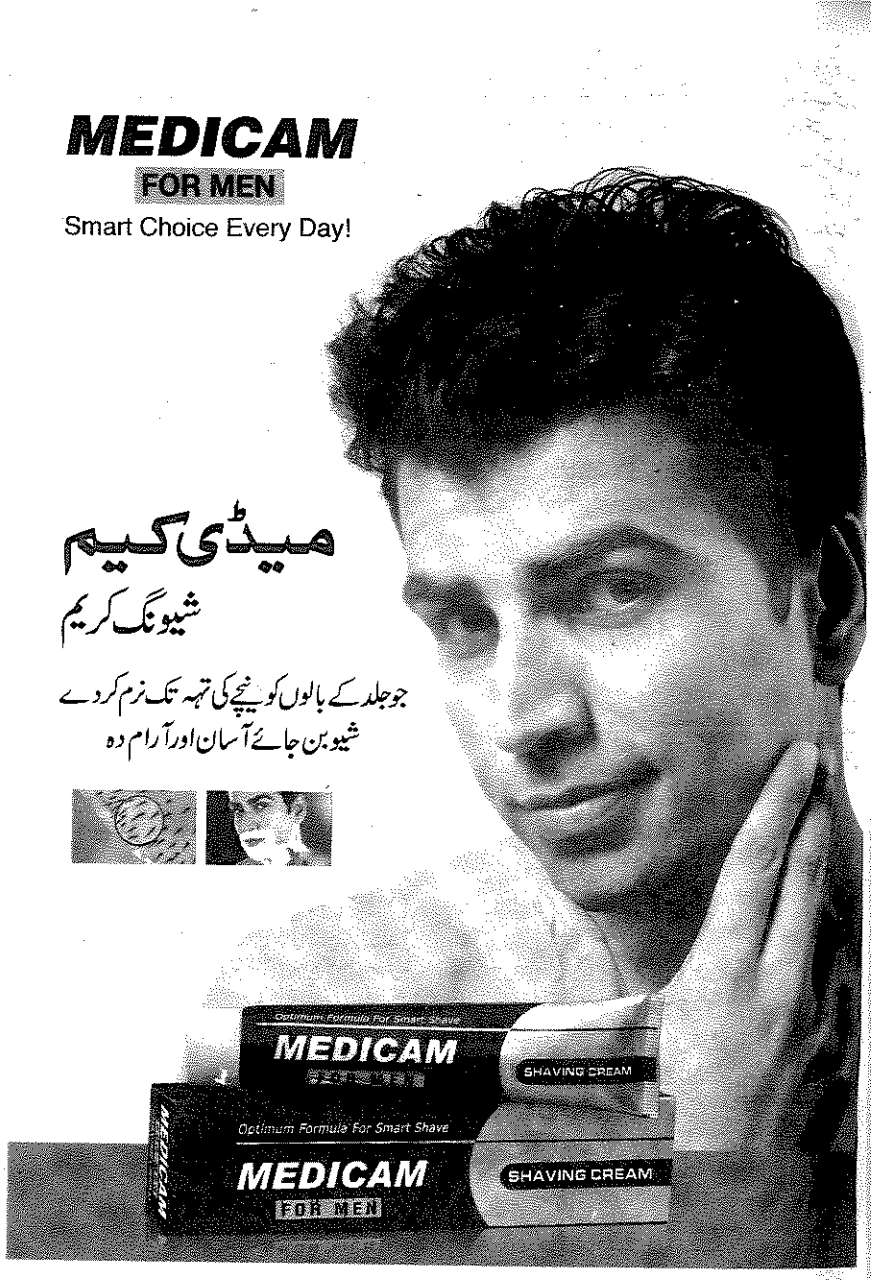

دیکھا؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھا ہے بلکہ انہوں نے ہی بتا کر دیا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ایک بات کہنا چاہت ہوں۔'' ہم دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں نے ماں جی کو سب بتا دیا ہے۔ آپ نے بالکل بھی فکر ناہیں کرنا۔ میرے اور ماں کے بیچ کوئی بھی بات چھپی ناہیں ہوتی۔ وہ وہی کریں گی جو میں کہوں گی۔''

''لو کرلو تماشا۔'' عمران نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں جی؟'' وجنتی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ لیکن کہیں ماں جی کی وجہ سے کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔''

''اگر میں ماں جی کو نہ بتاتی، تب گڑبڑ ہونے کا ڈر تھا۔ اب ہم اس معاملے کو سنبھال لیویں گے۔'' وجنتی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گھر میں صرف اپنے والد سے ڈرتی ہے اور اسے اب یہ خوف ہے کہ کہیں اس کے گھر میں ہونے والی خطرناک گڑبڑ کا پتا اس کے والد کو نہ لگ جائے۔ ہمیں یہ اندازہ بھی ہوچکا تھا کہ راج بھون سے ریٹائرمنٹ کے باوجود وجنتی کے پتا کی ہمدردیاں راج بھون اور حکم جی سے ہیں اور وہ ان لوگوں میں سے ہے جو راج بھون میں ہونے والے ہر کام میں کوئی نہ کوئی اچھائی تلاش کر ہی لیتے ہیں۔

وجنتی نے کہا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں اپنی ماتا کو ان سے ملانے کے لیے یہاں لائے گی۔

کھانے کے دوران میں ہم بالکل خاموش رہے۔ وجنتی کی آمد سے پہلے عمران نے کچھ ہلکی پھلکی باتیں کرکے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی تاہم میں جانتا تھا کہ میری طرح اس کا دماغ بھی مسلسل مصیبت زدہ اسحاق اور اس کی بھابی حمیدہ میں الجھا ہوا ہے۔

میں نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے عمران کہ اس کمینے جارج نے اسحاق کی بھاوج کو ایک چارے کے طور پر استعمال کیا ہے... اور شاید وہ آئندہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے... اس نے اس عورت کے خیر خواہوں کو مزید قسمت آزمانے کا موقع دیا ہے۔''

وجنتی بولی۔ ''میرا وچار ہے کہ آپ ٹھیک کہوت ہو۔ میں نے سنا ہے کہ اسحاق کے ایک اور دوست نے گورا صاحب کے سامنے آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا نام انور خاں ہے... ہم سب جانت ہیں کہ وہ بہت دلیر شخص ہے۔ زرگاں کے مسلمان اسے بہت مانتے ہیں۔ کچھ ماہ پہلے جب مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ جیل کے بجائے گورا صاحب کے گھر میں ہے تو علاقے کے مسلمان ایک دم بھڑک اٹھے تھے۔ انہوں نے گورا صاحب کے گھر پر چڑھائی کردی تھی۔ اس وقت انور خاں نے بہت ہمت دکھائی تھی۔ اب وہ کچھ عرصے سے تل پانی میں ہے۔ سنا ہے کہ وہ گورا صاحب کی سامبر رچنا میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کئی لوگن کا خیال ہے کہ شاید انور خاں وہ اکیلا شخص ہے جس کی گورا صاحب کے مقابلے میں جیتنے کی تھوڑی بہت امید کی جاسکت ہے۔''

یہ نئی اطلاع بھی سنسنی خیز تھی۔ وجنتی کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ جس سلطانہ کی بات کررہی ہے، میں اس کا شوہر ہوں اور انور خاں میرا قریبی ساتھی ہے۔ میں انور خاں کے بارے میں عمران کو بہت کچھ بتا چکا تھا۔ وجنتی سے انور کا ذکر سن کر عمران کے چہرے پر بھی سنسنی نظر آنے لگی۔

ہماری غیر موجودگی میں یہ جارج گورا نے انوکھا کھیل کھیلا تھا۔ اس کی کمینگی اور عیاری کھل کر سامنے آرہی تھی۔ اس نے واقعی حمیدہ کو چارے کے طور پر استعمال کرکے اسحاق کی غیرت کو جگایا اور اسے یہاں بلانے میں کامیاب رہا تھا۔ اب وہ اسے موت کے گھاٹ اتارنے والا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ انور خاں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا...

جو کچھ بھی تھا لیکن ایک بات تسلیم کرنی پڑتی تھی۔ سیکڑوں جنگجو افراد کا کمان دار ہونے کے باوجود جارج گورا بوقتِ ضرورت خود میدان میں اترتا تھا اور اپنے مقابل کو نیچا دکھاتا تھا۔ اس نفسیاتی برتری کے بعد وہ اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد ہوجاتا تھا۔ جو رہی سہی کسر تھی، وہ حکم جی کی معاونت سے پوری ہوجاتی تھی۔

میرے سینے میں ایک عجیب سی آگ دہکنے لگی۔ مجھے لگا کہ ایک طویل عرصے سے میں جس ''ٹاکرے'' کا انتظار کررہا تھا، اس کے لیے اسٹیج خود بخود تیار ہورہا ہے۔ میرے پٹھے تن گئے۔ سینے کی دھڑکن میں ایک نامانوس اضافہ ہوگیا۔

وجنتی کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''کیا آپ دونوں میری سہیلی کے لیے کچھ کر سکت ہیں؟''

عمران نے کہا۔ ''سہیلی سے پہلے تو اس کے دیور کی بات کرنی چاہیے جس کے بارے میں تم کہہ رہی ہو کہ اسے کل

www.kahopakistan.com

پھانسی یا سولی دی جانے والی ہے...''

''اس کے لیے اب کیا ہوسکتا ہے؟'' وہ بے حد مایوسی سے بولی۔ ''اس کے لیے کچھ کرنے کا سمے اب گزر چکا ہے لیکن حمیدہ کے بچاؤ کے لیے تو ابھی کافی سمے ہے۔ شاید کسی بڑی سفارش سے کوئی فائدہ ہو جائے... یا پھر اسے راج بھون سے نکالنے کی ہی کوئی کوشش کی جاسکے۔'' بات کرتے ہوئے وجنتی کے ہونٹ سوکھ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ سرد رات ہم نے اسی تاریک اسٹور روم میں گزاری۔ وجنتی کی ماتا واقعی اس کے کہے کے مطابق چلتی تھی۔ شام کا کھانا ہمارے لیے وہی لے کر آئی تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اور ہاتھ جوڑ کر بس ایک ہی بات کہی اور وہ یہ کہ اگر یہاں سے نکلنے کے بعد خدانخواستہ ہم پکڑے جائیں تو اس گھر کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ وجنتی کی طرح ہم نے اس کی ماتا کو بھی یہ حلف دیا تھا۔ وجنتی کی ماتا سے ہمیں ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی... اس نے بتایا کہ پانڈے کی جان نہیں بچائی جاسکی اور آج سہ پہر شاہی اسپتال میں اس کا دیہانت ہوگیا ہے۔

اب رات کی اس تیرگی میں میرے ذہن میں بار بار وہ مناظر گھوم رہے تھے جب سرپٹ بھاگتی گھوڑا گاڑی میں، میں نے پانڈے کو جان لیوا طور پر گھائل کیا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں ہورہا تھا کہ میں پانڈے جیسے موذی کو جہنم واصل کر چکا ہوں۔ اس نے دیوان میں بم بلاسٹ کر کے بڑی سفاکی سے بے گناہ لوگوں کے چیتھڑے اڑائے تھے۔ آج ان لوگوں کو انصاف مل گیا تھا۔

رات کو گلی میں مسلسل گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیتی رہیں۔ گاہے بگاہے کچھ للکارے بھی سنائی دیتے رہے۔ پتا چلتا تھا کہ ہماری تلاش جاری ہے... صبح اپنے پتا اور چھوٹے بھائی کے گھر سے چلے جانے کے بعد وجنتی ہمارے لیے ناشتا لے کر آئی... اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ آج سہ پہر حمیدہ کے دیور اسحاق کو پھانسی دی جارہی ہے۔ وہ پھانسی کا لفظ استعمال کر رہی تھی لیکن ہمیں معلوم تھا کہ یہاں پھانسی کے بجائے سولی چڑھایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بغاوت کے جرم میں جن افراد کو جیل کے اندر سزائے موت دی گئی، انہیں بھی سولی پر لٹکایا گیا تھا۔ اس کی لرزہ خیز تفصیلات ہمیں دوسرے لوگوں سے پتا چلی تھیں۔ وجنتی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کل رات ڈاکٹر اسٹیل کے بھائی کا کریا کرم ہوگیا ہے اور ابھی تھوڑی دیر بعد پانڈے کی آخری رسوم بھی ادا کی جائیں گی۔ پورے زرگاں میں سوگ کی فضا ہے۔

جب ہم دہی کلچے اور چنے کا ناشتا کر رہے تھے، وجنتی نے پوچھا۔ ''دوپہر کو آپ کیا کھائیں گے؟''

''جو مرضی بنالو۔'' عمران نے کہا۔

''آپ... ابھی... یہاں رہیں گے نا؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''نہیں... اسی لیے تو کہا ہے جو مرضی بنالو۔'' عمران نے جواب دیا۔

وہ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش، بے یقینی، اطمینان، سب کچھ گھل مل گیا تھا۔ ''اپنی بہن کو بہت زیادہ تکلیف دی ہے ہم نے... اب اور نہیں دیں گے... اور جو کچھ کہا ہے وہ بھی یاد رکھیں گے... حمیدہ کے لیے جو کچھ ہوسکا ضرور کریں گے۔'' پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم بھی کچھ کہو۔''

''سب کچھ تو تم خود کہہ دیتے ہو۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ بولی۔ ''باہر آپ کے لیے گمبھیر خطرہ ہوگا یا پھر... آپ آج کی رات اور رک جاویں...''

''نہیں، تمہارا بہت امتحان لے لیا ہے ہم نے... تمہارا بہت بہت دھنیواد۔'' عمران نے کہا۔

''اور تمہارا یہ احسان یاد بھی رکھیں گے۔'' میں نے اضافہ کیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ عمران نے کہا۔ ''بس ایک آخری چھوٹی سی تکلیف تمہیں دینی ہے۔ کسی طرح ہمارے لیے دو جوڑوں کا انتظام کردو تاکہ ہم یہ منحوس وردیاں اتار سکیں۔''

...اور اب یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ ہم وجنتی کے گھر سے باہر آچکے تھے۔ سردی عروج پر تھی۔ باہر آکر ہمیں پتا چلا کہ گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور تیز ہوا بھی چل رہی ہے... ہم مقامی لباس دھوتی کرتے میں تھے۔ سروں پر رنگ دار پگڑیاں تھیں اور ہم نے گرم چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ ہمارا اسلحہ ان چادروں میں چھپا ہوا تھا۔ سردی کے سبب مقامی لوگ اکثر اپنی پگڑیوں کو منڈاسے کی صورت باندھ لیتے تھے، اس سے چہرہ بھی کافی حد تک چھپ جاتا تھا۔ آج تو پھر یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے اپنی پگڑیوں اور گرم چادروں کو اپنا آپ چھپانے کے لیے استعمال کیا اور تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے اس بہت بڑے ہجوم میں داخل ہو گئے جو راج بھون سے کچھ فاصلے پر ایک چوک میں جمع تھا اور بڑھتا چلا جارہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں سے لوگ ٹولیوں کی شکل میں نکلتے تھے اور اس جم غفیر میں شامل ہو جاتے تھے۔ راج بھون کے ایک عظیم الشان دروازے سے باہر ایک پتھریلا چبوترا تھا۔ اس چبوترے پر باوردی افراد چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ لکڑی کے تین عدد بہت بڑے بڑے کراس بھی یہاں نصب تھے۔ یہ وہ سولیاں تھیں جن پر حکم کے معتوبین کو لٹکایا جاتا تھا۔

ہم ہجوم میں گھستے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ یہ وہی انداز تھا جو ہم نے دو دن پہلے راج بھون میں اختیار کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج یہ سب کچھ راج بھون کی چار دیواری سے باہر ہورہا تھا اور ہجوم میں امنگ ترنگ کی جگہ غم و غصہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ لوگ ایک شخص کی اذیت ناک موت دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ غصیلے نعرے لگاتے ہوئے وہ مکے لہرا رہے تھے۔

چبوترے کے اوپر ہلچل میں اضافہ ہوگیا۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی ہم دیکھ سکتے تھے۔ کچھ افسران ٹائپ لوگ چبوترے پر دکھائی دیے۔ ان کی پگڑیاں اونچی اور بھاری تھیں۔ تیز یخ بستہ ہوا میں ان پگڑیوں کے شملے لہرا رہے تھے... چبوترے کے گرد بے شمار مسلح محافظ اور سپاہی موجود تھے۔ کچھ اونچی جگہوں پر بھی محافظوں کی پوزیشنیں تھیں۔ غالباً یہ اضافی حفاظتی انتظامات پرسوں رات پیش آنے والے واقعات کے بعد کیے گئے تھے۔ شاید وجنتی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب اس آخری وقت میں اسحاق کے لیے کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر بھی ہم کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ کیا کرنا چاہتے تھے؟ یہ خود ہمارے ذہنوں میں بھی واضح نہیں تھا۔

ایک طویل انتظار کے بعد بالآخر اس تماشے کا کلائمکس شروع ہوگیا۔ دور چبوترے پر ہم نے ایک زرد رنگ چہرہ دیکھا۔ یہ شخص سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور اسے دو افراد نے سہارا دے رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں نے فلک شگاف نعرے لگائے اور ہجوم میں اضطراب کی بلند لہریں پیدا ہوئیں۔

''یہی ہے اسحاق؟'' عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں۔'' درد و کرب کے سبب میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

وہ ہزاروں افراد میں گھرا ہوا تھا۔ یہاں کوئی اس کا دوست نہیں تھا، سب دشمن تھے اور اس کے خون کے پیاسے تھے۔ ہم ہجوم میں داخل ہو کے آگے بڑھتے رہے۔ آخر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے مسلح محافظوں کا دُہرا حصار شروع ہوتا تھا۔ اگر ہم اس جگہ تھوڑی سی ہلچل پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو آگے بڑھنے اور کچھ کر گزرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ کامیابی کا امکان بہت کم تھا لیکن ہم چھوٹے سے چھوٹے امکان کو بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ہم حتی الامکان حد تک آگے پہنچ گئے۔ کینوس کا وہ سفید بیگ ابھی تک عمران کے کندھے سے جھول رہا تھا جس میں فالتو ایمونیشن رکھا جاتا ہے لیکن اس وقت بیگ میں ایمونیشن نہیں تھا۔ ایک زہریلا سانپ تھا جسے ہم نے زرگاں کے راستے میں جنگل سے پکڑا تھا اور اپنا ہم سفر بنالیا تھا۔ میں اور عمران اس سانپ کو یہاں ہجوم میں چھوڑنے اور خوف و ہراس پیدا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ عمران نے گرم چادر کے اندر اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ وہ کینوس بیگ کھولنے جارہا تھا۔ لیکن اچانک ایسا ہوا کہ عمران کے اندر کوئی روشنی سی بجھ گئی۔ چادر کے اندر اس نے اپنے ہاتھ بھی روک لیے۔

''کیا ہوا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''وہ دیکھو۔'' اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

محافظوں کی قطاروں کے درمیان تھوڑی سی جگہ خالی نظر آرہی تھی۔ یہاں سے خاردار تاروں کے قریباً پانچ فٹ اونچے بڑے بڑے چھلے نظر آئے۔ چھلوں سے بنی ہوئی اس ناقابلِ عبور باڑ نے چبوترے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ''اوہ گاڈ!'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

''ہم یہ کسی صورت پار نہیں کرسکیں گے۔'' عمران کی آواز میں مایوسی تھی۔

بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہم نے اس ڈھلتی سہ پہر میں اس چبوترے کے سامنے... ان سیکڑوں لوگوں کے درمیان... بڑی وضاحت سے محسوس کیا۔

ایک دم ہمیں لگا کہ ہم ہار گئے ہیں۔ کم از کم آج کا دن کسی طرح بھی ہمارے حق میں نہیں ہے۔ وقت بہت کم تھا اور ہم کسی بھی طرح ان لاتعداد محافظوں اور اس مخصوص خاردار باڑ سے گزر کر اسحاق تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اب ہماری حیثیت بھی تماشائیوں سے زیادہ نہیں رہی تھی اور تماشا تقریباً شروع ہو چکا تھا۔ یہاں قریباً چودہ پندرہ ہزار کا مجمع تھا اور ہر نگاہ حکم اور جارج کے گناہ گار پر جمی تھی۔ وہ غالباً کسی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور خود کو جلادوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اتنی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا، اس کا ایک ہاتھ سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ یقیناً

www.kahopakistan.com

یہ وہی ہاتھ تھا جس کی انگلیاں پرسوں کاٹ دی گئی تھیں۔ اسحاق کے چہرے پر بھی مار پیٹ کے گہرے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اسے ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ دو تین افراد نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ لکڑی کے ایک کراس کو آٹھ دس افراد نے مل کر چبوترے پر لٹایا پھر اس کراس پر اسحاق کو لٹا دیا گیا۔ ایک پہلوان نما جلاّد کے ہاتھ میں ایک بڑا ہتھوڑا نظر آیا۔ تب وہ کارروائی شروع ہوئی جو میرے سینے میں دل کو ٹکڑوں میں بدل گئی۔ یہ سب کچھ دیکھنے اور سہنے کے لیے لوہے کا دل درکار تھا۔ اسحاق کی ہتھیلیوں اور ٹانگوں پر نخنوں کے قریب لمبی آہنی کیلیں ٹھونکی جانے لگیں ہم کافی دوری پر ہونے کے باوجود اس کی کرب ناک آوازیں سن سکتے تھے۔

اس وقت میں نے سوچا کہ اگر ہم کچھ کر نہیں سکتے تھے تو یہاں آئے ہی نہ ہوتے اور یقیناً عمران بھی ایسا سوچ رہا تھا۔ ہم ہزاروں پُرجوش تماشائیوں کے درمیان ساکت کھڑے تھے۔ پھر درجن بھر افراد نے مل کر لکڑی کے کراس کو کھڑا کر دیا۔ اسحاق اس صلیب پر ٹنگا ہوا تھا۔ چلّا چلّا کر وہ شاید نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں سے بہتے ہوئے خون کی سرخی ہم اتنی دور سے بھی دیکھ سکتے تھے۔

وہ ہمارے گروپ کا سب سے جوشیلا رکن تھا۔ تھوڑا سا غصیلا بھی تھا لیکن اس کا غصہ بے وجہ نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس کے غصے کی جڑیں اس کے ماضی سے پیوست تھیں۔ اس کی جوان بہن پر مقامی عورتوں کے بدنام رسیا (جارج) نے رال ٹپکائی تھی... جارج کے ہاتھوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس لڑکی نے زہر کھایا تھا۔ اس کے پھیپھڑے بند ہو گئے تھے اور وہ سانس کو ترستے ترستے راہیِ عدم ہو گئی تھی۔ اب اس کے خاندان کی ایک اور عورت ایسی ہی صورتِ حال کا شکار ہوئی تھی اور وہ اسے بچانے کی کوشش کرتے کرتے اس سولی تک آ پہنچا تھا۔

پہلوان نما جلاّد آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی ہتھوڑا نظر آیا جس سے اس نے اسحاق کے جسم میں میخیں ٹھونکی تھیں۔ اس مرتبہ جلاّد نے اس ہتھوڑے کو ایک اور طرح کی سفاکی کے لیے استعمال کیا۔ ہتھوڑے کی زوردار ضرب اسحاق کی پنڈلی پر لگائی گئی۔ یقیناً پنڈلی کی ہڈی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ہو گی۔ یہاں کوئی لاؤڈ اسپیکر نہیں لگا ہوا تھا، پھر بھی اسحاق کے چلّانے کی دردناک آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد ایسا ہی سلوک اسحاق کی دوسری پنڈلی سے کیا گیا۔ پھر بازوؤں کی باری آئی۔ ہر بار جب ضرب لگتی تھی اور مرتا ہوا اسحاق چلاّتا تھا تو جواب میں جوشیلے نعرے بلند ہوتے تھے۔ کبھی کبھی انسان کتنا سنگ دل ہو جاتا ہے... ہجوم کی نفسیات اس سنگ دلی کو انتہا تک پہنچا دیتی ہے۔

ہمارے لیے اب وہاں مزید کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے دم توڑتے اسحاق کو دیکھا... اور دل ہی دل میں کہا۔ ''اے دوست! ہم نے وہ سب دیکھا جو ان دشمنوں کے درمیان تجھ پر بیتا۔ ہاں، ہم نے سب دیکھا... اور سب ہمارے دل پر نقش ہوا۔ اور ہم وعدہ کرتے ہیں تجھ سے کہ ہم تیری تکلیف اور بے بسی کو بھولیں گے نہیں۔ تیرے خون کا حساب لیں گے... اور اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش بھی کریں گے جس کی خاطر تو نے اس اجنبی جگہ پر... بے مہر لوگوں کے درمیان... بے بسی کے عالم میں تڑپ تڑپ کر جان دی ہے...''

اب ایک دوسرا جلاّد آگے بڑھ رہا تھا، اسے اسحاق کے کولہوں کی ہڈیاں توڑنا تھیں۔ لیکن کھیل تو شاید اس سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ سولی پر ٹنگا ہوا اسحاق تقریباً بے جان نظر آ رہا تھا۔ عمران نے میرا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ ''چلو آؤ تابش...'' اس کی آواز میں انتہا درجے کا دکھ تھا۔

ہم ہجوم کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے واپس چل دیے۔ جب ہم ایک ایک قدم کھسکتے ہوئے نسبتاً کشادہ جگہ پر پہنچے، مشتعل ہجوم نے فلک شگاف نعرے لگا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا... پتا چلا کہ مصلوب کے سینے میں خنجر گاڑ کر اس کا قصہ تمام کر دیا گیا ہے۔

ہم نکلتے چلے گئے۔ ہمارے سینوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ چوک سے باہر نکل کر ہم چھوٹی گلیوں میں داخل ہو گئے۔ سرد ہوا کی کاٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ اچانک ہم ٹھٹک گئے۔ ایک گلی میں سپاہیوں کا ناکا نظر آ رہا تھا۔ آنے جانے والوں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ ایک سخت گیر افسر ایک راہ گیر پر گرج برس رہا تھا۔ اس نے اسے کوٹ اتار کر تلاشی دینے کا حکم دیا پھر کسی بات پر شخص ہو کر اسے تھپڑ دے مارا۔ میں اس افسر کو دیکھ کر سکتہ زدہ رہ گیا... نگاہ پر بھروسا نہیں ہوا۔ کیا مُردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں؟ میرے سامنے رنجیت پانڈے کھڑا تھا۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

پیشہ ور

محمد عفان آزاد

اگر محبت کی دھیمی دھیمی آنچ میں سرور و انبساط ہے..... تو نفرت کے بھڑکتے شعلوں میں وہ تندی و تیزی پنہاں ہے ..... جو انتقام لیے بغیر سرد نہیں ہوتے ..... ایسے ہی دو دلوں کی داستان..... ایک محبت کی تلاش میں سرگرداں تھا ..... جبکہ دوسرے کی کھوج و جستجو کے پیچھے نفرت انتقام کا جذبہ کارفرما تھا۔

ایک چونکا دینے والے انجام کی منتظم مزاح کہانی

الیکس نارٹن نے سڑک عبور کی اور دوسری طرف موجود کیفے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اندر جانے کے بجائے باہر فٹ پاتھ پر موجود ایک میز منتخب کی اور اس پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد ویٹر آیا تو اس نے اس سے پائن ایپل جوس کی فرمائش کی۔ ویٹر نے اسے جوس لا دیا۔ اگست میں شکاگو کا موسم گرم ہوتا ہے۔ اس روز بھی خاصی گرمی تھی اور الیکس کو اپنا سوٹ چبھ رہا تھا لیکن مجبوری تھی، وہ سوٹ کے بغیر باہر نکلنے کا عادی نہیں تھا۔ الیکس تقریباً چالیس برس کا لیکن خوش شکل اور ہینڈسم ..... آدمی تھا۔ اپنی بے داغ جلد اور تر و تازہ چہرے کی وجہ سے وہ تیس سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا۔ قیمتی سوٹ، رسٹ

www.kahopakistan.com

واچ اور بہترین لیڈر بریف کیس کی وجہ سے کوئی خوشحال تاجر نظر آتا تھا جو کاروباری مصروفیت میں سے کچھ لمحے نکال کر سستانے کے لیے یہاں چلا آیا ہو۔

لیکن وہ نہ تو تاجر تھا اور نہ ہی سستانے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اسے ایک فون کال کا انتظار تھا۔ وہ پائن ایپل جوس کے گھونٹ لینے لگا۔ ایک گھونٹ لینے کے بعد وہ نفاست سے ہونٹ صاف کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ مضبوط لیکن ان میں کھردرے پن کے بجائے نرمی تھی جیسے اس نے زندگی میں کوئی سخت کام نہ کیا ہو۔ چند منٹ بعد اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا اور چند لمحے اس کی اسکرین دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کال ریسیو کی۔

''یس۔''

''الیکس نارٹن؟'' دوسری جانب سے کہا گیا تو اس کا جسم ایک لمحے کو تن گیا۔ اسے اپنا نام سننا اچھا نہیں لگا تھا کیونکہ وہ بولنے والے آدمی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور وہ اس کے نام سے واقف تھا۔ یہی نہیں، وہ اس کے فون نمبر سے بھی واقف تھا۔ دو دن اس نے الیکس سے رابطہ کیا۔ اس وقت بھی اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔

''الیکس نارٹن؟''

وہ چونکا کیونکہ نمبر اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس نے صرف اس لیے کال ریسیو کر لی کہ اس کا کوئی جاننے والا اس نمبر سے کال نہ کر رہا ہو لیکن بولنے والے کا لہجہ اس کے لیے مکمل اجنبی تھا۔ ''تم کون ہو اور تمہیں یہ نمبر کہاں سے ملا؟''

''دونوں سوال غیر ضروری ہیں۔'' اس آدمی نے کہا۔

''پھر ضروری کیا ہے؟'' اس کے لہجے میں رکھائی آ گئی۔

''وہ کام تم کرتے ہو۔'' اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''میں تم سے وہی کام لینا چاہتا ہوں۔''

''شاید تم نے غلط جگہ کال کی ہے۔''

''میں نے بالکل درست کال کی ہے۔''

الیکس کچھ دیر خاموش رہا اور دل ہی دل میں صورتِ حال کا تجزیہ کرنے لگا۔ ایک اجنبی شخص اس کے ذاتی موبائل فون تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور یہ نمبر بہت کم لوگوں کے پاس تھا اور جن کے پاس تھا، ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ ان میں ایک کارٹ تھی۔ کارٹ اس کی محبوبہ تھی اور وہ اس کے دیے پُرتعیش اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اس کے علاوہ چند دوست احباب تھے جو یہ جانتے تھے کہ وہ ایک سرمایہ کار ہے اور اسٹاک مارکیٹ میں اس کا اتنا سرمایہ لگا ہوا ہے کہ وہ کچھ کیے بغیر ہی آرام کی زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن ایک اجنبی آواز بتا رہی تھی کہ یہ نمبر کسی اور کے پاس جا چکا ہے اور وہ اس کے بارے میں یقیناً اس کی سوچ سے کہیں زیادہ واقف ہو چکا ہے۔ اس نے فوری فیصلہ کیا کہ وہ اس شخص سے بہت محتاط ہو کر بات کرے گا۔

''تم مجھ سے کام کیوں لینا چاہتے ہو؟''

''کیونکہ تم یہ کام کرنے والے بہترین افراد میں سے ایک ہو۔ مکمل پروفیشنل آدمی۔''

اسے ایک لمحے کو خوشی ہوئی کیونکہ وہ جو کام کرتا تھا اس کی آج تک کسی نے داد نہیں دی تھی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اسے سراہا تھا، اس کی تعریف کی تھی لیکن فوراً ہی اسے خیال آ گیا۔ ''تم مجھ سے کس طرح واقف ہو؟''

''میں کہہ چکا ہوں کہ یہ سوال غیر ضروری ہے اور میں اس کا جواب نہیں دوں گا..... لیکن یہ کال کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی تو اس کا تمہیں نقصان ہو گا۔''

الیکس نے دل ہی دل میں تجزیہ جاری رکھا۔ ''کیا یہ دھمکی ہے؟''

''نہیں، یہ حقیقت ہے۔''

الیکس نے محسوس کیا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ تفصیل میں جانا بے سود تھا اس لیے اس نے کام کی بات کی۔

''اوکے..... تم کیا چاہتے ہو؟''

''یہ جاننے کے لیے تمہیں شکاگو جانا ہو گا۔''

''اگر تم جانتے ہو کہ میں کیا کرتا ہوں تو تمہیں یہ بھی علم ہو گا کہ میں اس کا کیا معاوضہ لیتا ہوں؟''

''نصف کام سے پہلے اور نصف کام کے بعد!'' اس آدمی نے کہا۔ ''لیکن آج کل تم کیا معاوضہ لے رہے ہو، مجھے علم نہیں ہے۔''

''دو لاکھ ڈالرز!'' اس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، نصف معاوضہ تمہیں کل مل جائے گا۔ اس کے ساتھ شکاگو کا ٹکٹ اور کچھ ہدایات ہوں گی، تمہیں ان پر عمل کرنا ہو گا۔''

''میں اس طرح کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

''میں جانتا ہوں لیکن تم نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ اس بار معاملہ مختلف ہے اور تمہیں اپنے مروجہ طریقۂ کار سے ہٹ کر کام کرنا ہو گا۔''

الیکس نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ نظروں سے چھپ کر اپنے پلان کے مطابق کام کرتا تھا لیکن یہ معاملہ الگ تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اگر اس نے اسے مس پنڈل کیا تو اسے نقصان ہو گا اور وہ اپنی چھٹی حس کی بات سننے کا عادی تھا۔ شاید اسی وجہ سے اب تک زندہ تھا ورنہ اس کے پیشے میں لوگ زیادہ عرصے نہیں جیتے۔ اس شام کوئی اس کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر ایک چھوٹا بریف کیس ڈال گیا۔ کال بیل کی آواز سن کر جب تک وہ دروازے پر آیا' بریف کیس ڈالنے والا جا چکا تھا اور کیٹ آئی سے باہر کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے دروازہ کھولا تو بریف کیس سامنے پڑا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر اندر لے آیا۔ اسے کھولنے سے پہلے اس نے احتیاطاً اسے چند آلات کی مدد سے چیک کیا۔ بریف کیس محفوظ تھا پھر اس کا کھٹکا دبا کر کھول دیا۔ اندر ایک لاکھ ڈالرز کی رقم، ایک ائرٹکٹ اور ایک چھوٹا سا پرچہ تھا۔

''سیونتھ ایونیو پر الپائن کیفے کے سامنے میز پر صبح گیارہ بجے..... دو دن بعد۔''

کاغذ کسی کمپیوٹر سے پرنٹ کیا گیا تھا۔ اس نے تمام چیزوں کو دستانے پہن کر چھوا تھا تاکہ اگر ان پر کوئی نشان ہے تو وہ ضائع نہ ہو۔ ایک لاکھ ڈالرز اور ٹکٹ بھیجنے کا مطلب تھا کہ وہ شخص سنجیدہ ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرے؟ اس کے پاس سوچنے کے لیے دو دن تھے۔ اگلے روز صبح سویرے وہ ملواکی سے بذریعہ سڑک شکاگو کے لیے روانہ ہو گیا اور شام کو اس نے ایک عام سے ہوٹل میں قیام کیا۔ اس نے ائرٹکٹ استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا لیکن کوئی اس کے پیچھے نہیں تھا۔ اگلی صبح اسے کیفے الپائن میں موجود ہونا تھا۔

☆☆☆

شمالی کینیڈا کے اس برف زار میں میلوں تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ نارٹن خاندان گزشتہ سال یہاں آ کر آباد ہوا تھا۔ تواتر سے پڑنے والی برف، مشکل راستوں اور آبادی سے دوری کی وجہ سے رفتہ رفتہ خاندان کے دوسرے لوگ وہاں سے رخصت ہو کر جنوب کی طرف جاتے رہے جہاں حالات بہتر تھے۔ آخر میں وہاں صرف الیکس کا خاندان رہ گیا تھا۔ اس کا باپ میلون ایک ماہر شکاری تھا اور اس نے الیکس کو بچپن سے نشانے بازی میں طاق کر دیا تھا۔ کم عمر الیکس باپ کے ساتھ بھیڑیوں کے شکار پر جانا چاہتا تھا لیکن اس کی ماں اجازت نہیں دیتی تھی۔

الیکس نو سال کا تھا تو اس کا دل شکار پر جانے کے لیے مچلنے لگا۔ اس کے باپ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلے سال اسے شکار پر لے جائے گا۔ برف پگھلنے پر میلون شکار پر نکلا کیونکہ بھیڑیے بھی شکار کی تلاش میں اپنے بھٹوں سے نکل آتے تھے۔ اس روز الیکس کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ بھی چپکے سے باپ کے پیچھے نکل گیا۔ اس کی ماں کو جب پتا چلا تو وہ دور نکل گیا تھا۔ وہ بیٹے کی محبت میں اس کے پیچھے دوڑ پڑی۔ جب وہ باپ کے پاس پہنچا تو بھیڑیوں نے الیکس کو گھیر لیا اور اسے بچانے کے لیے باپ اپنی کمین گاہ سے نکل آیا۔ وہ اپنی رائفل سے بھیڑیوں پر گولیاں برسا رہا تھا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ اس کی ہر گولی سے کوئی نہ کوئی بھیڑیا مر رہا تھا لیکن اس کے پاس گولیاں کم تھیں اور بھیڑیے بہت زیادہ تعداد میں تھے۔ پھر بھی اس نے بیٹے کو بچا کر ایک درخت پر چڑھا دیا لیکن خود بھیڑیوں کے نرغے میں آ گیا۔ الیکس کی نظروں کے سامنے بھیڑیوں نے اس کے باپ کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ یہ منظر الیکس کی ماں نے بھی دیکھا اور ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ جب بھیڑیے چلے گئے تو الیکس کسی طرح بے ہوش ماں کو واپس گھر تک لے آیا۔ جب اسے ہوش آیا، تب بھی وہ ہوش میں نہیں تھی۔

الیکس کو اس کا ایک دور کا رشتے دار مرفی نارٹن ساتھ لے گیا اور اس نے الیکس کی ماں کو کسی دماغی امراض کے ادارے میں بھیج دیا۔ مرفی ٹورنٹو میں ایک شان دار مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ الیکس کو وہ پُراسرار سا شخص لگا۔ وہ کسی سے ملتا جلتا نہیں تھا اور نہ ہی اسے کسی سے ملنے دیتا تھا۔ الیکس کے لیے حکم تھا کہ وہ اسکول سے سیدھا گھر آئے اور کسی کو دوست نہیں بنائے گا۔ اس نے الیکس کو کبھی نہیں بتایا کہ اس کی ماں کہاں ہے۔ جب الیکس اس سے پوچھتا تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا۔ ایک بار اس نے الیکس کو مارا بھی تھا۔

لیکن ان باتوں سے ہٹ کر وہ الیکس کے لیے اچھا شخص ثابت ہوا۔ اس نے الیکس کو ہر ممکن سہولت اور آسائش مہیا کی۔ اس کے پاس بہترین لباس ہوتے تھے اور جس سال اس نے ہائی اسکول پاس کیا، مرفی نے اسے پارلے ڈیوڈسن بائیک تحفے میں دی۔ مرفی کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی لیکن اس کا ذریعۂ معاش کیا تھا؟ الیکس کو علم نہیں تھا۔ وہ اکثر گھر میں ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی کئی کئی دن کے لیے چلا بھی جاتا تھا۔ ایک روز وہ اسی طرح گیا۔ اس نے الیکس سے کہا کہ وہ چند دن میں لوٹ آئے گا۔

..... مگر مرفی اس کے بعد کبھی نہیں لوٹا۔ ان دنوں الیکس کالج میں تھا۔ جب مرفی ایک ہفتے تک نہیں آیا تو اس نے پولیس کو رپورٹ کی اور پولیس نے چھان بین کی لیکن وہ بھی پتا نہیں چلا سکی کہ مرفی کہاں گیا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ الیکس پریشان ہو گیا کیونکہ اس کا سارا خرچ مرفی

www.kahopakistan.com

اٹھاتا تھا۔ اب مرفی نہیں تھا۔ ایک دن الیکس نے اس کے بیڈروم کی تلاشی لی۔ وہاں سے اسے ایک ڈائری ملی .... اس کے ایک صفحے پر الیکس کے لیے ہدایات موجود تھیں۔

''الیکس! اگر میں کہیں جاؤں اور مقررہ وقت پر واپس نہ آؤں تو بیڈروم میں لگی گھوڑوں والی تصویر کے پیچھے سیف کھولنا اس میں تمہارے لیے سب ہوگا۔ سیف کا نمبر چالیس اٹھارہ ستائیس بادون ہے۔ یاد رکھنا، اگر کبھی اتفاق سے اس ڈائری کو دیکھ لو اور میں کہیں باہر ہوں تو ہرگز سیف مت کھولنا ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گا۔''

الیکس ان الفاظ کو پڑھ کر کانپ گیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مرفی ایسا ہی شخص ہے، وہ سچ مچ اسے قتل کردے گا۔ لیکن اب وہ اس کی ہدایات پر عمل کرسکتا تھا۔ اس نے تصویر کے پیچھے موجود سیف کھولا۔ وہ حیران رہ گیا۔ اس میں بے شمار دولت تھی۔ امریکن اور کینیڈین ڈالرز کی صورت میں یہ کوئی ایک ملین ڈالرز کی رقم تھی۔ الیکس کو کبھی نہیں معلوم ہوا تھا کہ مرفی نے گھر میں اتنی دولت جمع کررکھی ہے۔ اس کے پاس یہ دولت کہاں سے آئی؟ اس سوال کا جواب اس چھوٹی سی ڈائری میں تھا جو سیف میں رکھی تھی۔ اس ڈائری کو پڑھتے ہوئے الیکس کو سخت سردی میں بھی پسینا آگیا اور اس کا جسم لرز اٹھا۔ اب اسے معلوم ہوگیا کہ انکل مرفی نے اتنی دولت کہاں سے حاصل کی تھی۔ اس نے الیکس کو سب تفصیل سے بتایا تھا۔ لیکن پیسے اور لرزنے کا سبب یہ تفصیل نہیں تھی بلکہ مرفی کا وہ حکم تھا جو اس نے اسے ڈائری کے آخر میں دیا تھا۔ اس نے الیکس سے کہا تھا کہ اب تک وہ جو کام کرتا آیا تھا، اب وہ الیکس کرے گا۔ اس نے سارا طریقہ کار بھی واضح کیا تھا کہ اس سے کام لینے والے کس طرح اس سے رابطہ کریں گے اور وہ کس طرح سامنے آئے بغیر ان سے معاملات طے کرے گا۔ آخر میں وہ دہشت زدہ ہوگیا اور اس نے ڈائری پھینک دی۔

''نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

اس نے ڈائری سیف میں رکھ کر اسے بند کردیا اور خود بھولنے کی کوشش کرنے لگا کہ اس نے کیا پڑھا تھا۔ کالج میں اس کا آخری سال تھا۔ چھ مہینے بعد اس کا آخری امتحان تھا۔ اس دوران میں وہ سیف میں رکھی ڈائری اور اس کے مندرجات کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا۔ وہ خود سے لڑ رہا تھا اور رفتہ رفتہ اندر سے ہارتا جارہا تھا۔ جس دن وہ آخری پرچہ دے کر آیا، اس نے پھر سیف کھولا اور ڈائری نکالی۔ اس نے ایک بار اسے پھر سے پڑھا۔ اس کے خیال میں ڈائری ختم ہوگئی مگر اس نے ایسے ہی اس سے آگے ورق الٹے تو اسے انکل مرفی کے ہاتھ کی ایک اور تحریر مل گئی۔

''الیکس ..... جب تم گریجویشن کرلو گے، تب میں تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں بتاؤں گا۔ اسے میں نے امریکا میں ایک بہترین دماغی امراض کے ادارے میں داخل کرادیا ہے۔ ابھی میں نے تمہیں اس کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی تعلیم مکمل کرلو اور عملی زندگی میں آجاؤ۔ اس کے بعد میں تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں بتاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے تمہیں صبر کرنا ہوگا اور اگر میں کبھی غائب ہو جاؤں یا مر جاؤں تو تم ٹورنٹو میڈیکل یونیورسٹی میں دماغی امراض کی ماہر ڈاکٹر کیتھرین فیتھ سے رابطہ کرنا۔''

اگرچہ الیکس، انکل مرفی کے خوف سے خاموش رہتا تھا لیکن اس کے ذہن سے ماں کا خیال کبھی نہیں نکلا تھا اور وہ صبر سے اس وقت کا انتظار کررہا تھا جب وہ تعلیم مکمل کرکے... خودمختار ہوجاتا اور اس وقت اپنی ماں کو اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ جب مرفی غائب ہوا تو اسے سب سے پہلے یہی خیال آیا کہ اب وہ کبھی اپنی ماں سے نہیں مل سکے گا کیونکہ مرفی نے بارہا اسے بتایا کہ اس کی ماں کے بارے میں صرف وہی جانتا ہے۔ اس لیے الیکس اب مایوس تھا لیکن مرفی کی ڈائری سے اسے راستہ مل گیا تھا۔ وہ اگلے ہی دن ٹورنٹو میڈیکل یونیورسٹی پہنچ گیا۔ اس نے ایڈمن آفس کے کلرک سے ڈاکٹر کیتھرین فیتھ کے بارے میں پوچھا۔

''مجھے افسوس ہے، کیا تم ان کے کوئی عزیز ہو؟''

''نہیں۔'' الیکس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

''انہیں کیا ہوا ہے؟''

''دو دن پہلے ہارٹ اٹیک میں وہ انتقال کرگئیں۔''

الیکس سن سا رہ گیا۔ اس کی ماں تک پہنچنے کا واحد راستہ بھی بند ہوگیا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔ اسے لگا کہ اس کی ماں ہمیشہ کے لیے اس سے کھو گئی ہے۔ اسے انکل مرفی پر شدید غصہ آیا۔ چند دن بعد جب پولیس کی طرف سے مرفی نارٹن کو باضابطہ طور پر گم شدہ قرار دے دیا گیا تو مرفی کے وکیل نے الیکس سے رابطہ کرکے اسے بتایا کہ اس نے اپنی تمام دولت اور جائداد کا وارث الیکس نارٹن کو قرار دیا تھا۔ الیکس ماں کے لیے اتنا دکھی تھا کہ اسے اس خبر سے کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ اسے لگا جیسے اس کے شانے پر ذمے داری کا بوجھ آگیا ہو۔ اگلے ہی دن وہ مقامی ڈاک خانے گیا اور وہاں اس نے وصیت نامہ دکھا کر انکل مرفی کے لیے مخصوص پوسٹ بکس نمبر کی ڈاک طلب کی۔ اسے ڈاک دے دی گئی۔ وہ اسے لے کر گھر آیا اور انہیں چیک کیا۔ باقی ڈاک عام تھی لیکن اس میں ایک خاص لفافہ بھی تھا۔ اس میں پچاس ہزار کینیڈین ڈالرز، ایک تصویر اور اس کے ساتھ کچھ معلومات تھیں۔ پورے ایک دن اور رات وہ اس بارے میں سوچتا رہا پھر اسے لگا کہ اسے یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ جب وہ انکل مرفی کی دولت اور جائداد کا وارث بن گیا تھا تو اسے ان کے کام کی ذمے داری بھی قبول کرنا تھی۔

☆☆☆

''الیکس نارٹن۔'' دوسری طرف سے پھر کہا گیا۔

''میں پہنچ گیا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''یہ طریقہ کار میرا پسندیدہ نہیں ہے۔''

''اس کے باوجود تم یہاں آئے ہو۔'' بولنے والے آدمی کا لہجہ سرد ہوگیا۔ الیکس نے اس کی آواز سے اندازہ لگایا کہ وہ جوان آدمی ہے اور ممکنہ طور پر جرمن نسل سے ہے کیونکہ اس کی زبان میں جرمن جھلک موجود تھی۔ ''کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہیں یہاں آنا تھا۔ مسٹر الیکس نارٹن! تم یہاں آنے کے لیے مجبور تھے۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ الیکس جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''اگر میں نہ آتا تو؟''

''مسٹر نارٹن! خود کو تباہ کرنا کوئی پسند نہیں کرتا۔ کیا تم کرتے ہو؟'' اس کے لہجے میں چیلنج آگیا۔ الیکس کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

''نہیں۔''

''گڈ..... تم سمجھ دار آدمی ہو۔ مجھے شروع سے یقین رہا ہے کہ تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔''

''لیکن میں نے کبھی اس طرح کام نہیں کیا۔'' اس کے لہجے میں احتجاج آگیا۔

''لیکن اس بار تمہیں کرنا ہوگا۔ میں بلیک میلر نہیں ہوں بلکہ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جو کسی کو بلیک میل کرتے ہیں۔ ورنہ میں چاہتا تو تمہیں کچھ بھی نہیں ملتا اور تمہیں میرا کام بھی کرنا پڑتا۔''

الیکس جانتا تھا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ اس کے باوجود اس نے اسے اس کا پیشگی معاوضہ بھیجا تھا اور جانے کے لیے ٹکٹ بھی دیا تھا اگرچہ وہ آیا بائی روڈ تھا۔ ''تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ میں بائی روڈ آیا ہوں؟''

''میں جانتا ہوں، تم پوری طرح میری نظر میں ہو۔''

''اس طرح نظر رکھنے کی وجہ؟'' الیکس نے غیر محسوس انداز میں آس پاس دیکھنا شروع کردیا۔ یہاں زیادہ تر چھ سات منزلہ پرانی عمارتیں تھیں۔ اس سے بات کرنے والا کہیں بھی ہوسکتا تھا۔ کسی کمرے کی کھڑکی کے پیچھے بھی اور کسی آفس میں بھی۔ وہ کسی پارکنگ میں کھڑی کار میں بھی ہوسکتا تھا۔

''اس کی ایک ہی وجہ ہے .... میں تم سے اپنی مرضی سے کام لینا چاہتا ہوں۔''

الیکس نے کچھ دیر سوچا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں لیکن تمہارا اور میرا یہ رابطہ بس اسی حد تک رہے گا۔ اگر تم میرے بارے میں جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہوگے کہ میں ایک شخص کے لیے دوبارہ کام نہیں کرتا۔''

''مجھے منظور ہے۔ میں خود بھی اس کام کے بعد تم سے رابطہ رکھنا پسند نہیں کروں گا۔ اس کام کا تمہیں معاوضہ تو پورا ملے گا لیکن ساتھ ہی تمہیں ایک بونس بھی ملے گا۔''

''کیا بونس؟''

''میں تمہیں تمہاری ماں کا پتا بتاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

''تم جانتے ہو؟'' الیکس بے ساختہ بولا۔

''کل اسی جگہ ..... اسی وقت۔'' اس آدمی نے کہا اور کال منقطع کردی۔

''ہیلو .... ہیلو!'' الیکس زور سے بولا تو آس پاس بیٹھے لوگوں نے اسے ذرا عجیب نظروں سے دیکھا۔ الیکس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ معذرت خواہ مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے اٹھا۔ ایک نوٹ میز پر رکھا اور تیز قدموں سے چل پڑا۔ اس آدمی کے آخری الفاظ رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس نے اپنی ماں کو تلاش کرنے کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ انکل مرفی نے امریکا کا بتایا تھا اور گزشتہ بیس سال میں اس نے امریکا کا دماغی امراض کا کوئی ادارہ نہیں چھوڑا تھا جہاں اپنی ماں کی تلاش میں نہ گیا ہو۔ اس مقصد کے لیے اس نے امریکا میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ پھر امریکا سے مایوس ہو کر اس نے کینیڈا میں بھی ماں کو تلاش کیا مگر وہاں بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب تو وہ مایوس ہو چلا تھا۔ اس کے خیال میں اس کی ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اس کا انتقال ہو چکا تھا اور اسے لاوارث کی حیثیت سے کسی قبر میں دفنا دیا گیا تھا۔

اس کی ماں مر چکی تھی۔ یہ خیال اگرچہ اس کے لیے

www.kahopakistan.com

بہت اذیت ناک تھا لیکن اس کا حقیقت پسند ذہن کہہ رہا تھا کہ یہی ہوا ہے۔ اس کے باوجود اس نے ماں کی تلاش بند نہیں کی۔ امریکا اور کینیڈا دونوں جگہوں پر اس نے دو جاسوس ایجنسیوں کو ہائر کیا ہوا تھا اور وہ بھاری معاوضے کے عوض مستقل اس کے لیے کام کرتی تھیں۔ ماں کی تلاش تو ایک مستقل کام تھا، اس کے علاوہ بھی وہ اپنے کام کے سلسلے میں بھی ان سے مدد لیتا تھا۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے وہ اب بھی مایوس ہونے کو تیار نہیں تھا۔

اب یہ شخص کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی ماں کے بارے میں جانتا ہے اور جب وہ اس کا کام کردے گا تو وہ اسے باقی معاوضے کے ساتھ اس کی ماں کا پتا بھی بتا دے گا۔ یہ کیس اس کے لیے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ اس شخص کے بارے میں تشویش کا شکار تھا۔ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ اس کا ذاتی فون نمبر..... یہ کہ وہ کیا کام کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ اس کی ماں کے بارے میں جانتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ سچ مچ اسے تباہ کر سکتا تھا۔

الیکس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ جب اس آدمی کو اس سے کام ہی لینا تھا اور معاوضہ بھی دینا تھا تو اسے یہ طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ سیدھی طرح بھی اس سے کام کرنے کو کہہ سکتا تھا۔ کیا اسے خدشہ تھا کہ وہ اس کا کام کرنے سے انکار کر دے گا؟ حالانکہ الیکس نے کبھی کسی گاہک کو انکار نہیں کیا تھا۔ اس کے نزدیک صرف اس کے پیشے کی اہمیت تھی اور باقی ہر چیز غیر ضروری تھی۔ وہ آدمی صرف اس کی ماں کے بارے میں بتانے پر آمادہ ہو جاتا تو الیکس اس کے لیے دس بار کام کرنے پر تیار تھا۔ حالانکہ اس کا اصول تھا، وہ ایک بار جس شخص کے لیے ایک کام لیتا تھا، اس کے لیے کسی صورت دوسری بار کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ چاہے وہ کتنا ہی معاوضہ دینے کے لیے تیار ہو جائے اور ایسا کئی بار ہوا بھی تھا۔ الیکس کا انکار اقرار میں نہیں بدلا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی یہ منطق تھی کہ ایک بار کام کام ہوتا ہے لیکن دوسری بار وہ نوکری بن جاتا ہے اور وہ کسی صورت کسی کی نوکری نہیں کر سکتا تھا۔

اس آدمی نے دونوں بار اسے موبائل فون سے کال کی تھی اور نمبر ایک ہی تھا، یعنی یہ موبائل اسی کے پاس ہوتا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا یہ اس شخص کا اپنا موبائل تھا اور اس کے نام پر تھا یا اس نے کسی طریقے سے کہیں سے حاصل کیا تھا؟ الیکس اس کی تصدیق کر سکتا تھا۔ ہوٹل آنے کے بعد اس نے ہوٹل کے فون سے امریکا میں اپنے لیے کام کرنے والی جاسوس ایجنسی کے دفتر کال کی۔ اس ایجنسی کا سربراہ رابرٹ وان اسے میش کے نام سے جانتا تھا۔ کال رابرٹ نے ہی ریسیو کی۔

''میش بات کر رہا ہوں۔''

''سن رہا ہوں۔'' رابرٹ جانتا تھا کہ میش نامی اس شخص کو فالتو بات قطعی پسند نہیں ہے۔

''ایک نمبر بتا رہا ہوں، اسے نوٹ کرو اور مجھے شام تک بتاؤ کہ یہ کس کا نمبر ہے اور اس شخص کے بارے میں بھی معلوم کرو..... ممکنہ حد تک۔''

''میں سمجھ گیا۔'' رابرٹ نے مستعدی سے کہا۔

''میں شام کو کال کروں گا۔'' الیکس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ شکاگو اس کا پسندیدہ شہر تھا اور وہ جب یہاں آتا تو جھیل کی طرف ضرور جاتا تھا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ ملوا کی چھوڑ کر یہیں جھیل کے کنارے کوئی ولا لے کر اس میں رہائش اختیار کر لے۔ لیکن ملوا کی اس کے لیے کاروباری لحاظ سے اہم ہو گیا تھا۔ اس کے رابطے وہیں تھے۔ اگر وہ رہائش تبدیل کرتا تو اسے اپنے گاہکوں سے رابطے میں رہنے کے لیے نئے سرے سے سارے انتظامات کرنے پڑتے۔ لیکن وہ ہوٹل کے کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ ایک تو وہ اس معاملے پر غور کرنا چاہتا تھا، دوسرے اس کا کچھ سامان یہاں آنے والا تھا۔ ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جھیل کا ایک چکر لگا آئے۔ وہ لنچ کر کے واپس آیا تو نیچے سے ڈیسک کلرک نے کال کی۔

''سر! آپ کے لیے ایک پارسل آیا ہے۔''

''کمرے میں بھیج دو۔'' اس نے کہا۔ کچھ دیر میں ہوٹل کا ایک ملازم کوریئر والے کے ساتھ آیا۔ وہ اس کے لیے ایک بڑے بریف کیس کے سائز کا پارسل لایا تھا۔ پارسل لے کر اور سائن کر کے اس نے ان لوگوں کو رخصت کیا اور پارسل کھولا۔ اس میں واقعی ایک بریف کیس تھا۔ یہ دھاتی بریف کیس جدید قسم کے کمبی نیشن لاک سے کھلتا تھا۔ بریف کیس کی دھات اتنی مضبوط تھی کہ اسے توڑنا ناممکن تھا۔ اسے صرف گیس ویلڈنگ سے کاٹا جا سکتا تھا۔ اس میں اس کا مخصوص سامان تھا۔ جب وہ امریکا میں کہیں کام کے لیے نکلتا تھا تو یہ بریف کیس پارسل کی صورت میں پیک کر کے اسے کوریئر کمپنی کے سپرد کر دیتا تھا اور جہاں کے لیے اسے ضرورت ہوتی تھی، وہ کمپنی کو کال کر کے اپنا پارسل وہاں منگوا لیتا تھا۔ صبح کینیڈا کے لیے نکلنے سے پہلے اس نے کمپنی کو فون کر کے پارسل یہاں بھیجنے کو کہہ دیا تھا۔ اس نے بریف کیس کھول کر اپنا سامان دیکھا اور اسے صاف کر کے دوبارہ بریف کیس میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔

شام سات بجے اس نے رابرٹ کو کال کی اور رپورٹ طلب کی۔ اس نے کہا۔ ''یہ سیل نمبر کسی کارل مائلز کے نام پر ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ اس نے جس ڈرائیونگ لائسنس نمبر پر یہ سیل نمبر لیا ہے، وہ جعلی ہے کیونکہ یہی نمبر ایک اور شخص کا ہے اور وہ ٹیکساس کا رہنے والا ہے۔ اس نے نیویارک کا جو پتا دیا ہے، وہ بھی جعلی ہے کیونکہ وہاں پر ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر برسوں سے رہ رہی ہے۔ یہ ہر مہینے اسی موبائل پر بل ایس ایم ایس کی صورت میں وصول کر کے کسی بھی فرنچائز پر نقد جمع کرا دیتا ہے۔ اس کام کے لیے وہ کوئی کریڈٹ کارڈ یا ڈیبٹ کارڈ استعمال نہیں کرتا۔''

''دوسرے لفظوں میں تم کہہ رہے ہو کہ اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کر سکے۔'' الیکس نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''لیکن اگر مجھے کچھ وقت مل جائے تو میں یقینی طور پر اس کے بارے میں معلوم کر سکوں گا۔''

''کتنا وقت؟''

''ایک ہفتہ۔''

''ٹھیک ہے، میں تم سے ایک ہفتے بعد رابطہ کروں گا۔'' الیکس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اگلے روز اس نے ناشتے کے بعد ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا اور بریف کیس سمیت کینے الپائن کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دس بجے وہاں پہنچا اور اس نے اسی میز کا انتخاب کیا۔ اس نے پائن ایپل جوس کا آرڈر کیا اور جوس آنے پر اس کے گھونٹ لینے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر سامنے میز پر رکھ لیا تھا۔ جیسے ہی موبائل کی اسکرین آن ہوئی، اس نے جھپٹ کر کال ریسیو کی۔ اس پر وہی نمبر آ رہا تھا۔

''ہیلو۔'' اس نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے تم بے چینی سے انتظار کر رہے تھے؟'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یہ درست ہے، تم نے کل بات ہی ایسی کی تھی۔'' الیکس بولا۔ اس کی نظریں ایک بار پھر آس پاس بھٹک رہی تھیں۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ یہ شخص جہاں بھی چھپا ہے، وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

''تم نے اس نمبر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش تو کی ہو گی؟'' کارل نے اچانک کہا تو الیکس دنگ رہ گیا۔ ''لیکن افسوس تمہیں سوائے اس کے اور کچھ نہیں پتا چلا ہو گا کہ یہ نمبر کسی کارل مائلز کا ہے۔ اس کا ڈرائیونگ لائسنس اور پتا دونوں غلط ہیں۔''

''میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' الیکس نے بہ مشکل کہا۔

''اگر تم نے کی ہے، تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''تم شوق سے مجھے تلاش کرنے کی کوشش کر سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے، اب تم نے اجازت دے دی ہے تو میں تلاش کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔''

''گڈ..... اب کام کی طرف آتے ہیں۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ تم اپنی کار میں آئے ہو۔ تم اسی وقت ایکرون کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ یہ ریاست اوہائیو میں ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ جب تم ایکرون پہنچو گے تو میں تم سے رابطہ کروں گا۔ یہ سفر مشکل سے چار گھنٹے کا ہے۔ اس وقت ساڑھے دس بج رہے ہیں، میں تم سے ڈھائی بجے رابطہ کروں گا۔''

''کام کب کرنا ہے؟''

''آج ہی..... بس اب تم روانہ ہو جاؤ۔''

الیکس فوراً ہی روانہ ہو گیا۔ موٹروے کے ذریعے یہ راستہ مشکل سے پونے چار گھنٹے کا تھا۔ وہ ڈھائی بجے سے پہلے ایکرون میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا لیکن خوب صورت شہر ہے۔ سوائے چند مقامات کو چھوڑ کر کہیں بھی ہائی رائز بلڈنگز نہیں ہیں۔ زیادہ تر ایک یا دو منزلہ مکانات ہیں۔ آبادی کم ہے لیکن صنعتی اور تجارتی مرکز ہونے کے ساتھ علاقے کا مرکزی ائرپورٹ بھی یہیں ہے۔ اس لیے شہر میں بعض جگہوں پر نیویارک اور شکاگو جیسی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ الیکس ایک بار پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ ڈھائی بجے اس نے کار ایک ریستوران کے سامنے روکی۔ لنچ کا وقت تقریباً ختم ہونے والا تھا۔ اس نے عجلت میں ویٹر کو آرڈر دیا کیونکہ موبائل پر کال آ رہی تھی۔ اس نے ویٹر کے جانے کے بعد کال ریسیو کی۔

''میرا خیال ہے تم پہنچ گئے ہو؟''

''تم تنگرائی نہیں کر رہے؟'' اس نے سادہ انداز میں طنز کیا۔

''اس وقت نہیں۔''

''اس اعتماد کی وجہ؟''

www.kahopakistan.com

"کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔"

"اب مجھے کیا کرنا ہے؟"

"چھ بجے تم شمال مغرب کی طرف جانے والی بائی وے پر نکلو گے۔ اس کے ستائیسویں سنگ میل کے فوراً بعد ایک سڑک دائیں طرف نکل رہی ہے، تم وہاں پہنچ کر میرا انتظار کرو گے۔ تمہارے پاس ایک ہینڈ فری ہونا چاہیے اور اپنے سوا بائل کی بیٹری مکمل چارج کر لینا۔ ممکن ہے تمہیں ایک دو گھنٹے مسلسل مجھ سے رابطے میں رہنا پڑے۔ کوئی سوال؟"

"صرف ایک سوال ہے کہ تم مجھ سے اس طرح کام کیوں لے رہے ہو جبکہ تم براہ راست بھی کام لے سکتے تھے؟ تم مجھے پوری ادائیگی کر رہے ہو۔"

"میں نے کہا ہے نا کہ مجھے بلیک میل کرنے سے نفرت ہے۔ اس لیے میں تمہیں پورا معاوضہ دے رہا ہوں۔"

"اگر تم مجھے صرف میری ماں کا پتا بتانے کا وعدہ کر لیتے، تب بھی میں یہ کام کرتا اور یہ بلیک میلنگ نہیں ہوتی۔"

"میرا اپنا طریقہ کار ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "یاد رکھنا..... ٹھیک چھ بجے تمہیں وہاں ہونا چاہیے۔"

"میں اب تک تمہاری ہدایات کے مطابق ہی چل رہا ہوں۔"

"اس دوران میں اپنی کار کی سروس کرا لینا تاکہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔" اس نے کہا اور کال منقطع کر دی۔ موبائل رکھ کر الیکس کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ کھانا کھاتے ہی وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس نے کار کی سروس کرائی۔ اس دوران میں نزدیکی بار سے دو جام لیے لیکن اس نے تیز شراب سے گریز کیا تھا۔ کام کے دوران وہ پوری طرح چاق و چوبند رہنا پسند کرتا تھا۔ پانچ بجے وہ روانہ ہو گیا اور ٹھیک چھ بجے ستائیسویں سنگ میل کے بعد دائیں طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا..... اس نے کار سڑک کے کنارے روک لی۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور یہاں دور تک اونچی نیچی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں جن پر طویل قامت درخت موجود تھے۔ اس خوب صورت علاقے میں امرا نے شان دار مکانات بنا رکھے تھے۔ اس سڑک پر ٹریفک بہت کم تھا، یعنی یہ عام گزرگاہ نہیں تھی۔ اسے یہاں پہنچے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"موبائل فون پوری طرح چارج ہے؟"

"ہاں، تم اس کی فکر مت کرو۔ یہ سارے راستے چارجنگ پر لگا رہا ہے۔"

"گڈ..... اب تم اسے ہینڈ فری پر منتقل کرو اور آگے روانہ ہو جاؤ۔"

الیکس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے پاس جدید بلیوٹوتھ ہینڈ فری تھا۔ "تم نے کہا ہے کہ کام آج ہی کرنا ہے؟"

"درست ہے..... یہ کام ہر صورت میں آج ہی ہونا ہے ورنہ شاید کبھی نہیں ہوگا۔"

"مجھے ابھی تک اس شخص کے بارے میں بھی نہیں معلوم۔"

"میں تمہیں اسی کے پاس لے جا رہا ہوں۔ اس سڑک کے دائیں طرف دیکھتے رہنا، کچھ دیر بعد تمہیں ایک نیلا بورڈ نظر آئے گا۔ اس پر کارنیلا کنٹری سائڈ لکھا ہوگا۔ اس بورڈ کے فوراً بعد آنے والی سڑک پر دائیں طرف مڑنا ہے۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔" الیکس نے نظریں دائیں طرف رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد اسے مطلوبہ بورڈ نظر آ گیا۔ اس نے کار اس سے آگے آنے والی سڑک پر موڑ دی اور بولا۔ "میں مڑ گیا ہوں۔"

"اسی سڑک پر سیدھے آؤ۔"

وہ ڈرائیو کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد ہینڈ فری میں آواز آئی۔ "بائیں طرف دیکھتے رہو، تمہیں ایک جھاڑی کے ساتھ سرخ رنگ کا ربن نظر آئے گا۔"

الیکس نے دیکھا اور فوراً ہی اسے ربن نظر آ گیا۔ وہ شاید اس کے اندازے سے تیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے کار روک دی۔ "نظر آ گیا ہے۔"

"رک جاؤ۔"

"رک گیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، اپنے سامان سمیت کار سے نکلو اور اس جھاڑی کے ساتھ پہاڑی پر اوپر جاؤ۔"

اس نے کچھ دیر سوچا اور کار سے اترنے کے بجائے بولا۔ "سنو..... اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو تم کیا کرو گے؟"

"میں ایف بی آئی کو تمہارے دو بینک اکاؤنٹس سے آگاہ کر دوں گا جو تم نے الگ الگ ناموں سے کھول رکھے ہیں..... اور تم جانتے ہو، یہ کتنا سنگین جرم ہے۔ اس کے بعد جب تم گرفتار ہو گے اور تفتیش کا آغاز کیا جائے گا تو تمہارے اصلی جرائم کی تفصیل بھی ایف بی آئی کو فراہم کی جائے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو لیکن اگر تمہارے خیال میں میری بات صرف دھمکی ہے تو تم واپس جا

سکتے ہو۔"

الیکس کو پسینا آ گیا۔ اس نے مُردہ لہجے میں کہا۔ "میں واپس نہیں جا رہا۔"

"اب تم کار سے اترو اور وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔"

اس کا لہجہ خطرناک ہو گیا۔ "یاد رکھنا..... اگر آج یہ کام نہیں ہوا تو میں وہی کروں گا جو ابھی تمہیں کہہ چکا ہوں۔"

اس بار الیکس تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے بریف کیس لیا اور نیچے اتر آیا۔ یہ پہاڑی زیادہ اونچی نہیں تھی اور اس کی چوٹی تک پہنچنا اس کے لیے دشوار ثابت نہیں ہوا۔ وہ پانچ منٹ بعد چوٹی پر تھا۔ یہاں سورج کی روشنی اب بھی تیز تھی اور وہ اس کے عقب میں غروب ہونے جا رہا تھا۔ اس نے مطلع کیا۔ "میں چوٹی پر پہنچ گیا ہوں۔"

"سامنے دیکھو..... تمہیں نیلے رنگ کی بڑی عمارت نظر آ رہی ہے؟"

یہ اس جگہ واحد عمارت تھی اور اس کی ساخت کسی گھر سے زیادہ کسی دفتر یا اسپتال جیسی تھی لیکن یہ اسپتال نہیں تھا۔

"ہاں، دیکھ رہا ہوں۔"

"اب تم اپنا سامان تیار کرو..... تمہیں دوربین کی ضرورت بھی پڑے گی۔"

الیکس گھٹنے کے بل جھکا۔ اس نے بریف کیس زمین پر رکھ کر اس کا کمبی نیشن لاک ملایا اور اسے کھول دیا۔ اندر ایک دوربار رائفل ٹکڑوں کی صورت میں موجود تھی۔ اس نے رائفل کے ٹکڑے نکال کر انہیں جوڑنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ مشاقی سے یہ کام کر رہے تھے۔ رائفل جوڑ کر اس نے اس پر دوربین فٹ کی اور سب سے آخر میں اس کی نال پر سائلنسر فٹ کیا۔ اس نے دوربین کو ایڈجسٹ کیا۔ عمارت اس جگہ سے کوئی ڈھائی سو گز کے فاصلے پر تھی جبکہ اس رائفل کی مار پانچ سو گز سے زیادہ تھی۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے اپنا کام کر لیا ہے۔" ہینڈ فری کے اسپیکر سے آواز آئی۔

"ہاں، کر لیا ہے۔"

"گڈ..... تم اپنے کام میں ماہر ہو اسی لیے میں نے تمہیں ہائر کیا ہے۔"

"لیکن اس انداز میں؟" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تم کہہ چکے ہو کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر میں تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کروں تو؟" الیکس کا انداز دھمکی آمیز ہو گیا۔

"ضرور۔" اس نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں اجازت دے چکا ہوں اس لیے مجھے یاد دلانے کی کوشش مت کرو۔ اب تم اپنے کام کی طرف توجہ دو۔"

اس نے رائفل شانے سے لگا لی اور دوربین سے عمارت کی طرف دیکھا۔ "میں متوجہ ہوں۔"

"تیسری منزل پر دائیں طرف سے چھٹی کھڑکی دیکھو۔ کھڑکی کھلی ہے اور سامنے دیوار کا ہلکا نارنجی رنگ جھلک رہا ہوگا۔"

اس نے دوربین تیسری منزل پر فوکس کی اور دائیں طرف سے کھڑکیاں گنتا ہوا چھٹی کھڑکی تک آیا۔ اس میں دیوار کا نارنجی رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ دیوار پر ایک چھوٹا ٹی وی لگا تھا اور ایک معمر شخص کرسی پر جھولتا ہوا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس کے باریک بال بالکل سفید تھے۔ چیک دار گاؤن کی آستین سے جھانکتے اس کے ہاتھوں پر ابھری نسیں نمایاں تھیں۔ وہ بہت بوڑھا آدمی تھا۔

"تم نے اس بوڑھے کو دیکھ لیا ہوگا؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں، دیکھ لیا ہے۔" الیکس سرگوشی میں بولا۔

"یہی تمہارا شکار ہے۔"

الیکس نے بے یقینی سے کہا۔ "یہ بوڑھا..... جو چند سالوں میں مرنے والا ہے؟"

"الیکس..... تم اعتراض نہیں کر سکتے۔ تم ایک پیشہ ور قاتل ہو اور تم نے کبھی نہیں دیکھا کہ تم سے کام لینے والے کے قتل کروا رہے ہیں۔ تم نے جن لوگوں کو مارا ہے، ان میں بوڑھے اور بچے بھی شامل ہیں۔ ایک سال پہلے تم نے ایک ایسی بوڑھی عورت کو قتل کیا ہے جو کینسر کے ہاتھوں مرنے والی تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

الیکس دہل کر رہ گیا۔ اب اس کا رہا سہا شک بھی جاتا رہا تھا۔ یہ شخص واقعی اس کے بارے میں سب جان گیا تھا۔

"یہ درست ہے۔"

"تب تمہیں اس شخص کو قتل کرنے میں کیا اعتراض ہے؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جس شخص نے مجھے اس بوڑھی عورت کا کنٹریکٹ دیا تھا، اس سے بھی میں نے یہی پوچھا تھا اور وہ بھی یہی سمجھا تھا کہ مجھے ایک بوڑھی عورت کو قتل کرنے پر اعتراض ہے۔"

"حالانکہ تمہیں تو کبھی کسی کو قتل کرنے پر اعتراض نہیں ہوتا..... بشرطیکہ تمہیں اس کے لیے ادائیگی کی جائے۔ تم مکمل پیشہ ور ہو۔"

www.kahopakistan.com

"ہاں۔" اس کے لہجے میں فخر آ گیا۔ "میں پروفیشنل ہوں۔ میں نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ مجھے کس شخص کا کنٹریکٹ دیا جا رہا ہے۔ میں نے صرف اپنے معاوضے سے سروکار رکھا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ اگر تمہیں اپنی ماں کو قتل کرنے کا کنٹریکٹ دیا جائے تو تم اسے بھی قتل کر دو گے۔"

الیکس کو جھٹکا لگا۔ "کیا..... کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہا ہے کہ اگر تمہیں تمہاری ماں کو قتل کرنے کو کہا جائے تو تم معاوضے کے لیے اسے بھی قتل کر دو گے۔"

"بکواس..... میں اپنی ماں کو قتل نہیں کر سکتا۔" اس نے تند لہجے میں کہا۔

"تب تم پروفیشنل نہیں ہو۔"

الیکس برہم ہو گیا۔ "سنو، تم نے مجھ سے کام لینا ہے..... میں کون سا کام لیتا ہوں اور کون سا نہیں، تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔"

"فرض کرو کہ میں اس بوڑھے کی جگہ تمہاری ماں کو قتل کروانا چاہتا تو تم انکار کر دیتے؟"

"بالکل۔" اس نے جواب دیا۔ "میں کسی صورت اپنی ماں کو قتل نہیں کر سکتا۔"

"اس صورت میں بھی نہیں کہ میں تمہیں ایف بی آئی کے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"کسی قیمت پر نہیں..... میں اس دنیا میں کسی سے محبت کرتا ہوں تو وہ میری ماں ہے۔" اس کا خون کھولنے لگا۔

"تمہاری بات سن کر مجھے مایوسی ہو رہی ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تمہارے سینے میں دل ہی نہیں ہے، تبھی تم اتنی آسانی سے کسی بھی شخص کو قتل کر سکتے ہو، چاہے وہ کوئی عورت ہو یا بچہ۔"

"تم اپنی بکواس بند کرو۔" الیکس پھٹ پڑا۔ "تم نے مجھے یہاں کام کے لیے بلایا ہے، بحث کرنے کے لیے نہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں اس بوڑھے کو قتل کروں یا نہیں؟"

"اگرچہ اس بوڑھے سے مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی ہے لیکن اگر تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو تو کر دو۔"

"میں..... میں کیوں چاہوں گا؟ مجھے تم نے ہائر کیا ہے۔ معاوضہ دیا ہے اس لیے تم بتاؤ گے۔"

"اوکے! اگر میں کہوں کہ میں تمہاری ماں کو قتل کرانا چاہتا ہوں تو تم کر دو گے؟"

"تم کیا پاگل ہو؟" الیکس کو پسینا آنے لگا۔ "یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟"

"تم نے کہا ہے کہ تم میرے لیے کام کر رہے ہو اس لیے میرے کہنے سے کسی کو بھی قتل کر دو گے۔"

"ہاں کر دوں گا لیکن اپنی ماں کو نہیں۔"

"تب میری مرضی تو نہیں ہوئی۔"

"تم پاگل ہو یا مجھے پاگل کرنا چاہ رہے ہو۔" الیکس نے رائفل میں تین گولیوں کا مخصوص میگزین ڈالا۔ اس نے رائفل کا رخ ایک بار پھر عمارت کی تیسری منزل کی کھڑکی کی طرف کر دیا۔ بوڑھا بدستور کرسی پر جھول رہا تھا۔ الیکس نے اس کے سر کا نشانہ لیا۔ اتنے فاصلے سے اس کا نشانہ خطا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ "مجھے بتاؤ، اس بوڑھے کو مارنا ہے یا نہیں؟"

"کیا تم اسے مارنا چاہتے ہو؟"

الیکس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص سنجیدہ ہے یا اس کے ساتھ کسی قسم کا مذاق کر رہا ہے لیکن مذاق کرنے والے ایک لاکھ ڈالرز نہیں بھیجتے اور نہ ہی وہ اتنے لمبے چوڑے چکر چلاتے ہیں۔ اس نے تقریباً چلا کر کہا۔ "اسے میں نہیں تم مروانا چاہتے ہو۔"

"یعنی اگر میں کہوں تو تم اسے مار دو گے؟"

"کیا یہ بات میں لکھ کر دوں؟" الیکس نے زہریلے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے..... مار دو اسے۔"

الیکس اتنا اعصاب زدہ ہو گیا تھا کہ اس نے بلا تامل ٹریگر دبا دیا۔ رائفل سے ہلکی سی آواز آئی اور بوڑھے کا نصف سر اڑ گیا۔ اس کے خون کے چھینٹے اڑ کر سامنے دیوار اور ... تک گئے تھے۔ بوڑھے کی لاش گولی کے جھٹکے سے آگے گر ... اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن الیکس کو اطمینان تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ نصف سر اڑ جانے کے بعد اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی آواز نہیں آئی اور اگر کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا تو بوڑھے کی ہلاکت کا انکشاف بھی ... میں ہوتا۔ مگر اپنی عادت کی وجہ سے الیکس کام کرتے ہی پھرتی سے حرکت میں آیا۔ اس نے رائفل کھول کر اس کے ٹکڑے سلیقے سے بریف کیس میں واپس جمائے۔ اس سے پہلے وہ میگزین نکالنا نہیں بھولا تھا۔ یہ کام اس نے ایک منٹ میں کر لیا اور دوسرے منٹ میں وہ تیزی سے پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا۔ بوڑھے کو گولی مارنے کے چوتھے منٹ ... وہ کار اسٹارٹ کر کے اسے واپسی کے لیے گھما چکا تھا۔

کارل نے اس کی تعریف کی۔ "کام کر کے فر... ہونے کے معاملے میں تمہارا انداز منجھا ہوا ہے۔"

"شٹ اَپ۔" الیکس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنا کام کر دیا ہے، اب تم اپنا وعدہ پورا کرو۔"

"کون سا وعدہ؟" اس نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

اس کے انداز پر الیکس کو طیش آ گیا اور اسے خود پر قابو پانے میں خاصی دشواری محسوس ہوئی۔ "تم نے کہا تھا کہ مجھے میری ماں کے بارے میں بتاؤ گے۔"

"اوہ ہاں..... یہ بات تو میں بھول گیا تھا۔" وہ چہکا۔ "ویسے اگر میں نہ بتاؤں تو تم میرا کیا بگاڑ لو گے؟"

"میں تمہیں قتل کر دوں گا۔" الیکس نے دانت پیس کر کہا۔

وہ الیکس کے طیش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اگرچہ مجھے قتل کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے لیکن میں تمہیں اجازت دے چکا ہوں۔"

"مجھے میری ماں کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہے؟" الیکس غرایا۔ "ورنہ....."

"ورنہ تم مجھے قتل کر دو گے۔" وہ کچھ زیادہ ہی شوخ ہو رہا تھا۔

الیکس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کس طرح بات کرے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بے وقوف بن گیا ہے۔ اس نے کارل کا کام کر کے ایک اندھا قدم اٹھایا تھا جس کے نتائج سے وہ ابھی بے خبر تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "کارل یا تم جو بھی ہو، تم نے مجھ سے یہ کام کیوں لیا ہے جبکہ تمہاری اس بوڑھے سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی؟"

"تم نے درست کہا ہے، میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔" اس نے تسلیم کیا۔ "میری دشمنی تو تم سے ہے۔"

الیکس چونکا تو کار ایک لمحے کو لہرائی۔ "مگر کیوں؟"

اس نے رفتار کم کرنے کے لیے بریک پر دباؤ ڈالا تو اس پر انکشاف ہوا کہ بریک کام ہی نہیں کر رہے تھے۔ دہشت سے وہ سن رہ گیا۔ اس پہاڑی سڑک پر کار کی رفتار کوئی پچاس میل فی گھنٹا تھی اور ڈھلان پر ہونے کی وجہ سے اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے کانوں میں کارل کی آواز آئی۔

"تمہاری کار کے بریک ٹھیک ہیں؟"

"تمہیں کیسے.....؟" وہ کہتے کہتے رک گیا کیونکہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ "تو یہ تمہارا کام ہے؟"

"ہاں، یہ میرا کام ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

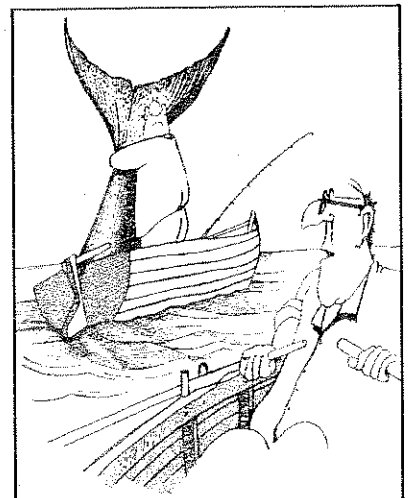

"مگر کیوں؟" اس نے ایک بار پھر پوچھا۔ وہ کار کو ممکنہ حد تک کنارے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سامنے سے کوئی گاڑی آ جاتی تو تصادم سے بچنا مشکل ہو جاتا۔ پھر سامنے سے گاڑی آ گئی اور اسے عجلت میں کار... بائیں طرف لانا پڑی۔ سامنے سے آنے والی کار تیزی سے اس کے برابر سے گزر گئی۔ وہ بال بال بچا۔ اس نے ایک بار پھر چلا کر کہا۔ "تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو جبکہ میں تمہیں جانتا بھی نہیں ہوں؟"

اپنے آپ سے بڑی مچھلی تو تم نے پکڑ لی
اب اس کا کیا کرو گے...؟

"تم نے ایک سال پہلے جس بوڑھی کینسر کی مریضہ کو ہلاک کیا تھا، وہ میری ماں تھی۔" کارل نے مختصر جواب دیا۔

"اوہ..... اس لیے۔" اس نے خود کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کار کی رفتار بتانے والی سوئی ساٹھ کے پاس پہنچ گئی تھی اور اس رفتار پر حادثہ جان لیوا ہو سکتا تھا۔ "ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا لیکن اس کے لیے یہ چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ جب تم میرے بارے میں جان چکے تھے تو تم براہِ راست بھی مجھ سے بدلہ لے سکتے تھے۔"

"تمہارے اعصاب قابلِ تعریف ہیں۔ تم اس حالت میں بھی سکون سے بات کر رہے ہو۔" کارل نے توصیفی لہجے میں کہا۔ "تم نے ٹھیک کہا کہ میں تمہیں خاموشی سے بھی ہلاک کر سکتا تھا لیکن میرے خیال میں تم اتنی آسان اور عام موت کے حق دار نہیں تھے۔"

www.kahopakistan.com

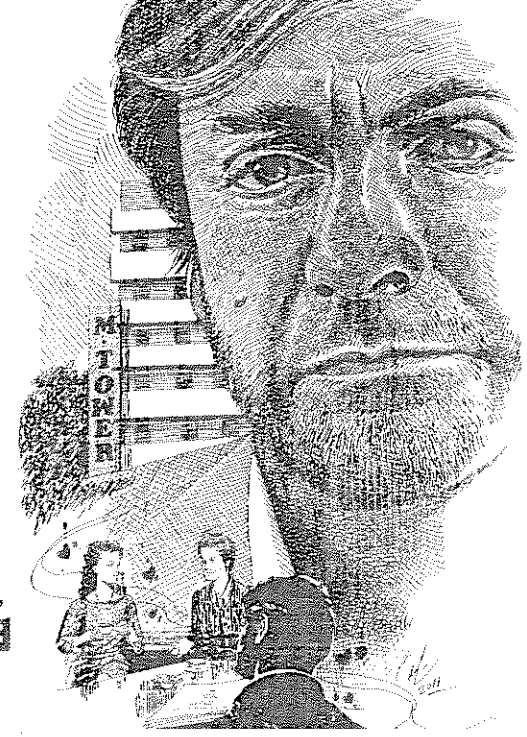

”اس بوڑھے کا کیا قصور ہے جسے تم نے میرے ہاتھ ہلاک کروایا ہے؟“

”اس کا کوئی قصور نہیں ہے اور وہ بوڑھا بھی نہیں ہے۔“

ایلکس کو جھٹکا لگا۔ ”کیا مطلب ...... وہ بوڑھا نہیں ہے؟ میں نے خود اسے گولی ماری ہے اور وہ......“

”وہ بوڑھا نہیں بلکہ بڑھیا تھی۔ ایک شعور اور احساس سے عاری بڑھیا جو ٹی وی اسکرین پر آنے والی تصویر کا مفہوم بھی نہ جانتی تھی اور نہ ہی آوازوں کو سمجھتی تھی۔ وہ کسی چھ سات مہینے کے بچے کی طرح انہیں دیکھ اور سن کر خوش ہوسکتی تھی۔ تم نے اس بڑھیا کو گولی ماری ہے۔“

رفتار کی سوئی ستر کے پاس پہنچ گئی تھی۔ کوئی تنگ موڑ یا سامنے سے آنے والی کوئی گاڑی اس کی زندگی کا خاتمہ ثابت ہوسکتی تھی لیکن کارل کی بات نے اسے ہر چیز سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اس نے پوچھا نہیں لیکن وہ جان گیا تھا کہ کارل نے اس کے ہاتھوں کسے ہلاک کرایا تھا۔ وہ اس کی ماں تھی۔ کارل نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تم سمجھ گئے ہوگے کہ وہ تمہاری ماں تھی۔ کسی احساس و شعور سے عاری عورت!“

”ذلیل شخص۔“ ایلکس نے نفرت سے کہا۔

”گڈ بائی اینڈ گڈ لک۔“ کارل ہنسا اور اس نے کال منقطع کر دی۔ اسی لمحے سامنے سے ایک درمیانی پک اپ نمودار ہوئی۔ بچنے کا موقع نہیں تھا۔ ایلکس نے کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اگلے ہی لمحے دھماکے نے کار سمیت اس کے پرخچے اڑا دیے۔ بظاہر بات ختم ہو گئی لیکن بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس حادثے کے دو دن بعد ایک پولیس کار نیو جرسی کے ایک قصبے میں واقع چرچ کے سامنے رکی۔ اس میں سے دو سادہ لباس پولیس والے اترے۔ ان کو دیکھ کر چرچ کا پادری باہر آگیا۔

”کیا حال ہیں میرے بچو؟“

”فادر مسٹر پیٹر شلز یہاں موجود ہے؟“ ایک آفیسر نے اپنا پولیس کارڈ سامنے کیا۔ وہ ہومی سائڈ سے تھا۔

”ہاں، وہ عقب میں قبرستان میں اپنی ماں مارتھا شلز کی قبر پر آیا ہے۔“ فادر نے جواب دیا۔ ”بے چاری ایک سال پہلے کسی نامعلوم شخص کی گولی کا نشانہ بن گئی جبکہ ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا تھا۔ وہ کینسر کی مریضہ تھی۔“

”ہم جانتے ہیں۔“ آفیسر نے سر ہلایا۔ ”اس کے قاتل کا بھی پتا چل گیا ہے۔“

”اوہ...... یہ تو مسٹر پیٹر کے لیے بہت بڑی خبر ہے۔ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اب بھی دوسرے تیسرے دن اس کی قبر پر آتا ہے۔“

”مارتھا شلز کی قبر کہاں ہے؟“

فادر ان کو عقب میں قبرستان تک لایا اور اس نے اشارے سے مارتھا کی قبر بتائی۔ پیٹر شلز اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے پولیس والوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سادہ لباس میں تھے لیکن پیٹر جان گیا کہ وہ پولیس والے ہیں۔ بات کرنے والا آفیسر آگے تھا۔ اس نے پیٹر کو بھی اپنا کارڈ دکھایا اور تعارف کرایا۔

”میں ہومی سائڈ کا جاسوس آفیسر کرافورڈ ہوں۔ یہ میرا ساتھی آفیسر میسن ہے۔“

”میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟“ پیٹر نے پوچھا۔

”دو دن پہلے ایکرون کے پاس ایک ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اس میں ایلکس نارٹن نامی شخص مارا گیا جبکہ دوسری گاڑی کا ڈرائیور شدید زخمی ہوا ہے۔“

”اس حادثے سے میرا کوئی تعلق ہے؟“ پیٹر نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”اس وقت نہیں تھا جب تک ہمیں حادثے کے مقام سے ایک سیل فون نہیں ملا تھا۔ اس سیل میں پولیس کو ایک طویل وائس ریکارڈنگ ملی ہے۔ اس ریکارڈنگ میں ایلکس نارٹن کسی کارل نامی شخص سے بات کر رہا ہے۔ جس نمبر سے کال آئی تھی، وہ بھی کسی کارل مائلز نامی شخص کے پاس تھا لیکن کارل مائلز نام کا شخص کوئی اور ہے اور اس کے پاس یہ نمبر نہیں ہے۔“

پیٹر کا چہرہ سفید ہوگیا۔ ”لیکن اس سے میرا تعلق اب بھی نہیں بنتا۔“

”تم نے ٹھیک کہا، سوائے تمہاری آواز کے اور کوئی تعلق نہیں بنتا لیکن اس گفتگو میں ایک ایسی کینسر کی مریضہ کا حوالہ موجود تھا جسے ایلکس نارٹن نے ہلاک کرنے کا انکشاف کیا ہے۔ اس سے ہمیں تلاش میں آسانی رہی۔“

پیٹر شلز کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، تم مجھے گرفتار کرنے آئے ہو؟“

”یہ ہمارا فرض ہے۔“ میسن نے اسے ہتھکڑی پہنادی اور وہ اسے لے کر پولیس کار کی طرف بڑھ گئے۔

فیصلے

آصف ملک

کامیابی کی جانب گامزن سفر میں ہر شخص کو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ...... لیکن ذی فہم اور عقل و شعور رکھنے والے ہر چیز پر گہری نظر رکھتے ہیں ...... اور اسی تناظر میں وہ ایسے فیصلے کرتے ہیں جو نہایت دیرپا ثابت ہوتے ہیں ... ایک سیدھی سادی گھریلو عورت کی معاملہ فہمی...

حقیقی دنیا سے تعلق رکھنے والے کرداروں کی انوکھی محبت کا فسانہ خاص

آنٹی میگی نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھا اور بولیں۔ ”جان تمہارے انکل انسانوں کو اہمیت دیتے تھے۔“

”حالانکہ وہ ایک بینکار تھے۔“ میں نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔

”تو کیا ہوا، بینکار بھی تو انسان ہوتے ہیں اور تمہارے انکل تو بہت اچھے انسان تھے۔“

انکل لائم کو اس دنیا سے گزرے دس برس ہونے کو آئے تھے لیکن آج بھی میں آنٹی میگی کے پاس جاتا ہوں تو وہ ان کا تذکرہ لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ٹھیک ہے انکل لائم بہت اچھے اور...... ہمدرد انسان تھے۔ وہ سب سے محبت کرتے تھے۔ مجھے بینک کے شعبے میں لانے والے وہی تھے۔ اس کے باوجود آنٹی میگی کی طرف سے ان کا اتنا زیادہ ذکر کبھی کبھی مجھے عجیب لگتا تھا۔

انسان کو کبھی اپنے موجودہ حالت پر بھی بات کر لینی چاہیے۔ انکل لائم اصل میں میرے ماما کے کزن تھے یعنی میرا اصل رشتہ ان سے ہے۔ آنٹی میگی ان کی بیوہ تھیں۔ اپنے انتقال کے وقت انکل لائم نے مجھے وصیت کی تھی کہ ان کے بعد میں آنٹی میگی کا پورا خیال رکھوں کیونکہ وہ بہت سادہ سی خاتون تھیں جن کو دنیا کے بارے میں بہت زیادہ پتا نہیں تھا۔ میں نے انکل کی وصیت کی پاسداری کی۔ جب مجھے محسوس ہوتا کہ آنٹی میگی کو میری ضرورت پڑنے والی ہے، میں فوراً ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ آج بھی میں اسی مقصد کے تحت آیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں ان سے اصل موضوع پر بات کرتا، انہوں نے حسب معمول انکل لائم کا موضوع پکڑ لیا اور

www.kahopakistan.com

اب وہ اس سے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں۔

انکل لائم نیچے سے ترقی کر کے ..... ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچے تھے اور پھر ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے جو کچھ کمایا، وہ اسے آنٹی میگی کے نام کر گئے تھے۔ اس میں یہ شاندار گھر تھا۔ اس گھر کے علاوہ انکل ان کے لیے ایک قیمتی مرسیڈیز کار اور تقریباً ایک ملین ڈالرز کا بینک بیلنس اور شیئرز چھوڑ کر گئے تھے۔ اس رقم کا بیشتر حصہ اسی بینک میں تھا جہاں پہلے انکل اور پھر میں کام کرتا ہوں۔ میں نیا نیا آفیسر بنا تھا اور میرا خیال تھا کہ اگر آنٹی اپنا اکاؤنٹ میرے توسط سے آپریٹ کریں تو مجھے فائدہ ہوگا۔ میں بچپن سے انہیں دیکھتا آیا تھا اور ان کی سادہ فطرت کی بنا پر مجھے یقین تھا کہ وہ میری بات مان جائیں گی۔

لیکن جب انکل کے انتقال کے کوئی ایک مہینے بعد میں ان کے پاس گیا اور اکاؤنٹ اپنی برانچ میں منتقل کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا۔ ''میں نے یہ رقم شیئرز میں لگانے ..... کا فیصلہ کیا ہے۔''

''شیئرز میں؟'' میں پریشان ہو گیا۔ ''آنٹی، شیئرز رسک والی چیز ہیں اور ان کا کچھ پتا نہیں ہوتا... جبکہ بینک آپ کو ایک یقینی انٹرسٹ دیتا ہے اور آپ کی رقم بھی محفوظ رہتی ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ہم ان کے گھر کے عقبی لان میں بیٹھے تھے۔ ''لیکن تمہارے انکل کا خیال تھا کہ شیئرز کا کام بھی برا نہیں ہے بہ شرط کہ آدمی آنے والے وقت کا درست اندازہ لگا لے۔''

بینک اور کامرس کا آدمی ہونے کی وجہ سے مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت اسٹاک مارکیٹ کی حالت اچھی نہیں ہے۔ آئے دن شیئرز کی قیمتیں اوپر نیچے ہوتی رہتی ہیں۔ اس میں لوگوں کو نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ ''آنٹی یہ وقت شیئرز میں رقم لگانے کا نہیں ہے۔''

''بات شیئرز یا بینک کی نہیں ہے۔'' آنٹی میگی نے چائے نکالتے ہوئے کہا۔ ''بات تبدیلی کی ہے۔ تمہارے انکل کا کہنا ہے کہ جب اوپر سے تبدیلی آئے تو انسان کو خود کو تبدیلی کے لیے تیار کر لینا چاہیے۔''

''اوپر سے تبدیلی؟'' میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

''ہاں تم دیکھ نہیں رہے ہو سیاست میں تبدیلی آ رہی ہے۔ کلنٹن کے بعد صدر بش آ گیا ہے اور وہ اس سے بالکل مختلف آدمی ہے۔ وہ جنگجو ذہن کا آدمی ہے اور جب ملک کا حکمران جنگجو ذہن کا ہو تو بینک غیر محفوظ ہو جاتے ہیں۔''

آنٹی میگی کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ''یہ بات آپ سے انکل لائم نے کہی ہوگی۔''

''بالکل... ورنہ تم جانتے ہو میں ایک عام سی عورت ہوں اور مجھے بالکل نہیں معلوم ہے کہ اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے انسان کو کیا کرنا پڑتا ہے۔ میں لائم کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں مجھے آنے والے وقت کے لیے بھی سمجھا دیا تھا۔'' ان کا لہجہ مرحوم شوہر کی محبت سے لبریز تھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''انکل لائم نے یہ سمجھا دیا تھا کہ صدر بدل جائے تو آپ رقم بینک سے نکال کر شیئرز لے لیں؟''

انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ''میرے بیٹے تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ جب میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ اتنا طویل عرصہ گزار لیتے ہیں تو ان کی سوچیں بھی یکساں ہو جاتی ہیں۔ یہ بات تم اس وقت سمجھو گے جب تمہاری شادی ہو جائے گی اور تمہیں اپنی بیوی سے محبت ہو جائے گی اور تم اس کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزار لو گے۔''

''آنٹی، میں آپ کی بات یوں سمجھ رہا ہوں کہ آپ انکل کے ذہن سے سوچ رہی ہیں اور آپ نے اس بنا پر یہ فیصلہ کیا ہے لیکن اس کے پیچھے آپ کی منطق کیا ہے؟''

''کوئی منطق نہیں ہے۔ تم جانتے ہو میں اس قابل نہیں ہوں کہ منطق کے ساتھ بات کر سکوں۔'' وہ سکون سے بولیں۔ ''میں بس اتنا جانتی ہوں میرے شوہر نے مجھے جو سمجھایا، مجھے اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اس سے مجھے کبھی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور محبت کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔''

میرا مقصد تو پورا نہیں ہوا لیکن اب مجھے فکر لگ گئی تھی کہ آنٹی میگی کو کوئی نقصان نہ ہو جائے کیونکہ ظاہر ہے انہیں شیئرز کے کاروبار کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''آپ کن شیئرز میں رقم لگانا پسند کریں گی؟''

''لائم نے کہا تھا کہ جب میں کہیں سرمایہ کاری کرنے کا سوچوں تو ہمیشہ نئے شعبے کی طرف جاؤں کیونکہ پرانے شعبوں میں منافع کی شرح معمولی ہوتی ہے۔''

''لیکن پرانے شعبے مستحکم بھی ہوتے ہیں۔''

''میرے بچے یہ تو تم لوگوں کی باتیں ہیں۔'' وہ شفقت سے بولیں۔ ''میں اس پر کب عمل کر رہی ہوں۔''

''تو آپ کا ارادہ کس شعبے میں سرمایہ کاری کرنے کا ہے؟''

''کل مجھے کچھ بروشر ملے ہیں۔'' آنٹی میگی نے کہا اور اندر سے بروشر اٹھا لائیں۔ یہ کچھ انٹرنیٹ کمپنیوں کے بروشر تھے جو آن لائن کاروبار کا آغاز کر رہی تھیں اور انہوں نے سرمایہ کاری کی ترغیب کے لیے بروشر چھاپے تھے۔ وہ بالکل انوکھے انداز میں کام کر رہے تھے۔ میں نے آنٹی سے کہا۔

''یہ رسکی ہے۔''

''لیکن مجھے یقین ہے یہ کمپنیاں کامیاب رہیں گی۔'' وہ یقین سے بولیں۔ ''میں چاہتی ہوں کہ تم فوری طور پر ان کمپنیوں کے ایک لاکھ شیئرز خرید لو۔''

''ایک لاکھ۔'' میں حیران ہوا۔ ''یہ تو بہت زیادہ ہیں؟''

''ہاں لیکن ایک شیئر صرف دس ڈالرز کا ہے۔''

میں پھر حیران ہوا۔ ''آپ اپنی ساری رقم داؤ پر لگا رہی ہیں۔''

''اگر میں اپنے اوپر اعتماد کر کے یہ کام کرنا چاہتی تو شاید ایک شیئر بھی نہ لیتی لیکن میں اپنے مرحوم شوہر کی ذہانت پر اعتماد کرتی ہوں اور یہ ان کی محبت کی توہین ہوگی۔ اگر میں پورے اعتماد سے سرمایہ کاری نہ کروں۔''

میں نے آنٹی میگی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھیں، مجبوراً مجھے ان کی ہدایت پر عمل کرنا پڑا اور اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں ان کے اکاؤنٹ کی دیکھ بھال نہیں کر رہا تھا ورنہ..... اتنی زیادہ مالیت کے ڈالرز نکلنے پر بینک میں میری کیا ساکھ رہ جاتی، اس کا اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے چند انٹرنیٹ کمپنیوں کے شیئرز خرید لیے جو آن لائن کاروبار کر رہی تھیں۔ کیونکہ ابھی اس شعبے کا آغاز تھا اس لیے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں یہ کتنی زیادہ ترقی کر جائے گا۔ جب آنٹی نے شیئرز لیے تو ان کی مالیت دس ڈالرز تھی لیکن ایک سال کے اندر ان کی مالیت چالیس ڈالرز سے تجاوز کر چکی تھی۔ دو سال بعد ان شیئرز کی مالیت ستر ڈالرز سے اوپر جا چکی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی یہ مالیت مزید اوپر جائے گی۔

آنٹی نے مجھے اپنا ذمے دار مقرر کر دیا اور ان کا اکاؤنٹ میری برانچ میں آ گیا۔ اس کا مجھے فائدہ ہوا اور دو سال کے اندر میں اسسٹنٹ منیجر بن چکا تھا۔ ان کے شیئرز کا منافع براہِ راست اکاؤنٹ میں آ جاتا تھا اس لیے جب اس دن آنٹی میگی نے مجھے بلایا تو میرا خیال تھا کہ وہ بینک سے متعلق کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔ حسبِ معمول اس بار بھی انہوں نے باغ میں چائے کا اہتمام کیا تھا۔ انکل لائم کے کچھ فرمودات سنانے کے بعد انہوں نے اچانک کہا۔ ''جان، میں نے سوچا ہے کہ اپنی سرمایہ کاری زمین اور جائداد میں منتقل کر دوں۔''

میں کچھ دیر کے لیے دم بہ خود رہ گیا پھر میں نے سنبھل کر پوچھا۔ ''کیوں آنٹی؟''

''میرا خیال ہے اب شیئرز کی قیمت اس سے اوپر نہیں جائے گی جبکہ زمین اور جائداد کی قیمت اوپر جائے گی۔''

یہ ٹھیک ہے ان دنوں زمین اور جائداد کی قیمت بڑھنے کا رجحان تھا لیکن یہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ آنٹی میگی ایک اچھے بھلے شعبے سے سرمایہ نکال کر اس میں لگا دیں۔ ''اس خیال کی وجہ آنٹی؟''

''تمہارے انکل کا کہنا تھا کہ جب آپ کا ملک کسی جنگ میں ملوث ہو جائے تو سب سے محفوظ سرمایہ کاری زمین اور جائداد میں ہوتی ہے کیونکہ کوئی اسے لوٹ کر بھاگ نہیں سکتا۔''

ان دنوں امریکا افغانستان پر حملہ کر چکا تھا اور عراق پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ''آپ کا خیال ہے کہ زمین اور جائداد کی قیمت بڑھے گی؟''

''بالکل کیونکہ تمہارے انکل لائم کا یہی کہنا تھا اور میں نے اپنی ساری عمر میں جو ان کے ساتھ گزاری، ان کی کوئی بات غلط ہوتے نہیں دیکھی۔''

یہ آنٹی کی انکل لائم سے محبت تھی کہ وہ انہیں غلطیوں

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فیلٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826,021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

www.kahopakistan.com

سے ماورا سمجھتی تھیں حالانکہ انسان سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ آنٹی میگی نے یہ بات میرے تاثرات سے بھانپ لی۔ ”تم شاید سوچ رہے ہو کہ غلطی تو ہر انسان سے ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے، تمہارے انکل سے بھی غلطی ہوتی ہوگی لیکن میرے بچے محبت میں کبھی غلطی نہیں ہوتی ہے۔“

آنٹی میگی جب کسی بحث کے دوران میں محبت کا حوالہ دیتی تھیں تو اس کا مطلب ہوتا تھا، انہوں نے اپنی بات یا فیصلے پر مہر ثبت کردی ہے اور اب اس پر کوئی بات نہیں ہو سکتی اس لیے میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”میرے لیے کیا حکم ہے؟“

وہ مسکرائیں۔ ”تم کسی اچھے ریالٹر کا بندوبست کرو جو میرے لیے زمین اور جائداد دیکھے۔“

اتفاق سے ایسا ایک ریالٹر میری نظر میں تھا۔ یہ میری ہونے والی منگیتر سارہ جیکسن تھی۔ ہونے والی یوں کہ ابھی ہم نے منگنی کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور شاید آنے والے موسم میں ہم منگنی کے بندھن میں بندھ جاتے۔ میں نے اسے آنٹی میگی سے ملوایا اور تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور ساتھ ہی کسی قدر ناراض بھی۔ ”منگنی میں بھی اتنی دیر... تم دونوں کو اس بارے میں جلد فیصلہ کر لینا چاہیے۔“

سارہ شرما گئی۔ ”آنٹی ابھی تو میں نے کام کا آغاز کیا ہے اصل میں یہ بزنس میرے ڈیڈی کا تھا اور ان کے غیر متوقع انتقال کی وجہ سے مجھے یہ کام سنبھالنا پڑ رہا ہے۔“

”کام بھی ہوتا رہے گا... شادی تو انسان کی مدد کرتی ہے کیونکہ کسی ایک مسئلے سے نمٹنے کے لیے دو افراد یکجا ہو جاتے ہیں۔“

”جی آنٹی ہم اس پر غور کریں گے۔“ میں نے کہا اور ان کے پاس سے روانہ ہوگیا۔ سارہ اور آنٹی دونوں خوش تھیں کیونکہ آنٹی کو ان کی مرضی کے مطابق زمینیں اور جائداد مل رہی تھیں اور سارہ خوش تھی کہ بنا کسی کوشش کے اسے اتنا اچھا بزنس مل گیا۔ چند مہینوں کے اندر آنٹی میگی نے پانچ ملین ڈالرز کی زمین خرید لی اور باقی شیئرز کو آئل سیکٹر میں تبدیل کر لیا۔ میرا یہ واحد مشورہ تھا جو انہوں نے قبول کیا کیونکہ آنے والے دنوں میں اس آئل کی قیمتیں بڑھنے کا پورا امکان تھا اور ایسا ہی ہوا۔ آنٹی نے جو شیئرز لیے تھے ان کی قیمتوں میں تیس سے چالیس فیصد اضافہ ہوا، لیکن انہوں نے جن زمینوں اور جائدادوں میں رقم لگائی تھی، ان کی قیمت دیکھتے ہی دیکھتے بڑھنے لگی۔ ایک سال کے اندر یہ قیمتیں بڑھ کر دگنی ہو گئیں۔

سارہ بہت مصروف تھی کیونکہ اس شعبے میں سرمایہ آیا تو اس کا کاروبار بھی اسی تناسب سے بڑھ گیا اور اب وہ بڑی مشکل سے میرے ساتھ ڈنر پر جانے کے لیے وقت نکال پاتی تھی۔ ہماری منگنی کا پروگرام اس سال بھی ٹل گیا کیونکہ ہم دونوں ہی بہت مصروف تھے۔ آنٹی میگی نے زور دیا کہ اب ہمیں شادی کر لینی چاہیے لیکن ہمارا خیال تھا کہ پہلے ہمیں خود کو مالی طور پر مستحکم کر لینا چاہیے اس کے بعد شادی بھی ہو جائے گی۔ آنٹی میگی کے ساتھ سارہ کا اکاؤنٹ بھی مجھے مل گیا یوں منیجر کے عہدے پر میری ترقی ہوگئی۔ سارہ مجھ سے کہیں زیادہ کما رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ شادی سے پہلے ایک گھر لے کر اسے مکمل طور پر سجائے گی۔ جب مجھے پتا چلا تو میں نے اسے منع کر دیا۔ میں اپنے زور بازو پر زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ سارہ نے کہا۔

”تو کیا ہوا، یہ دولت بھی تو ہماری مشترک ہوگی۔“

”نہیں، بہتر ہوگا تم اسے ہمارے بچوں کے لیے محفوظ رکھو اور شادی کے لیے مجھے گھر بنانے دو۔“

سارہ مان گئی۔ میری آمدنی تو اتنی نہیں تھی لیکن میں نے ہمت کر کے بینک کے توسط سے ایک نئی اسکیم میں تین بیڈ رومز کا مکان قسطوں پر حاصل کر لیا اور قسط کی ادائیگی میں میری نصف تنخواہ صرف ہونے لگی۔ کیش کی صورت میں دو لاکھ ڈالرز مالیت کا گھر مجھے بیس سال کی قسطوں پر چھ لاکھ ڈالرز میں پڑا تھا اور مجھے ہر مہینے ڈھائی ہزار ڈالرز بھرنے پڑتے تھے۔ جب سارہ کو پتا چلا تو وہ برہم ہوگئی۔

”تم نے یہ کیا حماقت کی ہے۔ میرے خدا بیس سال تم ڈھائی ہزار ڈالرز بھرتے رہو گے، اس سے بہتر تھا تم مجھ سے دو لاکھ ڈالرز لے لو اور اتنی ہی قسط مجھے دیتے رہو۔“

”اب تو میں نے لے لیا ہے۔“

”اسے واپس کر دو۔“ وہ بولی اور جب میں نہیں مانا تو اس نے معاملہ آنٹی میگی کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے مجھے بلا لیا۔

”جان، سارہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ تم نے کیا، کیا ہے۔ بینک میں کام کرنے کے باوجود تم نہیں جانتے کہ بینک کس طرح لوگوں کو اپنے جال میں پھنساتا ہے۔ بیس سال بہت بڑی مدت ہے اور اس دوران میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”یہ بات ٹھیک ہے لیکن آنٹی میں اپنے بل بوتے پر گھر بنانا چاہتا ہوں، میں سارہ کی دولت سے یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔“

”ٹھیک ہے، تم سارہ سے مدد مت لو لیکن تم مجھ سے تو رقم لے سکتے ہو؟“

”سوری آنٹی میں فیصلہ کر چکا ہوں اور اب تو چار قسطیں بھی بھر چکا ہوں اب میں نے مکان واپس کیا تو اس سے میری ملازمت پر بھی اثر پڑے گا۔“

آنٹی میگی اور سارہ نے مجھے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن نہ جانے کیا ہوا... شاید میں ضد میں آ گیا تھا اور میری سوچ یہ تھی کہ عورتوں کو بینک کے معاملات کا کیا پتا۔ میں نے مکان واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ دو مہینے بعد مجھے مکان مل گیا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ سارہ کو پرپوز کر دوں اور ہم کم سے کم منگنی شدہ تو ہو جائیں۔ ایک سہانی شام کو... اوپن ائر ریسٹوران میں، میں نے سارہ کو منگنی کی انگوٹھی پیش کی اور اس نے شرماتے ہوئے اسے اپنی انگلی میں پہن لیا۔ جب اگلے روز ہم نے ایک ساتھ جا کر آنٹی میگی کو یہ خبر سنائی تو وہ اتنی خوش ہوئیں کہ انہوں نے اپنا وہ بریسلیٹ جو انکل لائم نے انہیں شادی کی دسویں سال گرہ پر تحفے میں دیا تھا، سارہ کو پہنا دیا۔ اس نے انکار کیا کہ یہ انکل لائم کا تحفہ ہے تو آنٹی میگی نے اس سے کہا۔

”میری بچی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لائم کی یاد میرے لیے ان چیزوں سے مشروط نہیں ہے اور اس تحفے کے ساتھ تو دہری محبت ہے۔ اب اس میں تمہارے لیے بھی میری محبت شامل ہوگئی ہے۔“

سارہ رو دی، درحقیقت وہ آنٹی میگی سے محبت کرنے لگی تھی۔ جب ہم واپس جا رہے تھے تو اس نے کہا۔ ”آنٹی میگی بہت اچھی ہیں، وہ ہماری خوشی میں خوش ہیں۔“

”وہ ایسی ہی ہیں سراپا محبت۔“ میں نے کہا۔

”تم نے بتایا کہ تمہارا ان سے براہ راست رشتہ نہیں ہے پھر بھی وہ تم سے محبت کرتی ہیں۔“

”درحقیقت میری پرورش آنٹی میگی نے ہی کی ہے کیونکہ ماما زیادہ تر نشے میں دھت پڑی رہتی تھیں۔ خوش قسمتی سے ہمارا گھر بھی اسی گلی میں تھا اور آنٹی گھر آ کر میری دیکھ بھال کر لیتی تھیں۔ جب ماما کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہوتی اور وہ اسپتال میں داخل ہو جاتی تھیں تو آنٹی میگی مجھے اپنے گھر لے جاتی تھیں۔ میری تعلیم اور تربیت میں ان کا اور انکل لائم کا بہت ہاتھ ہے۔“

سارہ میرے بارے میں سب جانتی تھی لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ آنٹی میگی اور انکل لائم سے میرا تعلق کتنا گہرا ہے۔ میں نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ میری پیدائش کے دو سال بعد ماما کو چھوڑ گیا تھا اور مجھے وہ ذرا بھی یاد نہیں تھا۔ پھر ماما مجھے لے کر آبائی گھر آ گئیں۔ انکل لائم تو شروع سے یہیں رہتے تھے۔ ان کا گھر بہت شاندار تھا اور آنٹی میگی نے اسے مزید خوب صورت بنا دیا تھا جبکہ ہمارا گھر معمولی اور ٹوٹا

حسن بے پاپوش

ہماری ہر شام بصرہ میں گزرتی تھی۔ پہلی مرتبہ ہم ایک اتوار کی صبح کو وہاں گئے اور یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ عراقی مرد تو ہم ہندیوں کی طرح گورے بھی ہیں اور کالے بھی لیکن خواتین عراق سب کی سب لالہ رخ اور سمن بر ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ لالہ و سمن کسی قدر افلاس کے خس و خاشاک سے آلودہ تھا، لیکن ہم آملہ درجہ دوم کے متوالے ہندوستانیوں کے دل و دماغ کو معطر کرنے کے لیے کافی تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بصرہ کے بازاروں کی بھکارنیں بھی اگر کسی طرح ہندوستانی ریاستوں میں پہنچ جائیں، تو بغیر تعارف کے جونیئر مہارانیاں بن جائیں۔ اس قدر بے حجابا حسن کو یوں چیتھڑوں میں ملبوس اور ننگے پاؤں دیکھ کر دل دکھنے سا لگا بلکہ ہمارے ایک دوست نے تو جب پہلی عراقی حسینہ کو ننگے پاؤں دیکھا تو تڑاق سے اسے جوتے خرید دیے۔ فرمانے لگے:

”کیا ستم ہے یار، پھولوں جیسے نازک پاؤں اور انگاروں کی سی زمین پر چلیں، میری حمیت کو گوارا نہیں۔“

لیکن بعد میں جب ایسی ہی گل اندامؤں کے ٹھٹ کے ٹھٹ دیکھے جو بلاتکلف بصرہ کے بازاروں میں ننگے پاؤں پھر رہی تھیں، تو کسی قدر سراسیمہ سے ہو گئے۔ غالباً دل ہی دل میں آپ نے اپنی پونجی کو ان برہنہ پا حسیناؤں کی تعداد پر تقسیم کیا اور دیکھا کہ حاصل قسمت اتنا بھی نہیں کہ فی حسینہ ایک انگلی بھی ڈھک سکے۔ اس سادہ تقسیم کے سوال نے انہیں گہری رومانی دنیا سے نکال کر بصرہ کے تپتے چوک میں لا کھڑا کیا، چنانچہ اب وہ بے پاپوش دوشیزاؤں کو دیکھتے تو ان کی حمیت کو کوئی واضح ٹھیس نہ لگتی۔

کرنل محمد خان کی بجنگ آمد سے انتخاب
(شہزاد انصاری... ملتان)

اسکاٹ لینڈ والے تو کنجوسی کے سلسلے میں خواہ مخواہ بدنام ہیں۔ ہمارے ایک کرم فرما ہیں، انھوں نے جب اپنے بیٹے کو چشمہ خرید کر دیا تو ساتھ ہی ساتھ فضول خرچی سے بچنے کا یہ نسخہ بھی بتایا کہ بیٹا جب کسی چیز کی طرف نہ دیکھ رہے ہو تو چشمہ اتار کر رکھ دیا کرنا۔

www.kahopakistan.com

پھوٹا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ مزید خستہ حال ہوتا جارہا تھا۔ ہمارا گزارا اس رقم سے ہوتا تھا جو الاؤنس کی صورت میں ملتی تھی۔ اسکول اور اس کے بعد کالج میں میری تعلیم کا سارا خرچ انکل لائم نے برداشت کیا تھا۔ ماما کا ان دنوں انتقال ہو گیا جب میں اسکول کے آخری سال میں تھا۔ مستقل شراب نوشی کی وجہ سے انہیں جگر کا کینسر ہوگیا تھا۔ اس کا پتا بھی دیر سے چلا اور جب پتا چلا تو اس کے صرف سات ہفتے بعد وہ انتقال کر گئیں۔ ماما کیسی ہی تھیں اور مجھ سے بے پروا بھی تھیں لیکن میرے لیے تو وہی سب کچھ تھیں۔ جب وہ اچانک ہی مجھ سے جدا ہوئیں تو میں بکھر کر رہ گیا اور اس وقت آنٹی میگی مجھے نہ سنبھالتیں تو شاید میں کبھی اس مقام پر نہیں پہنچ پاتا جہاں آج میں ہوں، میں تو منشیات اور آوارگی میں پڑ چکا ہوتا۔

آنٹی میگی اور انکل لائم نے مجھے اپنے گھر رکھنا چاہا لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ میں اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنا چاہتا تھا بہرحال انکل لائم نے میری تعلیم کا سارا خرچ اپنے ذمے لے لیا اور مجھے اس بار انکار کرنے سے منع کر دیا۔ یونیورسٹی سے اکنامکس میں ماسٹر کرنے کے بعد جب میں عملی میدان میں آیا تو انکل لائم مجھے اپنے بینک لے آئے۔ وہ اس وقت ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ پھر جیسے ماما اچانک مجھ سے بچھڑ گئی تھیں اسی طرح انکل بھی بچھڑ گئے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ چند گھنٹوں کے اندر آئی سی یو میں زندگی کی بازی ہار گئے۔ میرا خیال تھا کہ آنٹی میگی اس طرح بکھر جائیں گی جیسے میں ماما کی وفات پر بکھر گیا تھا لیکن انہوں نے حیرت انگیز طور پر خود کو سنبھال لیا۔ شاید اس کی وجہ ان کی انکل لائم سے وہ محبت تھی جو اب کسی کے ہونے یا نہ ہونے کی محتاج نہیں رہی تھی۔ شاید انکل کو بھی توقع نہیں تھی کہ آنٹی میگی اتنی مضبوط ثابت ہوں گی تب ہی وہ مجھے ہدایت کر کے گئے تھے کہ میں ان کا خیال رکھوں۔ یہ اور بات ہے کہ مشکل ترین معاملات میں بھی ان کو میری مدد کی ضرورت پیش ہی نہیں آئی یا انہوں نے بہت معمولی سی مدد لی تھی۔

سارہ کی مدد سے انہوں نے زمین و جائداد میں جو رقم لگائی تھی، تین سال میں اس کی مالیت تین گنا زیادہ ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی زمین و جائداد کی قیمت مسلسل بڑھ رہی تھی۔ ایک صبح سارہ نے مجھے کال کی۔

"جان کیا تمہاری آنٹی میگی سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

"نہیں، کیوں کیا ہوا؟"

"تم نے انہیں زمین اور جائداد بیچنے کا مشورہ دیا ہے؟"

میں چونکا۔ "بالکل بھی نہیں، کیا انہوں نے تم سے ایسی کوئی بات کی ہے؟"

"ہاں، ابھی کچھ دیر پہلے ان کا فون آیا ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ میں ان کی تمام زمین اور جائداد کے لیے متوقع گاہک تلاش کرنا شروع کر دوں۔"

"وہ غلطی کر رہی ہیں کیونکہ زمین اور جائداد کی قیمت مسلسل بڑھ رہی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن بہرحال وہ مالک ہیں اور اپنی چیز کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتی ہیں۔"

"میں ان سے بات کرتا ہوں۔"

"نہیں، اگر تم نے ایسا کیا تو انہیں پتا چل جائے گا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے اور یہ راز داری کے اصول کے خلاف ہے۔ مجھے یقین ہے وہ جلد تم سے رابطہ کریں گی۔"

"رابطہ کرنے اور مشورہ لینے کا فائدہ۔" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "جب وہ اپنا ذہن بنا چکی ہیں۔"

"جان، وہ بہرحال بڑی ہیں اور دنیا کو زیادہ جانتی ہیں۔" سارہ نے نرمی سے کہا۔ "اور تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ان کے تمام فیصلے اب تک درست ثابت ہوئے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"یعنی ان میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے اس لیے تم پریشان مت ہو، وہ جو کرنا چاہتی ہیں ان کو کرنے دو۔"

میری اور سارہ کی منگنی کو دو سال ہونے والے تھے لیکن میں ابھی تک شادی کی پوزیشن میں نہیں آیا تھا۔ سارہ کئی بار کہہ چکی تھی کہ وہ شادی کے بعد بھی کام جاری رکھے گی۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کمائی سے گھر چلے۔ اس معاملے میں میرا ذہن قدامت پرست تھا اور میرے خیال میں عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہوتا ہے جیسا کہ آنٹی میگی نے ساری عمر گھر میں گزاری تھی۔ انہوں نے کبھی کوئی ملازمت یا کام نہیں کیا تھا۔ حد یہ کہ اپنے تمام مالی معاملات بھی وہ میرے توسط سے طے کرتی تھیں۔

سارہ کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ سارہ کی کال کے ایک گھنٹے بعد آنٹی میگی کا فون آگیا۔

"جان، آج شام تم فارغ ہو؟"

"جی آنٹی... آپ حکم کریں؟" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

"بس تو گھر آجاؤ... مجھے تم سے بات بھی کرنی ہے اور میں نے تمہارے لیے تمہاری پسندیدہ میکرونی بھی بنائی ہے۔"

میں خوش ہوگیا کیونکہ میکرونی مجھے پسند تھی اور آنٹی میگی بہت مزے کی بناتی تھیں۔ میں شام کو پہنچا تو سارہ کو بھی وہاں

پاکر خوشگوار حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ آنٹی کاروباری معاملات چھیڑیں گی لیکن کھانے کے بعد انہوں نے ہماری شادی کا موضوع چھیڑ دیا۔ "جان اور سارہ اب میں چاہتی ہوں تم دونوں شادی کر لو۔"

"آنٹی میگی..." میں نے کہنا چاہا تو انہوں نے میری بات کاٹی۔

"جان... میں سارہ سے اس موضوع پر بات کر چکی ہوں۔ تم اپنی زندگی کے خوبصورت سنہری سال ایک بے کار سی بات کے پیچھے پہلے ہی ضائع کر چکے ہو۔"

"آنٹی میں چاہتا ہوں کہ اپنا گھر میں خود چلاؤں۔"

"دیکھو اگر تم کسی کو نارمل پسند کر کے اس سے شادی کر لیتے ہو تو یہ منطق سمجھ میں بھی آتی ہے لیکن تمہارے اور سارہ کے درمیان محبت کا گہرا رشتہ ہے۔ مجھے یقین ہے شادی کے بعد یہ وہی نوعیت اختیار کر لے گا جو میرے اور لائم کے رشتے کی تھی۔ یقین کرو جب تم شادی کر لو گے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ گھر کون چلا رہا ہے۔ تم دونوں ایک وجود بن جاؤ گے۔ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔"

"میں بھی سمجھتی ہوں۔" سارہ نے کہا۔ "لیکن جان نہیں مانتا ہے۔"

"میرے بچے تم ایک بار فیصلہ کر لو۔ اس کے بعد تم خود دیکھو گے کہ جو بات آج تمہیں بہت اہم لگ رہی ہے، وہ کتنی بے معنی ہے۔"

آنٹی میگی اور سارہ کا مشترکہ دباؤ رنگ لایا اور میں ان کی بات ماننے پر مجبور ہوگیا۔ طے پایا کہ ہم دو مہینے کے اندر شادی کر لیں گے۔ اس کے بعد آنٹی میگی کے فیصلے پر بات ہوئی۔ میں نے ان سے کہا۔ "آپ غلط فیصلہ کر رہی ہیں اس وقت جائداد کی قیمت مستقل بڑھ رہی ہے اور آپ نے انکل لائم کے خیال کے مطابق سرمایہ کاری کی تھی۔ جن کا کہنا تھا کہ جب ملک حالتِ جنگ میں ہو تو سب سے محفوظ سرمایہ کاری زمین اور جائداد میں ہوتی ہے۔"

"یہ درست ہے جان لیکن تمہارے انکل کا یہ بھی کہنا تھا کہ جب ملک جنگ کی دلدل میں زیادہ ہی پھنس جائے تو جائداد کی سرمایہ کاری محفوظ نہیں رہتی ہے۔"

کیونکہ درمیان میں انکل لائم آگئے تھے اس لیے اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر پوچھا۔ "پھر آپ کیا کریں گی؟"

"میں چاہتی ہوں کہ اپنی سرمایہ کاری کچھ بینک اور باقی گولڈ میں بدل دوں۔"

تحفہ

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ جاوید، ریحانہ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

"اس کے تحفے دیکھ کر۔"

"تحفے دیکھ کر؟"

"ہاں، وہ ریحانہ کو ایسے تحفے پیش کرتا ہے جنہیں عرصہ دراز تک گھر میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

کراچی سے دائمہ یونس کا تعاون

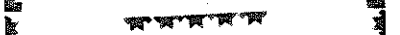

"محترمہ اچھا بھلا تو رومال ہے آپ خواہ مخواہ شکایت کرنے آئی ہیں، فرمایئے کیا شکایت ہے آپ کو؟"

"یہ رومال جو آپ کو نظر آرہا ہے نا آپ کی لانڈری میں آنے سے پہلے چادر ہوا کرتا تھا۔"

اگرچہ آنٹی میگی کا یہ فیصلہ میرے لیے سودمند تھا... کیونکہ یہ دونوں کام میرے اور میرے بینک کے توسط سے ہوتے اور ان کا بلاواسطہ فائدہ مجھے بھی ہوتا پھر بھی میں نے آنٹی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ابھی زمین و جائداد سے سرمایہ نہ نکالیں۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح فیصلہ کر چکی تھیں۔ سارہ ان کی پراپرٹی کے لیے گاہک تلاش کرنے لگی اور اس وقت یہ کام مشکل بھی ثابت نہیں ہوا۔ جب تک میں اور سارہ شادی کے بندھن میں بندھے تب تک آنٹی میگی کا سرمایہ پراپرٹی سے بینک ڈپازٹ اور گولڈ بانڈز میں تبدیل ہو چکا تھا اور اب ان کے سرمائے کی مالیت بڑھ کر بارہ ملین ڈالرز تک پہنچ گئی تھی، اس میں سے دس ملین ڈالرز کے انہوں نے گولڈ بانڈز لیے تھے حالانکہ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ زیادہ رقم بینک میں ڈپازٹ کرائیں۔ اس وقت بینک بہترین نفع حاصل کر رہے تھے اور ڈپازٹ پر لوگوں کو پُرکشش انٹرسٹ دے رہے تھے لیکن آنٹی میگی نے انکار کر دیا۔

"اتنی رقم سے آنے والا منافع میری ضرورت کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔"

شادی کے بعد ہم ہنی مون منانے برمودا اور کیوبا چلے گئے اور یہ شاندار ہنی مون آنٹی میگی کی طرف سے ہمارے لیے

www.kahopakistan.com

گفت تھا۔ واپسی کے فوراً بعد مجھے محسوس ہو گیا کہ حالات خرابی کی طرف جا رہے ہیں بینک کے درمیانی اسٹاف میں ... سرگوشیاں جاری تھیں کہ برے حالات آنے والے ہیں ... اگرچہ اعلیٰ انتظامیہ یقین دلا رہی تھی کہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن جلد سب کھل کر سامنے آ گیا۔ بحران شروع ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پراپرٹی اور بینکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پراپرٹی کی قیمت جو پہلے تیزی سے اوپر جا رہی تھی اتنی ہی تیزی سے نیچے آنے لگی اور اس شعبے میں اتنی تیزی سے زوال آیا کہ اس نے پورے ملک کی معیشت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس پر بینک دِوالیا ہونے لگے۔ میں اور سارہ اس بحران سے براہِ راست متاثر ہوئے، سارہ کا کام ٹھپ ہو گیا۔ اب کوئی پراپرٹی میں سرمایہ لگانے کو تیار نہیں تھا۔ سارہ کا کام نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ لیکن مجھے اطمینان تھا کہ میرے پاس جاب تھی۔

میں اب درمیانے افسران میں شامل تھا اس لیے فی الحال تو میری جاب کو خطرہ نہیں تھا مگر جلد افواہیں گردش کرنے لگیں کہ درمیانے درجے کے افسران کو بھی فارغ کیے جانے کا منصوبہ بن رہا ہے۔ یہ سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے .... جلد یہ افواہ حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آ گئی تھی اور ہمیں زبانی طور پر بتا دیا گیا کہ نوکری بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اکاؤنٹ لائے جائیں۔ بینک میں اکاؤنٹس کی شدید کمی ہو گئی تھی اور دوسری طرف دیے جانے والے قرضوں کی واپسی کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایک ہی راستہ نظر آیا اور میں آنٹی میگی کے پاس دوڑا چلا آیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ رقم بینک میں رکھوا دیں۔ یہ بات کہتے ہوئے ہچکچا بھی رہا تھا کیونکہ اس میں خطرہ تھا اگر بینک دِوالیا ہو جاتا تو امکان تھا کہ آنٹی کی رقم بھی ڈوب جاتی۔ مگر مجھے کچھ کرنا تھا اس لیے میں دل کڑا کر کے یہ بات کہنے آنٹی میگی کے پاس چلا آیا لیکن وہ ... انکل لائم کا موضوع نکال کر بیٹھ گئیں۔ پھر انہوں نے اچانک کہا۔

''جان میں چاہتی ہوں کہ تم میرے ڈیپازٹ کی باقی رقم کو بھی گولڈ بانڈ میں تبدیل کر دو۔''

میں دم بہ خود رہ گیا۔ میں ان سے درخواست کرنے آیا تھا کہ وہ کچھ سرمایہ بینک میں منتقل کریں جبکہ وہ اپنا باقی اکاؤنٹ بھی ختم کرنے کی بات کر رہی تھیں، میں نے بوکھلا کر کہا۔

''لیکن کیوں آنٹی اس پر آپ کو اچھا انٹرسٹ تو مل رہا ہے؟''

''یہ درست ہے میرے بچے لیکن اب بینک میں رقم رکھنا خطرناک ہو گیا ہے۔''

''وہ کیسے؟... کیا اس بارے میں بھی انکل لائم نے کچھ ارشاد فرمایا ہے؟'' میرا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔

آنٹی میگی کچھ دیر مجھے دیکھتی رہیں شاید ان کو میرا لہجہ اچھا نہیں لگا تھا، انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''تمہارے انکل بہت بلند سوچ والے انسان تھے۔ ہاں انہوں نے اس بارے میں بھی کہا تھا ان کا کہنا تھا کہ جب بینک مدد کے لیے حکومت کی طرف دیکھنے لگیں تو سمجھ لو وہ قابلِ اعتبار نہیں رہے اور اس وقت ان کے پاس رقم رکھوانا اسے گنوا دینے کے برابر ہے۔''

''لیکن آنٹی...'' میں نے بے تابی سے کہا۔ ''میں آپ کے پاس مدد کے لیے آیا ہوں، مجھے نوکری بچانے کے لیے اکاؤنٹس کی ضرورت ہے اور آپ کچھ رقم لگا سکتی ہیں۔''

''میں کچھ رقم لگا سکتی ہوں۔'' انہوں نے جیسے خود سے سوال کیا اور پھر میری طرف دیکھا۔ ''اس سے کیا ہو گا؟''

''میری نوکری جاری رہے گی۔''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے بچے تمہارے انکل لائم...''

''آنٹی پلیز... اس وقت میں بہت پریشان ہوں اور انکل لائم کے مزید فرمودات سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ آپ سنجیدگی سے میری درخواست پر غور کریں۔''

وہ مغموم ہو گئیں۔ ''یہ ممکن نہیں ہے میرے بیٹے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''میں کل ہی آپ کا باقی اکاؤنٹ گولڈ بانڈز میں تبدیل کرا دیتا ہوں۔''

''کیا تم سنو گے نہیں کہ لائم نے اس موقع کے بارے میں کیا کہا تھا۔'' آنٹی میگی نے عقب سے پکار کر کہا، میں رک گیا لیکن مڑ کر نہیں دیکھا۔ ''انہوں نے کہا تھا برسات میں مکان پر رنگ کرنا بے کار ہوتا ہے۔''

میں آنٹی میگی کے گھر سے نکلا تو بہت مایوس تھا۔ اس رات میں نے سارہ کو بتایا تو اس نے کہا۔ ''جان یہ ان کا حق ہے اور وہ ہماری خاطر نقصان کا خطرہ لیں، یہ توقع ٹھیک نہیں ہے۔''

''نقصان کا خطرہ ہے لیکن اتنا نہیں ہے۔'' میں نے جیسے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ سارہ آہستہ سے بولی۔

''جان تم جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔''

یہ درست تھا، حالات ٹھیک نہیں تھے۔ آنٹی میگی کا اکاؤنٹ ختم ہو گیا اور بینک انتظامیہ کی نظر میں اس کا ذمے دار میں تھا اس لیے ایک دن اچانک ہی مجھے رخصتی کا پروانہ تھما دیا گیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ہو سکتا ہے... اس کے باوجود مجھے شدید دھچکا لگا۔ خراب معاشی حالات کی وجہ سے ملازمتوں کا بحران جاری تھا اور لوگ ملازمت کے لیے مارے مارے پھر رہے تھے۔ ایسے میں مجھے کہاں سے ملازمت ملتی اور سب سے خراب حالت بینکوں کی تھی۔ بینک روزانہ کے حساب سے دِوالیا ہو رہے تھے ان میں نئی ملازمتوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جو بینک دِوالیا ہونے سے بچے تھے، وہ اپنی بقا کے لیے ملازمین کو نکالنے پر مجبور تھے۔ میں اس وقت سے ڈر رہا تھا اور وہی وقت میرے سامنے آ گیا۔ جب مجھے بیوی کے سہارے زندگی گزارنا پڑتی اور سارہ نے اس موقع پر مجھے سہارا بھی دیا تھا۔

''تم فکر کیوں کرتے ہو... میرا کام چل رہا ہے جب تک تمہیں کوئی دوسری ملازمت نہیں ملتی ہم گزارا کر سکتے ہیں۔''

''لیکن مکان کی قسط کا کیا ہو گا؟''

میرے اس سوال پر سارہ خاموش ہو گئی کیونکہ اس کی آمدنی اتنی نہیں رہی تھی کہ وہ مکان کی قسط بھی ادا کر سکتی۔ اس موقع پر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ اگر آنٹی میگی بینک سے اپنا اکاؤنٹس ختم نہیں کرتیں اور اس میں کچھ سرمایہ ڈال دیتیں تو شاید میری نوکری نہ جاتی۔ میں چند مہینے قسط ادا نہیں کر سکا اور اس دوران میں مجھے کوئی ملازمت بھی نہیں ملی... جو مل رہی تھیں ان میں تنخواہ اتنی کم تھی کہ میں گزارا بھی نہیں کر سکتا تھا، قسط دینا تو بالکل ممکن نہیں تھا۔ بینک کی طرف سے نوٹس آ گیا۔ اب میں قسط ادا نہیں کر پاتا تو مجھے مکان بینک کو واپس کرنا پڑتا۔ پھر وہ وقت آ گیا جب مجھے اور سارہ کو وہ مکان خالی کرنا پڑا جسے میں نے نہایت شوق اور ارمان سے لیا تھا اور سجایا بھی تھا۔ بینک نے مجھے مہلت دینے سے انکار کر دیا اور اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا کہ میں ان کا سابق ملازم تھا۔

وہ وقت بہت مشکل تھا۔ سارہ کے پاس اچھے وقت کی کچھ رقم موجود تھی اس نے شہر کی ایک نواحی بستی میں سستا مکان لے لیا یوں ہم کرائے کے مکان سے بچ گئے اور پھر گزارے کے لیے وہ اپنی ایجنسی چلا رہی تھی۔ میرے پاس کیونکہ کوئی اور کام نہیں تھا اس لیے میں اس کے ساتھ ایجنسی میں بیٹھنے لگا۔ پہلے اس کے پاس دو ملازمین تھے لیکن جب حالات خراب ہوئے تو وہ انہیں نکالنے پر مجبور ہو گئی۔ اب اسے دفتر کے ساتھ کسٹمرز کو بھی خود دیکھنا پڑتا تھا۔ میرے آنے سے وہ دفتر کی طرف سے بے فکر ہو گئی اور اب باہر کا سارا کام دیکھتی تھی۔ اگرچہ اس سے بزنس پر خاص فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ حالات بدستور خراب تھے اور لوگوں میں پراپرٹی خریدنے اور بیچنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

جہاں تک آنٹی میگی کا تعلق تھا تو ان سے رابطہ بہت کم رہ گیا تھا۔ اپنا سرمایہ گولڈ بانڈز میں منتقل کرانے کے بعد ان کو

ماہر امراض

لاہور میں ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہوتے تھے جن کی بڑی شہرت تھی۔ موصوف نے اپنے کلینک میں فیس مشورہ پانچ ہزار روپے لکھ کر لگائی ہوئی تھی اور اس 5000 کے کئی صفرے اکثر شوشا ہی کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی نیم پلیٹ پر ماہر امراض مزمنہ لکھوایا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ چھوٹے موٹے مرض کا علاج نہیں کرتے تھے بلکہ صرف دیرینہ اور موذی قسم کے امراض ہی کو قابلِ توجہ گردانتے تھے، چنانچہ اگر ان کے پاس کوئی نزلہ زکام کا مریض آتا تو وہ پہلے اسے ٹی بی کے مرض میں مبتلا کرتے اور پھر اس کا علاج کرتے، معمولی کھانسی والے کو پہلے دمہ کراتے اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوتے اور یہ بات قابلِ فہم بھی تھی کیونکہ اگر ماہر امراض مزمنہ چھوٹی موٹی بیماریوں میں الجھ کر رہ جاتا تو اس سے بڑی بڑی بیماریوں کی حق تلفی ہوتی تھی۔

(عطاء الحق قاسمی کی ''ہنسنا رونا منع ہے'' سے ایک اقتباس انتخاب... ولید بلال)

ویسے بھی شاید میری ضرورت نہیں تھی۔ میں خاصے عرصے سے ان کی طرف نہیں گیا تھا اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی بلاوا آیا تھا بس فون پر بات ہو جاتی تھی۔ ایک دن سارہ نے دفتر جاتے ہوئے کہا۔ ''آنٹی میگی ہمیشہ کی طرح فائدے میں رہی ہیں۔''

میں چونکا۔ ''وہ کیسے؟''

''تمہیں نہیں معلوم ... سونے کی قیمت مسلسل بڑھ رہی ہے اور پچھلے ایک سال میں اس میں تیس فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔''

''نہیں، میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا اس کا مطلب ہے کہ آنٹی کی دولت میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔''

''جان وہ یہ سب کیسے کر لیتی ہیں اتنے درست فیصلے تو معاشیات کے ماہر ہی کر پاتے ہیں۔''

''یہ تو میں بھی آج تک نہیں سمجھ سکا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''لیکن آنٹی کا کہنا ہے وہ تمام فیصلے انکل لائم کی کہی باتوں کی روشنی میں کرتی ہیں۔''

''میں نے اپنے مرحوم شوہر سے اس قدر محبت کرنے والی کوئی عورت نہیں دیکھی۔''

''یہ تو ہے۔ ایسا لگتا ہے ان کی زندگی کا محور ہی انکل لائم کی کہی باتیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بہت دن سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی... کیا خیال ہے کل ان کے پاس چلیں؟''

www.kahopakistan.com

سارہ راضی ہوگئی۔ ”کل کوئی اپائنٹ منٹ بھی نہیں ہے۔“
لیکن ہم دفتر پہنچے تو آنٹی میگی کی کال آگئی۔ ”جان، کیسے ہو تم دونوں؟“

”ٹھیک ہیں آنٹی ذرا مشکل ہے لیکن گزارا چل رہا ہے۔“

”کیا تم دونوں کل میرے پاس آسکتے ہو؟“

مجھے حیرت ہوئی۔ ”آنٹی ابھی دفتر آتے ہوئے ہم نے بھی سوچا تھا کہ کل آپ کے پاس آئیں گے۔“

”یہ تو اچھا ہوا۔“ وہ خوش ہوگئیں۔ ”بہت دن ہوگئے ہیں تمہیں دیکھے ہوئے۔“

اگلے روز جب ہم آنٹی میگی کے گھر پہنچے تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان چند مہینوں میں وہ بہت کمزور ہوگئی تھیں۔ ان کا رنگ سفید اور جسم جیسے گھل گیا تھا۔ ”آنٹی یہ آپ کو کیا ہوا ہے؟“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ آج سردی زیادہ تھی اس لیے ہم اندر ہی بیٹھے تھے۔

”آپ نے مجھے بتایا نہیں۔“ میں نے شکوہ کیا۔

”تم لوگ پہلے ہی پریشان تھے، میں نے سوچا کہ مزید کیا پریشان کروں۔ بہرحال اب سب ٹھیک ہے۔“ انہوں نے کہا اور ہمارے لیے چائے بنانے لگیں۔ سارہ کیک لائی تھی اس نے کیک کے پیس کیے۔ چائے پیتے ہوئے میں نے آنٹی میگی سے کہا۔

”آپ کا گولڈ بانڈز لینے والا فیصلہ بھی درست ثابت ہوا۔“

”اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، یہ سب تمہارے انکل لائم کی وجہ سے ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولیں۔ ”اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔“ وہ اٹھ کر گئیں اور انکل کا قیمتی چرمی بیگ لے آئیں اور اس میں سے گولڈ بانڈز نکال کر میز پر رکھ دیے۔ ”جان میری ایک تجویز ہے تم ان بانڈز کو فروخت کر دو اور حاصل ہونے والی رقم سے ایسی عمارات خریدو جن میں مناسب قسم کے اپارٹمنٹس ہوں جن کو کرائے پر دیا جاسکے۔“

”لیکن آنٹی سونے کی قیمت مسلسل بڑھ رہی ہے۔“

”میں جانتی ہوں لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس سرمائے سے کمایا جائے تمہارے انکل کا کہنا تھا کہ سونا قدر تو جمع کرتا ہے لیکن یہ آپ کو کما کر نہیں دیتا ہے۔“

”خیال تو برا نہیں ہے۔“ سارہ نے میری طرف دیکھا۔ ”اس وقت بے شمار لوگ بے گھر ہیں اور کرائے کے لیے رہائش کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے لیکن آنٹی آپ نے تجویز کی بات کیوں کی ہے؟“

”اس لیے کہ یہ بانڈز میری طرف سے تم دونوں کے لیے تحفہ ہیں۔“

میں اور سارہ ششدر رہ گئے۔ آنٹی بارہ ملین ڈالرز کے بانڈز ہمیں تحفے میں دے رہی تھیں۔ میں نے ہڑبڑا کر ان کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ ہم اتنا قیمتی تحفہ نہیں لے سکتے۔“

”تحفہ تمہیں لینا پڑے گا ورنہ کچھ عرصے بعد میری وصیت کے مطابق میرا سب کچھ تم دونوں کا ہونے والا ہے لیکن اس وقت تک .... پراپرٹی کی قیمت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہو جاتا اس لیے میں چاہتی ہوں...“

”ایک منٹ آپ نے کیا کہا... چند مہینے بعد؟“

انہوں نے سر ہلایا۔ ”میرے دماغ میں ٹیومر تشخیص ہوا ہے اور وہ ایسی جگہ ہے جسے آپریٹ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹرز نے کہا میرے پاس تین مہینے ہیں۔“

”میرے خدا آپ نے ہمیں بتایا بھی نہیں۔“ سارہ بولی۔

”مجھے خود دو دن پہلے پتا چلا ہے اس سے پہلے طبیعت خراب رہتی تھی تو میں نے اتنی توجہ نہیں دی۔“

ہم سب ہی خاموش ہوگئے پھر آنٹی نے اس خاموشی کو توڑا۔ ”میرے بچوں مجھے اس موت کا دکھ نہیں ہے۔ میں نے زندگی سے اپنا پورا حصہ حاصل کیا ہے اور اب موت کا حق ہے کہ وہ مجھے لے جائے۔“ وہ بولتے ہوئے رکیں۔ ”اگر تم مناسب سمجھو تو میری تجویز پر عمل کر سکتے ہو ورنہ تم اپنی مرضی کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہو۔“ انہوں نے ایک اور فائل نکال کر میرے سامنے رکھی۔ ”میں نے یہ گولڈ بانڈز تمہارے نام کر دیے ہیں باقی چیزوں کے لیے میرا وصیت نامہ میرے وکیل کے پاس ہے۔“

”انکل لائم آپ کے لیے ایک ملین ڈالرز چھوڑ کر گئے تھے جنہیں آپ نے بارہ ملین ڈالرز میں بدل دیا کیونکہ آپ کے پاس انکل لائم کی باتیں اور ان کی رہنمائی تھی لیکن میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“

آنٹی میگی مسکرائیں۔ ”تم بھول رہے ہو اصل چیز محبت ہے اور وہ تمہیں حاصل ہے۔“

میں نے سارہ کی طرف دیکھا... واقعی میری محبت تو میرے پاس تھی۔ آنٹی نے ٹھیک کہا تھا... محبت کبھی غلط فیصلہ نہیں کراتی ہے۔ وہ ڈاکٹرز کے اندازے سے کم زندہ رہیں اور اس ملاقات کے پانچ ہفتے بعد سوتے میں ان کا ٹیومر پھٹ گیا اور وہ انتقال کر گئیں۔ افسوس کہ وہ اپنی تجویز پر عمل ہوتے نہیں دیکھ سکی تھیں۔ میں نے گولڈ بانڈز فروخت کر کے اس سے ایک دس منزلہ عمارت خرید لی جس میں دو سو اپارٹمنٹس ہیں۔ ہم نے اس کا نام میگی ٹاور رکھا ہے۔

اسمان سے رحمتیں ہی نہیں ..... کبھی کبھی بلائے ناگہانی کا بھی نزول ہوتا ہے ..... ایک دہشت گرد کی موجودگی کو بھانپ لینے والے شخص کا عبرت انگیز ماجرا.....

آسمانی تحفہ

سلیم انور

اس تحفے کی کرامات جس نے انسانی زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا

رالف لندن کے ٹیوب اسٹیشن کے شمالی راستے سے باہر جا رہا تھا۔ جب وہ زیرزمین اسٹیشن کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو ایک عورت تیزی سے اس سے ٹکراتے ہوئے آگے نکل گئی۔

رالف نے ایک نظر اس عورت کا چہرہ دیکھا تو وہ اسے شناسا سا محسوس ہوا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا اور ذہن پر زور دینے لگا کہ یہ عورت کون ہو سکتی ہے۔ اس عورت کے چہرے کے سیاہ فام نقوش، گہری آنکھیں جن سے موت جھلکتی

www.kahopakistan.com

تھی، بار بار اس کے ذہن کے پردے پر دستک کر رہے تھے۔
اور پھر اسے ایک جھٹکا لگا۔
''اوئے! یہ تو نادیہ المعروف ڈیتھ لیڈی ہے۔'' وہ بے ساختہ اچھل پڑا۔ پھر اپنی انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں چیخنے لگا۔ ''یہ وہی دہشت گرد عورت ہے جسے ہمیشہ خبروں میں دکھایا جاتا ہے۔''
اس کی بلند آواز پر نادیہ کے تیز قدم ایک لمحے کے لیے ڈگمگا گئے۔ اس نے پلٹ کر رالف کو ہلاکت خیز نگاہوں سے گھورا جیسے اسے چیلنج کر رہی ہو کہ اپنی بات ایک بار پھر دہرا کر دکھائے۔ پھر وہ دوبارہ تیز تیز قدموں سے اپنی راہ چل دی۔ اس کے پاس ایک بھاری سا بریف کیس بھی تھا جسے وہ اپنے ساتھ گھسیٹ رہی تھی۔
یہ رش کے اوقات تھے۔ سیڑھیوں پر ٹیوب اسٹیشن سے باہر نکلنے والے مسافروں کا ہجوم دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ رالف کے چیخنے پر وہ سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے اور پھر انہیں حقیقت کا احساس ہوا تو تمام مسافروں کے قدم وہیں جم گئے۔
وہ سب احمقوں کی طرح منہ پھاڑے راہِ فرار اختیار کرتی اس دہشت گرد عورت کو دیکھ رہے تھے جو برطانیہ میں سب سے زیادہ مطلوب تھی۔
''ڈیتھ لیڈی! ڈیتھ لیڈی!'' رالف اب بھی چیخ رہا تھا۔
رالف نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ اس دہشت گرد عورت سے دو دو ہاتھ کر لے۔ وہ تصور میں تالیوں کا غلغلہ، شہرت اور اس دہشت گرد عورت کی گرفتاری پر ملنے والی انعامی رقم پر دل ہی دل میں خوش ہونے لگا۔
لیکن پھر اسے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ترجمان کی نصیحت یاد آ گئی۔ وہ کئی بار واضح کر چکا تھا کہ اس دہشت گرد خاتون کا سامنا ہونے پر عام شہری اس سے مڈبھیڑ سے گریز کریں کیونکہ وہ مسلح رہتی ہے اور انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔
یہ وارننگ اتنی بار دی جا چکی تھی کہ رالف نے نہتا ہونے کی بنا پر قسمت آزمائی کا ارادہ ترک کر دیا۔
رالف کے شور مچانے پر ڈیتھ لیڈی کی موجودگی کی خبر جنگل کی آگ کے مانند ہر طرف پھیل گئی۔ اس وقت تک نادیہ ٹیوب اسٹیشن کی سیڑھیاں عبور کر کے باہر پیدل چلنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو چکی تھی۔ لیکن باہر کے لوگوں کو بھی اس کی موجودگی کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ سب کے سب

سراسیمگی کی کیفیت میں ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ انہیں قدم اٹھانا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔
نادیہ کی عقابی نگاہیں راہِ فرار ڈھونڈ رہی تھیں۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اس کے اطراف میں شدید نفرت کا دباؤ ہر لمحے بڑھتا جا رہا ہے۔
اور پھر رالف کی دیکھا دیکھی سینٹرل لندن کے پیدل چلنے والوں کی بھیڑ نے بھی چلانا شروع کر دیا۔ ''ڈیتھ لیڈی! ڈیتھ لیڈی!''
اس وقت تک رالف بھی ٹیوب اسٹیشن سے باہر نکل آیا تھا۔ زیرِ زمین اسٹیشن سے اچانک دھوپ میں آتے ہی اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو دور نادیہ المعروف ڈیتھ لیڈی کو تیزی کے ساتھ ایک بلڈنگ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔
کئی پولیس مین بھی نیم دلی سے اس کے تعاقب میں جاتے دکھائی دیے۔ لگتا تھا کہ نادیہ کے پاس اب دو ہی آپشن رہ گئے تھے... یا تو خود کو پولیس کے حوالے کر دے یا پھر اس بلڈنگ میں داخل ہونے کے بعد اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جل دے کر راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرے۔
نادیہ نے دوسرے آپشن کا انتخاب کیا۔
نادیہ کے عمارت میں داخل ہونے کے بعد تماشائیوں کا ایک ہجوم عمارت کے سامنے جمع ہو گیا۔ وہ سب آس اور توقع لگائے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔
اور پھر ان کا ہیجان اور بڑھ گیا جب انہوں نے ایک پولیس ہیلی کاپٹر کو عمارت کے اوپر منڈلاتے ہوئے دیکھا۔
پانچ منٹ بعد مقابل کی ایک عمارت کی کھڑکی سے ایک آفس سیکریٹری نے سر باہر نکالا اور سب کو متوجہ کرتے ہوئے چیخنے لگی۔ ''وہ سامنے چھت پر ہے۔'' وہ انگلی سے اوپر کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ ''نادیہ اور پولیس والے چھت پر ہیں۔''
آئندہ چند سیکنڈ رالف کے لیے ایک دھند کے مانند تھے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ دہشت گرد عورت عمارت کی چھت کی منڈیر پر نہایت غیر محفوظ انداز میں کھڑی ہے۔
مجمع کی نگاہیں چھت کی جانب اٹھی ہوئی تھیں اور لوگ دبے دبے لہجے میں آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔
تب گولی چلنے کی گھٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی نیچے کھڑے ہوئے پُرحیرت مجمع کے ایک ساتھ گہرا سانس لینے کی آواز ابھری۔
دوسرے لمحے عمارت کی چھت پر کھڑی ہوئی نادیہ کے جسم نے ایک جھٹکا کھایا اور منڈیر پر سے لڑھک کر نیچے گرنا شروع ہو گیا۔ وہ پچیس منزل کی بلندی سے زمین پر آ رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کی چیخیں بھی نکل رہی تھیں۔ اس کے اور زمین کے درمیان اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔
پھر نادیہ کا جسم ایک زوردار دھب کی آواز کے ساتھ زمین سے ٹکرا گیا۔
زمین سے ٹکراتے ہی اس دہشت گرد عورت کی گرفت سے کوئی شے اڑتی ہوئی رالف کی پیشانی سے ٹکرائی اور اس کے قدموں میں گر پڑی۔
رالف کا ہاتھ بے ساختہ اپنی پیشانی پر چلا گیا۔ اس کی انگلیاں بہتے ہوئے خون کو تلاش کرنا چاہ رہی تھیں لیکن وہاں جلد پر زخم کے بجائے صرف سوجن کا نشان تھا۔ تب رالف کو تجسس ہوا کہ وہ کیا شے تھی جو اس کی پیشانی سے ٹکرائی تھی۔
اس نے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو وہاں پچاس پونڈ کے نوٹوں کی ایک گڈی پڑی ہوئی تھی۔ مجمع پر سراسیمگی کی کیفیت طاری تھی اور کسی کی نگاہ رالف کے قدموں میں پڑی ہوئی نوٹوں کی گڈی پر نہیں گئی تھی۔
پھر جیسے کسی ان کہے اشارے پر تماشائی اس سحر سے باہر نکل آئے جس نے ایک طویل لمحے تک انہیں اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔
جو عورتیں نادیہ المعروف ڈیتھ لیڈی کی شکستہ خون آلودہ لاش کے نزدیک موجود تھیں، انہوں نے بے ساختہ خوف زدہ انداز میں چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ جبکہ بہت سے مرد ابکائیاں لے رہے تھے۔
البتہ رالف نے خون میں لت پت نادیہ کی شکستہ لاش کو نظر انداز کر دیا اور محتاط انداز میں جھکتے ہوئے نوٹوں کی وہ گڈی اٹھالی جو اس کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''پائی چیز، پرائی چیز، جس کو ملے اس کی۔''
پھر اس نے پلک جھپکتے میں نوٹوں کی گڈی اپنے کوٹ کے اندر چھپالی۔

☆☆☆

صبح کے واقعات کے نتیجے میں رالف نے کام پر جانے کے بجائے گھر واپس جانے کا فیصلہ کیا۔
جب اس کی بیوی جینی نے جلدی گھر آنے کی وجہ پوچھی تو رالف نے اسے پورا واقعہ سنا دیا۔
''یہ اس دہشت گرد عورت کے خلاف ایک ثبوت ہے۔'' جینی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ گڈی پولیس کے پاس لے جانی چاہیے۔''
''یہ آسمانی تحفہ ہے۔'' رالف نے جواباً کہا۔
''نہیں، یہ دہشت گردوں کی دولت کا ایک حصہ ہے۔'' جینی نے اس کی بات رد کرتے ہوئے کہا۔
''او کے! میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ یہ دہشت گردوں کی رقم ہے... لیکن یہ میری گود میں آ کر گری ہے۔ یہ میری قسمت، یہ میرا نصیب ہے... بالکل اس طرح جیسے لاٹری کا جیتنا۔''
جینی بازو سمیٹتے ہوئے سوچ میں پڑ گئی۔
رالف نے جب محسوس کیا کہ اس کی بیوی نرم پڑ رہی ہے تو وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔ ''اسے گھر بیٹھے مل جانے والی دولت کی نگاہ سے دیکھو، تم اس سے گھر کی وہ چند ایک ضروریات پوری کر سکتی ہو جن کے لیے تم بار بار تقاضا کرتی رہی ہو۔''

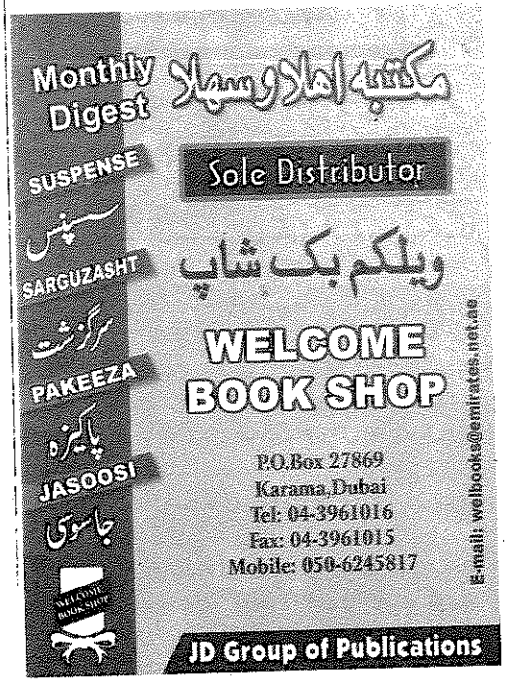

www.kahopakistan.com

ایک پریشان حال شخص ماہرِ نفسیات کے پاس گیا اور بولا "ڈاکٹر! میں چند راتوں سے بہت پریشان ہوں۔ خواب میں روزانہ چند لڑکیاں میرے کمرے میں گھس آتی ہیں اور بستر کے چاروں طرف گھومتی پھرتی ہیں..." ماہرِ نفسیات مسکرایا... اور کہا "یہ تو بہت اچھا خواب ہے جس سے کوئی شخص بھی چھٹکارا پانا پسند نہیں کرے گا، پھر بھلا تم خواہ مخواہ کیوں پریشان رہنے لگے ہو؟"

"آپ درست کہتے ہیں ڈاکٹر۔" وہ شخص بولا۔ "میں اس خواب سے چھٹکارا پانا نہیں چاہتا بلکہ آپ کے پاس اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ کسی طرح لڑکیوں کو یہ بات ذہن نشین کروا دی جائے کہ ان میں سے جب بھی کوئی لڑکی کمرے سے باہر جائے تو جاتی دفعہ کمرے کا دروازہ زور سے بند نہ کرے کیوں کہ اس کی اس حرکت سے میری آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر میں ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے گزار دیتا ہوں۔"

جینی کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر میں اس دہشت گرد عورت کو نہ بچاتا تو یہ رقم آخر میں کس کام کے لیے استعمال میں لائی جاتی؟ ہتھیاروں کی خریداری کے لیے؟ دہشت گردی کے لیے؟ میں نے ایک طرح سے اپنے ملک کی خدمت کی ہے لہٰذا یہ رقم ہمارا انعام ہے۔"

بالآخر جینی نے ہار مان لی۔

"لاؤ یہ مجھے دو۔" جینی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "اور اس کے بارے میں کسی کو ایک لفظ بھی مت بتانا۔ مجھے معلوم ہے کہ جب تم مے کدے جاتے ہو تو دوستوں کے سامنے کیا کیا شیخیاں بگھارتے ہو۔ اس معاملے میں اپنی زبان بند رکھنا۔"

جینی نے گڈی کے نوٹ گننا شروع کر دیے۔ وہ پورے پانچ ہزار پاؤنڈ کی رقم تھی۔

جینی نے گڈی میں سے پچاس پاؤنڈ کے چند نوٹ نکال لیے اور بولی۔ "جینیٹ کو اسکول کی تعطیلات کے لیے نئے فینسی نرم جوتے چاہئیں اور مارکو نیا کمپیوٹر گیم لینے کے لیے بے تاب ہے۔"

رالف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جینی اپنی بیٹی اور بیٹے کو خوش خبری سنانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

جینی کے جانے کے بعد رالف نے گڈی کی بقیہ رقم دوبارہ گننے کے بعد اپنی خواب گاہ کی سائڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دی اور لیونگ روم میں واپس آ کر اپنی پسندیدہ آرام کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ نہ جانے کیوں تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔

پھر اس نے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا۔

ٹی وی اسکرین روشن ہوا تو اس پر بریکنگ نیوز کی پٹی چل رہی تھی۔

"سینٹرل لندن میں دہشت گرد کی ہلاکت۔"

ایک اکھڑ سے لہجے والا نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ "آج صبح سویرے برطانیہ کی فیمیل ٹیررسٹ نادیہ المعروف ڈیتھ لیڈی پولیس کے ایک نشانچی کی گولی کا نشانہ بننے کے بعد المونڈو بلڈنگ کی چھت سے زمین پر گر کر ہلاک ہو گئی۔"

اب اسکرین پر نیوز روم کے منظر کی جگہ جائے وقوعہ کا منظر دکھائی دینے لگا جہاں ایک پولیس ہیلی کاپٹر المونڈو بلڈنگ کے اوپر گردش کر رہا تھا۔

"ڈیتھ لیڈی نوٹوں سے بھرا ہوا ایک بریف کیس لیے المونڈو بلڈنگ کی چھت پر پہنچ گئی تھی۔" نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ "پولیس کے ذرائع کے مطابق نادیہ کا ارادہ چھت پر سے ان کرنسی نوٹوں کو نیچے سڑک پر گرانے کا تھا۔ مرنے والی دہشت گرد لیڈی کو امید تھی کہ نوٹوں کی متوقع چھینا جھپٹی کے سبب ہزاروں معصوم شہریوں کی ہلاکت ہو جائے گی کیونکہ وہ تمام کرنسی نوٹ اعصابی نظام کو مفلوج کر دینے والے زہر سے آلودہ تھے۔"

"خوش قسمتی سے گو نادیہ المعروف ڈیتھ لیڈی اپنا بریف کیس کھولنے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن وہ کرنسی نوٹ بکھیرنے کے منصوبے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یقین یہ کیا جاتا ہے کہ ان زہر آلودہ کرنسی نوٹوں میں سے ایک بھی کسی شہری کے ہاتھوں تک نہیں پہنچا..." نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔

یہ سننا تھا کہ ٹی وی کا ریموٹ لیونگ روم میں بیٹھے ہوئے رالف کی بے جان انگلیوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ اس نے اپنی بیوی جینی، بیٹی جینیٹ اور بیٹے مارکو کو خبردار کرنے کے لیے چیخنا چاہا لیکن جب اس نے منہ کھولا تو اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی اور صرف رال بہنا شروع ہو گئی!

مجسمہ

ایم، اے راحت

گزشتہ سے پیوستہ باتیں خوشگوار ہوں تو ان یادوں کی خوشبو سے دل ودماغ تادیر مہکتے رہتے ہیں اور ان کی مہک سے دوسرے بھی متاثر ہوتے ہیں...... لیکن یادیں اگر تلخ...... سفاک ہوں تو......... وہ ذہن سے محو نہیں ہوتیں...... ان کی تلخی ہر لمحے کو تلخ سے تلخ تر بنا دیتی ہے...... زندگی کی بساط پر بازی ہار دینے والے محروں کا کٹھ پتلی تماشا.........

اس شخص کا قصۂ عبرت جو انسانوں پر سے اعتبار کھو چکا تھا

گھر سے تیسری بار فون آیا تھا۔ یہ فرحانہ کی عادت تھی۔ حالانکہ صرف تھوڑا سا فاصلہ تھا گھر اور دفتر میں لیکن گیارہ بجتے اور فرحانہ پریشان ہونے لگتی۔

"کیا بات ہے... ابھی تک دفتر میں کیوں بیٹھے ہو؟ کتنی دیر میں واپس آؤ گے؟" حالانکہ وہ چھ بجے گھر سے نکلا تھا۔ سالا اور اس کی بیوی آئے ہوئے تھے۔ وہ واپس جا رہے ہوں گے۔ وہ یہ کہہ کر آیا تھا کہ وہ لوگ دوسرے دن چلے جائیں لیکن زبیر نہیں رکا ہوگا مصروف آدمی ہے...

"ہیلو... فرحانہ!" فرہاد نے گہری سانس لے کر کہا۔

"گیارہ بج کر بیس منٹ ہو رہے ہیں جناب۔"

www.kahopakistan.com

''کیا وہ لوگ چلے گئے؟''

''ساڑھے دس بجے ہی چلے گئے تھے۔''

''فرحانہ! تم سو جاؤ، آج میں گھر واپس نہیں آسکوں گا۔''

اس نے اپنی حالت کے پیش نظر کہا۔ وہ کئی دن سے خود کو سنبھالے ہوئے تھا اور آج تو صبح ہی سے اس کی کیفیت بھٹکی بھٹکی سی تھی۔ نوکری کے معاملات وہ گھر پر بتانے کا عادی نہیں تھا۔

''کیا مطلب؟ کیوں؟'' فرحانہ کی آواز میں پریشانی تھی۔

''دراصل صبح دو مجرموں کو سزائے موت دینی ہے۔ اتفاق سے ان کے کاغذات وغیرہ نامکمل رہ گئے ہیں۔ کچھ افسران آنے والے ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر کاغذات مکمل کروں گا اور پھر صبح پونے سات بجے ان کی سزائے موت پر عمل ہو گا۔ اس کے بعد ہی گھر واپس آؤں گا۔ دیکھو فرحانہ! ذمے داری کی بات ہے اور تم جانتی ہو کہ میرا ریکارڈ کیسا ہے۔ تمہاری رفاقت سے نکلنا کتنا مشکل کام ہے میرے لیے، یہ تم جانتی ہو۔''

''خدا کے لیے ایسی خوفناک باتیں نہ کیا کرو مجھ سے۔''

''آئی ایم سوری فرحانہ! تم سو جاؤ'' فرہاد نے کہا۔

''اچھی بات ہے فرہاد! لیکن براہ کرم صبح جلدی آجانا۔ اور ہاں، اگر میں سو رہی ہوں تو مجھے فوراً جگا لینا۔ ٹھیک ہے؟''

''خدا حافظ۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

یہ دلکش گفتگو اسے چند لمحات تک گدگداتی رہی۔ وہ خواب گاہ کا منظر دیکھتا رہا۔

پھر یہ منظر بدل گیا۔ بیڈ روم سلاخوں میں بدل گیا اور سلاخوں کے پیچھے ایک چہرہ نظر آیا۔ قوی ہیکل بدن، بکھرے ہوئے گھنگریالے بال، بڑی بڑی حسین آنکھیں جن میں خون کی سرخی رچی ہوئی تھی۔

شہر کے کنارے سرسوں کے پھیلے ہوئے کھیتوں میں اس نے نوشاد کو دیکھا تھا۔ غرور میں ڈوبا ہوا اپنی عمر کے بچوں میں خود کو سرفراز رکھنے کا عادی۔ ذرا سی بات پر ہر ایک کو پیس کر رکھ دینے کا خواہش مند۔ اگر پوری بستی میں اس کی کسی سے دوستی تھی تو صرف فرہاد سے۔ وہ اس کی ہر بات سہہ لیتا تھا۔ اپنی عادت کے خلاف۔ یہ دوستی اس وقت ختم ہوگئی جب فرہاد کے والد رحمان شہر آگئے۔ حالات بدل گئے، ماحول بدل گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بھول گئے اور ماہ و سال کی گرد کی تہ دبیز ہوتی گئی۔ فرہاد زندگی کی ترقی کے بہت سے زینے طے کر گیا اور پھر شہر کی جیل میں تعینات ہو گیا۔ وہ جیلر کے عہدے پر تھا۔ نوجوان اور فرض شناس افسر۔

اور پھر جیل میں نوشاد آیا۔ کتاب زندگی کے بہت سے اوراق الٹ گئے۔ نوشاد کا وہی انداز تھا۔ وہی غرور تھا۔ اس کی شکل ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔ وہ فرہاد کو فوراً پہچان گیا۔

''یہ نوکری چھوڑ دے فرہاد... تجھے راس نہیں آئے گی۔ اس لیے کہ تیرا یار ڈاکو ہے۔'' نوشاد نے ہنس کر کہا۔

''لیکن یہ کیسے ہوا نوشاد! میں نے ڈاکو نوشاد کا نام تو سنا تھا لیکن سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ تم ہو گے؟''

''اب سوچ لے کہ یہ میں ہی ہوں اور اب بھی تیرا یار ہوں۔''

نوشاد کی آنکھوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ کتنا بدل گیا تھا۔ وہ کتنا بھیانک ہو گیا تھا۔ فرہاد تعجب سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''لیکن یہ ہوا کیسے؟''

''جو ہونا تھا ہو گیا۔ جو ہے وہ سوچ۔''

''شمشاد صاحب کہاں ہیں؟'' فرہاد نے اس کے باپ کے بارے میں پوچھا۔ وہ بستی کے سب سے معزز آدمی تھے۔ نیک اور ایمان دار... سب کے کام آنے والے۔

''قتل کر دیا گیا تھا انہیں۔ سب کچھ چھین لیا گیا تھا مگر میں نے سب واپس لے لیا۔ ان کے خون کی ایک ایک بوند کا انتقام لے لیا مگر وقت گزر گیا۔ اب وہ باتیں نہ کر۔ سن فرہاد... یہاں تو ہے۔ چند روز تیرے پاس گزاروں گا پھر بھاگ جاؤں گا... اگر تو یہاں نہ ہوتا تو آج ہی بھاگ جاتا۔''

''مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ نوشاد بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں؟''

''غلط ملا ہے تو مجھے۔ فاصلے قائم رکھنا۔ ورنہ نقصان اٹھائے گا۔ میں بہت بدل گیا ہوں۔ رعایت کرنا چھوڑ دیا ہے میں نے۔ بس مل لیا کر دوسرے تیسرے دن... اور میری بات پر دھیان رکھنا، دس بارہ دن سے زیادہ نہیں رہوں گا۔''

یہ بات فرہاد کو بری لگی۔ وہ جیلر تھا۔ ایمان دار افسر۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ نوشاد اس کی گرفت سے نکل جائے لیکن اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ تو آنے والا وقت بتاتا۔ اس نے حتی الامکان نوشاد کو سہولتیں فراہم کر دیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس پر کڑی نگاہ بھی رکھی۔ اب یہ تقدیر کی بات تھی کہ اسے ان دونوں میں تصادم مقصود نہیں تھا۔ ملاقات کے آٹھ دن پورے ہوئے تھے کہ اچانک فرہاد کا ایک دوسری جیل میں تبادلہ کر دیا گیا۔ اسے فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ کر اس جیل کا چارج لینا تھا۔

نوشاد نے قہقہہ لگایا۔ ''دعا مانگی تھی میں نے خدا سے... پوری ہو گئی۔ میں ڈاکو ہوں لیکن خدا مجھ سے خوش ہے۔ کوئی دعا مانگتا ہوں تو پوری ہو جاتی ہے۔ میں بہت پریشان تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میں یہاں سے نکل گیا تو تیری نیک نامی میں فرق آئے گا۔ اب ٹھیک ہے... اب بالکل ٹھیک ہے۔ پھر ملاقات ہو گی کہیں نہ کہیں۔'' اس نے گرم جوشی سے فرہاد سے مصافحہ کیا۔

نئی جگہ پہنچ کر فرہاد نے اخبار میں پڑھا... نوشاد جیل توڑ کر نکل گیا ہے۔ وہ ٹھوکر نکل کر رہ گیا۔ خدا جانے تقدیر کیا کھیل دکھاتی۔ وہ فرض کو دوستی پر قربان نہیں کر سکتا تھا اور دوست کا قتل بھی اس کے لیے سخت اذیت ناک ہوتا۔ خدا نے اسے اس امتحان سے بچا لیا تھا۔

اس کے بعد جب بھی اسے نوشاد کا خیال آیا، اس نے خدا سے یہی دعا مانگی کہ ان دونوں کا تصادم نہ ہو۔ وہ کسی سخت امتحان میں نہ پڑے... اور یہ دعا ایک مخصوص وقت تک پوری ہوتی رہی۔ نوشاد کا نام اس کے سامنے آتا رہتا تھا۔ وہ انتہائی خطرناک مجرم تھا، ڈاکا زنی اور قتل و غارت گری اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ فرہاد نے اسے دل سے نکال پھینکا۔ معاشرے کے اس ناسور سے وہ محبت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دوست کہنا اور سمجھنا انسانیت کی توہین تھی۔ پھر اس نے وہ دعا مانگنا ترک کر دی۔ اس نے سوچا کہ اگر نوشاد کبھی اس کے سامنے آیا تو وہ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتے گا۔

وقت گزرتا رہا۔ فرہاد کی زندگی میں بہت سی بہاریں آگئیں پہلے فرحانہ پھر شیراز۔ اس کے گلشن میں دو حسین پھول کھلے تھے اور اس کے بعد زندگی بہت حسین ہو گئی تھی۔

اس نئی جیل میں اسے دو سال گزر چکے تھے۔ اس کی ساری زندگی بے داغ تھی اور حکام کی نظر میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ پھر اس نے پڑھا کہ نوشاد گرفتار ہو گیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے سزائے موت ہو گئی اور آج سے دس دن پہلے اسے اسی جیل میں منتقل کر دیا گیا جس میں فرہاد تعینات تھا۔ خود کو لاکھ سنبھالنے کے باوجود فرہاد شدید متاثر ہوا۔ بچپن کی دوستی کا ایک تاثر آج تک اس کے ذہن پر طاری تھا۔ نوشاد کا بچپن آج بھی اس کی نگاہوں میں آجاتا تھا۔ دونوں میں گہری دوستی تھی اور لوگ اس دوستی کی مثال دیتے تھے لیکن نوشاد زندگی کے جن بھیانک راستوں پر نکل گیا تھا، وہاں سے اس کی واپسی ناممکن تھی۔

اس کے ساتھ ہمدردی کی بات بھی ایک سماجی اور انسانی جرم تھا۔ اسی لیے وہ دو دن تک نوشاد سے ملاقات بھی نہیں کر سکا۔ اس نے اپنا کام اپنے اسسٹنٹ سے لیا اور ان دو دنوں تک خود کو نوشاد کے سامنے لانے کے لیے تیار کرتا رہا۔ حالانکہ اس نے خود کو مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ نوشاد اب صرف ایک مجرم ہے۔ ایسا گھناؤنا مجرم جس سے دوستی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ایک مجرم سے نگاہ نہیں چرانا چاہیے۔

اور پھر تیسرے روز اس نے کال کوٹھری میں نوشاد سے ملاقات کی۔ وہی زندگی، وہی شگفتگی۔ فرہاد کو اس نے مسرور نگاہوں سے دیکھا۔

''ہیلو جیلر صاحب! آپ ہیں یہاں۔ کیسے ہو فرہاد؟'' آخر میں اس کے لہجے میں مٹھاس آگئی۔

''ٹھیک ہوں نوشاد! تم برائی کے راستوں پر بہت دور نکل آئے ہو۔'' فرہاد نے اداس لہجے میں کہا۔

''ہاں، یار! بہت باز رکھا خود کو، نہ رکھ سکا تو پھر پوری طرح کھل گیا۔ میں کوئی کام... ادھورا کرنے کا قائل نہیں ہوں۔''

''کیا ملا تمہیں جرائم کی اس زندگی میں؟''

''سچ پوچھو تو کیا نہیں ملا۔ کیا نہیں ہے میرے پاس۔ دولت کی ریل پیل ہے۔ ہر خوشی میرے قدموں میں ڈھیر ہو سکتی ہے لیکن یہ انسان کی بھول ہے۔ وہ چاہے تو ہر چیز کو اپنا سمجھ لے لیکن کوئی چیز اس کی اپنی نہیں ہے۔ تم اس زندگی کی بات کرتے ہو۔ کسی بھی زندگی میں کچھ نہیں ہے۔ زمین سے ایک کونپل اگتی ہے، پروان چڑھتی ہے، درخت بنتی ہے اور پھر ایک دن سوکھ جاتی ہے۔ ایک مسلسل عمل ہے جسے جو دل چاہے نام دے لو۔ ملتا ملاتا کچھ نہیں ہے۔ میرے دوست! یہ عمل جاری ہے اور جاری رہے گا۔''

''لیکن انسانیت کے کچھ اصول ہیں۔ درختوں کی ایک قطار ہوتی ہے۔ یہ اصول سرفرازی عطا کرتے ہیں۔ ایک مجرم اور ایک ولی کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ موت کے بعد بھی تو ایک زندگی ہوتی ہے... یہاں بھی اور وہاں بھی۔''

''ہاں، موت کے بعد بھی ایک زندگی ہوتی ہے۔ میں نے بھی اس زندگی کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے۔ اب دیکھ لوں گا... نہ جانے کیوں، مجھے یقین ہے کہ میری وہ زندگی بری نہیں ہو گی۔ اسے بھی تم انسان کی خوش فہمی کہہ لو۔ اس بات کو تو جاننے والا جانتا ہے۔ باقی رہی یہاں کی زندگی کی بات تو تم اس زندگی کے لیے کہہ رہے ہو جو موت کے بعد ایک یاد کی حیثیت سے قائم رہتی ہے۔''

www.kahopakistan.com

''ہاں... اچھے عمل ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔''

''برے عمل بھی ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں اور پھر کیا ملتا ہے ان یادوں سے؟ کس کی بات کر رہا ہے فرہاد! انسان نے انسان کے لیے بہت کچھ کیا ہے لیکن گزرنے والا وقت گزر جاتا ہے پھر یہ یادیں ایک تماشا بن جاتی ہیں۔ مضحکہ اڑتا رہتا ہے زندگی کا۔''

''میں نہیں سمجھتا نوشاد کہ تمہارا ذہن کن بنیادوں پر بھٹکا ہے۔ تمہیں علم ہے کہ اب تمہاری زندگی کا اختتام ہے؟''

''ہاں، میں جانتا ہوں اور میں نے خوشی سے یہ موت قبول کی ہے۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ یار! میں بہت تھک گیا ہوں۔'' نوشاد مسکرا دیا۔

''میں ان عوامل کو جاننا چاہتا ہوں نوشاد جنہوں نے زندگی میں تمہیں یہ غلط سوچیں بخش دیں۔ ان سوچوں کے مالک تم تنہا انسان نہیں ہو۔ ہر مجرم جو انسانیت سے دور چلا جاتا ہے، انسانیت پر ایسے ہی الزام تراشتا ہے اور یہ الزامات اس کی اپنی اختراع نہیں ہوتے بلکہ غلط سوچ اسے تباہی کے راستوں پر دوڑاتی ہے۔ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے؟''

''دوست کا سوال ہے تو بتاؤں گا لیکن تم یہ الفاظ اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم نوشاد نہیں فرہاد ہو۔ بات میری فطرت کی تھی۔ میں نہیں جانتا میری عادت میں خودسری کیوں تھی۔ تم جانتے ہو، اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ہمیشہ ہر اس بات کا مخالف تھا جو دوسری جانب سے کہی گئی ہو سب میرے والد کو نیک فطرت اور شریف الطبع انسان کہتے تھے لیکن میری نگاہوں میں نیکی اور شرافت کا مفہوم ذرا مختلف تھا۔ تم تو بستی چھوڑ کر چلے آئے۔ میں اداس ہو گیا کیونکہ بستی کے لوگ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ میں اداس رہنے لگا۔ تب میں نے اپنے والد سے کہا کہ وہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر بھیج دیں لیکن وہ اس پر تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ میں نے اطمینان سے ان کی تجوری سے کچھ رقم نکالی اور چل پڑا... قصبے پہنچا، وہاں سے ریل میں بیٹھ کر شہر آ گیا۔ اسٹیشن پر ہی مجھے ایک شخص نے پکڑ لیا۔ یہ کسی فلاحی انجمن کا نمائندہ تھا۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کی لیکن میں نے اسے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ اس نے زبردستی کی تو میں اسے زخمی کر کے وہاں سے بھاگ گیا اور اس شخص نے پولیس کے روزنامچے میں مجھے ایک خطرناک لڑکا درج کرا دیا۔ ضد کی ہی تو بات تھی۔ شہر میرے لیے اجنبی تھا۔ میں پولیس کی نگاہوں سے چھپ نہ سکا اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ سماجی کارکن کو زخمی کرنے کے سلسلے میں مجھے سزا دی گئی اور میں نے پہلی بار بچوں کی جیل دیکھی۔ یہ خاصی دلچسپ جگہ تھی۔ میں نے یہاں اپنی انا کی تسکین قائم رکھی۔ حکام نے لاکھ کوشش کی کہ میں اپنے گھر کا پتا بتا دوں لیکن میں نے انہیں شکست دی اور وہ میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم کر سکے۔ بچوں کی جیل سے ایک سال کے بعد نکلا۔ حالانکہ پہلی سزا صرف دو ماہ کی تھی لیکن باقی دس ماہ کی سزا میں نے جیل میں مار پیٹ کے بعد پائی تھی۔ ایک سال بعد جب میں رہا ہوا تو شہروز خان نے جیل سے باہر میرا استقبال کیا۔

''یہ لڑکا ایک استاد کا شاگرد تھا اور یہ استاد جیب تراش تھا۔ چنانچہ مجھے کھانا اور رہائش مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی کام سیکھنے لگا۔ کام سیکھ کر میں نے کاروبار شروع کر دیا۔ استاد میری فطرت سے واقف ہو چکے تھے اس لیے ذرا خیال رکھتے تھے لیکن ایک دن نشے میں بہک گئے۔ ان کے منہ سے گالی نکلی اور میں نے چاقو سے ان کی زبان کاٹ دی۔ اس کے بعد وہاں رکنا بے معنی تھا لیکن مجھے نواز خان نے فوراً ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ نقب زن تھا اور ہمیشہ بڑے بڑے پروگرام بناتا رہتا تھا۔ نواز خان سے میری ملاقات استاد کے اڈے پر ہی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے ایک آدمی کی جیب صاف کر دی تھی۔ بہرحال، میں نواز خان کے ساتھ کام کرتا رہا اور کئی سال گزر گئے۔

''پھر نواز خان مر گیا... اس کی موت کے بعد میں پھر بے سایہ ہو گیا لیکن ... میں نے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا اور اس میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ لیکن اب میرا ذہن کلاسیکی روایات کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں نے پرانی روایات تازہ کرنے کے لیے کلاسیکی طرز کے ڈاکے ڈالے اور گروہ بنا لیا۔

''دولت جمع ہوئی تو عورت کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن پہلا تجربہ ہی حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ طبیعت صنف مخالف کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔ بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہوتا چلا گیا کہ مرد کو مارنے یا مروانے میں شراب اور عورت اکسیر کا درجہ رکھتی ہیں۔ رہی سہی کسر فردوس نے پوری کر دی۔ اس کا اصل روپ سامنے آنے کے بعد میں نے عورت کے خیال... کو ذہن کے نہاں خانوں میں دفن کر دیا۔

''کیا تم یقین کرو گے فرہاد کہ نوشاد ڈاکو نے ساری زندگی نہ تو عورت کو چھوا اور نہ شراب کو۔ پہلی بار جب میں گرفتار ہوا تو عورت ہی اس کا محرک تھی لیکن وہ میرے ذریعے نہیں آئی تھی بلکہ میرا ایک ساتھی اس کا شکار ہو گیا تھا جس کی وجہ سے سب کو زحمت ہوئی۔ دوسری بار بھی عورت ہی ہماری گرفتاری کا باعث بنی تو میں نے اپنے ساتھیوں کے لیے پابندی عائد کر دی۔ شراب اور عورت میرے گروہ پر ممنوع ہو گئی تو میرے دوست اس پابندی سے بددل ہو گئے۔

میں اکثر سوچتا فرہاد کہ آخر ان دونوں چیزوں میں ایسی کون سی کشش ہے کہ انسان ان کے لیے دیوانہ ہے۔ زندگی کا ایک باب تشنہ رہ جاتا ہے... وہ یہ کہ کئی سال کے بعد ایک بار گھر کی یاد نے ستایا تو میں بستی پہنچ گیا۔ میں صرف ایک نگاہ ان لوگوں کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن جب میں اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو وہاں ملبے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ بستی ذرا ہٹ کر آباد ہو گئی تھی اور اس گھر کو ویرانے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے لوگوں سے وجوہ معلوم کیں تو انوکھا انکشاف ہوا۔

''تمہیں مولوی غلام رسول یاد ہے؟''

''ہاں... جس کے سات بیٹے تھے۔'' فرہاد نے یاد کر کے کہا۔

''بالکل وہی... اور جو پوری بستی میں اس لیے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ اس کی زبان نیکیوں کی تلقین کرتے نہیں تھکتی تھی۔ اس کو کہیں سے دولت مل گئی اس نے زندگی کا ڈھانچا ہی بدل دیا۔ مکان بنایا، زمینیں خریدیں اور پھر بستی میں..... غلام رسول کا نام ابھر آیا۔ اس کے ساتوں بیٹے جوان ہو گئے ..... سب سے بڑے بیٹے کا رشتہ میری بہن کے لیے آیا۔ والد صاحب غلام رسول کی حیثیت نہیں بھلا سکے تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا جسے ان کا بیٹا برداشت نہ کر سکا۔ اس نے میری بہن کو اغوا کرنے کی کوشش کی تو میرے بھائی نے اسے ہلاک کر دیا۔

''تب غلام رسول کے بیٹوں نے سازش کر کے پہلے میرے والد کو اور پھر میرے بھائی کو قتل کر دیا اور ظلم کی بات یہ ہے کہ تمہارے قانون سے بچ بھی گئے۔ یہ داستان سن کر میں نے نہایت سکون سے کام لیا اور پھر غلام رسول صاحب کو اس کے بیٹوں سمیت بستی کے چوک پر کھڑا کر کے گولی مار دی۔ گھر والوں کا کھیل بھی ختم ہو گیا تھا اور مجھے کوئی منزل نہیں ملی تھی۔ میرے دل میں کوئی ایسا احساس نہیں جاگا تھا جسے میں اپنا مرکز نگاہ بنا سکتا۔ ساری زندگی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے کسی شے کی تلاش ہے۔ وہ شے کہاں ہے، کیا ہے... اس کے بارے میں نہیں معلوم۔ اگر مجھے اس کا اندازہ ہو جاتا تو شاید میری زندگی کا رخ بدل جاتا لیکن میں معلوم ہی نہیں کر سکا... کبھی معلوم نہیں کر سکا۔''

''کتنے قتل کیے ہیں تم نے؟''

''کوئی یاد تھوڑی رکھے ہیں یار۔'' نوشاد ہنس دیا۔

''میں تمہیں بتاؤں نوشاد... تمہیں نیکی اور سچائی کی تلاش تھی۔ تمہاری ذہنی نشوونما میں کوئی سقم رہ گیا تھا۔ کوئی احساس تمہارے دل میں بند ہو گیا تھا جسے تم کھول نہیں سکے۔ کیا تم نے کبھی بھلائی کے راستوں پر چلنے کی کوشش بھی کی؟''

''دیکھ یار! اب اس آخری وقت میں تو بور نہ کر۔ مولوی راحت حسین یاد ہیں تجھے جو بچوں کو جگہ جگہ پکڑ کر اقوالِ زریں سنایا کرتے تھے؟''

''ہاں یاد ہیں۔''

''انہوں نے نیکیوں کے کچھ گر بتائے تھے۔ میں نے کوشش کی لیکن کام نہیں بنا۔''

نوشاد خاموش ہو گیا لیکن فرہاد کے دل پر بڑا بوجھ آ پڑا اور کئی دن ہے وہ اس بوجھ کو سب سے چھپائے ہوئے تھا۔ نوشاد کے پھانسی کے دن قریب آ گئے تھے۔ بالآخر یہ رات آ گئی جس کی صبح اسے دو انسانوں کو سزائے موت دینی تھی۔ اس رات وہ بہت اداس تھا۔ بڑی کشمکش کا شکار تھا۔

''نوشاد کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

☆☆☆

بارہ بجے، دفتر میں وہ تنہا تھا۔ باہر خاموش رات پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ سوچا اور دفتر سے نکل آیا۔ باہر کھڑے سنتریوں نے ایڑیاں بجائیں اور وہ سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کال کوٹھری کے قریب تھا جہاں بدنصیب قیدی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ کوٹھری صاف و شفاف تھی۔ ایک مدھم بلب جل رہا تھا اور کمرے کے درمیان نوشاد اطمینان سے بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔

قدموں کی چاپ پر اس نے چونک کر باہر دیکھا۔ فرہاد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سلام جیلر صاحب! کیا صبح ہو گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' فرہاد بھاری لہجے میں بولا۔

''کیا وقت ہوا ہے؟''

''ساڑھے بارہ۔''

''اس وقت کیسے آ گئے؟ خود میرا بھی اندازہ ہے کہ ابھی صبح نہیں ہوئی۔ تمہیں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی مجھے۔'' نوشاد اپنی جگہ سے اٹھ کر سلاخوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ نوشاد نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ درحقیقت نوشاد ذہنی مریض تھا۔ فرہاد نے بہت سے سزائے موت کے مجرموں کو دیکھا تھا۔ ان لمحات میں ان کی حالت بگڑ جاتی تھی اور وہ سب کچھ بھول جاتے تھے لیکن نوشاد جوں کا توں تھا۔ اس کے چہرے

www.kahopakistan.com

پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو نوشاد؟“ فرہاد نے پوچھا۔

”ایک فلسفہ جو بے حقیقت ثابت ہوا۔ لوگ کہتے ہیں... ”آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں...“ کیا خیال ہے، کیا میں اپنی موت سے آگاہ نہیں ہوں؟ چھ بج کر پینتالیس منٹ، کیسی بات ہے۔“

”ہاں، تم اپنی موت سے واقف ہو اور اب کوئی تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔“

”تمہیں سچائی کی قسم فرہاد... جہاں یہ شعر لکھا دیکھو مٹا دینا۔“

”ایک دوست ہونے کی حیثیت سے میرے دل میں تمہارے لیے اب بھی انسیت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر تمہارے دل میں کوئی خواہش ہو تو مجھے بتادو۔ میں اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”یار فرہاد! اگر تم نے یہ بات کہی ہے تو میں تم سے دل کی بات ضرور کہوں گا۔ یہ بتاؤ، تم نے شادی کرلی؟“

”ہاں۔“

”عورت کیا ہے...؟“

”ماں، بہن، بیوی، بیٹی... یہ چاروں روپ ہیں اس کے اور اگر وہ چار کے اس ہندسے سے نکلتی ہے تو عورت نہیں رہتی۔“

”بڑی انوکھی چیز ہے۔ میں نے عورت کبھی نہیں دیکھی۔ کیا وہ سچ مچ انسان کو اتنا ہی متاثر کرتی ہے؟“

”اس حیثیت کے دائرے میں۔“

”شراب پی ہے کبھی تم نے؟“

”ہاں، انکار نہیں کروں گا۔“

”اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں؟“

”اچھے نہیں ہوتے۔“

”میں ان دونوں چیزوں کو آزمانا چاہتا ہوں۔ کیا تم آج کی رات ان چند گھنٹوں میں مجھے یہ آخری خواہش پوری کرنے کا موقع دو گے؟ دیکھو، یہ بڑی معمولی سی بات ہے اور پھر یہ پیشکش تمہاری ہے۔“ نوشاد نے کہا تو فرہاد کے ہوش اڑ گئے۔ واقعی خواہش ناقابلِ عمل نہیں تھی لیکن نوشاد، عورت اور شراب... وہ کسی قدر پریشان ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری یہ خواہش پوری کردوں گا۔“

”شکریہ... لیکن جلدی۔ وقت بہت کم ہے۔ کہیں میری تحقیق ادھوری نہ رہ جائے۔“

فرہاد وہاں سے پلٹ آیا۔ وہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ اب اسے احساس ہورہا تھا کہ اس نے ایک جذباتی پیشکش کی تھی جو اس کے لیے خاصی الجھن کا باعث بن گئی تھی... لیکن وعدہ تو پورا کرنا تھا۔

سلاخوں والا دروازہ کھلا اور لمبے سیاہ لبادے میں ملبوس عورت کو اندر دھکیل دیا گیا۔ سنتریوں نے شراب کی اچھی خاصی مقدار مع گلاس کے اندر پہنچادی اور پھر دروازہ بند ہوگیا۔

نوشاد کی نگاہ اس آتشیں وجود پر پڑی جس کا رنگ سیاہ لبادے میں کندن کی طرح دہک رہا تھا۔ جس کے سنہرے بال منتشر تھے اور آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ وہ ایک ادا سے لڑکھڑا کر آگے بڑھی اور نوشاد کے سامنے پہنچ گئی۔

”تم کون ہو؟“ اس کی باریک آواز ابھری لیکن نوشاد دہکتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے عورت کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”بولو... تم کون ہو؟“

”تمہارے خیال میں کون ہوسکتا ہوں؟“

”جلاد۔“ وہ ہنس پڑی۔ یہ نشے میں ڈوبی ہوئی ہنسی تھی۔

”تمہارا خیال درست ہے۔“ نوشاد اپنی جگہ سے اٹھا اور شراب کی دونوں بوتلیں اٹھا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس نے گلاس میں شراب انڈیلی اور اس کا پہلا گھونٹ حلق میں اتار لیا۔

”تلخ اور بے مزہ۔ لوگ اسے کیوں پیتے ہیں؟“ وہ آہستہ سے بولا۔

”اس کی کڑواہٹ زندگی کی تلخیوں کو چوس لیتی ہے۔“ عورت کی آواز ابھری۔

”تم خاموش رہو۔ اگر ایک بھی لفظ اس کے بعد تمہارے منہ سے نکلا تو میں تمہاری گردن دبادوں گا۔“ نوشاد غرایا۔

عورت ہنسی اور پھر ایک دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ نوشاد نے گلاس خالی کردیا۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف کے آثار نظر آئے لیکن اس نے فوراً ہی دوسرا گلاس بھر لیا پھر اس نے دوبارہ عورت کو دیکھا۔

”انوکھی ہے... دلکش... مگر...“ اس نے شراب کے کئی گھونٹ لیے اور پھر تلخی سے منہ بنا کر بولا۔ ”انسان بھی عجیب ہے۔ مٹھاس سے دل بھر جاتا ہے تو پھر تلخیوں میں ڈوبنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمین پر اگنے والی حقیر کونپل، اپنے لیے مشکلات تلاش کرتی ہے۔“ اس نے تیسرا گلاس بھر لیا۔

اس بار تلخی کچھ کم ہوگئی تھی۔ وہ خاموشی سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ عورت شاید دیوار سے لگے لگے سوگئی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ کشادہ پیشانی سے نازک پیروں تک... اور بس عورت ختم۔

”بس اتنی سی ہے عورت... ہونہہ! اس کے بارے میں اتنے افسانے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شراب عورت کو مکمل کرتی ہے... کس طرح؟ یہ عورت نامکمل کیوں ہے؟“

اس نے شراب کا چوتھا گلاس ایک سانس میں خالی کردیا اور پھر خاموشی سے عورت کو دیکھتا رہا۔ بوتل خالی ہوگئی لیکن کوئی تحریک نہیں ہوئی... کوئی جذبہ نہیں جاگا۔

”دنیا ہی نامکمل ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صرف تمہارا احساس ہے خود کو جہاں چاہو سمجھ لو... جہاں چاہو دیکھ لو۔ یہ عورت ماں نہیں ہے، بہن نہیں ہے، بیوی نہیں ہے، بیٹی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے یہ عورت نہیں ہے۔ میں گوشت کے اس مجسمے میں عورت کہاں تلاش کروں... کہاں ہے عورت؟“ اس نے گلاس رکھ دیا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ آہستہ قدموں سے دیوار سے لگی عورت کے قریب پہنچا اور اسے جھٹکا دیا۔

عورت اس جھٹکے سے جھکی لیکن اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سنبھالا اور دوبارہ دیوار سے ٹکا کر کھڑا کردیا۔ وہ اس کے وجود میں دلکشی تلاش کرنے لگا۔ کندن دہک رہا تھا لیکن اس میں وہ کھینچ لینے والی کشش کہاں ہے؟ جس کے لیے پھر لوگ پاگل ہوجاتے ہیں؟

ماں۔ اس کے ذہن میں ایک تصور ابھرا اور اس نے اپنے ہونٹ عورت کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

کوئی تقدس نہ ابھرا۔ بہن... اس نے اپنے ہونٹ عورت کی پیشانی پر ٹکادیے۔ بیوی... اس کے رخسار عورت کے چہرے سے جاٹکے۔ بیٹی... اس کے بازوؤں نے اسے آغوش میں لے لیا اور پھر وہ کرب سے چیخا۔

”یہ نقلی ہے۔ اس کا ہر روپ جھوٹ ہے۔ یہ بہن ہوتی تو بے لباس نہ ہوتی۔ یہ ماں ہوتی تو اس کے ہاتھ میں محبت کی گرمی ہوتی۔ یہ بیوی ہوتی تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے۔ یہ بیٹی ہوتی تو اس کے لیے دل دکھتا۔ یہ نقلی عورت ہے۔ یہ عورت کے نام پر فریب ہے۔ ماں وہ ہوتی ہے جو گھر کی چار دیواری میں اولاد کے لیے سربسجود ہوتی ہے۔ بہن وہ ہوتی ہے جس کی آنکھوں میں بھائی کی عزت کا پاس ہو۔ بیوی وہ ہوتی ہے جس کی آغوش صرف شوہر کے لیے وا ہو۔ بیٹی وہ ہوتی ہے جو باپ کی ناموس کو سڑکوں پر نہ لے آئے... اور جو کچھ نہیں ہوتی، وہ یہ ہوتی ہے۔ مجسمہ عورت کا مذاق۔ عورت کے نام پر دھوکا... فریب۔“

نوشاد کے ہاتھ اس کی گردن پر پہنچ گئے۔ ان ہاتھوں میں بلا کی قوت تھی۔ عورت نے معمولی سی مزاحمت کی لیکن نوشاد کے ہاتھوں کی گرفت سخت سے سخت ہوتی گئی۔ اندر سے کچھ ہڈیاں ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ ناک، منہ اور کانوں سے خون بہنے لگا اور نقلی بت نیچے گر پڑا۔ زبان باہر نکل آئی تھی۔ آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں۔

نوشاد پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے بغور اسے دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہاں... جو عورت نہیں ہے، وہ یہ ہے... یہ اس کی اصلی شکل ہے اور شراب ایک دھوکا ہے جو انسان نے خود کو فریب دینے کے لیے ایجاد کیا ہے۔ فریب... صرف فریب۔“ اس نے شراب کی بوتل کو ٹھوکر ماری اور بوتل دور جا پڑی۔ جیل کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

فرہاد اچھل پڑا۔ اس نے پریشان نگاہوں سے کونے میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھا۔ اس کے عقب میں دوسرے افسر کھڑے ہوئے تھے۔ تب اس نے جیل کی کال کوٹھری کا دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا اور پھر اندر داخل ہوگیا۔ نوشاد زمین پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔

”نوشاد!“ اس نے آواز دی تو نوشاد نے اپنی شعلہ بار آنکھیں کھول دیں۔

”کیا وقت ہوا ہے فرہاد؟“

”چھ بجے ہیں۔“

”چلوں؟“

”ہاں... اٹھ جاؤ لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے میرے لیے کیا پریشانی پیدا کردی ہے؟ تم نے اس عورت کو قتل کردیا۔“

”مجھے افسوس ہے فرہاد۔“

”چلو تیار ہوجاؤ۔ میں نے اگر ذرا بھی عقل مندی سے کام نہ لیا ہوتا تو تم میرا طویل ریکارڈ خراب کرسکتے تھے۔ تمہاری موت کے پندرہ منٹ بعد اس عورت کو بھی سزائے موت دی جانے والی تھی کیونکہ اس نے اپنے آوارہ شوہر کو قتل کردیا تھا۔“

فرہاد نے اپنے عقب میں کھڑے اہلکاروں کو اشارہ کیا اور وہ اندر آگئے۔

www.kahopakistan.com

قسط :23

اسما قادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں
میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر
سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون
کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل
تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں
تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں
بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور
مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو
روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا
انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت
اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی
بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی
پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے..... اس
وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسرشاہی، جاگیرداری
اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

www.kahopakistan.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہر یار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری اسے اغوا کروالیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شہر یار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کالد سے منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آجاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ادھر مشابرم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے اور وہاں ایمونیشن بلاسٹ ہونے سے کافی تباہی ہوتی ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلانمبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر مشابرم خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہر یار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک میجر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہر یار کو بھی اس واقعے کی اطلاع میجر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہر یار فوراً اسکردو پہنچ جاتا ہے اور مشابرم خان اور ماہ بانو کو آرمی کی کسٹڈی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ صحافی افضل قاتلانہ حملے میں مارا جاتا ہے۔ ماہ بانو کراچی میں میڈیکل کالج میں مہرین کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ کشور اور آفتاب افضل کے ایک دوست بابر کی مدد سے اسلام آباد میں اس کی خالہ کے گھر پناہ گزیں ہو جاتے ہیں مگر کشور کو یہاں بھی سکون میسر نہیں آتا۔ خالہ کا اوباش بیٹا اسے تنگ کرتا ہے۔ ماہ بانو کو اس کی سہیلی راحیلہ اپنے بھائی سے ملوانے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں ماہ بانو پڑوس کے بنگلے میں مہا گرو کو دیکھ لیتی ہے اور شہر یار کو مطلع کرتی ہے۔ شہر یار فوراً کراچی آجاتا ہے۔ نگرانی کے دوران اسے سرمد نظر آتا ہے۔ وہ اس سے مل کر مہا گرو کا پتا لگاتا ہے اور ماہ بانو کی مدد سے اس پر قابو پا لیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ ادھر کشور کی ملازمۂ خاص رانی کا منگیتر اکو جنگل میں پوست کی کاشت کا پتا لگا لیتا ہے۔ اسے وہاں چودھری کے کارندے دیکھ لیتے ہیں اور اس کا پیچھا کر کے اسے مار دیتے ہیں۔ مہا گرو (ورما) کے لوگ ایک سینئر ڈاکٹر کی فیملی کو یرغمال بنا کر ڈاکٹر کو ساتھ دینے پر آمادہ کرتے ہیں اور ورما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ ادھر شہر یار کے ماموں لیاقت رانا پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ شہر یار خبر سن کر پریشان ہو جاتا ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر ماریا بھی اس کے ساتھ لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریا کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اس قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو شہر یار کے رویے پر پریشان ہوتی ہے اور اسی کیفیت کے زیرِ اثر اسے نیند نہیں آتی۔ اس کی روم میٹ اسے ٹرنکولائزر دے دیتی ہے جسے کھا کر وہ نیند کی وادی میں اترتی چلی جاتی ہے۔ آنکھ کھلنے پر ماہ بانو خود کو مانوس سی جگہ پر پاتی ہے اور اسے پتا چل جاتا ہے کہ وہ ایک بار پھر چودھری کے ہتھے چڑھ چکی ہے۔ ادھر شہر یار اپنے قدم بہکنے پر خود کی اور ماریا کی نظروں میں گر جاتا ہے اور ماریا کی طنزیہ گفتگو سن کر اس سے شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ وڈی چودھرائن اپنے داماد سے ماہ بانو کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہے اور اشرف شاہ ماہ بانو کو چودھری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ چودھری سمجھتا ہے کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے شہر یار کا ہاتھ ہے۔ ادھر آفتاب جمعے کی نماز کے لیے جاتا ہے تو وہاں اسے امام مسجد کا چہرہ شناسا لگتا ہے اور کسی کی صورت ذہن میں آنے کے بعد وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہے۔ ماہ بانو ڈاکوؤں کے چنگل میں ہوتی ہے اور ان کے کام کاج کرتی ہے۔ وہ تھک ہار کر لیٹتی ہے تو اسے نیند آجاتی ہے مگر ایک احساس اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس احساس کو سمجھتے ہی اسے جیسے ڈنک لگتا ہے اور وہ اچھل کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ وہ انسانی ہاتھ کا لمس تھا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر متحرک تھا۔ وہ وہی پینٹ شرٹ میں ملبوس ڈاکو تھا۔ ماہ بانو اس سے سختی سے اپنی جھونپڑی میں آنے کی وجہ پوچھتی ہے۔ اس کے مطابق اس نے سردار سے ماہ بانو سے متعلق اجازت لے لی ہوتی ہے کہ ماہ بانو پر صرف اس کا حق ہے۔ مگر وہ ماہ بانو کو غلط نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو کھلی فضا میسر کرنے کے لیے اپنی بنائی ہوئی ایک پھلواری میں لے جاتا ہے۔ ادھر شہر یار ماہ بانو کی تلاش کے سلسلے میں کوشاں رہتا ہے مگر اسے ناکامی ہوتی ہے۔ مشابرم خان آرمی کسٹڈی سے چھوٹ کر واپس آجاتا ہے۔ آفتاب شہر یار کو فون کر کے اسے را کے ایجنٹ کی وہاں موجودگی کا بتاتا ہے۔ ایک رات غلام محمد نامی را کا ایجنٹ آفتاب کے گھر پر دھاوا بول دیتا ہے۔ اس لڑائی میں کشور کو گولی لگتی ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے تاہم غلام محمد پکڑا جاتا ہے۔ شہر یار، مشابرم خان اور ---- فورس کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ ادھر ماہ بانو پھلواری میں بیٹھی ہوتی ہے کہ اسے نسوانی چیخوں کی آواز آتی ہے۔ وہاں موجود ڈاکو جمرو للی نامی عورت کی عزت پامال کر رہا ہوتا ہے۔ ماہ بانو اسے اس سے چھڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ جمرو، للی کو چھوڑ کر ماہ بانو کو پکڑ لیتا ہے۔ اس کے بدبودار وجود کی گرفت میں بے بسی سے مچلتی ماہ بانو کو لگتا ہے کہ جمرو کی صورت میں اسے سزا ملنے والی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جمرو کے بوجھ تلے اس کا نازک بدن حرکت کرنے سے بھی قاصر تھا لیکن پھر بھی وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح خود کو اس گرفت سے آزاد کروا سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہاتھ پیر چلانے کی بہت کوشش کی لیکن ایک گرانڈیل مرد کے آگے اس کی کوششوں کی کیا حیثیت تھی۔ وہ بس مچل کر رہ گئی۔ دوسری طرف جمرو کی ہمت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ماہ بانو کی قمیص کو اس زور سے جھٹکا دیا کہ قمیص شانے پر سے پھٹ گئی اور اس کا شانہ عریاں ہو گیا۔ اپنی عریانیت کے احساس پر وہ اندر سے کٹ کر رہ گئی اور جھنجلاہٹ میں جمرو کے ہاتھوں کی گرفت میں جکڑے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو جنبش دے کر اس کی بڑی بڑی مونچھوں کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس کے اس عمل میں اتنی شدت تھی کہ جمرو کی مونچھوں کے کئی بال اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آگئے اور وہ بلبلا کر رہ گیا اور غصے میں اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے رخسار پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ طمانچہ اتنا شدید تھا کہ اس کی انگلیوں کے نشان ماہ بانو کے نرم و شفاف رخسار پر ثبت ہو کر رہ گئے اور اس کے ہونٹوں سے ایک زوردار چیخ نکل پڑی۔

”میں تو اسلم کی وجہ سے مجبور ہو کر تیرے قریب نہیں آرہا تھا لیکن تُو نے خود اپنے لیے مصیبت کھڑی کر لی ہے۔ اب تو مجھ سے کسی صورت نہیں بچ سکتی۔“ وہ خوں خوار لہجے میں کہہ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔ عزت اور زندگی دونوں ہی داؤ پر لگتی دیکھ کر اس کے حلق سے پے در پے چیخیں بلند ہوتی چلی گئیں لیکن پھر جمرو کا آہنی ہاتھ اس کے منہ پر آجما اور اس کی چیخوں کا گلا گھٹ کر رہ گیا۔ جمرو نے اپنا ہاتھ کچھ اس انداز سے اس کے منہ پر رکھا تھا کہ منہ کے ساتھ ساتھ ناک بھی اس کے بڑے سے ہاتھ کے نیچے دب گئی تھی۔ منہ اور ناک دونوں پر جمے اس آہنی ہاتھ کی وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہو جائے گی۔ جسم کو توانائی فراہم کرنے والی آکسیجن کے رک جانے کے باعث وہ اب ڈھنگ سے مزاحمت بھی نہیں کر پا رہی تھی اور قریب تھا کہ کسی بھی لمحے بے بس ہو جائے گی کہ اچانک ہی اس کے بدن پر موجود بوجھ ہٹ گیا اور تازہ ہوا نے رک جانے والی سانسوں کا سلسلہ بحال کر دیا۔ اس نے نیچے زمین پر پڑے پڑے ہی اس تبدیلی کی وجہ جاننے کی کوشش کی اور اس کی نظر اسلم پر پڑی۔ وہ اس کے قریب کھڑا کینہ توز نظروں سے کچھ فاصلے پر پڑے زمین چاٹتے جمرو کو گھور رہا تھا۔ جمرو اور اسلم کے جثے کا ظاہری تقابلی جائزہ لیا جاتا تو یہ بات ناقابلِ یقین لگتی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ دبلے پتلے نظر آنے والے اسلم نے تنومند جمرو کو ماہ بانو پر سے اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔

ماہ بانو نے یہ منظر دیکھا اور ہمت کر کے اٹھ بیٹھی۔ چند ہی لمحوں میں جمرو نے اسے بُری طرح رگید ڈالا تھا۔ اس کا نازک بدن ایک طرف جمرو کے وزن تلے آکر کچل سا گیا تھا تو دوسری طرف جنگل کی زمین پر بچھی جھاڑ جھنکاڑ نے اس کے جسم پر کئی خراشیں ڈال دی تھیں مگر اس وقت وہ ان تکالیف سے زیادہ اپنے عریاں ہو جانے والے شانے کے باعث خود کو مجروح محسوس کر رہی تھی۔ مردوں کے اس معاشرے میں وہ جہاں بھی گئی تھی، کسی نہ کسی مرد نے اس سے اس کے عورت ہونے کا خراج لینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنے گھر کی محفوظ چار دیواری کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا تھا لیکن قسمت کے گرداب میں پھنس کر جب سے اس چار دیواری سے نکلی تھی، قدم قدم پر اس سے اس کی چادر چھیننے کی کوشش کی جاتی رہی تھی۔ اپنی اس بے بسی کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ آنکھوں سے بہتے اس پانی کے پار اس دھندلائے منظر کو دیکھنے لگی جس میں اسلم اور جمرو آپس میں نبرد آزما تھے۔

وہ دونوں ہی یقیناً غضب کے لڑاکے تھے اور بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے لیکن اسلم کے حملوں میں ایک جنونی سی کیفیت تھی۔ وہ مسلسل بڑبڑاتا ہوا جمرو پر تابڑتوڑ وار کر رہا تھا۔ جمرو کی کوشش تھی کہ اس کا وار روکنے کے ساتھ ساتھ اسے جوابی ضرب بھی لگا سکے۔ کبھی وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا اور کبھی ناکام رہتا۔ کامیابی اور ناکامی کے اس سلسلے میں وہ دونوں ہی لہولہان ہو رہے تھے لیکن دونوں میں سے ایک بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا وہ جانی دشمنوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ اچانک ہی جمرو کا داؤ چل گیا اور اس نے اسلم کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اسلم ایک درخت کے تنے سے جا کر ٹکرایا۔ ٹکرانے سے اس کی کمر پر چوٹ لگی اور وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ یہ لڑھکنا اس کی جان بچا گیا کیونکہ جمرو نے موقع ملتے ہی اپنا پسٹل نکال لیا تھا اور پے در پے کئی فائر بھی کر ڈالے تھے۔ اسلم کا جسم متحرک ہونے کی وجہ سے اس کا ہر نشانہ خطا گیا اور اسلم کو موقع مل گیا کہ خود کو ایک درخت کی آڑ میں چھپا

www.kahopakistan.com

سکے۔

''باہر آجا اسلم ورنہ میں تیری اس معشوقہ کو گولی ماردوں گا۔'' اسے چھپتے دیکھ کر جمرو نے اپنے پسٹل کا رخ ماہ بانو کی طرف کرلیا اور دھمکی دی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ فوراً ہی سامنے آگیا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر جمرو مسکرا دیا اور پسٹل کا رخ اس کے سینے کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''تو تو مجنوں کے کنبے کا بندہ لگتا ہے۔ معشوقہ کی جان خطرے میں دیکھ کر کس بے جگری سے سامنے آگیا۔ ایسی بے وقوفی تو کوئی دیوانہ ہی کرسکتا ہے۔ چل تجھے اپنی دیوانگی مبارک۔ آج تو بھی محبت کے شہیدوں میں شامل ہوجائے گا اور اس کے بعد تیری یہ معشوقہ ہم سب کا دل بہلانے کے کام آئے گی۔ یہ نیا آئٹم دیکھ کر دل خوش ہوگیا تھا لیکن تو اکیلا ہی اس کا مالک بن بیٹھا تھا۔ اب مزہ آئے گا۔'' وہ خباثت کا مظاہرہ کررہا تھا۔ ایک طرف کھڑی ماہ بانو اس صورت حال پر سخت متوحش تھی۔ اس نے جمرو کی دھمکی پر اسلم کا اپنی جان کی پروا کیے بغیر فوری طور پر سامنے آجانا بھی دیکھا تھا اور ایک بار پھر حیران ہوئی تھی کہ اس شخص کے دل میں اس کے لیے کتنی شدید چاہت ہے کہ وہ اپنا سارا مال اس کے لیے لٹا دینے کے بعد اب جان بھی قربان کرنے کو تیار ہے۔

اسلم کے جذبے کی اس شدت کو محسوس کرتی وہ موجودہ صورت حال میں اپنے کردار کا تعین کرنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اس نے یکدم ہی اسلم کو گولی کی سی تیزی سے جمرو کی طرف چھلانگ لگاتے دیکھا۔ وہ بھی پوری طرح تیار تھا۔ چنانچہ اس کے حرکت میں آتے ہی لبلبی دبا دی۔ فضا میں فائر کی آواز گونجی لیکن ماہ بانو یہ دیکھ کر متحیر رہ گئی کہ اسلم نے فضا میں ہی قلابازی کھا کر اپنا رخ بدل ڈالا اور جمرو کی چلائی ہوئی گولی اسے چھوئے بغیر ہی گزر گئی۔ ناکامی پر جمرو نے ایک فائر اور کرنا چاہا لیکن پسٹل سے گولی کے بجائے ٹھک کی آواز نکل کر رہ گئی۔ اسلم جس کے قدم زمین سے لگ چکے تھے، فوری طور پر جمرو پر جھپٹا۔ گولیاں ختم ہوجانے پر گھبرا جانے والا جمرو فوری طور پر اپنی طرف بڑھنے والی اس آندھی سے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں کرسکا اور اسلم نے اس کے بال جکڑ کر اس کا سر ایک درخت کے تنے سے ٹکرا دیا۔ اس نے یہ کام بہت زیادہ قوت سے کیا تھا لیکن جمرو کی خوش قسمتی سے درخت کا تنا کھوکھلا تھا جو اس کے سر کے ٹکرانے سے چرچر کی آواز سے ٹوٹتا چلا گیا اور اس کی کھوپڑی ٹوٹنے سے محفوظ رہی۔

''میں آج تیری یہ کھوپڑی ہی توڑ دوں گا تاکہ تو پھر کوئی شیطانی بات سوچ ہی نہیں سکے۔'' جنون میں مبتلا اسلم نے ایک بار پھر اسے بالوں سے جکڑ کر اس کا سر کہیں ٹکرانا چاہا لیکن ایک گونجیلی آواز اس کے ارادے کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔

''رک جاؤ اسلم!'' آواز میں رعب اور اتنا تحکم تھا کہ اسلم جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے منظر میں ایک سیاہ پوش داخل ہوا۔ اس کے پیچھے چند اور مزید افراد بھی تھے۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اس سیاہ پوش نے اسلم اور جمرو کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اس اسلم کے بچے کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہوگیا ہے سردار! اپنی معشوقہ کی خاطر یہ میری جان لینے پر تلا ہوا ہے۔'' جمرو نے پہل کی اور اپنی باچھوں سے بہنے والا خون آستین سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے سردار... واقعی میرے سر پر بھوت سوار ہے اور یہ بھوت اس خبیث کی جان لے کر ہی اترے گا۔'' اسلم نے جمرو کو کینہ توز نگاہوں سے گھورتے ہوئے بے خوفی سے جواب دیا۔

''دیکھا سردار... یہ خود اپنے منہ سے مان رہا ہے۔'' جمرو کو تو جیسے موقع مل گیا اپنی بات ثابت کرنے کا۔

''مان رہا ہوں، بالکل مان رہا ہوں کیونکہ میں تیری طرح بزدل اور حریص نہیں ہوں جو دوسروں کے مال پر نظر رکھوں۔'' اسلم نے دوبدو جواب دیا۔

''تیری اس گل کا کیا مطلب ہے اسلم؟'' سردار نے جمرو کے کچھ کہنے سے قبل اس سے پوچھا۔

''مطلب صاف ہے سردار! میں نے اس لڑکی کو اپنے لیے تم سے اس شرط پر مانگا تھا کہ گروہ کا کوئی دوسرا فرد اسے انگلی بھی نہیں لگائے گا اور تم نے میری شرط قبول کرکے سارے گروہ کو حکم دیا تھا کہ کوئی اس پر نظر نہ رکھے لیکن اس جمرو کمینے نے اس پر ہاتھ ڈالا۔ اگر میں ٹھیک وقت پر یہاں نہیں پہنچ جاتا تو یہ اپنا گھناؤنا ارادہ پورا کرچکا ہوتا۔'' اس نے سردار کو مختصراً سارا قصہ بتایا۔ ایک طرف بدن چرائے کھڑی ماہ بانو اپنے بارے میں کی گئی ناشائستہ گفتگو سن رہی تھی۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہ لڑکی خود میرے پیچھے آئی تھی۔ میں تو صرف ہوا خوری کے لیے ادھر آیا تھا لیکن اس نے میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ کہتی تھی اسلم جیسے نامرد کے ساتھ میرا جی نہیں لگتا، بس تو پھر میں بھی بہک گیا۔ عورت خود بلائے تو کون انکار کرسکتا ہے۔'' جمرو نے نہایت خباثت سے کہانی بنا کر سنائی۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں تو اسلم کی پھلواری میں بیٹھی تھی کہ مجھے للّی کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں اس کی آواز سن کر دوڑی تو دیکھا یہ شخص اس کے ساتھ زبردستی کررہا تھا۔ میں پہلے بھی اس کی للّی کے ساتھ بدتمیزی کو دیکھ چکی تھی اس لیے مجھے غصہ آگیا اور میں نے للّی کو اس سے بچانے کی کوشش کی جس پر یہ غصے میں مجھ پر ہی حملہ آور ہوگیا۔ اگر اسلم وقت پر یہاں پہنچ کر مجھے اس سے نہیں بچاتا تو یہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہوجاتا۔'' جمرو کے صاف جھوٹ پر اب تک خاموش تماشائی بن کر کھڑی ماہ بانو خاموش نہیں رہ سکی اور تڑپ کر فوراً ہی بولی۔

''للّی کہاں ہے؟'' اس کا بیان سن کر سردار نے سوال کیا تو اسے پہلی بار للّی کی غیر موجودگی کا احساس ہوا جس کے لیے اس نے خود کو مشکل میں ڈالا تھا۔ وہ اس کی مشکل میں کوئی مدد کرتی ہوئی نظر نہیں آئی تھی بلکہ سرے سے منظر سے ہی غائب ہوگئی تھی۔

''تھوڑی دیر پہلے تو وہ یہیں تھی۔ شاید کسی کو مدد کے لیے بلانے گئی ہو۔'' اس نے خوش گمانی سے کام لیا۔

''تم تینوں میرے ساتھ آؤ۔'' سردار نے اسلم، جمرو اور ماہ بانو سے کہا اور پھر اپنے ساتھ آنے والوں میں سے ایک کی طرف پلٹ کر بولا۔ ''للّی کو دیکھو کہاں ہے۔ اس سے کہو کہ فوراً میرے پاس پہنچے۔'' احکامات صادر کرنے کے بعد وہ لمحہ بھر بھی وہاں ٹھہرے بغیر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں کوئی اس کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کرے گا۔ جس آدمی کو اس نے للّی کو بلانے کے لیے بھیجا تھا، وہ فوراً ہی روانہ ہوگیا اور باقی نے ان تینوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ تینوں خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑے۔ اسلم نے اپنی جیکٹ ماہ بانو کو پہننے کے لیے دے دی تھی تاکہ اس کا عریاں جسم چھپ سکے۔ جب وہ لوگ جنگل سے نکل کر اس مقام پر پہنچے جہاں ان کی رہائشی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں اور زندگی کا دیگر کاروبار بھی جاری رہتا تھا تو ادھر ادھر بکھرے اپنے کاموں میں منہمک لوگ پلٹ پلٹ کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں حیرت اور تجسس تھا۔ یقیناً وہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ سب کیا تھا لیکن ان میں سے کسی نے زبان سے سوال کرنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ سب خاموشی سے چلتے ہوئے سردار کی رہائش گاہ تک پہنچ گئے۔ رہائش گاہ بھی جھونپڑی کی طرز کی بنی ہوئی تھی۔ سردار ان سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا اور ایک رنگین پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس نے ان تینوں کو ہاتھ سے اشارہ کرکے ایک طرف بیٹھنے کا حکم دیا تو وہ زمین پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گئے۔

زندگی کے اتنے لوازمات کے ساتھ ان ڈاکوؤں کے جنگل میں قیام سے صاف ظاہر تھا کہ یہاں باقاعدگی سے سازوسامان پہنچتا رہتا ہے اور ظاہر ہے ایسا بیرونی امداد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

انہیں انتظار میں بٹھا کر سردار خود نائو نوش میں مصروف ہوگیا۔ یقیناً وہ للّی کے انتظار کے لمحات کو بوریت سے بچانا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس وہ تینوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے پر مجبور تھے۔ اسلم اور جمرو البتہ وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے دیکھ لیتے تھے۔ سردار کے حکم کے باعث وہ للّی کی آمد تک وہاں ایک ساتھ بیٹھنے پر مجبور تھے اور للّی تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ جانے وہ کہاں تھی اور اس آدمی کو مل بھی سکی تھی یا نہیں جو اسے بلانے کے لیے گیا تھا۔ آخر اللہ اللہ کرکے ان کا یہ انتظار ختم ہوا اور للّی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اور ان سے قطرہ قطرہ پانی بہہ کر اس کی پشت کو بھگو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی غسل کیا ہو اور سردار کے بلانے پر بغیر بال خشک کیے سیدھی یہاں چلی آئی ہو۔

''کدھر تھی للّی... آنے میں اتنی دیر کیوں کردی؟'' سردار نے انگور کی بیٹی کا جام ایک سانس میں چڑھا کر اس سے پوچھا۔

''نہا رہی تھی سردار! نورے نے تمہارا پیغام دیا تو بغیر بال خشک کیے جو ہاتھ لگا پہن کر سیدھی یہاں پہنچ گئی۔'' اس نے اٹھلا کر جواب دیا۔ اس کی ادائے بے نیازی دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ یہاں جو عدالت لگی ہے، اس میں وہ اپنے گواہ کے کردار سے قطعی ناواقف ہے۔

''اس سے پہلے تو کدھر تھی؟'' سردار نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اپنی جھونپڑی میں جاکر ذرا دیر لیٹ گئی تھی۔ چولہا جلانے کے لیے لکڑیاں کاٹتے کاٹتے کمر اکڑ گئی تھی، میں نے سوچا ذرا دیر لیٹ کر کمر سیدھی کرلوں۔'' اس نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر لہراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی ان اداؤں کو دیکھتے ہوئے ماہ بانو حیران تھی کہ کیا یہ وہی عورت ہے جس نے اس کے سامنے اپنی مظلومیت کا رونا رویا تھا۔ اس وقت تو وہ کسی ستم زدہ سے زیادہ مردوں کو لبھانے کے لیے ادائیں دکھانے والی طوائف لگ رہی تھی۔

''کیا جمرو تجھے اپنے ساتھ زبردستی جنگل میں لے کر گیا تھا؟''

''پر وہ کس لیے؟ جمرو کو بھلا میرے ساتھ زبردستی

www.kahopakistan.com

کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' سردار کے سوال پر اس نے بے پناہ حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا، اسے سن کر ماہ بانو دنگ رہ گئی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو للی؟ میں نے خود جمرو کو تمہارے ساتھ زبردستی کرتے دیکھا تھا۔ تمہیں بچانے کے لیے غصے میں اس پر وار بھی کر دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ تمہارے ساتھ ایسا کر چکا ہے۔ اس وقت بھی میں اسلم کی پھلواری میں موجود تھی اور تمہاری چیخ و پکار سن کر وہاں پہنچی تھی تو تم نے روتے ہوئے مجھے اپنے سارے حالات سنائے تھے کہ کیسے تم یہاں تک پہنچیں اور یہاں تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے۔'' وہ گویا للی کی کھو جانے والی یادداشت کو واپس لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم کدھر کی باتیں کر رہی ہو؟ کہیں تم نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟ میں نے تمہیں اپنے یہاں پہنچنے کا قصہ ضرور سنایا تھا لیکن جنگل میں نہیں بلکہ کپڑے دھونے کے دوران بات چیت کرتے ہوئے۔'' وہ کسی بک جانے والے گواہ کی طرح جھوٹ پر جھوٹ بول رہی تھی۔

''تم سچ کیوں نہیں بول رہی ہو للی؟ کیا تمہیں کسی کا ڈر ہے؟'' ماہ بانو کی خوش گمانی اسے یہ قبول کرنے سے روک رہی تھی کہ وہ للی کو جھوٹا سمجھ سکے۔

''میں کسی سے کیوں ڈرنے لگی؟ جو سچ ہے وہی بول رہی ہوں۔'' اس نے ماہ بانو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا تو وہ بالکل ہی گنگ ہو گئی۔ اتنے سفید جھوٹ کے سامنے اس کا سچ بھلا کہاں چل سکتا تھا لیکن وہ حیران تھی کہ للی ایسا کیوں کر رہی ہے۔ اس نے تو اس کے ساتھ بھلائی ہی کی تھی اور اس بھلائی کا یہ صلہ ہرگز بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اسے سردار کے سامنے یوں جھوٹا ثابت کیا جاتا۔

''جو ہم دونوں کو بتانا تھا وہ ہم بتا چکے ہیں سردار! اب تمہاری مرضی ہے کہ تم ہمیں سچا مانو یا نہیں۔ فیصلہ اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' ماہ بانو، للی کو سچ بولنے پر اکسانے کے لیے شاید کچھ اور بھی کہتی لیکن اسلم نے یک دم ہی دخل اندازی کرتے ہوئے اسے ہاتھ کے اشارے سے بولنے سے روکا اور خود سردار سے مخاطب ہو کر بولا۔ سردار ان سب کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے گفتگو کے دوران کسی قسم کی دخل اندازی قطعی نہیں کی تھی لیکن ہر ایک کا کہا ایک ایک لفظ بہت توجہ سے سنا تھا۔ جب اسلم نے بحث ختم کر کے فیصلے کے لیے بال اس کے کورٹ میں ڈال دی تو وہ جمرو اور للی کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم دونوں کو کچھ اور کہنا ہے؟'' اس نے ان سے پوچھا۔ دونوں نے ہی نفی میں گردن ہلا دی۔

''تم لوگوں کے درمیان کیا ہوا اور کیا نہیں، اس کی حقیقت جاننے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی میں تم سے کسی ایک کو سچا اور دوسرے کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے اپنے گروہ میں پھوٹ نہیں چاہیے۔ تم لوگ زنانیوں کے پیچھے آپس میں لڑ مرو گے تو میں اگلی واری کوئی گل سنے بغیر ان زنانیوں کو ہی گولی مار دوں گا۔'' سردار نے بڑے طمطراق سے مختصر الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا ڈالا۔ وہ سب اس کا فیصلہ سن کر سر جھکائے کھڑے رہے۔ جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ فی الحال ان میں سے کسی کو کوئی سزا نہیں دی جا رہی اور صرف تنبیہ کر کے چھوڑا جا رہا ہے۔

''جاؤ اب جا کر اپنے اپنے دھندوں سے لگو۔'' سردار کا بارعب حکم ان سب کے لیے پروانۂ آزادی تھا۔ فیصلہ سن لینے کے باوجود ان میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ سردار کی طرف سے اجازت ملے بغیر وہاں سے جا سکے۔ اجازت ملتے ہی وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے وہاں سے باہر نکل گئے۔ باہر نکل کر جمرو تو تیز تیز قدموں سے چل کر آگے بڑھ گیا لیکن اسلم نے للی کو جا لیا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف گھمایا۔

''آئندہ ایسی اوچھی حرکت مت کرنا۔'' وہ للی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔

''محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے ڈارلنگ۔'' اس نے ایک آنکھ دبا کر اسے جواب دیا۔

''تو پھر جان لو کہ میں سب سے پہلے تمہارا قتل جائز سمجھوں گا۔'' اسلم نے قہر آلود لہجے میں دھمکی دی۔

''تمہارے ہاتھوں ماری بھی گئی تو غم نہیں ہوگا۔'' اس پر جیسے اسلم کے غصے کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''تجھے نہ سہی پر یہ جو تیرے اتنے سارے خصم ہیں انہیں تو غم ہوگا۔ کیوں بے موت مر کر ان ساروں کو رنڈوا کرے گی؟'' اسلم کے لہجے میں واضح طنز اور حقارت تھی۔ للی کے چہرے کا رنگ پل بھر کے لیے بدل گیا پھر وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اگر کسی ایک نے ہمیں اپنا لیا ہوتا تو آج یہ طعنہ نہیں سننا پڑتا۔'' اس کا جواب سن کر اسلم کی اس کے بازو پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

''جو کچھ ہوا، اس کا کم سے کم اتنا فائدہ تو ہوا کہ تم نے تھوڑی دیر کے لیے سہی ہمارا ہاتھ تو تھاما۔'' اسلم کو ڈھیلا پڑتا

دیکھ کر وہ یک دم شوخ ہوئی۔

''ذرا سامنہ کیا لگا لو سالی گلے ہی پڑنے لگتی ہے۔'' وہ بُرا سا منہ بنا کر بڑبڑاتا ہوا اسے دھکا دے کر وہاں سے ہٹ گیا۔

''مار ڈال ظالم! تیرے ہاتھوں مری تو سمجھوں گی کہ امر ہو گئی۔'' وہ ایک سسکاری سی لے کر بولی اور خود فراموشی کے عالم میں اپنا وہ بازو نہایت پیار سے سہلانے لگی جو کچھ دیر قبل اسلم کی گرفت میں تھا۔ اس سارے قصے میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتی ماہ بانو ہکا بکا سی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ للی کی شخصیت کے عجیب و غریب رنگوں نے اسے حیران کر دیا تھا۔ وہ عورت بیک وقت شعلہ و شبنم تھی لیکن کس کے لیے کب شعلہ ثابت ہوگی اور کس کے لیے شبنم یہ جاننا ذرا مشکل تھا۔

☆☆☆

آفتاب پریشانی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ رات میں کشور کو لے کر یہاں پہنچا تھا اور ابھی تک کوئی تسلی بخش جواب سننے کو نہیں ملا تھا۔ ہر بار سوال کرنے پر عملے کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ ہم اپنی کوشش کر رہے ہیں، آپ دعا کریں۔ مریضہ کا خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے اس لیے فی الحال ان کی حالت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ گھنٹوں سے کسی اچھی اطلاع کے انتظار میں اسپتال کے کوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک جاتا تو کچھ دیر کے لیے کسی بینچ پر بیٹھ جاتا۔ گزری رات کا ہر پل کسی بھیانک خواب کی طرح اس کے ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ را کے مبینہ ایجنٹ غلام محمد کا چوری چھپے رات گئے ان کے گھر میں داخل ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ عجیب معاملہ تھا کہ وہ اور غلام محمد دونوں اپنی شناخت چھپا کر اس چھوٹے سے گاؤں میں آ بسے تھے اور دونوں کا ہی ایک دوسرے کو شناخت کر لینا ان کے اپنے اپنے حساب سے ضرر رساں ثابت ہو سکتا تھا۔ ان کے درمیان فرق تھا تو یہ کہ آفتاب اور کشور اپنے دشمنوں سے چھپ کر یہاں آ بسے تھے اور غلام محمد دشمنی کرنے کے لیے یہاں رہ رہا تھا۔ را کے ایجنٹ کی حیثیت سے وہ ہر پاکستانی کا دشمن تھا اور دشمنی کے اس رشتے کو نبھانے کے لیے اس نے بہت چالاکی سے ایک پارسا اور پرہیزگار آدمی کا روپ اختیار کیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے زیادہ خطرناک تھا جو دوسروں پر گولیاں چلا کر انہیں قتل کر ڈالتے ہیں۔ گولیاں چلانے والے تو صرف انسانی جسموں کے قاتل تھے جبکہ وہ ذہن اور روح کو قتل کر ڈالنے میں مصروف تھا۔ جانے اس نے کتنے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کر کے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے انہیں اپنا معمول بنا ڈالا تھا۔ اس شخص نے پیر آباد میں بھی یہی کارنامہ انجام دیا تھا اور اب اس گاؤں میں بھی یہی کر رہا تھا۔

آفتاب نے اسے شناخت کر لیا تھا اور چاہتا تھا کہ شہریار کو اطلاع دے کر اس کے خلاف کوئی کارروائی ہونے تک خود کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھے لیکن اس کی اسی احتیاط نے غلام محمد کو ٹھٹکا دیا اور وہ اس کے بارے میں جاننے کے لیے رات گئے خاموشی سے اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے آفتاب کو اس کے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود شناخت کر لیا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی آفتاب کے بجائے کشور کو جا لگی۔ کشور کو زخمی دیکھ کر آفتاب جنون میں اس سے جا ٹکرایا لیکن اس کا اور ایک تربیت یافتہ ایجنٹ کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ عین موقع پر شہریار اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تو نہ صرف غلام محمد پر قابو پا لیا گیا بلکہ کشور کو بھی طبی امداد کے لیے پنڈی کے اس اسپتال تک پہنچانا ممکن ہو سکا۔ اس کے ساتھ اسپتال آنے والے شہریار کے ساتھیوں نے ہی اسپتال کے معاملات نمٹائے۔ اب وہ جس پریشانی میں مبتلا تھا، وہ کشور کے بارے میں خوش خبری سنے بغیر کسی صورت ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ رشتوں کے معاملے میں بہت مفلس آدمی تھا۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث وہ ان کے انتقال کے بعد اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ کشور اس کا واحد رشتہ تھی اور اپنے وجود میں پلتے بچے کے ذریعے اسے ایک اور خوب صورت رشتہ دینے جا رہی تھی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو وہ ان دونوں رشتوں سے محروم ہو جاتا۔ اس نے کشور کو پانے کی خاطر بہت کچھ کھویا تھا اور اب اسے کھونے کے لیے کسی طور تیار نہیں تھا لیکن اس کی بے دستور تشویش ناک حالت کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ اس وقت وہ ایک نڈر اور بے باک صحافی کے بجائے ڈرا سہما خوف زدہ انسان تھا جو اپنی خواہش کے خلاف کچھ نہیں سننا چاہتا تھا۔

خوف اور پریشانی کے اس عالم میں بیٹھے نہ جانے کتنے لمحے بیت گئے تھے کہ نسوانی سسکیوں کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے نظر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جو اس کے ساتھ والی بینچ پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ یہ اسپتال تھا اور اسپتال میں ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہی رہتے ہیں۔ لوگ اپنے پیاروں کی زندگیاں بچانے کے لیے اسپتالوں میں لاتے ہیں لیکن ہر ایک زندگی کی نوید لے کر جائے، یہ ضروری نہیں ہوتا۔ اس بے چاری کے ساتھ بھی یقیناً ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا اور یہ کوئی اتنی غیر معمولی

www.kahopakistan.com

بات نہیں تھی کہ وہ اس کی طرف مستقل متوجہ رہتا۔ اس کی توجہ اصل میں ان دو پولیس والوں نے کھینچی تھی جو اس لڑکی کے ساتھ تھے۔

"یہ پانی پی لو بی بی اور ذرا حوصلے سے کام لے کر بتاؤ کہ تمہارے والد کے ساتھ کیا ہوا اور انہیں کن لوگوں نے قتل کیا؟" وہ جوان العمر پولیس انسپکٹر کافی مہذب تھا جو اس کی حالت کو سمجھ کر اس سے نرم لہجے میں مخاطب تھا ورنہ پولیس کی نوکری میں ہر طرح کے کیسز بھگتاتے وہ لوگ عموماً اتنے سخت دل ہو جاتے ہیں کہ کسی کے مرنے جینے سے قطع نظر انہیں بس اپنا کام نمٹانے سے غرض ہوتی ہے۔ پولیس انسپکٹر کی ہدایت پر لڑکی نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے اس کے ساتھی کا بڑھایا ہوا گلاس تھاما اور مشکل سے دو گھونٹ پانی پی کر گلاس واپس کر دیا لیکن پانی کے یہ دو گھونٹ بھی کافی کارآمد ثابت ہوئے تھے اور اس کی سسکیاں بہت دھیمی پڑ گئی تھیں۔

"تمہارا نام کیا ہے بی بی؟" اسے بہتر حالت میں پا کر پولیس انسپکٹر نے سوال کیا۔ فاصلہ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے آفتاب ان کی ساری گفتگو آسانی سے سن رہا تھا۔

"مہک... مہک شفیق۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔

"تمہارے والد کے ساتھ جو ہوا اس کے بارے میں تم جو کچھ بھی جانتی ہو بتا دو۔"

"میری کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ تو ایک بہت سیدھے سادے اپنے کام سے کام رکھنے والے آدمی تھے۔ ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی پھر بھی جانے وہ کون ظالم تھے کہ ان کی جان لے گئے۔" اس نے رقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"تم ہمیں واقعے کی تفصیل بتاؤ، باقی مجرموں تک پہنچنا ہمارا کام ہے۔" انسپکٹر نے مثالی تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک اور زاویے سے اپنا سوال دہرایا۔

"رات کو جب میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئی تو بابا کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے یونیورسٹی جانا تھا اس لیے میں سو گئی۔ نیند میں مجھے ایسا لگا کہ ہمارا دروازہ بج رہا ہے لیکن نیند کے غلبے کی وجہ سے میں نے دھیان نہیں دیا پھر شاید مجھے کچھ لمحوں کے لیے جھپکی سی آ گئی اور دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے گھر کے اندر قدموں کی چاپ سنی۔ یہ ایک سے زیادہ افراد کے چلنے کی آواز تھی اس لیے مجھے حیرت ہوئی اور میں یہ دیکھنے کے لیے کہ اتنی رات گئے کون بابا سے ملنے آیا ہے، اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ آوازوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ آنے والوں کو بابا اپنے کمرے میں ہی لے گئے ہیں چنانچہ میں اس طرف ہی چلی گئی لیکن پھر یہ سوچ کر کہ آنے والے جانے کون ہیں اور بابا میرا ان کے سامنے آنا پسند بھی کریں گے یا نہیں، میں باہر ہی رک گئی اور اندر کی آوازیں سننے لگی۔ وہ لوگ بابا سے کسی ماسٹر آفتاب کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" لڑکی کا یہ جملہ سن کر آفتاب بُری طرح چونکا اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ اس نے اپنے باپ کا جو نام بتایا تھا، اس نام کے کسی شخص سے بھی وہ واقف نہیں تھا پھر وہ لوگ کیوں اس کا اتا پتا معلوم کرنے وہاں پہنچ گئے تھے؟ یا پھر وہ کوئی دوسرا ماسٹر آفتاب تھا جسے تلاش کیا جا رہا تھا؟ اس کے اندر اٹھتے سوالوں سے بے خبر لڑکی اپنا بیان دینے میں مصروف تھی۔

"بابا نے انہیں بتایا کہ وہ کسی ماسٹر آفتاب کو نہیں جانتے لیکن انہوں نے بابا کی بات نہیں مانی اور ان کے ساتھ مار پیٹ شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر میں بہت خوف زدہ ہو گئی تھی لیکن پھر بھی میں نے ہمت سے کام لیا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تاکہ پولیس کو فون کر سکوں۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے پہلے لینڈ لائن سے فون کرنے کی کوشش کی لیکن ریسیور اٹھاتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ ہمارا فون کل سے ڈیڈ پڑا ہے اور کمپلین کروانے کے باوجود ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ گھبراہٹ میں مجھے اپنا سیل فون بھی نہیں مل رہا تھا۔ میں کمرے میں ادھر اُدھر اسے تلاش کرتی رہی پھر مجھے اپنے بیگ میں دیکھنے کا خیال آیا۔ بیگ میں مجھے اپنا سیل فون مل گیا۔ سیل فون ملتے ہی میں نے جلدی سے ایمرجنسی نمبر پر کال کر کے آپ لوگوں کو اطلاع دی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ آنے والے واپس جا رہے ہیں۔ میں نے کمرے سے باہر نکل کر دیکھا، وہ دو آدمی تھے جو بھاگتے ہوئے باہر جا رہے تھے۔ میں جلدی سے بابا کے کمرے میں گئی تاکہ انہیں دیکھ سکوں، وہ نیچے فرش پر گرے ہوئے تھے اور صاف لگ رہا تھا کہ ان پر تشدد کیا گیا ہے۔ میں نے ان کے قریب جا کر انہیں بہت آوازیں دیں لیکن انہوں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔" بہت حوصلے سے پورا واقعہ سناتی لڑکی اس مقام پر آ کر ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس سے آگے کا ماجرا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لڑکی نے باپ کے زندہ ہونے کی امید پر کسی نہ کسی طرح انہیں اسپتال پہنچانے کا بندوبست کیا ہوگا اور وہ بے چارہ آدمی نہ جانے گھر پر ہی مر گیا تھا یا اسپتال پہنچ کر زندگی کی بازی ہارا تھا اور اب اس کی بیٹی بیٹھی پولیس والوں کو اپنا بیان ریکارڈ کروا رہی تھی۔ آفتاب اس کے بیان سے اندازہ لگا چکا تھا کہ ان باپ بیٹی کے علاوہ گھر میں کوئی دوسرا فرد نہیں تھا، جب ہی وہ لڑکی تنہا ساری صورتِ حال سے نمٹ رہی تھی۔ اسے اس پر بڑا رحم آیا۔ کسی اکیلی لڑکی کا اس طرح کے حالات سے نمٹنا بہت مشکل تھا۔ وہ تو پھر بھی غنیمت تھا کہ اس کا بیان لینے والا پولیس انسپکٹر معقول آدمی تھا ورنہ تو پولیس والے تو اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتے ہیں، ایک لڑکی کی ان کے سامنے حقیقت ہی کیا تھی۔ کشور کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ اس معاملے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس نے اپنے بیان میں ماسٹر آفتاب کا نام استعمال کیا تھا۔ جانے وہ ماسٹر آفتاب وہ خود تھا یا کوئی اور؟ حقیقت جاننے کے لیے اسے کوشش تو کرنی ہی تھی۔ اگر شفیق کے قاتل واقعی اسے ڈھونڈ رہے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اور کشور، چودھری کی پہنچ سے زیادہ دور نہیں ہیں۔

"کیا تم خود کسی ماسٹر آفتاب نامی شخص کو جانتی ہو؟" لڑکی کی حالت سے قطع نظر پولیس کے لیے کیس کی تحقیق زیادہ ضروری تھی چنانچہ انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔ جواب میں لڑکی نے رخسار پر بہتے آنسوؤں کو انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے محض نفی میں سر ہلا دیا۔

"تمہارے والد کی کسی سے کوئی دشمنی تھی کیا؟"

"نہیں، وہ دشمنیاں پالنے والے آدمی نہیں تھے۔ وہ تو اپنے نام ہی کی طرح بہت شفیق تھے۔" لڑکی نے بڑے دل گیر لہجے میں جواب دیا۔

"پھر بھی، ہوسکتا ہے کوئی کاروباری دشمنی ہو؟" پولیس انسپکٹر نے اسے اکسایا۔

"ایک بُک شاپ چلانے والے آدمی کی کسی سے کیا کاروباری دشمنی ہو سکتی ہے؟" لڑکی کا جواب سن کر آفتاب کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ شفیق نامی ایک شخص کو جانتا ہے۔ وہ شخص مہک بُک شاپ کا مالک تھا لیکن عموماً لوگ اسے خان صاحب کہہ کر پکارتے تھے اس لیے اس کے ذہن میں فوری طور پر اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ انسپکٹر کے پوچھنے پر لڑکی نے اپنا نام مہک بتایا تھا۔ باپ نے بیٹی کی محبت میں اپنی بُک شاپ کا نام بیٹی کے نام پر رکھ ڈالا تھا۔ اسے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ اسے ڈھونڈنے والے شفیق خان کے گھر کیوں پہنچے۔ اس نے شہریار کو رابطے کے لیے مہک بُک شاپ کا ہی ٹیلی فون نمبر دیا تھا۔ یقیناً اس کے دفتر میں چودھری کا کوئی مخبر تھا جس نے اس کے اور شہریار کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر نمبر چودھری تک پہنچا دیا اور اس کے گرگے فوراً ہی اسے ڈھونڈتے ہوئے شفیق کے گھر پہنچ گئے لیکن بے چارہ شفیق خان کیسے انہیں کسی ماسٹر آفتاب کے بارے میں بتا سکتا تھا؟ وہ اسے اس نام سے جانتا ہی نہیں تھا۔ اس سے تو آفتاب نے خود کو احمد کے نام سے متعارف کروایا تھا اور اس تعارف نے جہاں اسے اور کشور کو بچا لیا تھا، وہیں بے چارہ شفیق خان بے قصور مارا گیا تھا۔ شفیق کی موت پر دلی رنج محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے دل میں شہریار کی معاملہ فہمی کو بھی سراہا۔ اس نے اسے اپنے دفتر کے نمبر پر زیادہ تفصیلی بات کرنے ہی نہیں دی تھی اور فون نمبر لے کر موبائل سے کال کی تھی۔ اگر وہ یہ احتیاط نہیں کرتا تو غلام محمد کے معاملے جیسا حساس ایشو بھی کھل سکتا تھا۔

"مبارک ہو سر! آپ کی مسز اب خطرے سے باہر ہیں اور آپ کا بے بی بھی سیو ہے۔" وہ اس معاملے پر غور و فکر کر ہی رہا تھا کہ ایک نرس نے قریب آ کر اسے خوش خبری سنائی۔

"تھینکس گاڈ۔" آفتاب کے لبوں سے بے ساختہ ہی شکرانے کے الفاظ نکلے۔ اطلاع لے کر آنے والی نرس مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔

"شکر ہے میرے مالک تُو نے مجھے ایک بڑی مشکل سے نکال دیا۔ آگے بھی تُو ہی میری مدد فرما۔" نرس کے جانے کے بعد وہ دل ہی دل میں اللہ سے مخاطب ہوا کیونکہ اس سے بہتر بھلا کون جانتا تھا کہ بے شک فی الحال کشور خطرے سے نکل آئی ہے لیکن چودھری نام کا خطرہ تو بہرحال مسلسل ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔

☆☆☆

"میں للّی کو سمجھ نہیں سکی۔ بڑی عجیب و غریب عورت ہے۔ اپنے یہاں تک پہنچنے کی جو داستان اس نے سنائی تھی، اسے سن کر تو یہی لگا تھا کہ وہ بہت مظلوم ہے لیکن سردار کے سامنے اس نے جس طرح رنگ بدلا، میں حیران رہ گئی۔ اس کے اور جمرو کے درمیان جو کچھ ہوا، وہ اسے نہ جانے کیوں سردار سے چھپا گئی۔ وہ جمرو سے ڈرتی ہے یا اس نے اور جمرو نے مل کر کوئی ڈراما کھیلا تھا، مجھے بالکل سمجھ نہیں آیا۔ آخر اسے ضرورت ہی کیا پڑی تھی میرے ساتھ یہ ڈراما کرنے کی؟" وہ اسلم کے ساتھ اس کی لگائی گئی پھلواری میں بیٹھی تھی اور اس سے گزرے ہوئے واقعے پر بات کر رہی تھی۔

"تمہاری سب سے خاص بات ہی یہ ہے کہ تم بہت خالص ہو اور اپنے اس خالص پن کی وجہ سے دوسروں میں موجود کھوٹ کو پہچان نہیں سکتیں۔" اسلم نے پورے وثوق

www.kahopakistan.com

سے تبصرہ کیا۔
''تمہیں کیسے معلوم؟ تم تو مجھے ڈھنگ سے جانتے بھی نہیں ہو۔'' اسلم کی بات سن کر اس نے ذرا جھینپتے ہوئے گویا اس کا خود پر کیا جانے والا تبصرہ قبول کرنے سے انکار کیا۔
''کسی کو جاننے کے لیے ماہ و سال کی گنتی بے کار ہے، خاص طور پر تمہارے بارے میں تو بہت آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اتنی شفاف اور حیادار آنکھیں تو بس اسی انسان کی ہو سکتی ہیں جو اندر سے بہت خالص ہو۔'' اس کے پاس اپنی رائے کے حق میں دلیل موجود تھی جسے سن کر وہ مزید جھینپنے پر مجبور ہوگئی۔ اسلم کے اپنے لیے جذبات اب اس کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اسے کتنی شدت سے چاہتا ہے اور قسمت کی اس ستم ظریفی پر حیران بھی تھی۔ جس شخص کی چاہت کے لیے اس کے دل نے تمنا کی تھی، وہ تو کبھی اس پر کھلا نہیں تھا اور یہاں اس جنگل بیابان میں ایک شخص اس حد تک اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا کہ اپنا سب کچھ اس پر لٹا دینے کے لیے تیار تھا۔
''میرے بارے میں تبصرہ کرنا چھوڑو اور مجھے للی کے بارے میں بتاؤ۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' اسلم کو مزید کسی طرح کے اظہار سے روکنے کے لیے اس نے للی کو ہی موضوعِ گفتگو بنائے رکھنے کی کوشش کی۔
''للی نے اپنے ماضی کے بارے میں تمہیں جو کچھ بھی بتایا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس میں جھوٹ شامل نہیں ہوگا۔ وہ واقعی ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے اندر برائی کا عنصر بھی موجود ہے جو موقع ملتے ہی بڑی شدت سے ابھرتا ہے۔ ماں باپ کی نافرمانی کر کے شوبز کی رونقوں کو اپنا لینے کا فیصلہ کوئی سیدھی سادی اور نیک فطرت لڑکی کسی صورت نہیں کر سکتی۔''
''ایسا تو بہت لڑکیاں کر جاتی ہیں اور عموماً یہ وہی لڑکیاں ہوتی ہیں جو بہت معصوم اور سادہ ہوتی ہیں اور گھاگ شکاری انہیں آسانی سے شکار کر لیتے ہیں۔'' اس نے اسلم کے للی کے بارے میں کیے گئے تبصرے کو قبول کرنے سے انکار کیا۔
''چلو پہلی بار کے لیے میں اسے رعایت دے دیتا ہوں لیکن یہاں آنے کے بعد وہ جس طرح مردوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی، اس بارے میں تم کیا کہو گی؟ آئی ایم شیور کہ اتنی ذلت بھری زندگی تو کسی طوائف کو بھی منظور نہیں ہوگی، کسی شریف لڑکی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شریف لڑکیاں تو ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہیں۔'' وہ للی کے بارے میں اپنی رائے پر ثابت قدمی سے ڈٹا ہوا تھا۔
''اگر تمہیں میری بات غلط لگ رہی ہے تو بتاؤ کہ کیا تم اپنے لیے ایسی زندگی کو قبول کر لیتیں؟''
''ہرگز نہیں۔ میں ایسی زندگی کے بجائے اپنے لیے موت کو قبول کرتی۔'' اس نے اسلم کے سوال کا تیزی سے جواب دیا۔
''تو پھر ثابت ہوا کہ للی ایک کرپٹ عورت ہے۔''
''میں تمہیں للی کو کریکٹر سرٹیفکیٹ ایشو کرنے کا نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں صرف اس کے رویّے کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔'' اسلم کی بات سن کر اس نے قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔
''وجہ میں ہوں۔'' وہ بڑی فرصت میں تھا چنانچہ بڑے اطمینان سے گفتگو کر رہا تھا۔
''میں سمجھی نہیں۔''
''بات بہت واضح ہے۔ للی کے مطابق وہ میری محبت میں مبتلا ہے۔ جب وہ یہاں آئی تھی تو شروع میں اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے عورت ذات سے اس حد تک دلچسپی نہیں ہے کہ نفس کی تسکین کے لیے کسی بھی عورت کو قبول کر لوں۔ للی بھی میرے مطلب کی عورت نہیں ہے اس لیے اسے میری طرف سے مایوسی اٹھانی پڑی۔ مایوس ہو کر اس نے میرے پیچھے پڑنا بھی چھوڑ دیا لیکن جب سے تم یہاں آئی ہو، اس کی میرے لیے سوئی ہوئی محبت پھر جاگ گئی ہے۔ درحقیقت وہ تم سے جیلس ہے اور اسی جیلسی میں اس نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اور جمرو دونوں مل کر اپنے اپنے مفاد کے لیے ڈراما کر رہے تھے۔ میرے ساتھیوں میں جمرو عورت کے بارے میں سب سے زیادہ ندیدہ ہے۔ تم یہاں پہنچی تھیں تو تمہیں دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگی تھی لیکن جب سردار نے میری فرمائش قبول کر لی تو وہ بُری طرح تلملایا۔ یقیناً وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح تمہیں حاصل کر سکے اور اس کے لیے یہ موقع للی کے سازشی ذہن نے پیدا کر دیا۔ تمہیں جمرو کے ہاتھوں ذلیل کروا کر وہ مجھے نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ اگر وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتی تو مجھ سے بڑے طنز سے کہتی کہ جس عورت کو تم نے بہت پاکیزہ سمجھ کر اپنے لیے منتخب کیا تھا، اب وہ بھی میلی ہو گئی ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ میں عین وقت پر وہاں پہنچ گیا اور جمرو اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو جیسے ابھی للی نے سردار کے سامنے اس کا ساتھ دیا تھا، ویسے ہی تب بھی

www.kahopakistan.com

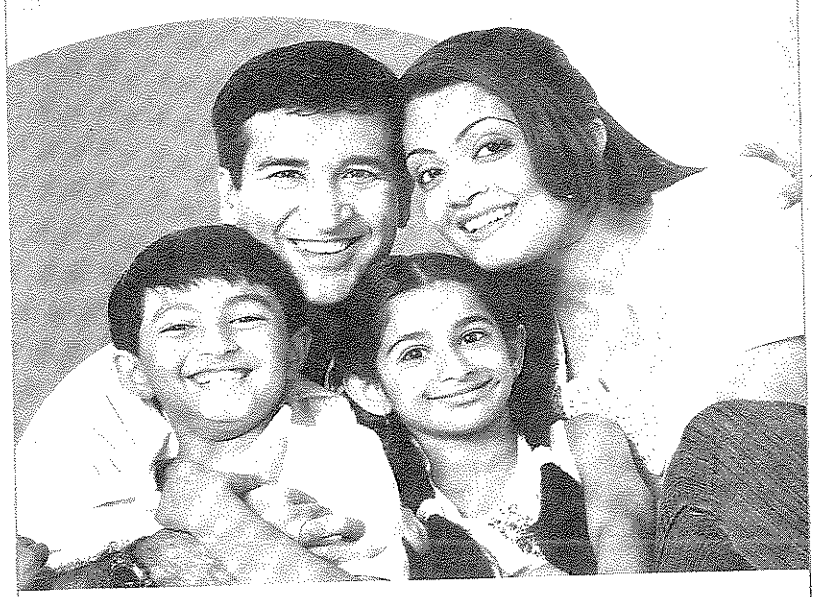

وہ اس کے حق میں گواہی دیتی اور کہتی کہ جو کچھ ہوا، تمہاری مرضی سے ہوا۔ اس طرح ان دونوں کا مقصد بھی پورا ہو جاتا اور کسی کو سزا بھی نہیں بھگتنی پڑتی۔'' اسلم نے جس طرح صورت حال واضح کی، اسے سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے تو ہمیشہ یہی سنا تھا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں اور وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ سختی سے اپنے اصولوں پر کاربند رہتے ہیں لیکن اس کی سنی سنائی کے برخلاف یہاں بھی سازش کا بازار گرم تھا۔

''اتنی گم صم کیوں ہو گئیں؟'' اس کی کیفیت دیکھ کر اسلم نے اسے ٹوکا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ للّی نے میرے ساتھ اتنی بڑی دشمنی باندھ لی ہے۔''

''تم ہو ہی ایسی کہ یا تو آدمی تمہاری محبت میں گرفتار ہو جائے یا پھر حسد میں مبتلا ہو کر دشمنی پر اتر آئے۔'' اسلم نے پُرمزاح انداز میں کہتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن میں نہ تو کسی سے دشمنی کر سکتی ہوں اور نہ ہی کسی کی محبت کا جواب محبت سے دے سکتی ہوں۔'' ماہ بانو نے سوچا کہ اسلم پر واضح کر دے کہ وہ اس کے لیے وہ جذبات نہیں رکھتی جو وہ اس کے لیے رکھتا ہے۔

''دشمنی تو میں جانتا ہوں کہ تم جیسی لڑکی کے بس کا کام نہیں لیکن محبت... محبت سے کیوں گریز ہے تمہیں؟'' اس نے بڑے اچنبھے سے پوچھا۔

''مجھے محبت سے گریز نہیں ہے لیکن اپنا یہ جذبہ میں نے ایک شخص کے لیے مختص کر دیا ہے۔ میری محبت اس کی امانت ہے۔ اگر زندگی نے موقع دیا تو میں اسے اس کی یہ امانت سونپ دوں گی ورنہ یہ خزانہ میرے دل میں ہی دفن رہے گا۔'' وہ اسلم کو خود سے مایوس کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

''کون ہے وہ خوش نصیب؟'' اس نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

''یہ راز میں اپنے دل میں ہی رکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے بڑی صاف گوئی سے جواب دیا۔ اسلم کا پل پل رنگ بدلتا چہرہ گواہ تھا کہ وہ بڑی تکلیف محسوس کر رہا ہے لیکن اسے تاریکی میں رکھنا مزید بڑا ظلم ہوتا۔

''اور اگر تمہیں یہاں سے نکل کر اس شخص تک پہنچنے کا موقع نہ ملا تو؟'' اسے شاید اب بھی کوئی امید تھی۔

''میں اس سوال پر اس صورت میں غور کرتی کہ اگر میں نے اسے پانے کا سوچا ہوتا۔ میری محبت پانے نہ پانے کی قید سے آزاد ہے۔''

''تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟'' وہ کچھ جھنجلایا ہوا نظر آنے لگا۔

''اس لیے کہ میں نہیں چاہتی کہ تم بہت زیادہ آگے تک جاؤ۔'' اس نے اپنی صاف گوئی کو جاری رکھا۔

''دور تو میں بہت نکل گیا ہوں اور اب مشکل ہی ہے کہ اپنے قدم واپس موڑ سکوں۔ ہاں، اتنی کوشش ضرور کروں گا کہ تمہاری طرح بے لوث محبت کر سکوں۔'' وہ اپنی بات کہہ کر وہاں رکا نہیں اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پھلواری سے باہر نکل گیا۔ اس کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کرتی ہوئی ماہ بانو کی نظریں اردگرد کھلے پھولوں پر بھٹکنے لگیں۔ آج ان پھولوں کے رنگوں کی شوخی بھی ماند تھی۔ شاید وہ اس شخص کے لیے اداس تھے جس کے ہاتھوں نے انہیں سینچا اور سنوارا تھا۔

☆☆☆

''ہاں بھئی آفتاب! کیا حال ہے؟ تمہاری مسز تو خیریت سے ہیں نا؟'' غلام محمد کی گرفتاری کے بعد وہ اب پہلی بار آفتاب سے بات کر رہا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے سر... سب خیریت ہے۔ بہت سیریس حالت تھی کشور کی... اگر انہیں بروقت اسپتال نہیں پہنچایا جاتا تو جان بچنا مشکل تھی۔ مجھے تو اس واقعے کے بعد اللہ کی قدرت پر مزید یقین ہو گیا ہے۔ اتنی ٹائمنگ سے اپنے بندے کی مدد کا بندوبست وہی کر سکتا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو پہنچنے میں دو تین منٹ اور لگ جاتے تو شاید میں غلام محمد کے ہاتھوں مارا جاتا۔''

''اس کا نام اشیش ہے آفتاب! غلام محمد کا تو اس نے صرف بہروپ بھرا تھا۔'' ایک مکروہ کردار کے مالک کا شخص کا غلام محمد کے نام سے پکارا جانا دل کو ناگوار گزر رہا تھا اس لیے شہریار نے دھیمے لہجے میں آفتاب کو بتایا۔

''تو اس نے اپنی اصلیت اگل دی؟'' اس کے جملے سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے آفتاب جوش سے بولا۔

''ابھی صرف اس کا نام سامنے آیا ہے۔ باقی معلومات حاصل کرنے کے لیے اس پر خاصی محنت کرنی پڑے گی۔ کسی تربیت یافتہ ایجنٹ سے اس کی حقیقت اگلوانا آسان نہیں ہوتا... لیکن مجھے امید ہے کہ ہمیں اشیش سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں وہ اچھا خاصا سخت جان ثابت ہو گا۔'' آفتاب نے قیاس آرائی کی۔

''یقیناً اس طرح کے لوگ بہت ڈھیٹ واقع ہوتے ہیں۔'' شہریار نے بیچے تلے انداز میں کہا۔ ''اور ہاں، میرے خیال میں تم اپنی رہائش کے لیے کسی پسماندہ گاؤں کے بجائے چھوٹے شہر کا انتخاب کرو۔ گاؤں میں تم جیسے آدمی کا رہنا اس لیے مناسب نہیں کہ تمہارا جو کام ہے، وہ گاؤں کے لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے اور تم وہاں زیادہ نمایاں ہو جاتے ہو۔ کسی چھوٹے شہر میں رہنے کا ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تم ازکم ٹیکنالوجی سے تو فائدہ اٹھا سکو گے۔'' اس نے آفتاب کو مشورہ دیا۔

''میں خود بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہا ہوں سر! موجودہ جگہ تو اب ویسے بھی ہمارے لیے محفوظ نہیں رہی ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ کب چودھری کے بندے وہاں پہنچ جائیں۔ پنڈی تک تو انہوں نے ہمارا کھوج لگا ہی لیا ہے۔''

''وہ کیسے؟ کیا تمہیں پنڈی میں چودھری کے گرگے نظر آئے تھے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں لیکن وہ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو جس بک شاپ کا فون نمبر دیا تھا، وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے اس بک شاپ کے مالک تک پہنچ گئے تھے۔'' اس نے اسپتال میں اتفاقیہ طور پر آ جانے والی مہک بک شاپ کے مالک شفیق خان کے قتل کی تفصیلات شہریار کے گوش گزار کر دیں۔ شہریار دھیان سے سب سنتا رہا۔ جو کچھ آفتاب بتا رہا تھا، اس سے تو یہی ظاہر تھا کہ اس کے دفتر سے مخبری ہوئی ہے۔ وہ تو اس کی احتیاط پسندی کام آ گئی تھی ورنہ بات مہک بک شاپ کے فون نمبر سے آگے نکل گئی ہوتی۔ اب بھی جو کچھ ہوا تھا، وہ خاصا افسوس ناک تھا۔ ایک بے گناہ آدمی قتل ہو گیا اور اس کے قتل کے بعد اس کی اکلوتی بیٹی یقیناً بہت مشکل میں پڑ گئی تھی لیکن چودھری جیسے لوگوں کا انسانیت سے تعلق ہی کہاں ہوتا ہے جو وہ کسی انسان کی زندگی لیتے ہوئے ہچکچائیں۔

''تم نے مجھے بہت اہم بات بتائی ہے۔ اب میں اپنے دفتر میں اس کالی بھیڑ کو تلاش کروں گا جو یہاں کی خبریں چودھری تک پہنچا رہا ہے۔'' اندرونی طور پر بہت غضب ناک ہونے کے باوجود اس نے ہموار لہجے میں اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ آفتاب جواب میں خاموش رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے شہریار کو کوئی مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر بہت سے مسائل خود ہی حل کر لیتا ہے۔ اس نے تو موجودہ حالات میں بھی اتنی حاضر دماغی سے کام لیا تھا کہ اشیش کی گرفتاری جیسے اہم معاملے میں الجھنے کے

وضاحت

نیا شادی شدہ جوڑا سڑک پر ٹہلتا ہوا جا رہا تھا کہ سامنے سے سنہرے بالوں والی ایک خوب صورت لڑکی نمودار ہوئی۔

''ہیلو جارج ڈارلنگ!'' اس لڑکی نے کہا پھر اس کی نظر جارج کی بیوی پر پڑی اور وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

''یہ منحوس کون تھی؟'' نئی نویلی دلہن نے غصے سے پوچھا۔

''فضول سوال مت کرو۔'' شوہر نے جواب دیا۔ ''تمہیں کیا پتا کہ مجھے تمہارے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کس مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

سلمان احمد کی بے بسی، ضلع جہلم سے

باوجود اس بات کا بندوبست کر دیا تھا کہ آفتاب کے پاس ایک نیا سیل فون سم سمیت پہنچ جائے تاکہ وہ جب چاہے اس سے رابطہ کر سکے۔

''او کے پھر تم اپنا خیال رکھو اور اردگرد سے باخبر رہنے کی کوشش کرو۔ کشور کے سفر کے قابل ہوتے ہی تم اپنی شفٹنگ کر لینا۔ اس سلسلے میں اگر میری مدد درکار ہو تو مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔'' اس نے آفتاب کو ہدایات دیتے ہوئے کال منقطع کر دی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ نورکوٹ اب زیادہ دور نہیں تھا لیکن بہرحال اتنا وقت تھا کہ وہ میجر ذیشان سے بات کر سکے۔ یہ میجر ذیشان ہی تھا جس کے تعاون سے وہ اشیش کی گرفتاری اتنے خفیہ طور پر کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ میجر ذیشان نے تو اسے یقین دلایا تھا کہ یہ کام اس کے آدمی آرام سے کر سکتے ہیں لیکن وہ اس موقع پر خود موجود رہنے کا خواہش مند تھا۔ اس کا اصرار دیکھتے ہوئے میجر نے اس کے سفر کے انتظامات کروا دیے تھے۔ وہ نورکوٹ سے لاہور تک اپنی ہی گاڑی میں گیا تھا لیکن اس سے آگے کے سارے انتظامات میجر ذیشان نے کیے تھے۔ اس مشن سے مشابرم خان کے سوا کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ مختصر عرصے میں اپنی ایمان داری اور وفاداری کو منوا لینے والا مشابرم خان اس کے ساتھ ساتھ رہا تھا اور اب بھی وہی اس کی گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے مشابرم خان پر اتنا اعتماد تھا کہ اس کے سامنے کوئی بھی بات کرتے

www.kahopakistan.com

ہوئے یہ خدشہ نہیں ہوتا تھا کہ بات لیک آؤٹ بھی ہو سکتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے پورے اطمینان سے آفتاب سے بات کی تھی اور اب میجر ذیشان کا نمبر ملا رہا تھا۔

''جی میجر صاحب! کچھ بتایا اشیش نے؟'' دوسری طرف سے کال ریسیو کیے جاتے ہی اس نے رسمی علیک سلیک کے بجائے براہِ راست سوال داغا۔ وہ اس معاملے میں اتنا پُرجوش تھا کہ اشیش کو اپنی کسٹڈی میں رکھنا چاہتا تھا لیکن میجر ذیشان نے اس کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اشیش ایک جاسوس ہے اور اس کا انٹیلی جنس کے قبضے میں رہنا ہی بہتر ہے۔ البتہ اس نے شہریار سے اتنا وعدہ ضرور کر لیا تھا کہ اشیش سے حاصل ہونے والی معلومات کو اس سے ضرور شیئر کرے گا چنانچہ اب وہ اسے فون کر کے یہی جاننا چاہتا تھا کہ اب تک اشیش سے کیا کچھ اگلوایا جا سکا ہے۔

''فی الحال تو ہم اس سے کچھ خاص معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ہاں، اس نے گاؤں کے اس لڑکے کے قتل کا اعتراف ضرور کر لیا ہے۔'' میجر ذیشان کا اشارہ اس لڑکے کی طرف تھا جسے اشیش نے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیا تھا۔ جمعے کی نماز میں اس بچے کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی تھی اور اسی موقع پر آفتاب نے اشیش کو شناخت کر لیا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے پیر آباد میں ماہ بانو کے چھوٹے بھائی کو بھی زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر ڈالا تھا۔

''اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنی ہے میجر صاحب! آپ کوئی بھی طریقہ استعمال کریں لیکن اس شخص سے سب کچھ اگلوا کر چھوڑیں۔ اور ہاں، یاد رکھیے گا کہ اس سے ورما کا پتا معلوم کرنے کے بعد آپ مجھے ضرور بتائیں گے۔'' اس نے ایک بار پھر میجر ذیشان کو یاد دہانی کروانا ضروری سمجھا۔

''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن میں آپ کو یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں، اس کے بارے میں اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔ آپ کی نیک نیتی اپنی جگہ لیکن قانونی طور پر یہ سب کرنے کی اتھارٹی نہیں ہے آپ کے پاس۔ یہ نہ ہو کہ آپ اپنوں کے ہاتھوں ہی دھر لیے جائیں۔'' میجر ذیشان نے اسے سمجھایا۔

''اپنی نیک نیتی کی وجہ سے ہی مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میں گرفت میں نہیں آسکوں گا اور اگر پھنس بھی گیا تو میرے پاس یہ اطمینان ہوگا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کے بجائے میں نے اپنے اور اپنے ملک کے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ آپ شاید میری کیفیت کو پوری طرح سمجھ نہ سکیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی نے مجھے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں پہنچ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ہر کام تھرو پراپر چینل ہو، یہ ضروری نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ جن لوگوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ایسے عناصر پر گرفت کریں، وہ یا تو خود ان کے محافظ بن کر بیٹھے ہیں یا پھر بے پروائی برت رہے ہیں۔ آٹے میں نمک کے برابر کچھ ایمان دار لوگ بھی ہیں لیکن اتنے سارے بے ایمانوں کی وجہ سے وہ ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔'' یہ سب کہتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے شینا اور سجاد رانا کی لاشیں گھوم رہی تھیں۔ ان دونوں کے قاتل ابھی تک پکڑے نہیں جا سکے تھے۔ مختار مراد آئی جی پنجاب ہونے کے باوجود اپنے داماد اور نواسی کے قاتلوں تک پہنچنے میں ناکام تھے اور ایسا صرف اس لیے تھا کہ ان کا ماتحت عملہ ان کے ساتھ پوری طرح تعاون نہیں کر رہا تھا۔

''شاید آپ کا نظریہ درست ہی ہے۔'' میجر آفتاب نے کھوئے ہوئے لہجے میں اس سے اتفاق کیا۔ وہ خود بھی تو شہریار کے ساتھ تعاون کر کے ایک طرح سے غیر قانونی کام ہی کر رہا تھا لیکن اسے اطمینان تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ غلط نہیں ہو رہا۔ طریقہ کار چاہے جو بھی تھا، شہریار بہرحال ملک دشمن عناصر کے خلاف ہی جنگ لڑ رہا تھا۔ اگر اس کا ایمبلی کے نام سے ملنے والی انڈا سے واسطہ نہیں پڑا ہوتا تو شاید وہ خود بھی کبھی اس طرح سے شہریار کا ساتھ نہیں دیتا جیسے اب دے رہا تھا۔ انڈا نے اسے اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر ایسا کام دکھایا تھا کہ وہ خفیہ معلومات اگل بیٹھا تھا۔ ایک عورت کے ہاتھوں چوٹ کھا کر وہ اندر سے بُری طرح تلملایا ہوا تھا اور بس نہیں چلتا تھا کہ ہر ملک دشمن کو نیست و نابود کر ڈالے۔ اس کی اسی کیفیت نے اسے شہریار کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ان کا یہ ساتھ کس حد تک اور کب تک رہتا... یہ تو آنے والا وقت ہی بتانے والا تھا۔

☆☆☆

فریدہ نے بیڈ پر رکھے زرق برق سبز رنگ کے لباس کو دیکھا اور عجیب سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ یہ لباس اسے وڈی چودھرائن نے بھجوایا تھا۔ لباس لے کر آنے والی عورت وہ ملازمہ تھی جو بہزاد شاہ کی خدمت اور اس کی چھوٹی موٹی ضروریات کا خیال رکھنے پر مامور تھی۔ ملازمہ نے اسے لباس اس اطلاع کے ساتھ پہنچایا تھا کہ وڈی چودھرائن نے کہا ہے، کل اس لباس کو پہن کر تیار رہیں، آپ کی گود بھرائی کی رسم ادا کی جائے گی۔ وڈی چودھرائن کا یہ حکم سن کر وہ حیران بھی ہوئی تھی اور خوش بھی۔ وہ جب سے بہزاد شاہ کے نام سے بیاہ کر اس حویلی میں آئی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ اسے کسی قابل سمجھا گیا تھا ورنہ اس سے قبل وہ کسی معاملے میں شریک نہیں کی گئی تھی۔ اسے حویلی کی بالائی منزل پر یہ الگ تھلگ گوشہ دے کر سب سے کاٹ دیا گیا تھا۔ صرف ملازمہ تھی جس سے وہ تھوڑی بہت بات چیت کر لیا کرتی تھی اور جس کے ذریعے اسے اردگرد کے حالات کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔

''چل فریدہ... آج یہ دن بھی دیکھ لے کہ کیسے وڈی چودھرائن اپنے شوہر کے ناجائز بچے کی ماں کی گود بھرائی کرتی ہے۔'' سبز رنگ کا لباس پر نظریں جمائے وہ آہستہ سے بڑبڑائی پھر ہاتھ بڑھا کر لباس اٹھا لیا۔ لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے وہ زیورات بھی پہن لیے جو اس کے ساتھ ہی بھیجے گئے تھے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر گنگناتے ہوئے میک اَپ کرنے لگی۔ آج اس کی تیاری بڑی بھرپور تھی۔ اسے یاد آیا کہ آخری بار اتنے بھرپور طریقے سے وہ اس دن تیار کی گئی تھی جب اس کا اور بہزاد شاہ کا ولیمہ ہوا تھا لیکن اس دن میں اور آج کے دن میں بڑا فرق تھا۔ اس دن اسے خود پر بڑا جبر کرنا پڑا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ جسم سے ایک ایک زیور اور لباس نوچ کر پھینک دے۔ سنگار کے وہ سارے لوازمات اسے چودھری کے ہاتھوں اٹھائی گئی شکست اور ذلت کی یاد دلا رہے تھے۔ آج کا سنگار اس لحاظ سے مختلف تھا کہ آج وہ چودھری کو اپنے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر چکی تھی۔ آج جب وہ بن ٹھن کر چودھری کے سامنے جاتی تو وہ اندر ہی اندر جلبلا کر رہ جاتا۔ اسے شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہوتا کیونکہ فریدہ نے اسے اپنے امید سے ہونے کی خبر ہی اتنی دیر سے دی تھی کہ وہ کسی طور اس بچے سے جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اس کے پاس دوسرا حل یہ تھا کہ وہ فریدہ کو ہی جان سے مار ڈالے لیکن اس کے لیے بھی اس نے چودھری کو باور کروا دیا تھا کہ اس کی موت کی صورت میں کچھ لوگ متحرک ہو جائیں گے جو نہ صرف اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کروا کے اس کے حاملہ ہونے کا پتا چلا لیں گے بلکہ یہ راز بھی ساری دنیا کے سامنے فاش کر دیں گے کہ بے شک فریدہ منکوحہ بہزاد شاہ کی تھی لیکن درحقیقت چودھری نے اسے اپنی رکھیل بنا رکھا تھا۔ اس نے چودھری کو بتا دیا تھا کہ اس کا تحریری بیان ایک معتبر شخصیت کے پاس بطور امانت موجود ہے جو اس کی موت کی صورت میں اس بیان کو میڈیا کے سامنے پیش کر دے گا۔ اپنی ان ساری باتوں کے جواب میں اس نے چودھری کے چہرے پر غصے اور بے بسی کی جھلک دیکھی تھی اور دل ہی دل میں بڑی محظوظ ہوئی تھی۔ آنے والے کل میں جب چودھری کی اپنی اولاد اس کے پوتے کی حیثیت سے حویلی میں پلتی بڑھتی تو وہ یقیناً اور بھی جھنجلاتا۔

''آہ... ہا۔ تم دلہن بنی ہو۔'' اچانک ہی بہزاد شاہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اسے یوں تیار دیکھ کر تالی بجاتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔ اس نے آئینے میں اپنے عکس کے پیچھے موجود بہزاد شاہ کے عکس کو دیکھا اور دھیرے سے مسکراتی ہوئی اس کی طرف پلٹی۔

''تم وڈی سوہنی لگ رہی ہو۔'' اس نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور قریب آکر اس کی کلائی میں پڑی جڑاؤ چوڑیوں کو چھو چھو کر دیکھنے لگا۔ یہ ایک بچکانا سی ادا تھی۔ اس دیوانے کو ذرا بھی شعور نہیں تھا کہ سامنے بن ٹھن کر کھڑی یہ بھرپور عورت اس کے نام سے اس حویلی میں لائی گئی ہے اور وہ نہ صرف اس کا شوہر کہلاتا ہے بلکہ آنے والے وقت میں اس کے بچے کا باپ بھی کہلائے گا۔ فریدہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تاسف بھرا ایک گہرا سانس لیا۔ خود اس تجربے سے گزر جانے کے باوجود اسے اب تک یہ یقین کرنا مشکل لگتا تھا کہ کوئی شخص اتنا گرا ہوا اور مکروہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے نفس کی تسکین کے لیے اپنے ذہنی معذور بیٹے کو استعمال کرے۔ وہ جن حالات میں چودھری کے ہاتھ لگی تھی وہ چاہتا تو اس کے بھائی چودھری بختیار سے اس کے لیے خود اپنا رشتہ بھی مانگ سکتا تھا۔ چودھری بختیار اس وقت اتنا بے بس ہو چکا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہامی بھرنی پڑتی لیکن شاید ایک طرف تو چودھری اپنی گھریلو زندگی میں کوئی نیا ہنگامہ نہیں کھڑا کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف اسے اس کے بھائی چودھری بختیار کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا مقصود تھا جو یہ گھٹیا طریقہ کار اختیار کیا۔

''تم کہاں جا رہی ہو دلہن؟'' بہزاد شاہ شاید اپنے سوال کو کئی بار دُہرا چکا تھا اور وہ خیالات میں ڈوبی ہونے کی وجہ سے سن نہیں سکی تھی اس لیے اس نے اس بار زور سے ہلا کر دریافت کیا۔

''کہیں نہیں۔ ادھر حویلی میں ہی ایک دعوت ہے۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔ چودھری کی اولاد ہونے کے باوجود وہ ذہنی پسماندہ لڑکا اسے کبھی بُرا نہیں لگا تھا اور نہ ہی کبھی وہ اس سے سختی سے پیش آسکی تھی۔ ہاں، ابتدا میں یہ ضرور ہوا تھا کہ اس نے سوچا تھا کہ بہزاد شاہ کے ذریعے چودھری کو مروا

www.kahopakistan.com

دے گی۔ ایک ذہنی معذور شخص اگر چودھری کو بلندی سے دھکا دے دیتا یا اس کے سر پر کسی بھاری شے سے وار کر کے اس کی کھوپڑی توڑ ڈالتا تو کوئی اسے کس طرح الزام دے سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بہزاد شاہ کو خود سے قریب کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی یا کوئی کھیل کھیلنے لگ جاتی۔ گھر والوں کی توجہ کو ترسا ہوا، ملازموں کے سہارے پروان چڑھنے والا بہزاد شاہ اس کی توجہ پا کر کھل اٹھتا۔ فریدہ نے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ بہزاد شاہ اس کا ہر حکم بڑی فرماں برداری سے بجا لاتا تھا۔ یہ اس کے منصوبے کے لیے بڑی خوش آئند بات تھی لیکن اس سے قبل کہ وہ اس پر عمل کرتی، اسے اپنے پریگننٹ ہونے کا احساس ہو گیا اور پھر اس نے اپنا لائحہ عمل بدل ڈالا۔ اس نے سوچا کہ یہ بچہ ضرور پیدا کرے گی اور اس کے ذریعے چودھری کو بلیک میل کرے گی۔ ڈاکٹر ماریا کی زبانی اسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ اب سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایک ٹیسٹ کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ بچے کا باپ کون ہے۔ ڈاکٹر ماریا دو تین بار ہی اس کے پاس آئی تھی لیکن اس نے اسے بہت تسلی دی تھی اور وقت پڑنے پر مدد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ اس لائق ہو سکی تھی کہ چودھری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔

''حویلی میں دعوت ہے۔ پھر تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ وڈے پروہنے آئیں گے۔ میں سب سے ہاتھ ملاؤں گا۔'' حویلی میں دعوت کا سن کر بہزاد شاہ بہت خوش ہوا اور ساتھ ہی اپنا پروگرام بھی ترتیب دے ڈالا۔

''تم دعوت میں نہیں جا سکتے۔ ادھر صرف عورتیں ہوں گی، ہور پروہنے بھی زیادہ نہیں آ رہے۔ بس تمہاری اماں اور بہنوں کے علاوہ دو تین زنانیاں ہور ہوں گی۔'' اس نے بہزاد شاہ کو سمجھایا۔

''یہ بھی کوئی دعوت ہوئی۔ دعوت تو وہ ہوتی ہے جس میں ڈھیر سارے لوگ آتے ہیں جیسے دادا جی کے عرس پر جمع ہوتے ہیں۔ تم ہی جاؤ ایسی بکواس دعوت میں۔'' وہ ذہنی طور پر معذور تھا لیکن حویلی میں ہونے والی دعوتوں کو تو بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا اس لیے فریدہ کی زبانی ہونے والی دعوت کا حال سن کر اسے کچھ مزہ نہیں آیا اور وہ فوراً ہی دعوت میں شرکت کے مطالبے سے دست بردار ہو گیا۔

''آپ کی تو وڈی دوستی ہے چھوٹے شاہ جی کے ساتھ۔'' اسی وقت ایک ادھیڑ عمر ملازمہ ہاتھوں میں ایک تھال اٹھائے وہاں پہنچی اور فریدہ کو بہزاد شاہ کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھ کر بولی۔ یہ ادھیڑ عمر ملازمہ ماسی رحمتے کے بعد وڈی چودھرائن کے سب سے زیادہ قریب تھی اور رحمتے کے منظر سے غائب ہوتے ہی اس نے اس کی جگہ سنبھال لی تھی۔ رحمتے تو اپنی دونوں جوان بیٹیوں کو کھونے کے بعد حواسوں میں ہی نہیں رہی تھی۔ نجمی اور شادو جو کبھی اپنی ماں کے ساتھ وڈی چودھرائن کی ناک کا بال بنی رہتی تھیں اور حویلی میں ہونے والے ہر واقعے کی کھوج میں رہتی تھیں، کشور کے فرار کے بعد معتوب ٹھہری تھیں اور چودھری کی طرف سے موت کی سزا پا کر اپنے انجام کو پہنچی تھیں۔ ان دونوں بہنوں اور ان کی ماں رحمتے نے مل کر کشور کے لیے بڑی مشکل پیدا کر رکھی تھی۔ اگر اس کی وفادار ملازمہ رانی کا ساتھ نہ ہوتا تو ان تینوں ماں بیٹیوں کی جاسوسی کے نتیجے میں کشور ابتدا میں ہی پھنس جاتی اور اسے جیتے جی حویلی کے زنداں سے نکلنے کا موقع نہیں ملتا۔

''یہ کیا لائی ہو ماسی؟'' فریدہ نے ملازمہ کے ہاتھوں میں موجود تھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ تھال میں پھول ہی پھول بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''یہ پھول وڈی چودھرائن نے آپ کے لیے بھجوائے ہیں۔ لائیں میں آپ کو پہنا دوں۔'' اس نے تھال ایک تپائی پر رکھا اور اس میں رکھا پھولوں کا زیور ایک ایک کر کے اسے پہنانے لگی۔ گجرے، کنگن اور بازو بند جسم پر سجے تو فریدہ سچ مچ دلہن لگنے لگی۔ ملازمہ نے اسے پھولوں کے زیورات پہنانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک بڑا سا گچھا بھی اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ بھاری لباس اور زیورات کے ساتھ اس گچھے کو بھی سنبھالنے کے لیے فریدہ کو اپنے دونوں ہاتھ استعمال کرنے پڑے۔ اس فراوانی سے اسے پھولوں سے لادنے کے باوجود ملازمہ کے پاس پھولوں کا ذخیرہ ختم نہیں ہوا تھا اور تھال میں اب بھی اچھے خاصے پھول بغیر پروئے ہوئے یا پتیوں کی صورت میں موجود تھے۔

''ان کا کیا کرو گی؟'' فریدہ نے ملازمہ سے دریافت کیا۔

''وڈی چودھرائن کا حکم ہے کہ جب آپ اوپر سے نیچے اتریں تو میں آپ کے پیچھے پیچھے یہ پھول برساتی ہوئی آؤں۔'' ملازمہ نے جواب دیا جسے سن کر فریدہ کے دل میں خواہش ابھری کہ کاش وہ اس حویلی میں کسی ڈھنگ کے شخص کے ساتھ بیاہ کر آئی ہوتی اور کسی کے جائز بچے کی ماں بن رہی ہوتی تو یقیناً آنے والے مہمان کی اس پذیرائی پر کھل اٹھتی۔

''چنگی گل ہے۔'' اپنی اداس ہوتی کیفیت پر قابو

پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور پھر ملازمہ سے پوچھا۔ ''کیا اب چلیں؟''

''ہاں بی بی!'' اس نے جواب دیا پھر اس کی اور بہزاد شاہ کی ملازمہ کی طرف رخ کر کے بولی۔ ''میں بی بی کو رسم کے لیے نیچے لے جا رہی ہوں تو چھوٹے شاہ جی کا خیال رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ وہ شوق میں نیچے آ جائیں اور پھر کوئی ہنگامہ کریں۔ یاد ہے نا ایک بار انہوں نے وڈے سرکار کے پروہنوں کے سامنے جا کر کیسی توڑ پھوڑ مچائی تھی، ہور بعد میں وڈے سرکار نے اس ملازمہ کی کھال ادھیڑ ڈالی تھی جس کی غفلت سے چھوٹے شاہ جی نیچے اترے تھے۔''

''فکر نہ کر ماسی۔ میں چھوٹے شاہ کا خیال رکھوں گی۔'' بیس بائیس سالہ ملازمہ نے خوف زدہ سے لہجے میں جواب دیا۔

''چلیں بی بی!'' بہزاد شاہ کی طرف سے مطمئن ہو کر وڈی چودھرائن کی چہیتی ملازمہ نے فریدہ کو مخاطب کیا تو وہ حرکت میں آ گئی۔ بھاری شرارہ نما لباس پہن کر چلنے میں اسے دشواری پیش آ رہی تھی۔ سیڑھیوں پر یہ مشکل اور بھی بڑھ گئی۔ ایک تو لباس بار بار پیروں میں آ کر الجھ رہا تھا، دوسرے دونوں ہاتھوں میں موجود پھولوں کی وجہ سے وہ اسے سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔ پیچھے اس سے ایک قدم کے فاصلے سے پھول برساتے ہوئے سیڑھیاں اترتی ملازمہ کو گویا اس کی مشکل کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ بڑے مگن سے انداز میں پھول برسانے کے ساتھ ساتھ کوئی دعائیہ گیت الاپنے میں مصروف تھی۔ اس مگن کیفیت میں اچانک ہی اس کا پیر مڑا اور وہ خود سے آگے چلتی فریدہ سے جا ٹکرائی۔ فریدہ کے پاس سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس کا پیر پھسلا اور وہ سیدھی سیڑھیوں سے نیچے کی طرف لڑھکتی چلی گئی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر وڈی چودھرائن کے علاوہ اس کی دونوں بیٹیاں تاجور، صنوبر اور چھوٹی چودھرائن اس کے استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ فریدہ سیڑھیوں سے لڑھکی تو ان سب کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ ان چیخنے والیوں میں سے کس کس کی آنکھوں سے مسرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں، یہ دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

''تم ان لوگوں میں کیسے شامل ہوئے اسلم؟'' وہ اسلم کی لگائی پھلواری میں درخت پر بنی مچان پر اس کے ساتھ موجود تھی۔ مچان سے دور تک نظر آتا جنگل کا منظر دیکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا لیکن اس منظر سے وہ بہت کم ہی لطف اندوز ہو پاتی تھی۔ اس کی وجہ اس کے پیروں میں موجود زنجیر تھی۔

www.kahopakistan.com

دونوں پیروں کے درمیان موجود اس زنجیر کی وجہ سے وہ بغیر کسی سہارے کے مچان تک پہنچانے والی سیڑھیاں چڑھنے سے معذور تھی چنانچہ صرف اسی وقت مچان تک پہنچ سکتی تھی، جب اسلم اس کے ساتھ ہو۔ جب سے جمرو والا واقعہ پیش آیا تھا، وہ پھلواری میں بھی اکیلے آنے سے گریز کرنے لگی تھی۔ خود اسلم نے بھی اسے ہدایت کی تھی کہ آئندہ اگر پھلواری تک جاؤ تو پہلے مجھے اطلاع دے دینا تاکہ میں نظر رکھ سکوں لیکن وہ احتیاط اس طرف آئی ہی نہیں تھی۔ آج اسلم نے خود اسے چلنے کی پیشکش کی تو وہ مان گئی اور اب وہ دونوں وہاں موجود تھے۔

اسے یہاں لانے کے بعد اسلم اس سے بے نیاز ہو گیا تھا اور ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا تھا۔ خاموش طبع تو وہ تھا ہی لیکن ماہ بانو نے محسوس کیا تھا کہ جب سے اس نے اسلم کے سامنے اپنے کسی اور کی محبت میں گرفتار ہونے کا اظہار کیا تھا، اس کی خاموشی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی بالکل الگ اور کٹا کٹا سا رہنے لگا تھا۔

اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے ماہ بانو نے اپنے دل میں اس کے لیے سخت افسوس محسوس کیا تھا لیکن وہ بھی کیا کرتی؟ دل کے معاملات میں زبردستی یا مروت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ اخلاقاً بھی اسلم کی محبت کی پذیرائی نہیں کر سکتی تھی۔ اخلاقاً یا مروتاً تو رہا ایک طرف، وہ تو مصلحتاً بھی ایسا نہیں کر سکی تھی ورنہ یہاں سے نجات کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے لیے اسلم کے جذبات کا فائدہ اٹھاتی اور اسے بے وقوف بنا کر یہاں سے نکلنے کی راہ ہموار کر لیتی۔ اس جیسی لڑکی کے لیے کسی کے سچے جذبات کو اس طرح کا دھوکا دینا گوارا نہیں تھا۔ اسلم کی اس کے لیے محبت بہت خالص تھی اور ایسی محبت کی اگر پذیرائی نہ کی جا سکے تو رسوائی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں اگر وہ نفس کا مارا کوئی ہوس پرست آدمی ہوتا تو پھر اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جا سکتا تھا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟'' وہ جو ابھی تک جنگل کے مناظر پر ہی نظر جمائے ہوئے تھی، اسلم کی طرف سے جواب نہ پا کر رخ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کا سر ابھی تک کتاب پر ہی جھکا ہوا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ پڑھ نہیں رہا ہے۔

''تم یہ جان کر کیا کرو گی؟'' آخر کار اس نے اپنی زبان کھولی لیکن جواب دینے کے بجائے الٹا سوال داغ دیا۔

''کر تو شاید کچھ نہیں سکتی لیکن میرے اندر ایک تجسس سا ہے کہ تم جیسا آدمی ان ڈاکوؤں کے درمیان کیسے پہنچا؟ تم ان سب سے بہت مختلف ہو اور کوئی حادثہ ہی تمہیں ان تک پہنچا سکتا ہے۔''

''جیسے تم حادثاتی طور پر یہاں پہنچ گئیں ورنہ شاید اس شخص کے ساتھ ہو تیں جسے تم نے اپنے دل میں بسا رکھا ہے۔'' وہ اداسی سے مسکرایا۔

''جسے چاہو اس کا ساتھ بھی مل جائے، یہ ضروری نہیں ہوتا۔'' اس نے حسرت زدہ سے لہجے میں جواب دیا۔ اسلم سمجھ نہیں سکا کہ اس نے اپنی محرومی بیان کی ہے یا اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

''تو تم مجھے اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے؟'' ماہ بانو نے یک دم ہی سر جھٹک کر اپنی کیفیت سے باہر نکلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو بتا دوں گا ورنہ سچ پوچھو تو میں خود بھی یاد نہیں رکھنا چاہتا کہ میں یہاں کس طرح پہنچا۔''

''اگر وہ بات دُہرانے سے تمہیں تکلیف محسوس ہو رہی ہے تو رہنے دو۔ میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے۔'' اسلم کا جواب سن کر اس کے تجسس پر جذبۂ ہمدردی غالب آ گیا اور وہ اپنی خواہش سے دست بردار ہو گئی۔

''اپنی زندگی کے اس حادثے کو میں کبھی بھول ہی نہیں سکا اس لیے دُہرانے نہ دُہرانے سے تکلیف کے کم زیادہ ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔'' اس کی آنکھوں میں سرخی سی اترنے لگی۔

''میں اور میری بہن آمنہ اپنے والدین کی بس دو ہی اولاد تھے۔ ہمارے والد قلی تھے۔ جب میں تقریباً تیرہ چودہ سال کا تھا تو ان کا ریل کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میں سبّی کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ ہمارے علاقے میں زندگی کی سہولیات کا بہت فقدان ہے۔ یہاں تک کہ پانی جیسی بنیادی ضرورت کی بھی بے حد قلت ہے۔ وہاں لوگ بارش کا پانی ذخیرہ کر کے اسے استعمال کرتے ہیں اور جب یہ ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر وہاں لوگوں کا دار و مدار جیکب آباد سے آنے والی اس ریل گاڑی پر ہوتا ہے جس میں آٹھ سے دس واٹر ٹینک ہوتے ہیں۔ یہ ریل گاڑی ہر چار دن بعد آتی ہے۔ تم خود سوچو کہ تقریباً ایک ہزار کی آبادی والے اس گاؤں کے لوگوں کے لیے پانی کی اتنی محدود مقدار میں گزارہ کرنا کتنا مشکل ہو گا۔ پانی کی کمی کی وجہ سے ہمارا گاؤں کھنڈر بنتا جا رہا ہے۔ آبادی بھی اسی وجہ سے اتنی گھٹ گئی ہے۔ میرے والد اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور انہیں اپنے گاؤں سے بہت محبت تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا گاؤں خوش حال ہو اور سدا آباد رہے۔ وہ خود تو ایک معمولی

سے قلی تھے اور جانتے تھے کہ اس حیثیت میں وہ اپنے گاؤں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے اپنی ساری امیدیں مجھ سے باندھ لی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر کوئی بڑا افسر بن جاؤں اور اپنے گاؤں کے لیے کچھ کروں۔ اپنی محدود آمدنی کے باوجود وہ میری تعلیم پر پوری توجہ دیتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو مجھے لگا کہ اب ان کا کوئی خواب پورا نہیں ہو سکے گا اور مجھے اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑے گا لیکن اس موقع پر میری ماں اور بڑی بہن نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ وہ دونوں سلائی کڑھائی کے فن میں ماہر تھیں۔ خصوصاً سندھی کڑھائی تو انہیں اتنی عمدہ آتی تھی کہ دیکھنے والے داد دیے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ گاؤں کی کسی دوسری عورت کے ہاتھ میں میری ماں کے ہاتھ جیسی صفائی نہیں تھی اور آمنہ کو بھی ماں سے یہ مہارت ورثے میں ملی تھی۔ ان دونوں نے اپنے اس ہنر کو ذریعۂ معاش بنا لیا۔ وہ دونوں خوب صورت و خوش رنگ کڑھائی والے کپڑے تیار کرتیں اور ایک ایجنٹ کے ذریعے دوسرے شہروں میں بکوا دیتیں۔ ماں، بہن کی دن رات کی محنت کے عوض میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ میں نے انٹر کرنے کے بعد کراچی جا کر پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری خواہش تھی کہ میں یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد سی ایس ایس کا امتحان دوں اور کوئی نمایاں پوزیشن حاصل کروں۔ یہ ایک لمبا پروسیجر ضرور تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ میرے والد میرے حوالے سے جو خواب دیکھتے تھے، وہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ میں حکومتی مشینری کا حصہ بن جاؤں۔ میری ماں اور بہن نے بھی میرے اس فیصلے کی تائید کی اور یوں میں نے کراچی کے لیے رختِ سفر باندھا۔

''میرے گاؤں سے روانہ ہونے سے قبل میری بہن کی منگنی گاؤں کے ہی ایک لڑکے سے کر دی گئی۔ وہ لوگ ہمارے مقابلے میں خاصے خوشحال تھے اور لڑکا بھی دیکھنے میں معقول لگتا تھا اس لیے میں بہن کے اس رشتے پر بہت خوش تھا۔ شادی کے لیے یہی طے کیا گیا تھا کہ کم سے کم میں بی اے کر لوں تو پھر ہی یہ فریضہ انجام دیا جائے گا۔ میں دل میں بہت سے عزائم لے کر کراچی چلا گیا اور نہایت محنت سے کام لے کر بی اے آنرز کا امتحان فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں نے ٹیوشنز کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا تاکہ اپنے اخراجات خود اٹھا سکوں۔ میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا تھا بلکہ کچھ رقم جوڑ کر بہن کی شادی کے لیے بھی چند چیزیں خرید لی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے اخراجات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ماں نے آمنہ کی شادی کے لیے رقم جوڑنا شروع کر دی تھی، چنانچہ امید یہی تھی کہ ہم عزت کے ساتھ اسے اس کے گھر رخصت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے اپنا ایم اے میں داخلے کا فارم جمع کروایا اور آمنہ کے لیے خریدے گئے تحائف لے کر گاؤں پہنچ گیا۔ میری طرح ماں کا بھی یہی خیال تھا کہ اب آمنہ کی شادی ہو جانی چاہیے۔ اس کے سسرال والوں سے اس سلسلے میں عندیہ لیا گیا۔ وہ لوگ بھی شادی کے لیے تیار تھے لیکن بالکل اچانک ہی انہوں نے ہمارے سامنے جہیز کی ایک لسٹ رکھ دی اور واضح کر دیا کہ شادی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب مطلوبہ اشیا فراہم کی جائیں گی۔ میں اور ماں اس صورتِ حال پر بھونچکے رہ گئے۔ تقریباً تین سال قائم رہنے والی منگنی کو توڑنا بھی آسان نہیں تھا۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ آمنہ اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہیں ہے۔ ایک عام گھریلو لڑکی کی طرح اس نے منگنی ہوتے ہی اپنے سارے خواب اپنے منگیتر سے وابستہ کر لیے تھے۔ منگنی ٹوٹتی تو نہ صرف اسے زبردست دھچکا لگتا بلکہ ہمیں بھی اس کے لیے کوئی دوسرا بر ڈھونڈنے میں بڑی مشکل پیش آتی۔ ایک تو پہلے ہی ہماری روایات کے خلاف اس کی شادی میں بہت تاخیر ہو گئی تھی۔ دوسرے ہمارے ہاں کسی لڑکی کی منگنی ٹوٹ جانا ایک طرح سے اس کا عیب دار ہو جانا تھا۔''

یہاں تک اپنی داستان سنا کر اسلم خاموش ہو گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ماہ بانو نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بھی گہری ہو گئی تھی اور چہرے کی لکیروں میں درد کروٹیں لیتا نظر آ رہا تھا۔ ماہ بانو نے محسوس کیا کہ یہی وہ مقام تھا جہاں سے اسلم کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا ہو گا۔ ایک ایسی بہن جس نے اپنی زندگی کے کئی قیمتی ماہ و سال بھائی کی خاطر محنت کرتے ہوئے گزار دیے تھے، جب زندگی کے نازک ترین دور سے گزر رہی ہو گی تو کیا بھائی کا دل نہیں چاہا ہو گا کہ اب وہ اپنے حصے کا فرض ادا کرے اور بہن کی جھولی خوشیوں سے بھر دے...

''میں نے ماں سے کہا کہ لڑکے والوں سے شادی کے لیے کچھ مہینے کی مہلت لے لو۔ میں کوشش کروں گا کہ اس عرصے میں کہیں سے رقم کا بندوبست کر سکوں۔ ماں نے ایسا ہی کیا۔ لڑکے والے بھی مہلت دینے پر راضی ہو گئے اور میں واپس کراچی لوٹ گیا۔ میری ایم اے کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں لیکن ہمیشہ کی طرح میں پڑھائی پر توجہ نہیں دے پا رہا

www.kahopakistan.com

تھا۔ سارا وقت ذہن میں یہی سوال گونجتا رہتا کہ کہاں سے اتنی رقم کا بندوبست کروں کہ بہن کے سسرالیوں کے مطالبات پورے ہوسکیں۔ کبھی خیال آتا کہ تعلیم چھوڑ کر کوئی ملازمت کرلوں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ ملازمت کرکے بھی میں چند ہزار سے زیادہ جمع نہیں کرسکوں گا جبکہ ضرورت لاکھوں کی تھی۔ ایک دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں کسی سے قرض لے لوں اور بعد میں آہستہ آہستہ اتارتا رہوں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ قرض مانگا کس سے جائے؟ میری اس الجھی ہوئی کیفیت کو سب ہی محسوس کررہے تھے۔ کئی کلاس فیلوز اور ٹیچرز نے مجھ سے پوچھا بھی کہ اسلم کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ میں سب کو مسکرا کر ٹال جاتا لیکن جب میرے ایک کلاس فیلو راشد ڈوگر نے مجھ سے یہ سوال کیا تو میں اسے ٹال نہیں سکا۔ راشد نے سب کی طرح مجھ سے سرسری لہجے میں یہ سوال نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ زبردستی کیفے ٹیریا تک لے گیا تھا اور وہاں چائے اور سموسوں سے میری تواضع کرنے کے بعد بڑی ہمدردی سے یہ سوال کیا تھا۔ راشد پڑھنے میں تو بس گزارے لائق تھا لیکن اپنی شوخ اور ہمدرد طبیعت کی وجہ سے سارے ڈپارٹمنٹ میں بہت مقبول تھا۔ اس کے رہن سہن سے لگتا تھا کہ وہ خاصے خوش حال گھرانے کا فرد ہے۔ بعض اوقات یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ اس نے کسی کے پاس رقم نہ ہونے کی صورت میں اس کی سمسٹر فیس جمع کروادی یا کسی اور طرح کی مالی معاونت کردی۔ جب اس نے مجھ سے اتنی ہمدردی سے میرا مسئلہ پوچھا تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ راشد سے ہی بہن کی شادی کے لیے قرض مانگ لوں۔ میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا اور ساتھ ہی جھجکتے ہوئے قرض کے لیے بھی درخواست کردی۔ میری بات سن کر وہ تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

''دیکھ جگر! مجھے تجھ سے ہمدردی ہے لیکن میں تجھے اتنی بڑی رقم قرض نہیں دے سکتا۔ آٹھ دس ہزار کی بات ہوتی تو میں تیرے کہنے سے پہلے ہی دے دیتا لیکن ڈیڑھ دو لاکھ بہت ہوتے ہیں۔ میرے ابا کے کوئی کارخانے نہیں چل رہے جو میں اتنی بڑی رقم ہمدردی میں کسی کو تھما دوں۔'' مجھے راشد سے اس طرح کے جواب کی توقع نہیں تھی لیکن اپنی ضرورت کو دیکھتے ہوئے میں نے اس سے گزارش کی کہ وہ مجھے یہ رقم دے دے اور واپسی کے بارے میں فکر نہیں کرے۔ میں تھوڑا تھوڑا کرکے اس کی ساری رقم واپس کردوں گا۔ میری یہ بات سن کر وہ ہنسا اور بولا۔

''تو جتنا عرصہ لگائے گا رقم واپس کرنے میں اتنے عرصے میں تو ہوسکتا ہے میں دوسری دنیا سدھار جاؤں... اور صاف صاف بات ہے میرے بھائی کہ میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس لیے پیسا نہیں کماتا ہوں کہ دوسروں کے کام نکلتے رہیں۔ میں اپنی موج مستی کے لیے ہاتھ پیر چلاتا ہوں۔ تجھے بھی اگر بہن کی شادی کرنی ہے تو خود ہاتھ پیر مار... دوسروں کے آگے رونے گانے مت بیٹھ۔''

''اس کا جواب سن کر میرے ذہن میں تجسس پیدا ہوا کہ آخر وہ ایسا کیا کام کرتا ہے جس کے ذریعے اس کی اتنی آمدنی ہوجاتی ہے کہ وہ یوں ٹھاٹ باٹ سے رہتا ہے۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ اس کا باپ کوئی بزنس مین یا اعلیٰ عہدے دار ہے لیکن راشد نے خود صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے مال پر عیش نہیں کررہا بلکہ اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ میں نے اس سے اس کا ذریعۂ آمدنی پوچھا۔ میرا سوال سن کر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر بولا۔

''اگر میں تجھے اپنے کام کے بارے میں بتادوں تو کیا تو وہ کام کرے گا؟'' میں نے کہا کہ بالکل کروں گا کیونکہ مجھے چند مہینوں کے اندر بہن کی شادی کے لیے رقم جوڑنی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''تو اپنی بہن کی خاطر کیا کرسکتا ہے؟''

میں نے جواب دیا کہ بہن کے لیے میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں اس پر وہ ہنس کر بولا۔ ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے کیونکہ جو کام میں کرتا ہوں اس میں جان خطرے میں ڈالنی پڑتی ہے۔''

میں حیران ہوا کہ ایسا بھلا کون سا کام ہے۔ میری حیرت دیکھ کر راشد اور بھی زیادہ زور سے ہنسا اور پھر بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ڈاکے مارتا ہوں۔'' اس کی بات سن کر میرا منہ کھلا رہ گیا۔ مجھے لگا کہ شاید مجھے سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے لیکن راشد بالکل سنجیدہ تھا۔ اس نے مجھے کچھ اور کھل کر بتایا کہ وہ اور اس کے ساتھی مل کر لوگوں کے موبائل، پرس اور گاڑیاں چھیننے سے لے کر شاپنگ مالز میں ڈاکے مارنے تک سارے کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے میں ایک شریف لڑکا تھا اور پڑھ لکھ کر سیدھے راستے سے ایک باعزت مقام حاصل کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔

فوری ردعمل کے طور پر میں نے اس کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کردیا۔ میرا انکار سن کر وہ طنز سے بولا۔ ''ابھی تو تم بہن کی خاطر جان دینے کا دعویٰ کررہے تھے اور اب ایک منٹ میں تمہاری ہوا کھسک گئی۔'' میں نے کہا کہ واقعی میں بہن کی خاطر اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن جس طرح کا کام تم کرتے ہو وہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ جواب میں وہ بولا۔

''تو پھر لکھ لو کہ تم اپنی بہن کو اس کے گھر رخصت کرکے نہیں بھیج سکتے۔ اس ایک طریقے کے علاوہ نہ تو تم کسی اور طریقے سے اتنی جلدی اتنی رقم کما سکتے ہو اور نہ ہی کوئی تمہیں اتنا قرض دے گا۔'' اس کا کہنا بھی درست تھا۔ میں چپ سادھ گیا۔ میری خاموشی دیکھ کر وہ بولا۔ ''آج کی رات اچھی طرح سوچ لو جگر! بہن بیاہنی ہے تو ہمارے ساتھ شامل ہوجانا ورنہ ساری عمر اسے اپنے گھر بٹھا کے رکھنا۔'' میں تب بھی چپ رہا۔ اس نے بھی مجھے مزید نہیں چھیڑا اور چائے سموسوں کا بل ادا کرکے وہاں سے رخصت ہونے لگا۔ جاتے جاتے وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ''اگر تم ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہو تو ہم تمہیں کھلے دل سے خوش آمدید کہیں گے لیکن اگر تمہارا موڈ نہ بنے تو جو کچھ ابھی مجھ سے سنا ہے، اسے بھول جانا کیونکہ اگر تم نے زبان کھولنے کی کوشش کی تو پھر ہمیں تمہارے ہمیشہ کے لیے خاموش رہنے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔'' اس کا لہجہ اتنا خوف ناک تھا کہ میں اندر سے کانپ گیا۔ مجھ جیسا سیدھا سادہ لڑکا جو کبھی ہاف ٹائم میں اسکول سے نکل کر بھی نہ بھاگا ہو، اس طرح کے آدمی کا بھلا کہاں مقابلہ کر سکتا تھا۔ راشد ڈوگر نے مجھ سے جس لہجے میں بات کی تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے میں بھی دیر نہیں لگائے گا۔ ایک خوش مزاج اور ہمدرد نظر آنے والے شخص کا یہ روپ دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا تھا۔

''کچھ دیر بعد جب میں شاک سے باہر آیا تو واپس اپنے ہاسٹل چلا گیا۔ سارا دن اور رات میں نے راشد اور اس کی پیشکش کے بارے میں سوچتے ہوئے وقت گزارا۔ ایک طرف میرا دل کہتا تھا کہ جو راہ راشد نے دکھائی ہے وہ غلط ہے اور اس پر چل کر میں اپنی زندگی تباہ کرلوں گا لیکن دوسری طرف بہن کی زندگی کا سوال تھا۔ راشد نے صحیح کہا تھا کہ میں کسی اور طریقے سے بہن کی شادی کے لیے اتنی بڑی رقم حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ میرے انکار کی خواہش کے آگے بہن کی خوشیاں اور اس کی آس بھری نگاہیں دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں۔ جب میں گاؤں سے آرہا تھا تو میری بہن کی آنکھوں میں آس کے دیے روشن تھے۔ اسے امید تھی کہ اس کا بھائی اس کی خاطر کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ بس پھر جب مجھے اس کی وہ نگاہیں یاد آئیں تو میری ساری مزاحمت دم توڑ گئی اور میں نے راشد کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے خود کو تسلی دی تھی کہ بس میں اتنا عرصہ ہی ان لوگوں کے ساتھ شامل رہوں گا جتنے عرصے میں بہن کے جہیز کے لیے رقم جمع ہوجائے لیکن میں خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ ایک جھوٹی تسلی ہے۔ میں جس گڑھے میں گرنے جارہا ہوں، اس سے زندگی بھر نکل نہیں سکوں گا۔ بہرحال، میں نے اپنے تمام خدشات کو پس پشت ڈال کر راشد کو اپنی رضامندی کے بارے میں بتادیا۔ وہ میرا فیصلہ سن کر بہت خوش ہوا اور مجھے اپنے دوسرے ساتھیوں سے ملانے لے گیا۔

''شروع کا ایک مہینا ایک طرح سے انہوں نے میری ٹریننگ کی اور مجھ سے چھوٹی موٹی وارداتیں کرواتے رہے۔ ان وارداتوں سے مجھے رقم تو بہت معمولی ملی لیکن مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ میں فطری طور پر ایک بہادر اور نڈر آدمی ہوں۔ میرے ساتھیوں نے بھی یہ بات بھانپ لی چنانچہ جب میں نے ان سے مطالبہ کیا کہ اتنی معمولی رقوم سے میرا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا اور وہ مجھے کسی بڑی واردات میں شامل کریں تو انہوں نے انکار نہیں کیا۔ چند دن بعد ہم نے ایک سپر اسٹور پر کامیاب ڈاکا مارا۔ اس واردات میں میرے حصے میں چالیس ہزار کی رقم آئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر ایسی ہی تین چار وارداتیں اور کرلی جائیں تو بہن کی شادی کے لیے اچھی خاصی رقم جمع ہوسکتی ہے۔ میں نے ماں کو خط لکھ دیا کہ وہ چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ لے لے۔ رقم کے سلسلے میں، میں نے اسے یہ بتایا تھا کہ میرا ایک دوست قرض دینے پر تیار ہوگیا ہے۔ ماں کو خط لکھنے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے مطالبہ کیا کہ اب ہمیں جلدی جلدی بڑا ہاتھ مارنا چاہیے۔ گروپ لیڈر اس بات کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کم وقفے سے کی جانے والی بڑی وارداتیں ہمیں مشکل میں ڈال دیں گی۔ وہ سنبھل کر اور ٹھنڈا کرکے کھانے کا قائل تھا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ راشد بھی یہ بات سمجھتا تھا چنانچہ اس نے بھی گروپ لیڈر پر زور دیا کہ میرے مسئلے کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے وہ لوگ اپنے اصول سے ہٹ کر طریقۂ کار اختیار کرلیتے ہیں۔ آخر کار فیصلہ میرے حق میں ہوا اور یوں ہم نے جلدی جلدی وارداتیں کرنا شروع کردیں۔ بہن کی شادی سے مہینا بھر پہلے ہم نے جو آخری واردات کی، اس سے اچھی خاصی رقم ہاتھ آنے کی امید تھی۔ یہ رقم مل جاتی تو آمنہ کی شادی کے لیے مطلوبہ رقم پوری ہوجاتی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ میری آخری واردات ہوگی اور اس کے بعد میں آئندہ یہ غلیظ کام نہیں کروں گا۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اگر میں کراچی میں رہا تو میرے ساتھی میری جان نہیں چھوڑیں گے اس لیے میں نے خاموشی سے یہ بھی انتظام کرلیا تھا کہ میرا ٹرانسفر پنجاب

www.kahopakistan.com

یونیورسٹی میں ہو جائے۔ بہن کی محبت میں، میں نے جرم کا راستہ ضرور اپنایا تھا لیکن اپنے حوالے سے اپنے والد کے خواب کو نہیں بھولا تھا۔ راشد اور میرے دوسرے ساتھیوں کو علم نہیں تھا کہ میں کس علاقے کا رہنے والا ہوں اس لیے بھی مجھے یقین تھا کہ میں اپنے منصوبے میں کامیاب رہوں گا لیکن قسمت کی تیز ہواؤں کی زد پر آ کر میرے یقین کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں۔

''میں جس واردات کو اپنی مجرمانہ زندگی کا اختتام سمجھ رہا تھا، وہ درحقیقت میرے ایک مستقل مجرم بننے کا آغاز بن گئی۔ اپنی طرف سے میں نے اور میرے ساتھیوں نے واردات کی پوری منصوبہ بندی کی تھی۔ ہم جس جیولری شاپ کو لوٹنے جا رہے تھے، اس کے گارڈ اور مالک کے پاس اسلحے کی نوعیت تک کا ہمیں اچھی طرح علم تھا۔ ان دونوں افراد کو ہم نے پہلے ہی مرحلے پر کنٹرول کر لیا تھا۔ کوئی بھی واردات کرتے وقت ہم اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ ہمارے ہاتھوں کسی بندے کی جان نہ جائے۔ قتل کی صورت میں جرم کی نوعیت زیادہ سنگین ہو جاتی ہے اس لیے ہم اس عمل سے دور ہی رہتے تھے۔ جیولری شاپ پر بھی ہم اس مقصد میں کامیاب رہے لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہاں موجود گاہکوں میں سے ایک ریٹائرڈ فوجی افسر بھی ہے۔ وہ افسر مسلح تھا۔ ہماری زیادہ توجہ چونکہ جیولری شاپ کے اسٹاف کی طرف تھی اور ہم نے وہاں موجود گاہکوں کو صرف دھمکا دینا ہی کافی سمجھا تھا، اس لیے اس فوجی افسر کو اپنا اسلحہ نکال کر استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کی فائرنگ کی زد میں جو دو افراد آئے، ان میں سے ایک میں تھا۔ ہم دونوں زخمیوں کو چھوڑ کر ہمارے باقی ساتھی افراتفری میں فرار ہو گئے۔ میری ٹانگ پر گولی لگی تھی۔ میں زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ تعاقب میں لگی بدقسمتی نے اس موقع پر مجھ پر ایک وار اور کیا۔ انہی دنوں میری بہن کا منگیتر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کراچی گھومنے پہنچ گیا۔ اس نے نیوز چینلز پر چلنے والی خبروں میں مجھے دیکھ کر شناخت کر لیا اور گاؤں واپس جا کر یہ خبر اپنے گھر پہنچانے کے ساتھ ساتھ پورے گاؤں میں پھیلا دی۔ اس موقع پر وہ لوگ جن کی کمینگی کی وجہ سے میں جرم کی راہ پر چلنے پر مجبور ہوا تھا، سب سے زیادہ عزت دار بن گئے اور انہوں نے یہ کہہ کر منگنی ختم کر دی کہ ہم ایک ڈاکو کی بہن کو اپنے گھر کی بہو نہیں بنا سکتے۔ ایک تو میری مجرمانہ زندگی اور گرفتاری کی خبر نے ہی میری ماں، بہن کو ہلکان کر دیا، دوسرے رشتہ ٹوٹ گیا۔ میری بہن نے اس بات کا اتنا صدمہ لیا کہ برداشت نہیں کر سکی اور خودکشی کر لی۔ مجھے حوالات میں اپنی بہن کے مرنے کی اطلاع ملی اور میں نے درخواست کی کہ مجھے ایک بار اپنے گھر جانے کی اجازت دی جائے۔

''میرے کیس کا تحقیقاتی افسر اچھا آدمی تھا۔ میری داستان سن کر اسے افسوس بھی بہت ہوا تھا۔ اس کی خصوصی کوشش سے مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ میں پولیس کی نگرانی میں جب اپنے گاؤں پہنچا تو میری بہن کی تدفین ہو چکی تھی۔ میں نے چاہا کہ ماں کے گلے لگ کر اس کے ساتھ اس غم پر آنسو بہا سکوں اور اس سے اپنے کیے کی معافی مانگوں لیکن ماں نے مجھ سے ملنا گوارا نہیں کیا اور میں اپنے ہی گھر کی دہلیز سے واپس لوٹا دیا گیا۔ جب میں وہاں سے مایوس پلٹ رہا تھا تو مجھے اپنی بہن کا منگیتر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کھڑا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس نے میری یہ حرکت نوٹ کر لی اور جواب میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر مجھ پر پھبتیاں کسنے لگا۔ میں پہلے ہی غم و غصے کا شکار تھا چنانچہ برداشت نہیں کر سکا اور اس پر حملہ کر بیٹھا۔ میرے ساتھ آئے ہوئے پولیس کے سپاہی جب تک مجھے سنبھالتے، تب تک میں اس خبیث کو اپنے ہاتھوں میں پڑی زنجیر سے گلا گھونٹ کر ختم کر چکا تھا۔ اس شخص کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں وہاں سے فرار ہو گیا اور کئی دن تک بھوکا پیاسا ویرانوں میں بھٹکتا رہا۔ ایک دن جبکہ میں بھوک اور پیاس سے نڈھال ایک سنسان جگہ پر درخت کی چھاؤں میں لیٹا تھا کہ ایک آدمی وہاں چلا آیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اس نے مجھے کھلایا پلایا اور مجھ سے میرے حالات دریافت کیے۔ میں ذہنی طور پر اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس کی ذرا سی ہمدردی پا کر اسے اپنا سارا احوال کہہ سنایا۔

''میری داستان سن کر وہ بولا کہ اب تمہارا واپس جانا تو ممکن نہیں ہے، اگر واپس جاؤ گے تو قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پھانسی پر چڑھ جاؤ گے اور تمہاری بوڑھی ماں کو جوان بیٹی کے بعد بیٹے کی موت کا صدمہ بھی اٹھانا پڑے گا اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم واپس جانے کے بجائے کسی طاقتور آدمی کی پناہ میں چلے جاؤ۔ اس آدمی نے مجھے بتایا کہ اس کے کچھ ایسے لوگوں سے روابط ہیں جو مجھے اپنے پاس پناہ دے سکتے ہیں پھر اس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے مجھے خاموشی سے سندھ سے نکال کر پنجاب پہنچا دیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ میں جرم کے جس تالاب میں گرا تھا، اب اس سے نکل کر سمندر میں پہنچ گیا ہوں۔ قسمت نے مجھ سے عجیب مذاق کیا تھا۔ میں اپنا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے کراچی سے نکل کر

پنجاب یونیورسٹی میں ٹرانسفر کروانے کا سوچ رہا تھا اور ٹرانسفر ہو گیا جرائم کی یونیورسٹی میں۔ اپنی کم اعصاب زدگی میں، میں نے اس صورتِ حال کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور ان ڈاکوؤں کے ساتھ شامل ہو گیا۔'' اپنی داستان کے اختتام پر اسلم کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے جنہیں ماہ بانو سے چھپانے کے لیے وہ رخ موڑ کر بیٹھ گیا۔

''اور تمہاری ماں... تمہیں ان کی کچھ خبر ہے؟'' اس کے لیے دل میں گہرا درد محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو نے اس سے پوچھا۔

''وہ زندہ ہے یہ مجھے معلوم ہے لیکن میں گاؤں سے فرار ہونے کے بعد اس کی شکل دوبارہ نہیں دیکھ سکا۔ جس شخص کو میں نے قتل کیا تھا، اس کے گھر والے قسم کھا کر بیٹھے ہیں کہ اگر میں ان کے ہاتھ لگ گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں ان کی اس دھمکی سے تو خیر نہیں ڈرا اور ایک بار رات کی تاریکی میں گاؤں پہنچ گیا کہ کسی طرح ماں سے مل سکوں لیکن ماں نے اس وقت بھی مجھے مایوس لوٹا دیا۔ وہ بہت ضدی عورت ہے اور عہد کر کے بیٹھی ہے کہ جیتے جی نہ مجھے اپنی شکل دکھائے گی اور نہ ہی میری شکل دیکھے گی۔ ماں کی اس ضد کی وجہ سے میں دوبارہ گاؤں کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اب بُری بھلی جیسی بھی میری ان لوگوں کے ساتھ گزر رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی تاریک رات جب میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ واردات کے لیے نکلوں تو پھر واپس نہ آ سکوں اور جرم کی اس دنیا سے نکل کر موت کی آغوش میں سکون سے سو جاؤں۔'' پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ یہ جملے ادا کرتے ہوئے اسلم کے چہرے پر اتنا درد تھا کہ ماہ بانو کو اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا اسلم جیسا شخص واقعی اس بات کا حق دار ہے کہ تاریک راہوں میں خاموشی سے مارا جائے؟

☆☆☆

''تجھے کس نے کہا تھا یہ سب کرنے کو؟ وڈے ارمان پھوٹ رہے تھے تیرے دل میں؟'' فریدہ جب سیڑھیوں سے گری یا گرائی گئی تو اس وقت چودھری حویلی میں موجود نہیں تھا۔ منصوبہ بندی کرنے والوں نے اس بات کا خاص طور پر خیال بھی رکھا تھا لیکن قدرت کو ان کی چال ناکام بنانا منظور تھی کہ ادھر فریدہ لڑھکتی ہوئی آخری سیڑھی تک پہنچی، اُدھر چودھری کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی۔ حویلی میں ہنگامہ بپا تھا اور ظاہری طور پر سب بڑے پریشان نظر آ رہے تھے لیکن کوئی بھی یہ کوشش نہیں کر رہا تھا کہ فریدہ کو فوری طبی امداد پہنچ سکے۔ چودھری وہاں پہنچا تو فریدہ کو اس حال میں دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جو کچھ ہوا، وہ اس کے لیے مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔ فریدہ اسے پہلے ہی دھمکی دے چکی تھی کہ اس کی حادثاتی موت کی صورت میں اس کے ہمدرد متحرک ہو جائیں گے اور چودھری کو کہیں کا نہیں چھوڑیں گے۔ اس دھمکی کے باعث وہ خود چاہنے کے باوجود فریدہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اب جو یہ منظر دیکھا تو اسے اپنی فکر پڑ گئی۔ فوری طور پر اس نے ڈاکٹر ماریا کو فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے حویلی پہنچنے کی درخواست کی۔

ڈاکٹر ماریا شادی کے سلسلے میں چند چھٹیاں کرنے کے بعد دوبارہ مرکزِ صحت پر ڈیوٹی دینے آنے لگی تھی۔ چودھری کا فون ملتے ہی وہ فوراً حویلی پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ایک مڈوائف بھی تھی اور وہ ضرورت کا تمام دستیاب سامان بھی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس وقت وہ مڈوائف کے ساتھ حویلی کے ایک کمرے میں فریدہ کی جان بچانے کی کوشش میں مصروف تھی جبکہ باہر چودھری وڈی چودھرائن سے الجھ رہا تھا۔

''میں نے کچھ نیا تو نہیں کیا چودھری صاحب! حویلی کی ریت ہے یہ۔ بھلے سے فریدہ آپ کے دشمن کی بہن ہے لیکن بہزاد شاہ تو حویلی کے وارثوں میں سے ہے۔ بے شک اسے ہوش نہیں پر ہمیں تو ہوش ہے نا کہ اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ میرے لیے تو وہ اپنے مراد شاہ کی طرح ہی ہے۔ بھلے آپ یقین کرو نہ کرو لیکن میں نے کبھی مراد شاہ اور بہزاد شاہ میں فرق نہیں سمجھا ہے۔ اگر بہزاد شاہ کی ماں زندہ ہوتی تو ہور گل تھی لیکن ابھی تو مجھے ہی ساری رسمیں ریتیں پوری کرنی تھیں، پر مجھے کیا علوم تھا کہ ایسی مصیبت سر پر آ پڑے گی... ہور کڑی سیڑھیوں سے گر جائے گی۔''

وہ چونکہ سب کچھ طے شدہ منصوبے کے مطابق کر رہی تھی اس لیے اسے چودھری کے سامنے وضاحتیں پیش کرنے میں مشکل پیش نہیں آئی۔ چودھری کا عین وقت پر حویلی پہنچ جانا البتہ اس کے منصوبے کے خلاف تھا ورنہ وہ فریدہ کو طبی امداد تو ضرور پہنچاتی لیکن اتنی تاخیر سے کہ پھر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اب بھی وہ پُرامید تھی کہ اسے کامیابی حاصل ہو گی اور بے شک فریدہ کی جان بچ جائے لیکن اس کی کوکھ میں پلتا بچہ نہیں بچ سکے گا۔ اس کی اصل دشمنی تھی بھی اس بچے سے ہی۔ وہ زندہ رہتا تو اس کی اولاد کے ساتھ جائداد کا وارث اور حصے دار ٹھہرتا جبکہ وہ کسی صورت اپنی اولاد کے سوا کسی اور کو اس جائداد پر عیش کرتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

www.kahopakistan.com

''میرے سر پر دس مصیبتیں پڑی ہیں، ہور تجھے رسموں ریتوں کی پڑی ہے۔ کیا دیا ہے مجھے حویلی کے ان وارثوں نے۔ ایک کو کس گل کا ہوش نہیں ہے، ہور دو جا بیوی بچوں کے ساتھ امریکا جا کر بیٹھ گیا ہے۔ دو دھیاں عزت سے بیاہ دی تھیں اور تیسری کے لیے سوچا تھا کہ اس کے جوڑ کا ہر خاندان میں نہیں تو کوئی گل نہیں۔ میرے نال کوئی کمی تو ہے نہیں کہ دھی کو کھلا پہنا نہ سکوں۔ حویلی میں عیش سے رہ کر ساری حیاتی گزار لے گی لیکن وہ تو میری ناک ہی کٹوا کر چلی گئی۔ جب تک میں اسے ہور اس کے اس نامراد عاشق کو پکڑ کر نوٹے ٹوٹے نہیں کر ڈالتا، اس حویلی پر ساری خوشیاں حرام ہیں۔ کان کھول کر سن لے چودھرائن کہ اب یہاں خوشی کے شادیانے تب ہی بجیں گے جب کشور کا جنازہ اٹھے گا۔'' غضب ناک چودھری نے حکم صادر کیا۔

''ہاں چودھری صاحب جو آپ کا حکم۔'' چودھرائن نے فرماں برداری کا مظاہرہ کیا لیکن اس وقت درحقیقت اس کا ذہن اس کمرے کی طرف لگا ہوا تھا جہاں فریدہ اور اس کے بچے کی زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ دوسری طرف چودھری دُہرے ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ اسے کشور اور آفتاب کے سلسلے میں مہک بُک شاپ کا جو کلیو ملا تھا، وہ بے کار گیا تھا۔ اس کے آدمی بُک شاپ کے مالک شفیق کی جان لے کر بھی کچھ معلوم نہیں کر پائے تھے۔ مالک کے علاوہ انہوں نے دکان کے ملازمین کو بھی کھنگالا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی ماسٹر آفتاب نامی شخص سے واقف نہیں تھا۔ اس کے آدمیوں نے بُک شاپ کے مالک کی بیٹی مہک کی نگرانی کر کے بھی دیکھ لیا تھا کہ اگر آفتاب ان لوگوں کا واقف کار ہے تو شفیق خان کی موت پر اس کی بیٹی سے تعزیت کرنے ضرور آئے گا لیکن یہ نگرانی بھی بے سود گئی تھی۔ آفتاب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔

ان حالات میں چودھری اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ یا تو اسے ملنے والا کلیو غلط تھا یا پھر آفتاب کوئی اور نام اختیار کر کے رہ رہا تھا جس کی وجہ سے کوئی اسے نام سے شناخت نہیں کر پا رہا تھا۔ حقیقت جو بھی تھی لیکن وہ اپنی ناکامی پر بُری طرح بلبلایا ہوا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ آفتاب اور کشور اس کے چنگل میں آتے آتے بچ نکلے تھے۔ قسمت ان دونوں کا ساتھ دے رہی تھی اس لیے وہ ہر بار ہاتھ آتے آتے رہ جاتے تھے۔ دوسری طرف وہ ماہ بانو کے حویلی سے غائب ہو جانے پر برافروختہ تھا۔ اسے ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ حویلی سے نکلنے میں کس طرح کامیاب ہوئی۔ جن ملازمین نے اسے نکالنے میں مدد دی تھی، وہ مُردہ پائے گئے تھے۔ چودھری اپنا غصہ ان ملازمین کے بچوں کو بے عزت کر کے ان کی ہلاکت کی صورت میں ہی نکال سکا تھا لیکن ماہ بانو کا پتا ہنوز نہیں چل سکا تھا اور اب یہ فریدہ کی مصیبت سر پر آ پڑی تھی۔ عام حالات میں اسے فریدہ یا اس کے بچے کی موت زندگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن فریدہ کی دشمنی تلوار کی صورت اس کے سر پر لٹکی ہوئی تھی۔ وہ کسی صورت میڈیا کی یلغار کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مبارک ہو چودھری صاحب! آپ کے ہاں پوتا ہوا ہے اور فریدہ کی زندگی بھی بچ گئی ہے۔'' چودھری اور وڈی چودھرائن اپنی اپنی فکروں اور سوچوں میں غلطاں کسی خبر کے منتظر بیٹھے تھے کہ ڈاکٹر ماریا نے وہاں آ کر مسکراتے ہوئے انہیں اطلاع دی۔ اس اطلاع پر جہاں چودھری نے سکون کا سانس لیا، وہیں چودھرائن کے سینے میں آگ لگ گئی لیکن وہ اپنے دلی جذبات چھپاتے ہوئے منافقانہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

''مبارک ہو چودھری صاحب! آپ کی نسل جاری رکھنے والا ایک ہور پتر آ گیا۔ میں ابھی منشی جی کو کہلواتی ہوں کہ درگاہ پر صدقے کی دیگیں چڑھوا دیں۔'' وہ جوش و خروش سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

''آپ کو جو کچھ کرنا ہے کریں لیکن میں آپ پر واضح کر دوں کہ ماں اور بچے کی جان ابھی مکمل طور پر خطرے سے باہر نہیں ہے۔ فریدہ کا خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے جبکہ بچہ چونکہ پری میچور ہے اس لیے اسے بھی بہت زیادہ کیئر کی ضرورت ہے۔ مجھ سے وقتی طور پر جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ میں کر چکی ہوں لیکن اب آپ کو فوری طور پر ماں اور بچے کو کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کرنا ہوگا۔ دونوں کی زندگی بچانے کے لیے یہ بہت اہم ہے۔ دیر کرنے کی صورت میں کوئی بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔'' چودھرائن کے جوش و خروش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ڈاکٹر ماریا نے براہِ راست چودھری کی طرف رخ کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں اسے بتایا۔

''میں ابھی گڈی نکلواتا ہوں۔'' اس کی بات سن کر چودھری جلدی سے بولا۔

''اس کے مقابلے میں ایمبولینس زیادہ بہتر رہے گی۔ اس میں آکسیجن سلینڈر اور فوری طبی امداد کا دوسرا سامان موجود ہے۔ راستے میں اگر کوئی پریشانی پیش آئی تو اس سے نمٹا جا سکے گا۔'' ماریا نے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسا آپ کہیں۔'' چودھری کے لیے

فریدہ کی زندگی بہت اہم تھی۔

''اور ہاں... خیال رہے کہ فریدہ کے ساتھ اسپتال میں آپ کا کوئی قابلِ اعتبار شخص ہے۔ فریدہ نے شک ظاہر کیا ہے کہ اس کے ساتھ ہونے والا حادثہ اس کے قتل کی سازش بھی ہو سکتی ہے اور آئندہ کے لیے بھی وہ اپنی اور اپنے بچے کی جان خطرے میں محسوس کر رہی ہے۔'' یہ جملے کہتے ہوئے ڈاکٹر ماریا کی نظریں چودھری اور وڈی چودھرائن دونوں کے چہروں پر بھٹک رہی تھیں۔ اپنی اپنی جگہ احساسِ جرم میں مبتلا وہ دونوں ہی اس سے نظریں چرا گئے۔ ڈاکٹر ماریا جن دو افراد سے فریدہ کے تحفظ کے لیے اقدامات کرنے کو کہہ رہی تھی، درحقیقت اسے ان دونوں سے ہی سب سے زیادہ خطرہ لاحق تھا لیکن ان دونوں کی فریدہ سے مخاصمت کی وجوہات اتنی مختلف تھیں کہ دونوں ہی ایک دوسرے پر اسے ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

راحیلہ سکتہ زدہ سی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی اور بے یقینی کے عالم میں اس کاغذ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دائیں ہاتھ میں موجود سفید لفافے سے نکلا تھا۔ یہ لفافہ کچھ دیر قبل ہی ایک ویٹر دے کر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس لفافے میں اس کے لیے کوئی پیغام ہے اور وہ حیران رہ گئی تھی کہ یہاں کون اسے پیغام بھیج سکتا ہے؟ اس کی اس ہوٹل میں موجودگی کا علم تو اس کے ماں باپ کو بھی نہیں تھا۔ بہرحال، اس نے ویٹر سے لفافہ وصول کر لیا تھا کہ لفافے پر واضح طور پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ لفافہ کھول کر اس نے اس میں تہ کر کے رکھا گیا کاغذ کھولا تو تحریر پڑھے بغیر ہی جان گئی کہ اسے یہ پیغام بھیجنے والا اس کا بھائی ڈاکٹر طارق ہے۔ لفافے کے اوپر لکھے نام سے اس نے طارق کی لکھائی کو اس لیے شناخت نہیں کیا تھا کہ وہ اس بات کی توقع ہی نہیں کر رہی تھی کہ برابر والے کمرے میں مقیم طارق اسے کوئی تحریری پیغام بھیج سکتا ہے لیکن اب چند لفظوں کے مقابلے میں باقاعدہ کئی سطور لکھی دیکھ کر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ طارق کی لکھائی کو شناخت نہ کر سکے۔ گھر میں وہی طارق سے سب سے زیادہ قریب تھی اور اپنی تعلیم سے لے کر دوسرے تمام معاملات تک اسی سے مدد لیتی تھی۔ طارق بھی اسے عموماً اپنے ساتھ ساتھ رکھنا پسند کرتا تھا۔

دونوں بہن بھائی کی اس قدر قربت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ کراچی چھوڑ کر یہاں اسلام آباد تک آ گئی تھی اور ہوٹل کے اس کمرے میں تقریباً قیدیوں کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ طارق نے اس سے یہی کہا تھا کہ اس کا غیر ضروری طور پر باہر نکلنا ان کے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ طارق اسے کچھ بھی کھل کر نہیں بتا رہا تھا۔ اس کا انداز بہت پُراسرار تھا اور اب اس نے اسے یہ خط بھیج دیا تھا۔ راحیلہ نے اس کی اس حرکت پر حیران ہوتے ہوئے خط کے الفاظ پڑھے اور مزید حیران ہو گئی طارق نے لکھا تھا۔

''ڈیئر سس!

تم مجھے اپنی ذہانت اور سمجھ داری کی وجہ سے ہمیشہ بہت عزیز رہی ہو۔ تم نے بھی میرے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کی بلکہ ہمیشہ مجھے تم سے مدد ہی ملی ہے۔ یہ آخری مدد تم نے میری کی ہے، اس کے لیے میں تہ دل سے تمہارا مشکور ہوں کیونکہ اگر یہ سب نہیں ہوتا تو مجھے اپنا مستقبل بنانے کا ایسا سنہری موقع نہ ملتا اور میں پوری طور پر یہاں سے امریکا روانہ ہونے کے قابل نہیں ہو پاتا۔ تم شاید میری بات پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی ہو گی... تو چلو میں تمہاری اُلجھن دور کر دیتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے کا کتنا شوق تھا۔ میرے اس شوق کی راہ میں وسائل کی کمی رکاوٹ بن کر کھڑی تھی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں نے بڑے ہاتھ پیر مارے، یہاں تک کہ لڑکیوں کی خرید کرنے والے ایک آدمی کو لڑکیاں سپلائی کرنا تک منظور کر لیا۔ تمہیں میرے ساتھ جاب کرنے والی وہ نرس تو یاد ہو گی جس کی بہن ہمارے گھر آئی تھی اور جس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن میرے ساتھ ڈنر پر گئی تھی لیکن واپس گھر نہیں آئی۔ میں نے اس عورت کو غلط قرار دے کر گھر سے روانہ کر دیا تھا لیکن درحقیقت وہ عورت غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی بہن کو سپلائی کر دیا تھا لیکن وہ شخص بڑا بے ایمان نکلا اور طے شدہ رقم سے آدھی رقم دے کر مجھے ٹال دیا۔ میں اس کے خلاف کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا اس لیے خاموشی اختیار کرنی پڑی لیکن مجھے کسی نہ کسی طرح باہر تو جانا ہی تھا۔ انہی دنوں تم مہرین کو اپنے ساتھ لے کر گھر آنے لگیں۔ مجھے وہ لڑکی اچھی لگی۔ وہ بہت خوب صورت اور پُرکشش تھی اور میں نے سوچا تھا کہ اسے بھی اپنے جال میں گرفتار کر کے اس آدمی تک پہنچا دوں گا لیکن اس بار میں سودے میں دھوکا نہیں کھانا چاہتا تھا اس لیے مہرین کی تصویریں دکھا کر پہلے ہی اس سے آدھی رقم وصول کر لی تھی۔ باقی آدھی رقم کے لیے میں مہرین کو اپنے جال میں جکڑتا، اس سے قبل ہی حادثاتی طور پر یہ بات علم میں آ گئی کہ وہ لڑکی درحقیقت مہرین نہیں، ماہ بانو ہے اور ایک وڈیرے

www.kahopakistan.com

سے بچنے کے لیے مہرین بن کر یہاں چھپی ہوئی ہے۔ میں نے اس وڈیرے سے رابطہ کیا اور بھاری رقم کے عوض اسے مہرین یا ماہ بانو جو بھی کہہ لو، اس کا پتا بتا دیا۔ تم نے بھی میرے ساتھ ہی ماہ بانو کی داستان سنی تھی اس لیے یہ بھی جانتی ہو گی کہ ماہ بانو کی پشت پر بھی ایک بااثر شخصیت موجود تھی۔ اس شخصیت سے بچنے کے لیے ہی میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک میں ملک سے باہر نہیں نکل جاتا، تب تک ہمارا چھپ کر رہنا ضروری ہے۔

تمہیں میں اس لیے اپنے ساتھ لے آیا تھا کہ تمہارے ذریعے ان لوگوں کو یہ علم ہو سکتا تھا کہ میں ملک سے باہر جانے کے چکر میں ہوں۔ وہ میرا نام ای سی ایل میں ڈلوا دیتے تو مجھے بڑی مشکل ہو جاتی۔ اب جبکہ تمام مراحل بہ خیر و خوبی طے ہو گئے ہیں اور میں صبح تمہارے جاگنے سے پہلے روانہ ہو چکا ہوں گا تو تمہارے لیے میرا یہی مشورہ ہے کہ فوری طور پر گھر کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ ہوٹل کا بل میں نے جمع کروا دیا ہے۔ تمہارے پاس اتنی رقم بھی ہے کہ اسلام آباد سے کراچی تک کا سفر بہ آسانی کر سکو۔ وہاں جا کر تم میرا یہ خط سب کو دکھا سکتی ہو، اس طرح تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ رہا میں تو مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ میرا اب کبھی واپس پاکستان آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ تمہارے بے حد تعاون کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔

یور لونگ برادر

ڈاکٹر طارق...''

شروع سے آخر تک سارا خط کئی بار پڑھنے کے بعد بھی راحیلہ کی حیرانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ طارق کے اعترافات نے اسے سُن کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ خود غرض ہے، یہ بات وہ پہلے بھی جانتی تھی لیکن اس خود غرضی میں وہ اپنی سگی بہن کو بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرے گا، یہ بات وہ پہلے کبھی نہیں سمجھ پائی تھی۔ طارق کا کہنا تھا کہ کامیابی کے لیے کچھ بھی کر گزرو تو واقعی وہ اپنی اس بات پر عمل کر گیا تھا۔ وہ خود بھی کافی حد تک طارق کے اس مقولے پر عمل کرتی تھی۔ ماہ بانو سے دوستی بھی اس نے اپنی غرض سے کی تھی۔ ماہ بانو کے کالج جوائن کرنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں اس نے یہ بات جان لی تھی کہ وہ ایک محنتی اور ذہین طالبہ ہے چنانچہ اس نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس دوستی سے بھرپور استفادہ کر سکے گی اور نوٹس وغیرہ تیار کرنے کی زحمت سے بچ جائے گی۔ اس دوستی کو مزید گہرا کرنے اور اس پر اپنا اعتماد زیادہ سے زیادہ قائم کرنے کے لیے وہ اسے لے کر اپنے گھر بھی چلی گئی تھی۔ یہ وہی گھر تھا جو ان کے ایک عزیز ملک سے باہر جاتے وقت وقتی طور پر انہیں دے گئے تھے اور اس گھر میں صرف وہ اور طارق رہائش پذیر تھے۔ ان کے والد نے اس گھر میں قیام کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف بھائی کی محبت اور اچھے گھر میں رہنے کے شوق میں وہاں آ گئی تھی لیکن طارق یقیناً اس لیے وہاں رہ رہا تھا کہ لڑکیوں کو اپنی اچھی مالی پوزیشن دکھا کر متاثر کر سکے تاکہ وہ آسانی سے اس کے جال میں پھنس جائیں۔

بہرحال وہ ایک آدھ بار سے زیادہ ماہ بانو کو اپنے ساتھ گھر لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی لیکن پہلی ملاقات کے بعد ہی طارق نے اس سے اصرار شروع کر دیا کہ وہ اپنی سہیلی کو اپنے ساتھ وہاں لایا کرے۔ اس کے اس اصرار پر اسے خیال گزرا تھا کہ ماہ بانو اسے پسند آ گئی ہے لیکن اب سمجھ آ رہا تھا کہ وہ اسے پسند تو واقعی آ گئی تھی لیکن پسندیدگی کی وجہ کچھ اور تھی۔ وہ اسے بھی اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر کہیں فروخت کرنے کا سوچ رہا تھا لیکن یہ اتفاق ہی ہوا کہ ان کے علم میں یہ بات آ گئی کہ وہ کسی چودھری سے ڈر کر بھاگی ہوئی ہے چنانچہ طارق نے اپنا منصوبہ بدل لیا اور چودھری سے سودے بازی کر لی۔

وہ ان سب باتوں سے واقف نہیں تھی لیکن جب طارق نے اچانک ہی اسے اپنے ساتھ اسلام آباد چلنے کو کہا اور گھر والوں کو بتانے سے بھی منع کر دیا تو وہ چونک پڑی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ طارق سے کوئی غلط حرکت سرزد ہوئی ہے۔ وہ طبیعتاً کافی نڈر تھی اس لیے نہ تو گھبرائی اور نہ ہی ساتھ جانے سے انکار کیا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ بھائی کا ساتھ دے کر وہ اس کا اعتماد جیت سکتی ہے تاکہ آنے والے وقت میں بھائی بھی اسے فائدہ پہنچاتا رہے لیکن بھائی اس کی توقعات سے بڑھ کر خود غرض ثابت ہوا اور اسے اس اجنبی شہر میں تنہا چھوڑ کر خود اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے امریکا چل پڑا۔ اس کی اس خود غرضانہ روش پر وہ کچھ دیر تو بے حس و حرکت بیٹھی حیران ہوتی رہی لیکن پھر آخر کار اسے حرکت میں آنا پڑا۔ وہ ہوٹل کے اس کمرے میں تنہا زیادہ دیر تک نہیں رک سکتی تھی۔ اسے واپس اپنے گھر جانا تھا۔ وہ گھر... جو بہت چھوٹا تھا اور اس کے باپ نے اپنی حلال کی کمائی سے بنایا تھا لیکن اس کے بڑے بڑے خواب اس چھوٹے سے گھر میں نہیں سما پائے تھے۔

☆☆☆

''یہ لیجیے یہ ہے آپ کا نیا گھر۔'' دو کمروں کے ایک کشادہ سے صحن والے مکان پر ایک پُرسکون نظر ڈال کر

مسکراتے ہوئے آفتاب نے کشور سے کہا تو اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے نقاہت زدہ چہرے پر یہ خمسکراہٹ اور بھی عجیب لگی۔ وہ جس حادثے سے گزری تھی، اس میں اس کی اور بچے کی جان تو بچ گئی تھی لیکن اس کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا تھا۔ وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد پڑ جانے والے سیاہ حلقے اور پچکے ہوئے رخسار اس کی اس کمزوری کی گواہی دیتے تھے۔ ڈاکٹرز نے اس کے لیے ڈیلیوری تک مکمل بیڈ ریسٹ تجویز کیا تھا لیکن وہ لوگ جس مشکل کا شکار تھے، وہ انہیں ایک جگہ سکون سے ٹکنے بھی تو نہیں دیتی تھی۔ چودھری کے گرگوں کے پنڈی تک پہنچ جانے کے بعد وہ پنڈی یا اس کے گردونواح میں کہیں بھی رہنے میں خطرہ محسوس کر رہے تھے چنانچہ شہریار کی تجویز قبول کرتے ہوئے سندھ کا رخ کیا اور اب وہ دونوں میرپور خاص میں موجود تھے۔ یہاں تک آنے کے لیے کشور کو پہلے برقع میں ملبوس کراچی تک بائی ایئر سفر کرنا پڑا تھا اور وہاں سے آگے آفتاب اسے ایک جدید سہولیات سے لیس ایمبولینس میں لے کر بائی روڈ یہاں پہنچا تھا۔ گھر کا انتظام کرنے میں شہریار نے اس کی مدد کی تھی اور اپنے کسی ذریعے سے اس کے لیے یہ گھر حاصل کر کے اسے اطلاع دے دی تھی۔ شہر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد آفتاب نے اس شخص سے فون پر رابطہ کیا جس کا نمبر اسے شہریار نے دیا تھا۔ اس شخص نے اسے گورنمنٹ گرلز کالج تک پہنچنے کی ہدایت کی اور پھر وہاں سے ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر اس گھر تک پہنچا دیا۔

اس شخص کے روانہ ہوتے ہی کشور نے چہرے پر پڑا نقاب اتار کر پھینکا اور ایک چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ چارپائی پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ باقی گھر بھی اچھی حالت میں تھا اور وہاں ضرورت کی تمام بنیادی چیزیں موجود تھیں۔ یہ سارا انتظام آفتاب کی استدعا پر کیا گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کشور کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ گھر کا انتظام و انصرام سنبھال سکے۔ وہ خود بھی اس جھنجٹ میں الجھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کچھ زائد رقم خرچ کرنا مناسب سمجھا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی کتاب کا سیکنڈ ایڈیشن شائع کرنے کا بھی پبلشر نے حال ہی میں ایگریمنٹ کیا تھا اس لیے اسے رقم کی طرف سے زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ اب وہ یکسو ہو کر اپنے کالمز کے ساتھ ساتھ ناول کی تکمیل کا ارادہ رکھتا تھا۔ ناول اختتامی مراحل میں تھا اور اسے پوری امید تھی کہ بچے کی دنیا میں آمد سے قبل اشاعت کے لیے پریس میں چلا جائے گا۔ اس کا پبلشر رائلٹی کا چیک تو مسودہ ہاتھ میں آتے ہی اسے تھما دیتا چنانچہ اسے بے فکری سی کہ بچے کی پیدائش کے بعد اخراجات کا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ اس وقت تو اس کے پیشِ نظر سب سے اہم مسئلہ کشور کی صحت اور زندگی کا تھا چنانچہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ بے فکری اور آرام مہیا کرنا چاہتا تھا۔ اب بھی وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے اسکواش کا ٹھنڈا گلاس تیار کر کے لایا تھا اور گلاس اسے تھماتے ہوئے اس سے خوش گوار لہجے میں یہ جملہ کہا تھا لیکن جواب میں کشور کی مسکراہٹ بہت عجیب تھی۔

''شاید آپ کو یہ گھر پسند نہیں آیا؟'' اس کی مسکراہٹ سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''عارضی ٹھکانے کے لیے پسند ناپسند کا کیا سوال؟ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ جسے آپ میرا نیا گھر کہہ رہے ہیں، جانے مجھے اس میں کتنے دن رہنا نصیب ہو گا۔ زندگی نے عجیب ہی موڑ لیا ہے۔ کہاں تو حویلی کی چار دیواری سے باہر نکلنا نصیب نہیں ہوتا تھا اور کہاں اب سارا وقت اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنا پڑتا ہے۔ آپ کو یاد ہے نا کہ آپ سے ملنے کے لیے مجھے کتنے جتن کرنا پڑتے تھے۔ کبھی رات کی تاریکی میں اپنی جان داؤ پر لگا کر چپکے سے رانی کی مدد سے آپ تک پہنچتی تھی تو کبھی لاہور والی کوٹھی جانے کے لیے بہانے تلاش کرتی تھی۔ ایک خواب تھا دل میں کہ آپ کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں سکون کی زندگی گزاروں گی لیکن ایسا لگتا ہے کہ قسمت کو میرا یہ چھوٹا سا خواب بھی پورا کرنا منظور نہیں ہے۔'' وہ ایک بار پھر ڈپریشن کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی، اس میں عورت ویسے ہی بہت نازک احساسات کی مالک ہو جاتی ہے اور وہ تو پھر بڑے غیر معمولی حالات سے گزر رہی تھی۔

''آپ کو حویلی کی وہ جامد زندگی اچھی لگتی تھی یا میرے ساتھ یوں مارے مارے پھرنا صحیح لگتا ہے؟'' آفتاب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک نہایت ہی نازک سوال کیا۔ یاسیت کا شکار کشور اس سوال کو سن کر چونک گئی۔ آفتاب کے سوال سے ظاہر تھا کہ اسے اس کی زود رنجی بُری لگی تھی۔

''آپ کا ساتھ تو مجھے ہر حال میں اچھا لگتا ہے لیکن میری خواہش ہے کہ اب ہم کہیں سکون سے رہ سکیں۔ یہ بھاگ دوڑ بچے کی زندگی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ پھر بعد میں جب بچہ دنیا میں آ جائے گا تو اور بھی مشکل ہو جائے گی۔ کیا وہ بے چارہ بھی ہمارے ساتھ یونہی اِدھر اُدھر بھٹکتا رہے گا؟'' آفتاب کا ہاتھ تھام کر اپنے رخسار سے لگاتے ہوئے اس نے اپنے جذبات کے ساتھ ساتھ خدشات کا بھی اظہار کیا۔

www.kahopakistan.com

''آپ کی ہر خواہش، ہر خواب ضرور پورا ہوگا۔ ہمارا یہ مشکل وقت ہمیشہ ٹھہرا نہیں رہے گا۔ جیسے ہر رات کی صبح ضرور ہوتی ہے اسی طرح ہماری زندگی میں بھی خوشیوں کا سورج ضرور چمکے گا۔'' اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے آفتاب نے دلاسا دیا۔

''شاید ایسا ہی ہو لیکن اس سورج کے نکلنے تک جانے کتنی زندگیوں کے چراغ گل ہو جائیں گے۔ میرے دل پر بڑا بوجھ ہے آفتاب۔ کتنے لوگ ہیں جو ہم پر قربان ہو گئے ہیں۔ رانی، افضل بھائی، بابر، اسلام آباد والی خالہ اور ان کا بیٹا اور اب وہ انجان شخص شفیق خان۔ اپنے باپ کی موت کے بعد تو اس کی بیٹی دنیا میں تنہا ہی رہ گئی ہوگی۔ کیا اس نے اپنے دل میں ہمیں کوسا نہیں ہوگا کہ ہماری وجہ سے اس کے باپ کی جان چلی گئی۔ ہم تو اس بے چاری کو اس کے باپ کی موت کا پُرسہ تک نہیں دے سکے۔'' وہ ٹھیک ٹھاک ڈپریشن کا شکار تھی۔

''میں اس لڑکی سے تعزیت کرنے جانا چاہتا تھا لیکن مجھے خطرہ تھا کہ چودھری صاحب کے آدمی اس کے اردگرد ہی منڈلا رہے ہوں گے۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ اگر میرا شفیق خان سے کوئی تعلق ہے تو میں اس کی موت پر اس کی بیٹی سے ملنے ضرور جاؤں گا بس اسی ڈر اور احتیاط کی وجہ سے میں وہاں نہیں گیا۔ لیکن آپ یقین رکھیں کہ مہک سے تعزیت اور معذرت دونوں کرنا مجھ پر قرض ہے۔ مجھے زندگی میں جب بھی موقع ملا، میں یہ قرض ضرور ادا کروں گا۔ باقی بھی جو لوگ ہماری خاطر اپنی جان سے گئے، میرے دل میں بھی ان کے لیے گہرا رنج ہے لیکن پھر میں خود کو یہ کہہ کر بہلا لیتا ہوں کہ اللہ نے سب کی موت کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔ وہ لوگ بھی اپنے وقت پر ہی اس دنیا سے گئے ہوں گے، بس حیلہ ہماری ذات بن گئی۔ اس طرح سوچنے کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے ان لوگوں کی قربانی کا احساس نہیں ہے۔ میں دل سے ان سب کا احسان مند ہوں لیکن میرے پاس اس احسان کو اتارنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ میں ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہوں اور اللہ سے ان کے لیے جنت کے باغوں میں ہر نعمت عطا کر دینے کی درخواست کروں۔'' اس کا اپنا لہجہ بوجھل ہونے لگا۔ جو لوگ مارے گئے تھے اس کے سینے پہ یہ بوجھ سہنا آسان نہیں تھا لیکن وہ برداشت سے کام لے رہا تھا تو صرف کشور کی خاطر وہ ہی حوصلہ چھوڑنے لگی تو اس کے اپنے دل کا درد بھی زبان پر آ گیا۔ کشور نے ذہنی دباؤ کا شکار ہونے کے باوجود اس کی اس کیفیت کو بھانپ لیا اور فوراً ہی خود کو سنبھال کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آپ اداس نہ ہوں آفتاب! میرا دل بس یونہی ذرا سا گھبرا گیا تھا اس لیے میں ایسی باتیں کرنے لگی تھی۔ میرا مقصد آپ کو پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔'' آفتاب وہ شخص تھا جسے اس نے بے تحاشا چاہا تھا۔ اس کی کُل کائنات آفتاب کی ذات تک محدود تھی۔ وہ اسے کیسے اداس اور پریشان دیکھ سکتی تھی، سو فوراً ہی اس کی دل جوئی کرنے لگی۔

''دل کو سمجھایا کریں نا۔ آپ کا دل پریشان رہے گا تو اس کا اثر ہمارے چھوٹو پر بھی پڑے گا۔ پہلے ہی وہ بے چارہ بال بال بچا ہے۔ اب تو ہمیں اس کی اور بھی زیادہ حفاظت کرنا ہوگی اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ اپنا خیال رکھیں۔ خوش رہیں اور اچھی خوراک لینے کے ساتھ ساتھ آرام بھی کریں۔ آپ کو یاد نہیں کہ ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟ اب آپ کو بہت احتیاط کرنی ہے لیکن آپ خیال نہیں کرتیں اور بے احتیاطی کرتی ہیں۔'' اس نے خود بھی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور کشور کو سمجھانے لگا۔

''میں اپنا خیال کیوں رکھوں؟ آپ ہیں نا میرا خیال رکھنے کے لیے۔'' دل ربائی سے کہتے ہوئے کشور نے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔

''وہ تو میں رکھوں گا ہی۔ آپ مجھے عزیز نہیں ہوتیں تو آج ہم یہاں نہیں ہوتے... لیکن میری جان! آپ کو میرے ساتھ تعاون بھی تو کرنا ہوگا۔ یہ اداس اداس رہنا اور الٹی سیدھی سوچوں میں الجھے رہنا تو ہم دونوں کے لیے مسائل پیدا کر دے گا۔ آپ پہلی بار میں ہی خود کو اتنا نڈھال کر لیں گی تو اس فوج کا کیا ہوگا جو میں نے مستقبل میں تیار کرنے کا سوچ رکھی ہے۔'' اسے سمجھاتے سمجھاتے وہ کچھ شرارت پر اتر آیا تو کشور نے اسے مصنوعی ناراضی سے گھور کر دیکھا۔

''آپ تو مجھے ایسے گھور رہی ہیں جیسے آپ کا تعلق محکمہ بہبود آبادی سے ہے جنہیں دو سے زیادہ بچے اچھے ہی نہیں لگتے۔'' آفتاب نے اسے ایک بار پھر چھیڑا۔

''بچے تو میرے خیال میں ماں کو کتنے بھی ہوں، اچھے ہی لگیں گے لیکن بچوں کی فوج تیار ہونے کی صورت میں بچوں کے ابّے بُرے لگتے ہوں گے۔'' وہ بھی شرارت پر اتر آئی۔

''نہ بھئی، یہ تو ہمیں کسی صورت منظور نہیں کہ ہم آپ کو بُرے لگیں اس لیے میرے خیال میں بچے دو ہی اچھے رہیں گے۔'' وہ فوراً تائب ہوا اور پھر دونوں کی ہنسی کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔ اس ہنسی نے اداسی کے وہ بادل چھانٹ دیے جو کچھ دیر قبل وہاں چھائے ہوئے تھے اور زندگی تو نام ہی اس دھوپ چھاؤں کا ہے۔

☆☆☆

''ڈاکٹر طارق کی بہن راحیلہ گھر پہنچ گئی ہے سر! اس کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر طارق اسے اچانک ہی کراچی سے اسلام آباد لے گیا تھا۔ اس نے بہن سے کہا تھا کہ اس کی جان خطرے میں ہے اس لیے فوری طور پر کراچی چھوڑنا ضروری ہے۔ راحیلہ کے مطابق وہ اسلام آباد میں قیام کے دوران مسلسل طارق سے پوچھتی رہی کہ اسے کس سے خطرہ ہے لیکن اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ بعد میں وہ راحیلہ کے نام ایک خط چھوڑ کر خاموشی سے امریکا روانہ ہو گیا۔ راحیلہ نے اپنی بات کے ثبوت کے طور پر وہ خط مجھے دکھایا ہے۔ خط کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ چودھری کو ماہ بانو کی کراچی کے گرلز اسپتال میں موجودگی کی خبر دینے والا ڈاکٹر طارق ہی تھا۔ میں آپ کو خط کی کاپی بھجوا دوں گا، فی الحال اس کے خاص خاص نکات زبانی بتا دیتا ہوں۔'' شہریار نے جس آدمی کو راحیلہ کی فیملی کی نگرانی پر متعین کر رکھا تھا، وہ اسے فون پر رپورٹ دے رہا تھا۔ شہریار خاموشی کے ساتھ لیکن بڑے غور سے اس کی بات سنتا رہا۔

''میرے لیے مزید کیا حکم ہے سر؟'' رپورٹ دینے کے بعد اس آدمی نے دریافت کیا۔

''تم فی الحال چھٹی کرو۔ آئندہ کوئی کام ہوگا تو میں تمہیں بتاؤں گا۔'' ڈاکٹر طارق کے فرار کے بعد کچھ کرنے کے لیے بچا ہی نہیں تھا۔ وہ یہاں ہوتا تو اسے اس حرکت کی پاداش میں سخت سزا بھگتنی پڑتی لیکن خوش قسمتی سے وہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر اسے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ طارق ملک سے باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ ای سی ایل میں اس کا نام ڈلوا دیتا لیکن اسے یہ خیال اس لیے نہیں آیا تھا کہ ایک تو یہ کنفرم نہیں تھا کہ چودھری تک اطلاع پہنچانے والا وہی ہے، دوسرے اس پر شک کرنے کے باوجود وہ یہی سوچ رہا تھا کہ راحیلہ اور طارق معاملہ ٹھنڈا ہونے کے انتظار میں اندرون ملک ہی کہیں عارضی طور پر چھپ کر رہ رہے ہیں اور جلد یا بدیر منظر عام پر آ جائیں گے۔ اس کی توقع کے مطابق ایسا ہوا بھی تھا لیکن صرف راحیلہ سامنے آئی تھی اور طارق نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ موجودہ صورت حال میں وہ طارق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اور راحیلہ ایک طرح سے بے قصور نظر آ رہی تھی۔ اس کا جو تھوڑا بہت قصور تھا، اس کی سزا بھی وہ بھائی کی طرف سے ملنے والے دھچکے کی صورت میں بھگت چکی تھی چنانچہ نگرانی پر مامور آدمی کو فارغ کرنے کے

نیا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

ماہنامہ
سرگزشت

مئی 2011ء کی ایک جھلک

خادم اردو
دنیائے ادب کے ایک بلند قامت شخص کا زندگی نامہ

محفوظ عجوبہ
تعمیری غلطی کے سبب عجائباتِ عالم میں شمار ہو جانے والی عمارت کا احوال

جہنم کدہ
جاپان میں آئے سونامی اور ایٹمی پاور پلانٹ سے جوہری اخراج کا آنکھوں دیکھا حال

آفتاب موسیقی
فن موسیقی کے ایک قیمتی گوہر کا تذکرہ

مشرق مغرب
ایک دل دکھا دینے والی آپ بیتی

اس کے علاوہ
فلم و ادب کے مخفی گوشوں پر مبنی داستانیں، کہی ان کہی باتیں، سراب جیسی مقبول طویل سرگزشت ان کے علاوہ بھی بہت کچھ

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں،
آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے،

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

www.kahopakistan.com

علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

''اوکے سر! ایز یو وش۔'' اس کا جواب سن کر دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر سلسلہ منقطع ہوگیا۔ موبائل سیٹ میز پر رکھ کر وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے ایک بار پھر موبائل اٹھایا اور جگو کا نمبر نکال کر اسے ڈائل کرنے لگا۔ ماہ بانو کے مسلسل غیاب نے اس کے دماغ میں چنگاریاں سی بھر دی تھیں اور وہ ہر اس شخص کو سخت سزا دینا چاہتا تھا جو اس معصوم لڑکی کی زندگی کو بے سکون کرنے کا سبب بنا تھا۔ جگو نے دوسری ہی بیل پر اس کی کال ریسیو کرلی۔

''سلام صاحب! فرمائیے کیسے یاد کیا خادم کو؟'' اس کے انداز میں انکساری تھی۔ وہ کئی بار اس کے کام آنے کے باوجود اب بھی اس کے اس احسان کو نہیں بھولا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے بیٹے کی زندگی بچی تھی اور بچہ بروقت اسپتال پہنچ گیا تھا۔

''یاد تو تمہیں ایک کام سے ہی کیا ہے جگو! مجھے جس دشمن کا سامنا ہے، اس پر حملہ کرنے کے لیے تم سے بہتر آدمی نہیں ہے میرے پاس۔'' اس نے جگو کے سامنے اعتراف کیا۔

''یعنی چودھری افتخار عالم شاہ کی مزاج پرسی کرنی ہے۔'' وہ فوراً ہی سمجھ گیا۔ ''آپ حکم دیں کہ اس بار اس کے ساتھ کیا کرنا ہے؟ کام کی گارنٹی میں آپ کو ابھی سے دیتا ہوں۔'' وہ بڑا پُراعتماد تھا۔ وہ جس سیاسی پارٹی کے لیے غنڈا گردی کرتا تھا، آج کل اس کا ستارہ عروج پر تھا چنانچہ پارٹی لیڈرز کے علاوہ ان کے کارکنوں اور پالتو غنڈوں کی بھی موجیں ہورہی تھیں۔ جگو کی تو پھر بات ہی الگ تھی۔ وہ تو پارٹی لیڈر کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔

''کیا کرنا ہے یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ بس مجھے کام ایسا چاہیے کہ چودھری بلبلا اٹھے۔'' اس نے اپنی خواہش جگو تک پہنچائی۔ اس وقت وہ اپنے اسٹڈی روم میں تھا اس لیے بہت کھل کر بات کررہا تھا۔ ماریا پر اعتماد ہونے کے باوجود وہ صرف اس خدشے کی بنیاد پر کہ عورت کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا کہ کون سی بات کہاں کہہ ڈالے، اس سے اپنے معاملات پوشیدہ رکھتا تھا۔ راتوں کو بیڈروم چھوڑ کر کئی کئی گھنٹے اسٹڈی میں گزار دینے کے پیچھے ایک وجہ رازداری تھی جبکہ دوسرا سبب اس کی وہ دلی کیفیت بھی تھی جو ماریا کو اپنا ہم سفر بنالینے کے باوجود اسے اس کی قربت اختیار کرنے سے روکتی تھی۔ جانے کیوں اس کا دل اچھی خاصی خوب رو ماریا کے لیے کسی قسم کی رغبت محسوس ہی نہیں کرتا تھا۔

''میں سمجھ گیا سر! اطمینان رکھیں... کام آپ کی مرضی کے عین مطابق ہوگا۔'' دوسری طرف سے جگو اسے تسلی دے رہا تھا۔

''سچ پوچھو تو میری مرضی تو یہ ہے کہ چودھری جیسے بندے کے بوجھ سے اس دھرتی کو آزاد کردوں لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چودھری نہیں ہوگا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا لے لے گا اور یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ سارے ہی ایک جیسے ہوتے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو بار بار ایسی زک پہنچائی جائے کہ ان کا غرور ٹوٹ جائے اور یہ لوگ جو خود کو اس زمین پر خدا سمجھنے لگے ہیں، یہ سوچیں کہ سب کچھ ان کی مرضی سے ہی ہونا ممکن نہیں ہے۔'' جگو جس طرح اس سے تعاون کررہا تھا، وہ اس سے غنڈا ہونے کے باوجود اپنے دلی جذبات شیئر کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

''یہ زمینی خدا تو ہر جگہ ہیں سر! جس کا جہاں زور چلتا ہے وہ اپنا کام دکھا دیتا ہے۔ کون سا میدان ہے جو...'' جگو اپنے خیالات کا اظہار کررہا تھا لیکن ایک احساس نے شہریار کی توجہ اس کی بات کی طرف سے ہٹا دی۔ اسے یوں لگا تھا کہ اسٹڈی کے دروازے سے باہر کوئی موجود ہے۔ بہت معمولی سی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ رات کے اس پہر کسی ملازم کی وہاں موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ملازمین رات دس بجے تک فارغ ہوکر اپنے اپنے ٹھکانوں تک محدود ہوجاتے تھے اور صرف اسی صورت میں متحرک ہوتے تھے کہ انہیں حکم دیا جائے۔ پھر وہ کون تھا جو اسٹڈی کے باہر موجود تھا؟ کیا اس کا کوئی ملازم چھپ کے اس کی باتیں سننے کی کوشش کررہا تھا؟ دفتر کے فون پر ہونے والی گفتگو لیک آؤٹ ہوجانے کے بعد سے وہ سخت کانشیس ہوگیا تھا اور ہر ایک کو شک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا چنانچہ اب گھر میں موجود قابلِ اعتماد ملازمین بھی پہلے کی طرح قابلِ بھروسا نہیں لگتے تھے۔

وہ اپنی جگہ سے آہستگی سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اسٹڈی کے دروازے کی طرف بڑھا تاکہ وہ جو کوئی بھی ہے، اسے پکڑ سکے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے ہینڈل پر دباؤ ڈالا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے جو منظر تھا، وہ اس کے لیے قطعی ناقابلِ یقین تھا۔

یہ پرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

بڑا بھائی

مریم کے خان

زندگی کا تمام تر حسن پُرسکون ماحول میں مضمر ہے ..... خصوصاً جب اس کے گرد خوبصورت پھول کھلے ہوں... یہ پھول اس وقت تو اور دلکش ہوجاتے ہیں ... جب انسانی رشتوں کی صورت میں زندگی کا خاصہ ہوں... ایسے ہی دو بھائیوں کی کہانی جو ایک دوسرے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھے ...

محبت و انتقامی جذبات کے درمیان معلق ہوجانے والی واردات کا سنسنی خیز احوال

جوزف کے چہرے پر غور و فکر کے تاثرات تھے۔ وہ میرا بھائی ہے اور ہم دونوں میں وہ بڑا اور باس کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی فیصلہ وہ کرتا ہے اور اس پر عمل کرنا میری ذمے داری ہوتی ہے۔ جیکسن ولا میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے کے باوجود ہم آبائی طور پر ہنگری سے تعلق رکھتے تھے اور ہنگری میں خاندان اور بڑے بھائی کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوزف باس تھا۔ میری سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے لیکن ان دنوں ہمیں رقم کی اشد ضرورت تھی اور وہ یقیناً رقم کے حصول کے کسی طریقے پر غور کررہا ہوگا۔ پھر اس نے گہری سانس لی اور میری طرف دیکھا۔

www.kahopakistan.com

''ہم شیری کو اغوا کریں گے اور اس کے بدلے جانز سے تاوان طلب کریں گے۔''

میرا قد ساڑھے پانچ فٹ ہے لیکن اس وقت میں مزید ایک فٹ اونچا ہو گیا تھا۔ جوزف کی بات نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں نے غلط سنا ہے۔ میں نے مشکوک لہجے میں کہا۔ ''مجھے ایسا لگا ہے جیسے تم نے کسی کو اغوا کرنے کی بات کی ہے... اور شیری کا نام لیا ہے جو جانز جیسی کے بار میں کام کرتی ہے۔''

''میں نے شیری کا ہی نام لیا ہے اور وہ جانز جیسی کے بار میں ہی کام کرتی ہے۔'' جوزف غرایا۔ ''اس کمینے نے خود کو کیا سمجھا ہوا ہے۔ اس نے ہمارا بار ہتھیا لیا لیکن وہ اسے اتنی آسانی سے ہضم کر گیا ہے۔ یہ میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا۔''

دو سال پہلے یہ بار ہم بھائیوں کا تھا اور ہم اسے بہت شریفانہ انداز میں چلا رہے تھے۔ یعنی ہماری شرابوں میں نصف سے زیادہ ملاوٹ نہیں کی جاتی تھی۔ بھکنے والوں کو اٹھا کر باہر پھینکنے کے لیے غنڈے نہیں تھے اور سب سے بڑھ کر ٹاپ لیس رقص کرنے والی لڑکیاں نہیں تھیں، اس لیے بار میں صرف وہی لوگ آتے تھے جنہوں نے سچ مچ شراب پینی ہوتی تھی۔ بار اچھا چل رہا تھا کیونکہ شہر میں بڑے موقع کی جگہ پر تھا لیکن یہی بات بار سے ہم بھائیوں کی بے دخلی کی وجہ بن گئی۔ جانز ایک ابھرتا ہوا مقامی بدمعاش تھا جو بہت تیزی سے ترقی کرنا چاہتا تھا اور اسے کسی موقع کی تلاش تھی۔ اسے یہ موقع ہمارے بار کی صورت میں نظر آیا۔ ایک دن وہ اپنے گرگوں کے ساتھ اچانک بار میں داخل ہوا اور کاؤنٹر پر براجمان ہو گیا۔ وہ جوزف سے بار کے بارے میں سوالات کر رہا تھا۔ جوزف سادگی سے جواب دے رہا تھا اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جانز کیا کرنے والا ہے۔ جب اس نے جوزف سے بار کے بارے میں سب پوچھ لیا تو اس نے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے کاؤنٹر پر ڈال دیا۔

''یہ پچاس ہزار ڈالرز ہیں، اس بار کی قیمت... کل میرا وکیل تم سے معاہدے پر دستخط لے گا اور میرے آدمی آ کر قبضہ لے لیں گے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' جوزف نے احتجاج کیا۔ ''کس بات کے پچاس ہزار ڈالرز...؟ ہمارا یہ بار بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

اس بات پر جانز نے کاؤنٹر سے ایک بوتل اٹھائی اور اسے کاؤنٹر پر مار کر توڑ دیا۔ پھر اس نے یہ ٹوٹی ہوئی بوتل جوزف کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی اور آرام سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد جوزف اسے دبی زبان میں گالیاں دینے لگا۔ اس نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ ''میں اس کمینے کو اپنا بار کسی قیمت پر نہیں بیچوں گا۔''

یہی بات اس نے اگلے روز آنے والے وکیل سے کہی اور اس کا معاہدہ اس کے منہ پر دے مارا۔ نتیجے میں دو گھنٹے بعد جانز کے گرگے آ گئے اور جب وہ پولیس سائرن سن کر رخصت ہوئے تو بار میں کوئی چیز مع ہم دو بھائیوں کے سلامت نہیں رہی تھی۔ اس کے تیسرے دن ہم نے یہ بار جانز کو..... فروخت کر دیا۔ ملنے والی پچاس ہزار ڈالرز کی رقم سے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے اس لیے ایک سال سے بھی پہلے یہ رقم خرچ ہو گئی اور ہم دونوں بھائی ملازمت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جوزف کو ایک بار میں بارٹینڈر کی نوکری مل گئی تھی اور میں ایک شوز اسٹور پر سیلز مین بن گیا تھا۔ آمدنی محدود ہو گئی تھی۔ اس میں ہمارا گزارہ نہیں ہوتا تھا اس لیے ایک دن ہم بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ ہم وہی کریں گے جو ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ یوں ہم جرائم پیشہ بن گئے اور چھوٹی موٹی وارداتیں کر کے گزارہ کرنے لگے بلکہ بہت اچھی طرح گزارہ کرنے لگے کیونکہ مہینے میں ایک دو ہاتھ مار کر ہمیں اس سے زیادہ ہی مل جاتا تھا جتنا ہم سارا دن اور رات محنت کر کے کماتے تھے۔

اس کے باوجود پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی، خاص طور سے جوزف کو بار سے محرومی کا صدمہ تھا۔ یہ بار ہمارے باپ نے قائم کیا تھا اور اس کے بعد اسے میں اور جوزف چلاتے رہے تھے۔ جوزف مجھ سے چھ سال بڑا تھا۔ وہ اکتالیس برس کا تھا اور میں پینتیس برس کا ہونے والا تھا۔ شادی ہم دونوں نے نہیں کی تھی لیکن جوزف کی ایک گرل فرینڈ نتاشا ضرور تھی۔ البتہ شادی وہ اس سے بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب ایسے ہی اچھی بسر ہو رہی ہے تو شادی کا پھندا گلے میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگرچہ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں تھی لیکن تقریباً یہی خیال میرا بھی تھا۔ جیگسن والا میں ایک شان دار فلیٹ کے ساتھ ہمارے پاس نواحی علاقے میں ایک چھوٹا سا فارم بھی تھا جہاں اب سوائے گھاس کے اور کچھ نہیں اگتا تھا۔ ہمارے اس فارم کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ مہینے میں ایک بار میں اور جوزف یہاں جاتے تھے اور ایک دو دن رک کر واپس آ جاتے تھے۔

ان دنوں حالات ٹھیک نہیں تھے، پولیس نے بڑھتے ہوئے جرائم کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر رکھا تھا اور شہر کے ان علاقوں میں گشت بڑھا دیا تھا جہاں لوٹ مار کی وارداتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے ہمیں موقع نہیں مل رہا تھا پھر اتفاق سے جمع پونجی بھی نہیں تھی کہ کچھ عرصے تک گزارہ ہو جاتا۔ ہم دونوں ہی پریشان تھے۔ میں نے جوزف سے کہا۔

''ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''لیکن کوئی اندھا قدم اٹھانا بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ پولیس کے پاس ہمارا کوئی ریکارڈ نہیں ہے اور ہماری ذرا سی غلطی سے انہیں ہمارا ریکارڈ مل جائے گا۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جس وقت شہر کے چھوٹے موٹے اچکے منہ چھپائے پھر رہے تھے، ہم آرام سے اپنے فلیٹ میں بیٹھے تھے کیونکہ پولیس کے پاس ہمارا کوئی مجرمانہ ریکارڈ نہیں تھا۔ اس کے باوجود کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا ورنہ ایک ڈیڑھ ہفتے بعد فاقوں کی نوبت آ سکتی تھی۔ جوزف سوچ رہا تھا، ہم کیا کریں کہ کچھ رقم ہاتھ آئے۔ پھر اس نے سوچ لیا اور تجویز میرے سامنے رکھی تو میں اچھل پڑا۔ میں نے جوزف سے کہا۔

''بھائی، یہ بہت مشکل کام ہے۔ جانز کے بارے میں تم بھی جانتے ہو لیکن یہ شیری بھی کم خطرناک نہیں ہے۔ اسے قابو کرنا کسی بپھری ہوئی شیرنی کو قابو کرنے سے کم نہیں ہے۔''

''اگر ہم اچھا منصوبہ بنائیں اور پھر اس پر درست انداز میں عمل کریں تو سب ممکن ہو سکتا ہے۔''

''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم شیری کو اس وقت اٹھائیں گے جب وہ اپنا کام مکمل کر کے بار کے عقبی دروازے سے نکل رہی ہوگی۔ اس وقت وہ نشے میں ہوتی ہے اور باقی کسر ایک چھوٹا سا انجکشن پوری کر دے گا، وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ ہم اسے کار کی ڈکی میں ڈال کر وہاں سے نکل جائیں گے۔''

''یہ آسان نہیں ہے... بے شک عقبی گلی سنسان ہوتی ہے لیکن اس بات کا خطرہ ہوتا ہے کہ کوئی اچانک وہاں آ جائے اور ہمیں دیکھ لے۔''

''اگر کوئی آ جائے اور ہمیں دیکھ لے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ہمارے چہروں پر نقاب ہوں گے۔''

''ہماری گاڑی پہچانی جا سکتی ہے۔'' میں نے نکتہ اٹھایا۔

''روانگی سے پہلے ہم اس پر پلاسٹک پینٹ کر دیں گے اور نمبر پلیٹ بدل دیں گے۔''

اسپرے پینٹ کے ذریعے دونوں بھائی ایک گھنٹے کے اندر پوری کار کا رنگ بدل سکتے تھے۔ یہ رنگ بعد میں صرف پریشر سے پانی مارنے سے بھی اتر جاتا تھا اور نیچے والے رنگ کو کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ جوزف اپنی کار کے لیے بہت حساس تھا۔ اگر اسے نقصان کا خدشہ ہوتا تو وہ یہ تجویز نہ دیتا۔ نمبر پلیٹ بدلنا کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ ہمارے پاس کئی جعلی نمبر پلیٹس موجود تھیں۔

''ٹھیک ہے،'' ہم نے شیری کو وہاں سے اٹھا لیا۔ اس کے بعد کیا کریں گے... اسے کہاں رکھیں گے؟ فلیٹ تو لے جا نہیں سکتے۔''

''ہم اسے فارم پر رکھیں گے۔ وہاں اس کی چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں ہوگا۔''

شیری چیخ و پکار کرنے والی عورت نہیں تھی۔ لیکن اگر وہ واقعی چلانا چاہتی تو وہاں سچ مچ اس کی آواز کسی تک نہ جاتی۔ اصل میں بعض زمینی تبدیلیوں کی وجہ سے وہاں زمین زراعت کے قابل نہیں رہی تھی اس لیے لوگ اپنے فارم چھوڑ کر چلے گئے تھے اور یہ علاقہ ویران ہو گیا تھا۔ اکثر فارم ہاؤس تو مکمل ویران پڑے تھے لیکن کچھ میں لوگ رہتے تھے۔ ہمارے فارم کے آس پاس..... ایک کلومیٹر تک کوئی آباد گھر نہیں تھا۔ اب مجھے جوزف کا منصوبہ کسی قدر قابل عمل لگنے لگا۔ اب صرف ایک سوال میرے ذہن میں باقی رہ گیا میں نے جوزف سے وہ بھی پوچھ لیا۔

''جانز سے تاوان کیسے لیا جائے گا؟''

''شیری کو یہاں لانے کے بعد ہم جانز کو کسی فون بوتھ سے کال کریں گے اور اسے صبح سے پہلے تاوان ادا کرنے کو کہیں گے۔ دوسری صورت میں اسے شیری کی لاش ملنے کی دھمکی دیں گے۔''

''تم میرا مطلب نہیں سمجھ رہے ہو... جانز، شیری کے لیے تاوان کیوں ادا کرنے لگا؟''

اس بار جوزف میرا مطلب سمجھ گیا۔ ''کیونکہ شیری اس کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے۔ اس کا بار چلتا ہی شیری کی وجہ سے ہے۔ ہر رات شیری کو دیکھنے کے لیے درجنوں ایسے دولت مند آتے ہیں جن کی جیبیں نوٹوں کی گڈیوں سے بھری ہوتی ہیں۔ جانز اس کی وجہ سے ہر مہینے لاکھوں ڈالرز کماتا ہے تو کیا وہ اس کے بدلے ایک چوتھائی ملین ڈالرز تاوان ادا نہیں کر سکتا؟''

میں ایک بار پھر اچھل پڑا۔ ''ایک چوتھائی ملین ڈالرز یعنی ڈھائی لاکھ ڈالرز؟''

''ہاں، ہم اس سے تاوان میں اتنی رقم مانگیں گے۔''

www.kahopakistan.com

میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا وہ میرا رقم ادا کردے گا؟''

''میرا خیال ہے کہ کردے گا۔''

''اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ وہ شیری کا متبادل تلاش کرلے گا، یہ زیادہ آسان کام ہے۔''

جوزف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شیری کا متبادل تلاش کرنا آسان نہیں ہے... اور اگر وہ چند دن رقص نہ کرے تو جانز کے بار میں الو بولنے لگیں گے۔''

مجھے ایک بار پھر جوزف کا منصوبہ حقیقت سے دور لگنے لگا۔ ہم اس پر عمل تو کرسکتے تھے اس میں مجھے کوئی شک نہیں تھا لیکن عمل کرنے کے بعد جانز سے تاوان بھی وصول کرسکتے تھے، اس بات پر مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ بے شک شیری بے حد حسین سہی اور اس کا بدن بھی قیامت خیز تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ جانز اس کی خاطر اپنی حرام کی کمائی میں سے ڈھائی لاکھ ڈالرز قربان کردیتا۔ جیکسن ولا میں ڈانسر لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور جانز کے بار کا ایک نام ہوگیا تھا۔ کوئی بھی ڈانسر وہاں کام کرنے کو تیار ہوجاتی کیونکہ وہاں اسے کمائی کے بے پناہ مواقع ملتے۔ بہرحال، جوزف فیصلہ کرچکا تھا اور اب ہمیں اس پر عمل کرنا تھا۔

اس کام کے لیے ہم نے اتوار کا دن منتخب کیا کیونکہ ایک تو اس رات شیری زیادہ دیر کام کرتی تھی۔ زیادہ دیر کام کرنے کا مطلب تھا، وہ زیادہ تھک جاتی اور اسے قابو کرنا آسان ہوتا۔ دوسرے اس رات زیادہ آمدنی ہوتی اور جانز کو اس میں سے ڈھائی لاکھ ڈالرز ادا کرتے ہوئے زیادہ دکھ بھی نہ ہوتا۔ سب طے ہوگیا تھا اور یہ بھی فرض کرلیا گیا تھا کہ جانز تاوان لازمی ادا کرے گا۔ صرف ایک مسئلہ باقی رہ گیا تھا کہ تاوان کس طرح وصول کیا جائے... کہ ہم جانز سے محفوظ رہیں۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ اگر جانز... تاوان ادا کردیتا تب بھی وہ یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ شیری کو اغوا کرنے والے کون ہیں کیونکہ یہ معاملہ اس کی ناک کا بھی ہوتا کہ کوئی اس جیسے آدمی سے رقم نکلوالے۔

جوزف کے ذہن میں اس مسئلے کا حل بھی موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ''جیکسن ولا سے باہر نکلتے ہوئے تم نے ایک چھوٹا سا برساتی نالا دیکھا ہوگا۔ اس کے پُل کے ساتھ ایک فون بوتھ ہے، ہم رقم وہاں رکھوائیں گے اور اس کے بعد نالے سے جاکر ہم میں سے کوئی یہ رقم نکال لائے گا۔''

''اگر جانز نے کسی کو نگرانی پر لگادیا تو؟''

''نہیں، ہم میں سے ایک پہلے ہی وہاں موجود ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے ایک موبائل فون حاصل کرلیا ہے۔ اس پر ہم بے خوف ہوکر جانز سے رابطہ کرسکتے ہیں۔''

مجھے اس منصوبے میں خطرات نظر آرہے تھے لیکن مسئلہ وہی تھا، جوزف فیصلہ کرچکا تھا اور اب ہمیں اس پر عمل کرنا تھا۔ اتوار والے دن ہی ہمیں کار پر رنگ کرنا تھا کیونکہ یہ رنگ بہت کچا ہوتا ہے کچھ دیر گزرنے کے بعد خود بہ خود اترنے لگتا ہے۔

☆☆☆

جوزف نے کار فارم ہاؤس کے سامنے روکی اور میری طرف دیکھا۔ ''پہلا مرحلہ تو طے ہوگیا ہے۔''

نصف گھنٹے پہلے شیری جیسے ہی بار سے نکلی ہم نے اسے اچانک دبوچ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ مزاحمت کرتی، جوزف نے اس کی گردن میں انجکشن اتار دیا اور وہ بے ہوش کر میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے اسے ڈکی میں منتقل کیا گیا اور ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ جوزف کا دعویٰ تھا کہ وہ کم سے کم چار گھنٹے بے ہوش رہے گی۔ ہم کار سے اتر کر اندر آئے اور میں نے موسم کی مناسبت سے برانڈی نکالی۔ جب ہم نے شیری کو اغوا کیا تو ہم نقاب میں تھے۔ جوزف نے برانڈی کا پورا گلاس ایک ساتھ ہی حلق میں انڈیل لیا اور پھر گلاس میز پر پٹخ دیا۔ وہ کچھ اعصاب زدہ لگ رہا تھا کیونکہ اسے اب جانز جیسی سے بات کرنا تھی۔ کال کرنے سے پہلے اس نے آلو کا ایک کٹا ہوا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا۔ اس طرح اس کی آواز اور بولنے کا انداز بدل جاتا۔ اس نے جانز کا مخصوص نمبر ملایا، اس نے فوراً کال ریسیو کرلی۔ میں نے جوزف کے ساتھ کان لگالیا۔

''کون ہے؟'' جانز غرایا۔

''میں...'' جوزف بولتے بولتے رکا۔ شاید وہ اپنا نام بتانے جارہا تھا لیکن اسے بروقت خیال آگیا۔ اس نے لہجہ سخت کرنے کی کوشش کی۔ ''جانز! میری بات سنو... شیری میرے قبضے میں ہے۔''

''شیری!'' جانز نے حیرت سے کہا۔ ''جو میرے بار میں کام کرتی ہے؟''

''ہاں وہی شیری۔'' جوزف نے کہا۔ ''اگر تم اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو دو گھنٹے کے اندر اندر ڈھائی لاکھ ڈالرز تیار کرلو۔ مجھے پتا ہے کہ اس وقت تمہارے بار میں اس سے کہیں زیادہ کیش موجود ہے۔ تمہیں بس رقم گن کر اسے پیک کرنا ہے۔ میں دو گھنٹے بعد تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے یہ رقم کہاں پہنچانی ہے۔ اور کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو شیری کی لاش تمہیں مل جائے گی۔'' جوزف نے کوشش کی کہ

آخری جملہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں سفاکی آجائے لیکن اس کے منہ سے الفاظ ہی مشکل سے نکل رہے تھے۔ اس نے فون بند کرکے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کیسا رہا؟''

''ٹھیک رہا... لیکن جانز نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی کہ وہ تاوان ادا کرنے کے لیے تیار ہے؟''

''وہ تاوان ادا کرے گا۔'' جوزف نے اعتماد سے کہا۔ ''کیونکہ وہ شیری کی اہمیت سمجھتا ہے۔ وہ اسے کھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

''شاید۔'' میں نے شک سے کہا۔ ''اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' میرا اشارہ شیری کی طرف تھا جو بدستور ڈکی میں بندھی۔ جوزف نے اپنے لیے دوبارہ برانڈی نکالی۔

''اسے وہیں رہنے دو... آج اگرچہ کچھ سردی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اسے فرق نہیں پڑے گا۔''

''میرا تو خیال ہے اسے اندر لے آتے ہیں اور اوپر کمرے میں بند کردیتے ہیں۔ اگر وہ ہوش میں آگئی تو ڈکی کھول سکتی ہے۔''

''وہ تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔'' اس نے کہا۔ ''ہم میں سے رقم لینے کون جائے گا؟''

''تم۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ میرے گھٹنے کے ساتھ مسئلہ ہے اور میں زیادہ دیر ناہموار جگہ پر نہیں چل سکتا۔''

میں ایک بار سیڑھیوں سے گر گیا تھا اور میرے گھٹنے کو نقصان ہوا تھا۔ اس کے بعد سے میں اس گھٹنے پر زیادہ زور نہیں ڈال سکتا تھا۔ جوزف مضبوط بھی تھا اور پستول چلانے میں تیز بھی تھا۔ اگر کوئی ایسی صورتِ حال پیش آتی جس میں جان کا خطرہ ہوتا تو وہ اس سے آسانی سے نمٹ سکتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، میں چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی اس سے میں ہی رابطہ کروں گا۔''

جوزف نے طے کیا کہ جب رقم لانے والا پل کے پاس سے گزر رہے گا تو وہ اسے جانے دے گا اور جب اسے اطمینان ہوجائے گا کہ رقم لانے والا اکیلا ہے اور اس کے پیچھے بھی کوئی نہیں ہے تو وہ اسے کال کرکے واپس بلائے گا اور رقم فون بوتھ میں رکھوا کر اسے جانے کو کہے گا۔ جب رقم لانے والا دور جاچکا ہوگا تو وہ نالے سے نکل کر رقم کا تھیلا اٹھا کر نالے میں سے ہوتا ہوا اس جگہ نکلے گا جہاں اس نے کار کھڑی کی ہوگی اور اس میں بیٹھ کر فارم واپس آجائے گا۔ اس کے فوراً بعد ہم شیری کو جیکسن ولا لاکر کسی بھی جگہ کار سے دھکا دے دیں گے۔ دیکھنے میں یہ منصوبہ اچھا لگ رہا تھا۔

رات کا کھانا ہم نے ایک اچھے ریستوران میں کھایا تھا اور ہمارے پیٹ بھرے ہوئے تھے اس لیے ہم کھانے کی کوئی چیز ساتھ نہیں لائے تھے۔ صرف برانڈی کی ایک بوتل لی تھی۔ جب جوزف نے تیسرا گلاس نکالا تو میں نے اسے ٹوک دیا۔

''تم اپنی حد سے زیادہ پی چکے ہو۔''

''ٹھیک ہے، یہ میرا آخری گلاس ہے۔'' اس نے تسلیم کرلیا۔ ویسے وہ باس تھا لیکن جب میں اسے کسی غلطی پر ٹوکتا تو وہ اسے تسلیم بھی کرلیتا تھا۔ اس بار گلاس خالی کرکے اس نے اسے دھو کر رکھ دیا اور ہم وقت گزاری کے لیے تاش کھیلنے لگے۔ جب میں نے لگاتار دوسری بازی جیت لی تو اس نے پتے پھینک کر گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''جانز سے بات کرنے کا وقت قریب آرہا ہے۔ اب تک اس نے تصدیق کرلی ہوگی کہ شیری غائب ہے۔''

''اگر اس نے مطالبہ کیا کہ شیری سے بات کرائی جائے؟''

''تو ہم اس کی بات کرادیں گے۔''

''اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے یہاں لایا جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔ ''آؤ اسے لے آئیں۔''

باہر خاصی سردی تھی۔ کار کے پاس پہنچ کر میں نے ڈکی کھولنا چاہی تو جوزف نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''پہلے نقاب پہن لو۔''

میں نے جلدی سے ٹوپی نیچے کھینچ کر نقاب بنالی پھر ڈکی کھولی۔ اندر شیری بے سدھ پڑی تھی۔ جوزف نے پلاسٹک کی بنی مخصوص ہتھکڑی اس کے ہاتھ اور پیروں میں ڈال دی۔ ایک بار اسے پہنا دیا جاتا تو یہ لاک ہوجاتی تھی اور پھر اسے کاٹ کر ہی اتارا جاسکتا تھا۔ اس نے یہ کام کرکے شیری کو ڈکی سے نکالا اور شانے پر ڈال لیا۔ شیری کا وزن اچھا خاصا تھا لیکن جوزف نے اسے کسی ہلکی ڈمی کی طرح اٹھالیا۔ میں شیری کو اس طرح نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں نے ڈکی بند کی اور ہم اندر آئے۔

اوپر والے کمرے میں آکر جوزف نے چھوٹا سا اسٹور کھولنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو اس نے شیری کو فرش پر کھڑا کردیا اور مجھ سے کہا۔ ''اسے پکڑ کر رکھو، جب تک میں رسّی لاتا ہوں۔ اسے کھڑا کرکے باندھنا ہے۔''

میں نے شیری کو سنبھال لیا۔ ''اس طرح اسے مشکل نہیں ہوگی؟''

''مشکل ہوگی، تب ہی تو یہ جانز سے فریاد کرے گی کہ اسے آزاد کرایا جائے۔'' جوزف ہنسا اور نیچے چلا گیا۔

www.kahopakistan.com

میں نے شیری کو یوں پکڑا ہوا تھا کہ اس کی پشت دیوار سے لگی تھی۔ ورنہ اسے تھامنا آسان نہیں تھا۔ اس نے سرد موسم میں بھی بہت مختصر سا لباس پہن رکھا تھا، نہ ہونے کے برابر اسکرٹ... البتہ ٹانگوں پر لمبے موزے تھے اور اوپر اس نے ایک کھلی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں بٹن نہیں تھے، بس سامنے ایک گرہ لگی تھی۔ گریبان سے اس کا جسم دعوتِ نظارہ دے رہا تھا میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو اسے ہوش میں پایا، وہ مجھے گھور رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنا سر پیچھے کیا اور ایک خوف ناک چیخ کے ساتھ سر میری ناک پر مارا۔ دوسری چیخ میرے منہ سے نکلی۔ اس نے پوری قوت استعمال کی تھی۔ مجھے لگا کہ میری ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔

مگر اس ظالم نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ سر پیچھے کر کے اگلی ٹکر زیادہ قوت سے ماری اور میں لڑکھڑا کر فرش پر جا گرا۔ میرے منہ سے مارے اذیت کے چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں اٹھتا، وہ اچھل کر مجھ پر آئی۔ اس نے میرے پیٹ کے دونوں طرف گھٹنے ٹکائے اور اس بار اوپر سے اپنا سر گھما کر میرے منہ پر مارا۔ چیخوں کے ساتھ میرے منہ سے گالیاں بھی نکل رہی تھیں اور میں ہاتھوں سے اس چڑیل کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ میرے چہرے پر ناک باقی نہ رہے۔ جب تک جوزف میری چیخیں سن کر آتا اور اسے کھینچ کر مجھ سے الگ کرتا، وہ میری ناک کی ہڈی توڑ چکی تھی۔ جوزف نے اسے تھپڑ مارا اور کھینچ کر اسٹور میں کھڑا کر دیا۔ اس نے رسّی سے اس کے ہاتھ اوپر کر کے ہینگر سے باندھ دیے اور اسٹور کا دروازہ بند کر دیا۔ میں اندھوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اندھا دھند ہی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ غنیمت رہا کہ لڑھکا نہیں ورنہ ناک کے ساتھ کچھ اور ٹوٹ پھوٹ بھی یقینی تھی۔

کچن میں سنک کے نلکے کے نیچے سر رکھ کر میں نے پانی کھول دیا۔ سرد پانی نے میری ناک سے بہتے خون کو روک دیا تھا پھر میں نے چلو میں بھر بھر کر سرد پانی ناک میں بھی ڈالا، اس سے بہت فرق پڑا۔ خون رک گیا تھا اور درد میں بھی کمی آئی تھی۔ جوزف نیچے آیا تو وہ سخت غصے میں تھا۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا اور غرایا۔

''تم سے ایک عورت نہیں سنبھالی گئی۔''

''عورت۔'' میں منمنایا۔ ''وہ چڑیل ہے... دیکھو، اس نے میری ناک کا کیا حال کیا ہے۔''

میری ناک سوج گئی تھی اور سیدھا ہونے سے خون پھر رسنے لگا تھا۔ میری حالت دیکھ کر جوزف کو ترس آ گیا۔ اس نے رومال نکال کر میری ناک صاف کی۔ اس دوران میں مجھ پر قیامت گزر گئی۔ ہڈی شاید کئی جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔''

''ابھی ہم نہیں جا سکتے۔'' جوزف نے انکار کیا۔ ''صبح تک صبر کرو۔''

''تم اب جانز سے بات کرو اور اس کتیا کا تاوان لے کر اسے کہیں پھینکو۔''

جوزف نے سوچا اور موبائل نکال کر جانز سے رابطہ کیا۔ اس بار بھی اس نے فوراً کال ریسیو کی۔ ''رقم تیار ہے۔''

''گڈ!'' جوزف منہ میں آلو رکھنا بھول گیا تھا اور اصل آواز میں بول رہا تھا میں اشارے سے اسے یہ بات بتانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ ''اب تم رقم اور کوئی موبائل اپنے آدمی کو دے کر جیکسن ولا سے شمال کی طرف جانے والی ہائی وے پر بھیج دو۔ جب تم اسے روانہ کر دو گے تو مجھے اسی نمبر پر کال کر کے اس کا نمبر بتاؤ گے۔ باقی ہدایات میں اسے دوں گا۔''

''ٹھیک ہے لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ شیری تمہارے پاس ہے۔''

''اس کا ایک ثبوت تو میں تمہیں ابھی اس سے بات کرا کے دے سکتا ہوں اور اگر تم تاوان ادا کرنے سے انکار کرتے تو دوسرا ثبوت تمہیں کل اس کی لاش کی صورت میں مل جاتا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے... مجھے دھمکاؤ مت۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔ ''میں کہہ چکا ہوں کہ تمہیں رقم مل جائے گی۔ تم شیری کو کب چھوڑو گے؟''

''رقم ملنے کے دو گھنٹے کے اندر۔'' جوزف نے کہا اور موبائل لے کر اوپر چلا گیا۔ جب اس نے شیری کو اسٹور میں بند کیا تھا تو کسی طرح اس کا منہ بھی بند کر دیا تھا۔ جیسے ہی اس نے شیری کا منہ کھولا، گالیوں کا ایک طوفان اس کے منہ سے نکلا اور اس کا ہدف ظاہر ہے ہم دونوں تھے۔ وہ جانز کو شیری کی آواز سنانا چاہتا تھا۔ شیری نے وہ مقصد خود پورا کر دیا۔ اس کا منہ اور اسے بند کر کے وہ دوبارہ نیچے آیا اور جانز سے کہا۔ ''میرا خیال ہے اب تمہاری تسلی ہو گئی ہوگی۔''

فون بند کر کے اس نے پھر میرا معائنہ کیا اور بولا۔ ''دو اوپر بند ہے اور تم اس کی نگرانی کرو گے۔ میں رقم لینے جا رہا ہوں۔''

میرے اندر خدشات سر سرانے لگے۔ جانز بہت بے رحم آدمی تھا اور جوزف میرا ایک ہی بھائی تھا۔ اگر وہ اس کے آدمیوں کے ہاتھ آ جاتا تو وہ اس کے قتل سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوتے۔ ''جوزف! پلیز محتاط رہنا... جانز اور اس کے آدمی بہت سفاک ہیں۔''

''میں جانتا ہوں، تم فکر مت کرو۔'' اس نے میرا شانہ تھپتھپایا اور باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور تب میں نے دیکھا کہ وہ پستول تو یہیں میز پر بھول گیا ہے۔ میں پستول اٹھا کر اس کے پیچھے لپکا لیکن جب باہر پہنچا تو کار کی عقبی سرخ روشنیاں ہائی وے کی طرف مڑتی نظر آئیں۔ میں نے سر جھٹکا۔ ''لعنت ہو۔''

ایک تو جوزف جانز کے آدمیوں کا سامنا کرنے گیا تھا، دوسری طرف وہ اپنا پستول بھی بھول گیا تھا۔ لیکن میں اب سوائے فکر مند ہونے کے اور کیا کر سکتا تھا۔ اندر آ کر میں نے فریج سے برف کی سکائی والی ٹھیلی نکالی اور اسے اپنی ناک سے لگا لیا۔ یہاں کوئی دوا نہیں تھی ورنہ میں پین کلر لے لیتا۔ اچانک اوپر سے ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی فرش پر پاؤں مار رہا ہے اور یہ کام ظاہر ہے شیری کر رہی تھی۔ میں نے پستول کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ میں اوپر جا کر اس چڑیل کے سر میں سوراخ کر دوں۔ مگر میں ایسا صرف سوچ سکتا تھا، سچ مچ نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اس کی طرف سے شور کا سلسلہ جاری رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ فرش اور اسٹور کے دروازے پر لاتیں مار رہی ہے۔ جب اس کا شور ناقابلِ برداشت ہو گیا تو میں نے چلا کر کہا۔ ''آرام سے بیٹھو، ورنہ اوپر آ کر تمہارا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا۔''

اس تک میری آواز چلی گئی تھی لیکن اس نے شور کا سلسلہ بند نہیں کیا تھا۔ بدقسمتی سے وہ جگہ عین میرے سر کے اوپر تھی جہاں وہ بند تھی اور اس کا شور براہِ راست میرے پہلے سے مضروب سر پر آ کر لگ رہا تھا۔ میں برداشت کرتا رہا کیونکہ میں اوپر نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں اسے شوٹ ہی نہ کر دوں مگر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جلد وہ حد آ گئی۔ میں نے پستول اٹھایا اور سیڑھیوں سے اوپر آیا۔ وہ پوری مستقل مزاجی سے اسٹور کا دروازہ اور فرش بجا رہی تھی۔ میں نے دروازے پر پستول کا دستہ مارا۔

''شور بند کرو ورنہ...''

اس نے گویا سنا ہی نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ شدت سے دروازے پر لاتیں مارنے لگی۔ یہاں شور کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ تنگ آ کر میں نے اسے ہلکا پھلکا سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ پستول کی دو تین ضربیں اسے خاموش رکھنے کے لیے کافی ثابت ہوتیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور یہ بھول گیا کہ وہ باہر کی طرف کھلتا تھا اور شیری کی لات کی زد میں تھا۔ جیسے ہی میں نے کنڈی ہٹائی، دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور مزید بدقسمتی کہ میرا منہ بالکل سامنے تھا۔ مجھے ویسے بھی عادت ہے کہ کھڑے رہنے کے دوران میرا منہ آگے نکلا رہتا ہے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا اور دروازہ آ کر پوری طاقت سے میرے منہ پر لگا۔ مجھے لگا جیسے کسی نے فولادی مکا میرے منہ پر رسید کر دیا ہو۔ میں چکرا کر پیچھے جا گرا۔

کچھ دیر کے لیے میں یقیناً بے ہوش ہو گیا کیونکہ مجھے ہوش آیا تھا اور جب ہوش آیا تو میں نے اپنے عین سامنے شیری کا غضب ناک چہرہ دیکھا۔ غصے سے اس کے نقوش اس طرح بگڑے ہوئے تھے کہ وہ سچ مچ چڑیل لگ رہی تھی۔ نہ جانے کیسے اس نے خود کو آزاد کرا لیا تھا۔ میرا پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور صرف پستول ہی نہیں بلکہ ایک اور چیز بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے بوکھلا کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، میری ٹوپی غائب تھی۔ شیری نے ٹوپی لہرائی اور بولی۔

''گدھے کے بچے... تم دونوں بھائی عقل سے پیدل ہو۔''

وہ مجھے دیکھ چکی تھی اور ظاہر ہے ہم دونوں بھائیوں کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ میں نے اس کی بات پر احتجاج کرنا چاہا لیکن میرے منہ سے صرف ایک گڑگڑاتی ہوئی آواز نکلی جس میں الفاظ اگر تھے تو سمجھ سے باہر تھے۔ شیری نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور بولی۔ ''بکواس کرنے کے بجائے میری بات سنو... جوزف کہاں ہے؟''

وہ خالی ہاتھ سے کم خطرناک نہیں تھی اور اس وقت تو اس کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ میں نے اسے بتانا چاہا کہ جوزف تاوان لینے گیا ہے لیکن میرے منہ سے پھر وہی گڑگڑاتی ہوئی آواز نکلی۔ میں نے پریشان ہو کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تب انکشاف ہوا کہ میرا منہ ہی ٹیڑھا ہو رہا تھا۔ دروازہ لگنے سے شاید جبڑا بھی ٹوٹ گیا تھا اور اب میں درست طریقے سے بولنے سے بھی قاصر تھا۔ شیری نے اپنا سوال دہرایا تو میں نے منہ کی طرف اشارہ کیا۔

www.kahopakistan.com

اس کی وجہ سے میں درست انداز میں بولنے سے قاصر تھا۔ شیری مسئلہ سمجھ گئی۔

''اوہ اچھا... تمہارا جبڑا ابھی ٹوٹ گیا ہے۔'' اس نے ترس کھانے والے انداز میں کہا۔ ''کس احمق نے تمہیں مشورہ دیا تھا اس چکر میں پڑنے کا؟''

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ احمق جوزف تھا اور اس وقت باہر تھا لیکن اس سے پہلے ہی اس نے بالکل غیر متوقع طور پر مکّا گھما کر میرے منہ پر مارا اور میرے منہ پر ایک قیامت اور گزر گئی۔ میں پھر پیچھے جا گرا اور وہیں سے چلّایا۔ ''لعنت ہو... چڑیل... کتیا...'' بولتے ہوئے اچانک مجھے احساس ہوا کہ اب میں بالکل درست انداز میں بول رہا تھا اور وہ گڑگڑاتی آواز نہیں آئی تھی جو اس سے پہلے میرے منہ سے نکل رہی تھی۔ شیری کے مکّے نے میرے جبڑے کو اپنی جگہ واپس فٹ کر دیا تھا۔ میں نے منہ چلا کر دیکھا، وہ بالکل ٹھیک طریقے سے حرکت کر رہا تھا۔ شیری نے ایک بار پھر مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور غرا کر بولی۔

''اب تم ٹھیک بھونک سکتے ہو اس لیے فوراً بک دو کہ یہ کیا معاملہ ہے؟''

میں اب مزید مار نہیں کھانا چاہتا تھا۔ وہ بہت ظالم عورت تھی اس لیے میں نے فوراً بک دیا۔ ''ہم نے تمہیں اغوا کیا ہے۔''

اس پر اس نے اپنے گھٹنے کو حرکت دی اور میں پیٹ پکڑ کر جھک گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب اس کا گھٹنا میرے منہ پر لگے گا اس لیے میں نے ہاتھ آگے کر لیا۔ لیکن اس نے گھٹنا مارنے کے بجائے میرے بال پکڑ کر سر اوپر کیا۔ ''بھونکتے رہو ورنہ میرا گھٹنا چلے گا۔''

میں ہانپتے ہوئے جلدی جلدی بولنے لگا۔ ''ہم نے تمہیں... اغوا کر کے جانز سے تمہارا تاوان لینے کا منصوبہ بنایا تھا۔''

''جانز سے میرا تاوان؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔ ''وہ مجھ جیسی آوارہ کے لیے ایک ڈالر نہیں دے گا۔''

''وہ تیار ہو گیا ہے۔'' میں نے کراہ کر کہا۔ ''جوزف رقم لینے گیا ہے۔''

''وہ رقم نہیں، اپنی موت لینے گیا ہے۔'' وہ بولی۔ ''پتا نہیں تم دونوں بھائیوں کو کس گدھی نے جنم دیا ہے۔ تم لوگ جانز سے میرا تاوان لینے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''میں نے جوزف کو سمجھایا تھا لیکن وہ بڑا ہے نا... اپنی کرتا ہے اور میری ایک نہیں سنتا۔''

اس پر شیری نے جوزف کو چند ناقابلِ بیان گالیاں دیں۔ ''وہ پاگل کا بچہ خود بھی مرے گا اور مجھے بھی مروا دے گا۔''

میں چونکا۔ ''تمہیں کیسے مروا دے گا؟ جانز تمہارے لیے تاوان ادا کرنے کو تیار ہو گیا ہے۔''

''وہ تاوان ادا نہیں کرے گا اس کے بجائے اس کے قاتلوں کا دستہ آئے گا اور تم دونوں کے ساتھ مجھے بھی اس دنیا سے رخصت کر دے گا۔''

''ہم نے تو اسے لوٹنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ تمہیں کیوں مارے گا؟''

اس نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا اور بولی۔ ''جوزف تاوان لینے کہاں گیا ہے؟''

میں نے اسے ہائی وے کے چھوٹے پُل کے بارے میں بتایا۔ اس نے میرا کالر پکڑ کر کھینچا۔ ''جلدی کرو، اس سے پہلے کہ جانز جیسی کے قاتل تمہارے ٹچر بھائی کا کام تمام کر دیں، ہمیں وہاں پہنچنا ہے۔''

وہ مجھے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ گرم کپڑوں کے باوجود میں سرد فضا میں کانپ اٹھا اور وہ نہ ہونے کے برابر لباس میں بھی آرام سے تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہاں کوئی اور گاڑی نہیں ہے، ہم ہائی وے تک کیسے جائیں گے؟ وہ جگہ کم سے کم بھی سات میل دور ہے۔''

''یہاں آس پاس کوئی گاڑی نہیں ہے؟''

مجھے ایک میل دور موجود اپنے واحد پڑوسی کا خیال آیا۔ اس کے پاس ایک پرانی لیکن بہترین حالت میں چلنے والی پک اَپ تھی اور سب سے اچھی بات تھی کہ اس نے اس کے سیلف میں ایک چابی مستقل پھنسا دی تھی کیونکہ اسے چابیاں گم کرنے کی عادت تھی۔ اگر وہ گھر پر تھا تو اس کی پک اَپ لے جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے شیری کو اس بارے میں بتایا تو وہ بولی۔ ''بس جلدی چلو۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ اسے تو مجھے جانز کے پاس لے جانا چاہیے تھا۔ وہ اس کی نظر میں اچھی بن جاتی اور ہم مارے جاتے تو اس کی بلا سے کیونکہ وہ اسی قسم کی عورت تھی۔ اگر اسے اپنے کسی معمولی مفاد پر کسی کو قربان کرنا پڑتا تو وہ بے دریغ ایسا کر گزرتی... تو پھر وہ ہمیں بچانے کی کوشش کیوں کر رہی تھی؟ یہ سوال میں نے چلتے ہوئے کئی بار اس سے کیا لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ بس ایک بار کہا۔ ''بکواس کرنے کے بجائے تم اپنے بھائی کی فکر کرو۔ امکان یہی ہے کہ جب ہم وہاں پہنچیں گے تو اس کی لاش پڑی ہو گی۔''

اس کی بات سن کر مجھے سچ مچ جوزف کی فکر لگ گئی۔ میں نے غرا کر کہا۔ ''اگر میرے بھائی کو کچھ ہوا تو میں جانز کو ضرور قتل کر دوں گا۔''

اس نے ذرا حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''اچھا، تمہارے اندر اتنی ہمت ہے؟''

میں پہلے سمجھا کہ وہ طنز کر رہی ہے لیکن وہ بالکل سنجیدہ تھی۔ میں نے کہا۔ ''سچی بات ہے کہ میں بزدل ہوں لیکن میں اپنے بھائی سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اسے کوئی نقصان ہو، یہ مجھے برداشت نہیں ہو گا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''تمہارا بھائی یقیناً خوش قسمت آدمی ہے جسے کم سے کم ایک ایسا شخص میسر ہے۔ بعض لوگوں کو تو دنیا میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ملتا جو ان پر جان وار سکے۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ شاید اس کا اشارہ اپنی طرف تھا۔ اس دوران میں ہم پڑوسی کے فارم ہاؤس کے پاس پہنچ گئے اور خوش قسمتی سے وہ گھر پر تھا۔ اس کی پک اَپ باہر کھڑی تھی۔ میں اور شیری پک اَپ میں گھس گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی اور سیلف گھمایا۔ ہلکی سی گھرگھراہٹ کے ساتھ انجن اسٹارٹ ہوا لیکن فوراً ہی مکان کی طرف سے پڑوسی کے چلّانے کی آواز آئی۔

''اے کون ہے...؟ میں گولی مار دوں گا۔''

میں نے فوراً گیئر بدل کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس دوران میں پڑوسی اپنی گن سمیت باہر نکل آیا تھا اور اس نے بے دھڑک فائر کر دیا۔ گولی پک اَپ کی باڈی پر کہیں لگی۔ دوسرا فائر ہوا میں گیا اور تیسرے فائر سے پہلے پک اَپ اس کی زد سے نکل گئی۔ پکی سڑک پر آتے ہی میں نے رفتار بڑھا دی۔ شیری نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ''اس کے پاس کوئی دوسری گاڑی تو نہیں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم، مجھے بس اسی پک اَپ کا علم ہے۔''

''ٹھیک ہے، اب رفتار بڑھاؤ۔'' اس نے حکم دیا۔

''کیا جانز سے کسی بات پر تمہارا اختلاف ہو گیا ہے؟''

''اختلاف؟'' وہ ہنسی۔ ''اب ہم ایک دوسرے کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس خبیث نے مجھے دل کھول کر استعمال کیا۔'' اس نے پھر اپنی مخصوص زبان میں وضاحت کی کہ جانز نے اسے کس طرح استعمال کیا اور یہ سارا استعمال ذاتی تھا۔ ''اس نے مجھ سے لاکھوں ڈالرز کمائے اور ان میں سے مجھے کچھ نہیں دیا۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں کچھ نہیں ملتا... یعنی کوئی تنخواہ نہیں ہے؟''

چند وزنی گالیوں کے بعد اس نے کہا۔ ''مجھے صرف وہی ملتا تھا جو میں خود کما لیتی تھی۔ آج یہاں میری آخری رات تھی اور میں نے بیج سے معاہدہ کر لیا ہے۔''

بیج ایک اور بدمعاش تھا اور اس کا بھی یہی کاروبار تھا۔

''کیا جانز کو اس معاہدے کا پتا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ اسے پتا چل گیا ہے، تب ہی رات اس کا رویّہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ حالانکہ آج اسے ریکارڈ آمدنی ہوئی ہے۔''

''جوزف نے بھی اسی لیے آج کی رات منتخب کی تھی۔''

شیری نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم دونوں بھائی جانز کو بالکل نہیں جانتے۔ وہ بھیڑیا فطرت ہے، موقع ملے تو اپنے ہی ساتھیوں کو چیر پھاڑ کر کھا جائے اور اس کے لیے سب سے ناقابلِ برداشت چیز یہ ہے کہ کوئی اسے دھوکا دے... اور ہم تینوں نے یہی کام کیا ہے۔ اس وجہ سے مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے بعد مجھے بھی مار دے گا اور اس کا الزام تم دونوں کے سر جائے گا۔ وہ صاف بچ جائے گا۔''

''میرے خدا!'' میں کراہا۔ ''پتا نہیں یہ سب باتیں جوزف کی سمجھ میں کیوں نہیں آئیں؟''

شیری نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب اس کی سمجھ میں آ گئی ہوں گی۔''

میں چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

شذرہ

ہیں چند دکانوں پر گرمچھ کی کھال کے بنے ہوئے بڑے خوبصورت جوتے بکنا شروع ہوئے تھے اور حسبِ معمول خواتین میں انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

ایک خاتون اتفاق سے ایک ایسی دکان پر پہنچ گئیں جہاں اس نئی قسم کے جوتے نہیں بکتے تھے۔

انھوں نے کہا۔ ''مگرمچھ کے جوتوں کا ایک جوڑا عنایت فرمائیے۔''

''ضرور ضرور۔'' دکاندار نے انھیں بڑی آؤ بھگت کے ساتھ کرسی پر بٹھایا، پھر پوچھا۔ ''ہاں تو آپ کے مگرمچھ کا سائز نمبر کیا ہے؟''

www.kahopakistan.com

''اسے گئے ہوئے کتنی دیر ہو چکی ہے؟''

''ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا ہے۔''

''کیا اتنی دیر میں اسے واپس نہیں آجانا چاہیے تھا؟''

میرا دل رکنے لگا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ وہ جانز کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گیا ہے؟''

''میرا خیال ہے۔''

جوزف، جانز کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے، یہ تصور ہی خوف ناک تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''مہربانی کر کے رفتار بڑھاؤ۔ کیا تم اپنے بھائی کے یقینی خاتمے کے بعد وہاں پہنچنا پسند کرو گے؟''

میں نے ایکسلریٹر کو ممکنہ حد تک دبا دیا۔ میں اتنی تیز ڈرائیونگ کا عادی نہیں تھا اس لیے اسٹیئرنگ قابو کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ دس منٹ بعد ہم پُل کے پاس پہنچ گئے اور مجھے جوزف کی کار فون بوتھ کے پاس ہی نظر آگئی۔ اس نے تو کہا تھا کہ وہ کہیں اور کار کھڑی کر کے نالے کے راستے پُل تک آئے گا۔ میرا دل دھڑکنے لگا... کچھ ہو چکا تھا۔ میں نے پک اَپ ذرا دور سڑک سے نیچے اتار لی اور ہم نیچے اتر آئے۔ شیری نے آہستہ سے کہا۔ ''اب بولنا مت... اور کوئی ہتھیار ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا پھر پک اَپ کا ٹول بکس دیکھا اور اس میں سے ڈیڑھ فٹ لمبا پہیا کھولنے والا پانا نکال لیا۔ قریب سے وار کرنے کے لیے یہ اچھا ہتھیار تھا۔ شیری نے سر ہلایا اور ہم نالے کی طرف بڑھے۔ آس پاس کچھ نہیں تھا۔ جو تھا، نالے میں تھا اور فوراً ہی اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ کسی کی دبی ہوئی کراہ سنائی دی اور پھر کوئی بولا۔

''شرافت سے بتا دو کہ شیری کہاں ہے؟ کیا فائدہ کہ تم اپنا ناقابلِ تلافی نقصان کرنے کے بعد بتاؤ۔''

جواب میں جوزف نے شیری کا ایک ناقابلِ بیان پتا بتایا جو پوچھنے والی کی والدہ سے متعلق تھا۔ شیری نے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہارا بھائی بہادر آدمی ہے۔''

''کچھ کرو، وہ اسے تکلیف دے رہے ہیں۔'' میں نے کہا اور بے ساختہ ذرا اونچا بول گیا کیونکہ میری آواز نالے میں موجود لوگوں تک گئی تھی۔ فوراً ہی کوئی بولا۔ ''یہ کس کی آواز ہے؟ ڈیک! تم اوپر جا کر دیکھو۔''

شیری نے بنا کچھ کہے میری طرف جن نظروں سے دیکھا اس میں وہ سب کچھ تھا جو وہ کہنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کہ ڈیک اوپر آتا، اس نے دوڑ کر پُل کی دیوار کی اوٹ لے لی۔ حیرت انگیز طور پر ہائی ہیل والی سینڈل میں ہونے کے باوجود اس کے دوڑنے سے ذرا آواز نہیں ہوئی تھی۔ ڈیک، جانز کا خاص گرگا تھا اور جب جانز کو کسی سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوتا تھا، تب وہ ڈیک کو استعمال کرتا تھا۔ میں ابھی سوچ رہا تھا کیا کروں کہ اچانک ڈیک نالے سے نمودار ہوا اور مجھے دیکھ کر اس نے نیچے اطلاع دی۔ ''اس کا بھائی بھی آگیا ہے۔''

''اسے نیچے لے آؤ... اس سے پوچھتے ہیں کہ شیری کہاں ہے؟''

ڈیک ہنسا۔ ''پھر تینوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیں گے۔''

ڈیک اس طرح کھڑا تھا کہ شیری کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ اسے نہیں دیکھ سکا اور شیری نے دبے قدموں آکر اس کی پشت سے پستول لگا دیا۔ وہ یک دم ساکت ہو گیا۔ میں پھرتی سے آگے بڑھا اور ڈیک کی تلاشی لے کر اس کی جیکٹ سے ایک لمبی نال والا پستول نکال لیا۔ شیری نے اسے دھکا دیا اور وہ بادلِ ناخواستہ نیچے اترنے لگا۔ میں آگے تھا اور میں نے پستول والا ہاتھ پشت کی طرف کر رکھا تھا۔ شیری، ڈیک کے بالکل عقب میں تھی اور نظر نہیں آرہی تھی۔ جوزف چاروں ہاتھ پاؤں پھیلائے زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو افراد اور تھے۔ میں نے ان کو پہچان لیا، یہ جانز کے خاص گرگے میٹ اور ڈونلڈ تھے۔ دونوں مسلح تھے اور ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے شیری کو دیکھ لیا تو فائرنگ شروع کر دیں گے۔ نالے میں چاند کی روشنی کم آرہی تھی اس لیے ذرا دیر سے نظر آیا۔ جوزف ہاتھ پاؤں پھیلائے نہیں لیٹا تھا بلکہ انہوں نے اس کے ہاتھ اور پیروں کو لمبی کیلوں سے چھید دیا تھا۔ کیلیں اس کے ہاتھ پاؤں سے گزر کر زمین میں گھس گئی تھیں۔ میرا خون کھول اٹھا اور میں نے ہاتھ سامنے کرتے ہوئے پہلے میٹ پر گولی چلائی۔ وہ پیٹ پکڑ کر ڈھیر ہو گیا۔ اتنی دیر میں ڈونلڈ نے اپنی شاٹ گن کا رخ میری طرف کیا پھر میری چلائی ہوئی گولی سے بچنے کے لیے جھکا، اس بار نشانہ خطا گیا۔ ایک فائر عقب سے ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کس نے کیا تھا۔ فوراً ہی میں نے تیسری گولی چلائی جو ڈونلڈ کے شاٹ گن والے بازو میں لگی۔ اس کے ہاتھ سے شاٹ گن چھوٹ گئی۔ اسی اثنا میں ڈیک منہ کے بل زمین پر گرا اور میرے قریب سے ہوتا ہوا

نالے میں جانے لگا۔ شیری نے اسے گولی مار دی تھی۔ میٹ پہلے ہی ساکت ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی گن لات مار کر دور پھینک دی۔ شیری نے ڈیک کے سر میں گولی ماری تھی۔ وہ بھی مر گیا تھا۔ صرف ڈونلڈ زندہ تھا اور ہاتھ پکڑ کر کراہ رہا تھا۔ شیری نے اس کی شاٹ گن بھی دور کر دی اور پستول اس کی گردن پر لگا دیا۔

''جانز کے کتے... یہ بتا کہ مجھے دفن کرنے کی بات کیوں کی جا رہی تھی؟''

''تمہارا نام کس نے لیا؟'' اس نے معصوم بننے کی کوشش کی لیکن اسے شیری کی سفاکی کا اندازہ نہیں تھا۔ اس نے پستول اس کی گردن سے ہٹایا اور اس کے گھٹنے پر رکھ کر فائر کر دیا۔ اس نے چیخ ماری اور اس کتے کی طرح چیخنے لگا جو کسی گاڑی تلے آگیا ہو۔ شیری نے اپنا سوال دُہرایا تو وہ چیخ کر بولا۔

''کتیا... جانز نے حکم دیا ہے... تُو بچے گی نہیں۔''

''یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔'' شیری نے کہا اور اچانک ہی اسے گولی ماردی۔ ڈونلڈ سر میں گولی لگنے کے بعد آواز نکالے بغیر لڑھک گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ تم نے کیا کیا؟''

''وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم ان کی فکر کرنے کے بجائے اپنے بھائی کو دیکھو۔''

ان لوگوں نے جوزف کے ساتھ نہایت درندگی کا سلوک کیا تھا اور اس کے ہاتھ اور پیروں میں لمبی کیلیں اتاردی تھیں۔ یہ اس کی ہمت تھی جو وہ اس اذیت کو برداشت کر گیا تھا اور اس نے ان لوگوں کو ہمارے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر باری باری کیلیں نکالیں۔ وہ کراہتا رہا۔ ''تم کیسے ان کے ہاتھ آئے؟''

''مجھ سے پوچھو۔'' شیری نے کہا۔ ''یہ سمجھا ہوگا کہ وہ ایک ہی گاڑی میں آئیں گے اور جب اس نے ان سے نالے والے بوتھ کا ذکر کیا ہوگا تو وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ نالے میں چھپا ہوا ہے، بس انہوں نے اسے یہیں چھاپ لیا ہوگا۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' جوزف نے خفت سے کہا۔ میں رومال اس کے ہاتھوں کے زخموں پر باندھ چکا تھا پھر پیروں کے زخم پر باندھنے کے لیے اپنی شرٹ کو پھاڑا۔ ''یہ کیا چکر ہے، تم شیری کے ساتھ یہاں کیسے آئے؟''

''اس نے مجھے قابو کر لیا تھا۔'' اس بار میں نے خفت سے کہا۔ ''پھر اسی نے مجھے بتایا کہ تمہاری جان خطرے میں ہے اور جانز کو اس کی بالکل پروا نہیں ہے کیونکہ یہ اسے چھوڑ کر جانز کے حریف بیج کے پاس جانے والی تھی۔ شکر ہے، ہم... بروقت پہنچ گئے۔''

''ہاں، میری جان بچ گئی کیونکہ وہ مجھے مار دیتے... لیکن تاوان کی رقم نہیں ملی۔'' جوزف نے مایوسی سے کہا۔

''وہ بھی مل سکتی ہے بلکہ اس سے زیادہ رقم مل سکتی ہے۔'' شیری نے کہا۔ وہ کسی مرنے والے کی جیب سے سگریٹ نکال کر دھواں اڑا رہی تھی۔ ''اگر تم دونوں میرا ساتھ دو تو۔''

''وہ کیسے؟'' جوزف نے پوچھا۔

''جانز کے اہم آدمی یہی تین ہیں اور یہ اب مارے جا چکے ہیں۔ اس وقت بار میں اس کے ساتھ ایک یا دو آدمی ہوں گے۔ اگر ہم ان کے علم میں لائے بغیر اندر پہنچ جائیں تو سیف سے رقم حاصل کر سکتے ہیں۔''

''جانز کے سیف سے؟'' میں لرز گیا۔ ''تم جانتی ہو کہ وہ کس قسم کا شخص ہے۔ قبر تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔''

''وہ خود اپنی قبر میں ہوگا اس لیے ہمارا پیچھا نہیں کرے گا۔'' شیری نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' میں پہلے سے زیادہ لرز گیا۔

''مطلب صاف ہے، جب ہم ان تین کو مار سکتے ہیں تو جانز کو کیوں نہیں مار سکتے؟ اس طرح ہمیں مستقل اس سے نجات بھی مل جائے گی۔''

''نہیں۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''میں یہ کام نہیں کر سکتا۔''

''لیکن میں کر سکتا ہوں۔'' جوزف غصے سے بولا۔ ''شیری! میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن ایک شرط پر...''

''وہ کیا؟''

''جو ملے گا، اسے ہم سب برابر تقسیم کریں گے۔''

''نہیں، رقم کے دو حصے ہوں گے... نصف میرا اور نصف تم دونوں کا۔''

''نصف کیوں؟'' میں نے اعتراض کیا۔

''ٹھیک ہے، جانز کو پھر تم مارنا اور پھر برابر کا حصہ لے لینا۔''

یہی سب سے مشکل کام تھا اس لیے مجبوراً میں مان گیا اور جب میں مان گیا تو جوزف بھی راضی ہو گیا کیونکہ شیری کا ساتھ اصل میں تو مجھے دینا تھا۔ جوزف صرف ہمارے ساتھ جا سکتا تھا۔ ہم نے جانز کے ساتھیوں کا اسلحہ جمع کیا اور ان کی لاشیں نالے میں اس طرح ڈال دیں کہ وہ آسانی سے نظر نہ

www.kahopakistan.com

آئیں۔ جوزف مشکل سے سہی لیکن چل پھر رہا تھا۔ وہ کار کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ ہم نے پک اپ وہیں چھوڑ دی تھی۔ میں نے برابر میں بیٹھی شیری سے کہا۔ ''ہم بار میں اندر کیسے جائیں گے؟''

''ہم براہِ راست نہیں جائیں گے بلکہ برابر والی عمارت کی چھت سے اتر کر اندر داخل ہوں گے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''سیڑھیاں جانز کے کمرے کے پاس نکلتی ہیں اور سیف روم اسی کے کمرے کے ساتھ ہے۔''

ایک گھنٹے بعد ہم بار کی عقبی گلی میں تھے۔ جوزف کو ایک عدد پستول کے ساتھ کار میں چھوڑ کر میں اور شیری برابر والی عمارت میں داخل ہوئے۔ میری ناک کی تکلیف خاصی حد تک کم ہوگئی تھی اور مجھے امید تھی کہ یہ تکلیف اس کام میں حارج نہیں ہوگی جو ہم کرنے جارہے تھے۔ ایک نامی گرامی بدمعاش کو قتل کرنے کے بعد میرا حوصلہ بلند ہوگیا تھا۔ ہم برابر والی عمارت سے بار کے اوپر اترے اور دبے قدموں سیڑھیوں کے راستے نیچے آئے۔ اتنے عرصے بعد میں اس جگہ کا راستہ بھول گیا تھا لیکن شیری اس کے چپے چپے سے واقف تھی۔ اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ جانز کا کمرا کون سا ہے پھر اس نے آہستہ سے دستک دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے جانز کی غنودہ آواز آئی۔

''یس۔''

شیری بے دھڑک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی جانز نے میز کی کھلی دراز میں ہاتھ ڈالنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی شیری نے گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ سخت مزاج عورت ہے لیکن وہ یوں قتل کرتی پھرے گی، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جانز مرا نہیں تھا، اس نے پھر کوشش کی اور شیری نے دوسری بار بھی گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ اس بار وہ اپنی کرسی پر لڑھک گیا۔ شیری نے مجھ سے کہا۔ ''سیف روم دیکھو اور وہاں موجود ساری رقم نکال لو۔''

سیف روم کھلا ہوا تھا کیونکہ ابھی کیش اس میں رکھا جا رہا تھا جو جانز کے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے سیف روم میں جھانکا، وہاں بھی خاصی رقم تھی۔ بیگ مجھے ایک کونے سے مل گیا اور میں نے پہلے جانز کے سامنے موجود رقم اس میں ڈالی اور پھر سیف روم میں داخل ہوگیا۔ اس دوران میں بار کے دوسرے حصوں سے رہ رہ کر فائرنگ کی آواز آرہی تھی اور یہ سارے فائر اس پستول سے ہو رہے تھے جو شیری کے پاس تھا۔ وہ جانز کے باقی گرگوں کا صفایا کر رہی تھی۔ جب تک میں نے ساری رقم بیگ میں ڈالی، وہ اپنا کام کر کے واپس آگئی تھی۔ اس وقت تک بار بند ہو جاتا تھا اور دوسرے ملازمین چلے جاتے تھے۔ یہاں صرف جانز کے خاص آدمی رہ جاتے تھے۔ شیری انہیں ہی شوٹ کر رہی تھی لیکن یہاں کوئی اور ہوتا تو شیری رازداری برقرار رکھنے کے لیے یقیناً اسے بھی مار دیتی۔

ساری رقم رکھ کر میں نے بیگ بند کیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کم سے کم آٹھ لاکھ ڈالرز کی رقم تھی۔ جانز نے بار کے ساتھ جوا خانہ بھی کھول لیا تھا اور اس سے بھی دولت کما رہا تھا مگر افسوس کہ وہ یہ دولت استعمال کرنے کے لیے زندہ نہیں رہا تھا۔ شیری اندر آئی تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''میں نے سب کو ختم کر دیا ہے، اب ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا۔''

میں نے بیگ شانے پر اٹھالیا۔ ہم عقبی دروازے سے باہر جا سکتے تھے کیونکہ ہمارا راستہ روکنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا لیکن جیسے ہی ہم دروازے کی طرف بڑھے، ایک فائر ہوا اور شیری منہ کے بل زمین پر گری اور ساکت ہوگئی۔ اس کے سنہری بال عقب سے سرخ ہونے لگے۔ میں نے بھڑک کر پیچھے دیکھا، جانز کا پستول والا ہاتھ جھک رہا تھا اور پستول کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔ دو گولیاں کھانے کے بعد بھی اس نے کسی طرح اپنا پستول نکال ہی لیا تھا۔ اس نے مرنے سے پہلے شیری سے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ شیری مرچکی تھی۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا اور باہر نکل آیا۔ جس وقت میں اور جوزف وہاں سے جارہے تھے تو پولیس سائرن کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ میں نے جوزف کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ اندر شیری اور جانز سمیت سب مر گئے تھے اور ہمارے ہاتھ آٹھ لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی رقم آئی تھی۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

جوزف نے آگے جھک کر بیگ میں موجود رقم کی جھلک دیکھی اور بولا۔ ''ہم کہیں اور چلیں گے جہاں ہم سکون سے رہ سکیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ دولت اتنی ہے کہ ہمیں دوبارہ جرم کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

ذرا دیر بعد ہماری کار شہر سے باہر جارہی تھی... کسی انجانی منزل کی طرف جہاں ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتے تھے۔

☆

خطرپسند

سکندر ملاح

یگڈنڈیاں اونچی نیچی... اور راستے پُرخطر نہ ہوں تو زندگی کے رنگ پھیکے پڑنے لگتے ہیں... مہم جو فطرت کے مالک ایک ایسے ہی نڈر شخص کی زندگی کے شب و روز... جو اپنے ہر پل کو جوش و جذبے اور خطروں سے لڑتے ہوئے گزارنا چاہتا تھا...

ایک پولیس آفیسر کی مہم پسندی کا جوہر محاذ پر اپنی فتح چاہتا تھا

لیفٹیننٹ کارل میکس آسٹن کا پولیس چیف بننے کا خواب دیکھ کر پولیس میں بھرتی ہوا تھا لیکن گزشتہ دس سال میں تمام تر کوششوں کے باوجود وہ بس لیفٹیننٹ کے عہدے تک پہنچ سکا تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھیوں کے لیے ترقی کی یہ رفتار قابلِ رشک تھی لیکن خود کارل اس سے بالکل مطمئن نہیں تھا، وہ اس رفتار میں مزید اضافہ چاہتا تھا۔

کارل کی عمر ابھی صرف پینتیس سال تھی اور وہ فی الحال آسٹن میں سب سے کم عمر لیفٹیننٹ تھا۔ اس نے آنے والے

www.kahopakistan.com

دس سالوں میں پولیس چیف کے عہدے تک رسائی کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا تھا۔

کارل کی بیوی اس کی خواہش سے اچھی طرح واقف تھی اور اس کے خیال میں یہ کوئی بری بات بھی نہیں تھی لیکن وہ کارل کی اس عادت کے خلاف تھی کہ بعض اوقات اپنے فرائض کی ادائیگی میں وہ حدِ سے گزر جاتا تھا اور اس کی اور اپنے دو بچوں کی پروا کیے بغیر اپنی جان خطرے میں ڈال دیتا تھا۔ اس وجہ سے وہ کئی بار مرتے مرتے بچا تھا۔ ایک بار بینک میں ڈاکا مار کر بھاگتے ہوئے ڈاکو کو روکتے ہوئے اس نے دو عدد گولیاں کھائیں اور ایک مہینا اسپتال میں داخل رہا۔ ڈاکٹروں نے بڑی جدوجہد کے بعد اس کی جان بچائی تھی۔ ان گولیوں کے نشانات ابھی تک اس کے سینے پر موجود تھے۔

اس حادثے کے باوجود کارل کا رویہ تبدیل نہیں ہوا۔ وہ بدستور خطرات مول لیتا رہا۔ یہ ٹیکساس کا علاقہ تھا اور کارل جانتا تھا کہ یہاں کسی پولیس افسر کے سروس ریکارڈ سے اس کے جسم پر دورانِ ملازمت آنے والے زخم زیادہ دیکھے جاتے تھے۔ اس لیے وہ اپنی جان خطرے میں ڈالنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس کے سامنے کئی ایسی مثالیں تھیں۔ جن میں کچھ پولیس والے جو اپنے سر میں گدھے جتنا دماغ رکھتے تھے محض اپنی احمقانہ بہادری کی بدولت کہیں سے کہیں پہنچ گئے تھے۔ کارل ایسے کیسوں کی بو سونگھتا پھرتا تھا جن میں اسے کچھ کر دکھانے کا موقع ملے۔

اس روز وہ دفتر آیا تو فوراً ہی اس کے پاس میکڈونلڈ نے اسے طلب کرلیا۔ اتنی صبح تکلی کا مطلب کوئی سنگین کوتاہی بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن جب وہ میکڈونلڈ کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں اسے ایک نوجوان بیٹھا نظر آیا۔

"یس کیپٹن۔" کارل نے کہا۔

"کارل! یہ ایجنٹ اینڈریو ہیکمین ہے اور اینڈریو یہ میرے شعبے کا بہترین افسر کارل میکس ہے۔"

وہ لاابالی سا نوجوان فیڈرل ایجنٹ تھا۔ کارل نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے غور سے دیکھا تو اس کی عمر کے اندازے پر بھی نظر ثانی کرنا پڑی۔ پہلی نظر میں وہ بیس بائیس برس کا لگا تھا لیکن اس کی اصل عمر کم سے کم اٹھائیس برس تھی۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ "میرا تعلق نارکوٹکس سے ہے اور مجھے ایک کیس کے سلسلے میں ایک مقامی پولیس افسر کی ضرورت ہے۔"

کارل نے سوالیہ نظروں سے میکڈونلڈ کی طرف دیکھا تو اس نے کھنکھار کر کہا۔ "مجھے نارکوٹکس کی طرف سے باضابطہ درخواست ملی ہے اور میں نے تمہارا نام تجویز کیا ہے۔۔۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو۔"

"کیس کیا ہے؟"

"منشیات کا۔" اینڈریو نے کہا۔

"میں نے پوچھا ہے، کیس کیا ہے؟ ظاہر ہے تمہارا تعلق نارکوٹکس سے ہے تو تم ایجنسی کے خلاف تو تحقیق نہیں کررہے ہو گے۔"

"ایک ریکٹ ہے جو میکسیکو سے منشیات کی اسمگلنگ کے لیے گلف میکسیکو میں پرائیویٹ کشتیوں کو استعمال کررہا ہے۔"

"کیا تم اس بات کی وضاحت کرو گے کیونکہ گلف میں بے شمار ریکٹ سرگرمِ عمل ہیں۔"

اینڈریو ہچکچایا۔ "یہ ٹاپ سیکرٹ ہے۔"

"اس کی پروا مت کرو، یہاں ہونے والی بات کہیں نہیں جائے گی۔" کیپٹن نے اسے تسلی دی۔

کارل نے بُرا سا منہ بنایا۔ "ظاہر ہے ہم راز رکھنے کے اہل ہیں تب ہی تو تم یہاں آئے ہو۔"

اینڈریو شرمندہ ہوگیا۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے یہ بات کسی صورت بھی باہر نہیں نکلنی چاہیے ورنہ میں اب تک اس کیس پر جو کام کر چکا ہوں، شاید وہ ضائع ہو جائے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" کارل نے کہا۔

"اینٹی نارکوٹکس ایجنسی کو پتا چلا کہ خلیج میکسیکو میں ایک گروہ سرگرم ہے جو تفریح کے لیے جانے والی نجی کشتیوں پر کھلے سمندر میں اچانک حملہ کرکے یرغمال بنالیتا ہے اور پھر ان کشتیوں میں منشیات چھپا کر امریکا لے آتا ہے۔ کیونکہ یہ مقامی کشتیاں ہوتی ہیں اس لیے کسٹم کے حکام یا دوسری ایجنسیاں ان کی طرف توجہ نہیں دیتیں اور یہ نہایت آسانی سے منشیات کی بڑی کھیپ امریکا لانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔"

"جب تمہارے پاس یہ معلومات ہیں تو تم نے اس ریکٹ کے خلاف اب تک کیا کیا ہے؟" کارل نے پوچھا۔

"ہم نے ایسٹ کوسٹ پر موجود اس ریکٹ کا بڑی حد تک صفایا کر دیا ہے اور دو درجن سے زیادہ افراد کو گرفتار کرلیا ہے۔ ایک ٹن کے قریب منشیات بھی برآمد کی ہے جس میں نصف ہیروئن ہے۔"

"ایک ٹن۔" کارل نے بے ساختہ کہا۔ "یہ تو بہت بڑی مقدار ہے۔"

"ہاں لیکن ابھی سارا تھ کوسٹ پر یہ ریکٹ سرگرمِ عمل ہے اور میکسیکن گلف کے راستے اسمگلنگ جاری ہے۔"

"تمہیں کوئی خاص اطلاع ملی ہے؟"

اینڈریو نے سر ہلایا۔ "ایک کھیپ جس میں دو ٹن سے زیادہ منشیات ہے، آئندہ ایک ہفتے میں امریکا اسمگل کر دی جائے گی۔ میکسیکو سے یہ کھیپ روانہ کردی گئی ہے۔ پھر اسے کسی امریکی نجی کشتی کی مدد سے امریکا لایا جائے گا۔"

"نجی کشتی۔" کارل نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اگر تمام نجی کشتیوں کی نگرانی کی جائے تو۔۔۔؟"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" اینڈریو نے اس کی بات کاٹی۔ "تمہیں شاید معلوم نہیں ہے، صرف میکسیکو گلف میں امریکی نجی، تفریحی اور دوسری اقسام کی غیر کمرشل کشتیوں کی تعداد بیس ہزار سے اوران میں سے بیس سے پچیس فی صد ہمہ وقت سمندر میں ہوتی ہیں۔ تم پانچ ہزار کشتیوں کی نگرانی کا مطلب جانتے ہو؟"

کارل نے گہری سانس لی۔ "تمہیں تو پوری فورس یہاں لگانی پڑے گی۔"

"تب بھی نگرانی ممکن نہیں۔"

"تب تمہیں مخبری کے نظام پر انحصار کرنا پڑے گا۔"

"خوش قسمتی سے ہمارے کچھ مخبر ان لوگوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور وہ ہمیں معلومات بھی دے رہے ہیں۔"

"تب کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ ان کو بہت اندر کی معلومات حاصل نہیں ہیں جن کی مدد سے ہم فیصلہ کن کارروائی کرسکیں۔ وہ صرف سطحی قسم کی معلومات تک رسائی حاصل کرسکے ہیں۔"

"ڈوٹن منشیات غیر معمولی ہوتی ہے۔" میکڈونلڈ نے تشویش سے کہا۔ "یہ کم سے کم دو ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کافی ہے۔"

امریکا میں ہر سال مختلف اقسام کی دو ہزار ٹن منشیات اسمگل کرکے لائی جاتی ہے جس کی مالیت پچاس ارب امریکی ڈالرز سے زیادہ بنتی ہے اور یہ بہت محتاط تخمینہ ہے، ممکن ہے اس منشیات کی مالیت اس سے تین گنا ہو۔ اسے استعمال کرنے والے لاکھوں افراد میں سے ہر سال ہزاروں افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ تعداد مستقل نشہ کرنے والوں کی ہے اور جو کبھی کبھی منشیات استعمال کرتے ہیں ان کی تعداد اس سے دو گنا زیادہ ہے یعنی ہر تیس میں سے ایک امریکی کبھی کبھی نشہ استعمال کرتا ہے۔

"تمہارے مخبروں نے کیا بتایا ہے؟" کارل نے پوچھا۔

"ہمیں جو اطلاعات ملی ہیں، ان کے مطابق منشیات کی یہ کھیپ کورپس کرسٹی لائی جائے گی۔"

"کشتی کی مدد سے۔" کارل نے سوچ کر کہا۔ "تب تو کام آسان ہے وہاں آنے والی ہر کشتی کی نگرانی کی جاسکتی ہے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے، یہاں رجسٹرڈ کشتیوں کی تعداد دو ہزار ہے اور اس بندرگاہ پر مستقل کشتیاں آتی رہتی ہیں۔ پھر یہ بندرگاہ بہت بڑی ہے اور پوری بندرگاہ کی نگرانی کرنا تقریباً ناممکن ہے۔"

"ایک منٹ۔" کیپٹن میکڈونلڈ نے مداخلت کی۔ "کارل، تم اس کیس پر کام کرنے کے لیے تیار ہو؟"

"میں تیار ہوں کیپٹن۔" اس نے کہا۔

"گڈ۔۔۔ تب تم اس کیس پر کام تک مسٹر اینڈریو کے ساتھ رہو گے۔ یہاں تمہارے پاس کوئی خاص کام تو نہیں ہے؟"

"نہیں بس کچھ چھوٹے موٹے کیس ہیں۔"

"ان کو بیگل کے سپرد کردو۔" کیپٹن میکڈونلڈ نے حکم دیا۔ پھر اس نے اینڈریو کی طرف دیکھا۔ "مزید کچھ کہنا ہے مسٹر اینڈریو؟"

"نو سر۔" وہ اس کا مطلب سمجھ کر کھڑا ہوگیا۔ "اب مجھے اجازت دیں، میں مسٹر کارل کو ساتھ لے جارہا ہوں۔"

"ہمارے آدمی کا خیال رکھنا۔" کیپٹن نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے رسمی انداز میں کہا۔

وہ دونوں باہر آگئے۔

کارل نے اپنے کیسز ساتھی آفیسر بیگل کے سپرد کیے تو اس نے برا سا منہ بنایا۔ "میرے پاس اپنا کام کم نہیں ہے۔"

"یہ تم جا کر کیپٹن کو بتانا۔" کارل نے اپنا سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔ "اس نے مجھے کیسز تمہارے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے۔"

"جیسے میں فارغ بیٹھا ہوں۔" بیگل بھنا کر بولا۔

"او کے دوست پھر ملتے ہیں۔" کارل مسکرایا اور اینڈریو کے ساتھ باہر آگیا۔ "اب کہاں چلنا ہے دوست؟"

"یہاں فی الحال میں مقامی اینٹی نارکوٹکس کے ایک سیف ہاؤس میں مقیم ہوں لیکن وہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ یہاں کوئی اچھا اور معقول ہوٹل ہے؟"

"بے شمار ہیں لیکن تم میرے گھر چلو، رونی تم سے مل کر خوش ہوگی۔"

اینڈریو ہچکچایا۔ "یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

"بالکل مناسب ہوگا جب تک ہم روانہ نہیں ہوجاتے، مجھے کچھ وقت بیوی بچوں کے ساتھ گزارنے کا موقع بھی مل جائے گا۔"

www.kahopakistan.com

اینڈریو کے پاس ایک شاندار سیاہ مرسیڈیز وین تھی جیسی کہ عام طور سے وفاقی ایجنٹوں کو ملتی ہے۔ کارل اس کے ساتھ گھر آیا۔ وہ پولیس کار میں آتا تھا مگر اب اسے پولیس کار کہاں سے ملتی۔ کارل کے دونوں بچے لان میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔ کارل کو سیاہ وین سے برآمد ہوتے دیکھ کر وہ اس کی طرف بھاگے اور اس سے لپٹ گئے۔

''پاپا! آپ اس وقت۔۔۔؟'' اس کے چھوٹے بیٹے سیرس نے تعجب سے کہا۔ کارل اسے گود میں اٹھا کر بولا۔

''ہاں مجھے دوسرے شہر جانا ہے۔ اس سے پہلے میں نے سوچا کچھ وقت تمہارے ساتھ گزاروں۔''

شور سن کر رونی باہر آگئی۔ اینڈریو کو دیکھ کر اس نے سوالیہ نظروں سے کارل کی طرف دیکھا۔ اس نے جلدی سے تعارف کرایا۔ ''رونی، یہ نارکوٹکس سے اینڈریو ہے اور یہ میری بیوی رونی ہے۔''

دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ کارل نے رونی کو بتایا کہ وہ کام کے سلسلے میں کورپس کرسٹی جارہا ہے۔ رونی فکرمند ہوگئی۔ وہ کارل کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔ ''کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟ میں نے سنا ہے منشیات کے اسمگلر بہت سفاک ہوتے ہیں۔''

''ظاہر ہے وہ موت بیچتے ہیں۔ لیکن تم فکر مت کرو، میں صرف مقامی آفیسر کے طور پر اینڈریو کے ساتھ جارہا ہوں، میرا اس کیس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔''

اس کے جواب سے رونی کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ کارل بے دھڑک خطرات میں کود پڑنے والا شخص ہے مجرم قانون نافذ کرنے والوں میں فرق نہیں کرتے ہیں ان کے نزدیک سب ان کے دشمن ہوتے ہیں۔ رونی جانتی تھی کارل کا جانا ضروری ہے اس لیے اس نے بادلِ ناخواستہ سر ہلایا۔ ''اپنا خیال رکھنا ہماری خاطر۔''

''تم فکر مت کرو ڈیئر اور آج ذرا اچھا سا لنچ بنانا، میں خاص طور سے اسے یہاں لایا ہوں۔''

''اس کی تم فکر مت کرو۔'' رونی اندر جاتے ہوئے بولی۔

اینڈریو اتنی دیر میں بچوں سے بے تکلف ہو کر ان کے ساتھ فٹ بال کھیلنے میں لگ گیا تھا۔ کارل کو فارغ دیکھ کر وہ اس کی طرف آیا۔ ''میرا خیال ہے تمہاری بیوی تمہاری طرف سے فکر مند رہتی ہے۔''

کارل مسکرایا۔ ''ہر بیوی اپنے شوہر کی جانب سے فکر مند رہتی ہے۔''

اینڈریو نے گہری سانس لی۔ ''ایسا نہیں ہے، ہر بیوی ایسا نہیں کرتی۔ میریا کو میری ذرا بھی فکر نہیں ہے۔ میں دو دن یا دو ہفتے بھی گھر نہ آؤں، وہ کبھی نہیں پوچھے گی۔''

''ممکن ہے، وہ اندر ہی اندر فکر مند ہوتی ہو۔''

اینڈریو کی مسکراہٹ میں تلخی آگئی۔ ''میریا کسی کے لیے فکر مند نہیں ہوتی سوائے اپنی ذات کے۔''

کارل نے محسوس کیا کہ اینڈریو کے لیے یہ دل دکھانے والا موضوع تھا اس لیے اس نے بات تبدیل کردی۔ ''تمہاری رہائش کہاں ہے؟''

''اٹلانٹا سٹی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن فیلڈ ایجنٹ ہوں نا اس لیے پورے ملک میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔''

وہ اندر آئے۔ کارل نے کولڈ ڈرنک کے ٹن نکالے اور ایک اینڈریو کو تھما دیا۔ ''ہمیں کورپس کرسٹی کے لیے کب روانہ ہونا ہے؟''

اینڈریو نے ٹن کھول کر ایک گھونٹ لیا۔ ''ممکن ہے آج شام ورنہ کل صبح لازمی روانگی ہے۔ اصل میں مجھے وہاں سے ایک پیغام کا انتظار ہے۔ وہ ملتے ہی روانہ ہوجائیں گے۔''

''پیغام کون بھیجے گا؟''

''ایک مخبر ہے۔ وہ ہمارے لیے بہت قیمتی معلومات فراہم کررہا ہے۔ اسے بچانے کے لیے ہم نے اس کی شخصیت کو خفیہ رکھا ہے۔''

کورپس کرسٹی میکسیکو سے کوئی دو سو کلومیٹر دور گلف میکسیکو کے ساتھ ایک کھاڑی کے کنارے آباد خوب صورت قصبہ ہے جو اپنے دلفریب ساحلوں اور بندرگاہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں سال کے بیشتر حصے موسم خوش گوار رہتا ہے اس لیے یہاں تقریباً سارے سال ہی سیاحوں کا ہجوم موجود رہتا ہے۔ اس قصبے کی رونق سیاحوں کے دم سے ہے۔ آسٹن سے اس کا فاصلہ تین سو کلومیٹر بنتا تھا اور ہائی وے سے پانچ گھنٹے کا راستہ تھا۔

کچھ دیر بعد رونی نے لنچ لگنے کا اعلان کیا۔ سب کھانے کی میز پر آگئے۔ اینڈریو کو رونی کے ہاتھ کا کھانا بہت پسند آیا اور اس نے دل کھول کر تعریف کی۔ رونی خوش ہوگئی۔ اس نے کارل کی طرف دیکھا۔ ''تم کبھی اس طرح سے میری تعریف کرتے ہو؟''

''یہ عادی ہوگیا ہے۔'' اینڈریو بولا۔ ''مجھ سے پوچھو جس نے کسی گھر میں اتنے دنوں بعد مزے کا کھانا کھایا ہے۔''

''تم شادی شدہ ہو؟''

''ہاں کئی سال سے۔۔۔ لیکن میری بیوی کھانا بنانا نہیں جانتی۔''

کارل نے پھر موضوع بدل دیا۔ کھانے کے بعد وہ لیونگ روم میں آگئے۔ کارل نے محسوس کیا کہ اینڈریو گھر میں کیس پر بات کرنے کے لیے راضی نہیں ہے، اس نے دو تین بار موضوع چھیڑا لیکن وہ ٹال گیا اس لیے وہ دوسرے موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ شام کے وقت اینڈریو کو کسی کی کال موصول ہوئی اور وہ کارل سے معذرت کر کے گھر سے باہر چلا گیا۔ کال سن کر وہ واپس آیا تو بہت سنجیدہ تھا۔ اس نے کارل سے کہا۔

''ہمیں اسی وقت روانہ ہونا ہے۔ تم پوری تیاری کے ساتھ چلنا۔''

کارل اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے جا کر کپڑے بدلے اور دو جوڑوں کے ساتھ اپنا نائٹ سوٹ بھی ساتھ رکھ لیا۔ اس نے اپنا سروس پسٹل بھی ساتھ لے لیا تھا۔ گاڑی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اینڈریو کی وین تھی۔ وہ سورج ڈھلنے پر گھر سے روانہ ہوگئے۔ رونی فکر مند تھی، اس نے ایک بار پھر کارل سے کہا۔ ''پلیز! تم اپنا خیال رکھنا۔''

''تم فکر مت کرو۔'' کارل نے اس کا رخسار سہلایا۔

''رونی تم سے بہت محبت کرتی ہے۔'' اینڈریو نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے رشک آمیز لہجے میں کہا تو کارل نے گہری سانس لی۔

''ہاں، یہ تو ہے۔ وہ واقعی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''کارل! میں نے تمہیں اب تک اس کیس کے بارے میں تفصیل سے نہیں بتایا ہے۔۔۔ بہتر ہوگا تم اس کے بارے میں جان لو۔ اس میں خطرات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے اور جان کا خطرہ بھی ہے کیونکہ یہ ریکٹ بہت سفاک لوگوں پر مشتمل ہے، اس میں بیشتر اسپینش اور کالے ہیں۔ پچھلے دو سال میں کم سے کم دس افراد اس ریکٹ کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں جن میں چار اینٹی نارکوٹکس ایجنٹس بھی شامل ہیں۔''

''تم یہ سب مجھے کیوں بتارہے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم اب بھی سوچ لو اور اگر چاہو تو اس کیس سے الگ ہوجاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''میں کیوں الگ ہوجاؤں۔۔۔ کیا تم اپنی خاطر اس کیس سے الگ ہوسکتے ہو؟''

''اگر میریا میری اتنی پروا کرتی تو شاید میں الگ بھی ہو جاتا۔۔۔''

''لیکن میں الگ نہیں ہوسکتا۔ ٹھیک ہے میری بیوی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے فرائض بھول جاؤں۔'' کارل نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''تم بہادر آدمی ہو۔'' اینڈریو نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے تم کیس پر بات کرو۔''

''او کے، ہم کیس پر آتے ہیں۔ تم نے گرٹ میگوور کا نام سنا ہے؟''

''اچھی طرح۔۔۔ وہی جو کورپس کرسٹی کا ایک دولت مند آدمی ہے اور اس نے شہر سے کچھ دور ایک ری سائیکل انڈسٹریل ایریا بنا رکھا ہے۔ سنا ہے بہت مخیر ہے، اپنے علاقے میں غریبوں کے لیے کئی رفاہی ادارے چلا رہا ہے۔''

''غریب۔'' اینڈریو ہنسا۔ ''جن بستیوں میں اس کے ادارے کام کررہے ہیں وہاں مقیم بیشتر لوگ امریکا میں غیر قانونی داخل ہونے والے اسپینش اور وسط امریکا کے مقامی انڈین باشندے ہیں۔ یہ کولمبیا تک سے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سے اکثر مجرم بن جاتے ہیں اور مافیا والے ان سے کام لیتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے گرٹ مجرم ہے؟''

''اس بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا لیکن ایک بات میرے مخبر نے بتائی ہے کہ آنے والی منشیات کا تعلق گرٹ سے ہے۔''

''کیا اس کا امکان ہے کہ گرٹ ہی اصل میں اس ریکٹ کا سربراہ ہو؟''

''بالکل امکان ہے خاص طور سے مشرقی ساحل سے اس ریکٹ کا صفایا ہوا ہے تب سے امکان ہے کہ ریکٹ کی باگ ڈور گرٹ نے سنبھال لی ہے لیکن ہمارے پاس اس سلسلے میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

کارل نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''یہ کھیپ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کی مدد سے گرٹ پر ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے۔''

''بالکل یہی بات ہے۔'' اینڈریو نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔ ''تم ذہین آدمی ہو اور مجھے تم جیسے ساتھی کی ضرورت ہے جو دلیر بھی ہو اور ذہین بھی۔''

''گرٹ طاقت ور شخص ہے لیکن مجھے معلوم ہے پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی مجرمانہ سرگرمی میں ملوث رہا ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا ہے۔ اینٹی نارکوٹکس نے اس کا پولیس ریکارڈ بھی چیک کرایا ہے۔''

کارل نے نوٹ پیڈ اٹھایا اور خاص خاص پوائنٹ لکھنے لگا۔۔۔ ساتھ ساتھ وہ بولتا بھی جارہا تھا۔ ''نمبر ایک ہمیں میکسیکو سے آنے والی منشیات کی کھیپ کو روکنا اور قبضے میں لینا ہے۔''

''درست۔''

''نمبر دو، ہمیں گرٹ سے اس کھیپ کا تعلق تلاش کرنا ہے۔''

''ٹھیک۔''

www.kahopakistan.com

"لیکن ہمیں نہ تو یہ معلوم ہے کہ منشیات کس ذریعے سے آرہی ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ اسے کہاں اتارا اور رکھا جائے گا۔ نیز ملک میں اس کی آگے ترسیل کن طریقوں سے ہوگی۔"

"یہ سب درست ہے سوائے ایک بات کے اور وہ یہ کہ مخبر نے اس جگہ کا ممکنہ طور پر پتا چلا لیا ہے جہاں یہ منشیات کورپس کرسٹی میں اتارنے کے بعد رکھی جائے گی۔ یہ ایک ویئر ہاؤس ہے جہاں عام طور سے کشتیوں کا ناکارہ سامان رکھا جاتا ہے اور جب یہ سامان خاصا ہوجاتا ہے تو اسے گرٹ کی ری سائیکل کرنے والی فیکٹری میں روانہ کردیا جاتا ہے۔"

"گودام کا مالک کون ہے؟"

"بظاہر تو جارج نامی شخص ہے لیکن شبہ ہے کہ اس کا اصل مالک گرٹ ہے۔"

"اس شبے کی وجہ؟"

"بتایا تو ہے کہ کباڑ جن ری سائیکل فیکٹریوں کو فراہم کیا جاتا ہے، وہ سب گرٹ کی ملکیت ہیں۔"

"اس بات کا امکان ہے کہ کباڑ کی آڑ میں منشیات کی اندرونِ ملک شپ منٹ کی جاتی ہو؟"

"اس بات کا امکان ہے لیکن آج تک ایسی کوئی شپ منٹ پکڑی نہیں گئی ہے۔"

"کیا ویئر ہاؤس سے نکلنے والے سامان کو کبھی چیک کیا گیا ہے؟"

"براہِ راست تو نہیں لیکن دوسرے طریقوں سے چیک کیا گیا ہے۔ دو مہینے پہلے ہمارے ایک ایجنٹ نے کال کرکے کچھ اہم اطلاعات دینے کی کوشش کی لیکن کال کے دوران ہی وہ خاموش ہوگیا اور اگلے دن اس کی لاش کھاڑی میں تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔"

"وہ ویئر ہاؤس کی نگرانی کررہا تھا؟"

"ہاں اور اسی بات سے وہ پوری طرح مشکوک ہوگیا ہے۔"

"اس ایجنٹ کے علاوہ بھی اینٹی نارکوٹکس کا کوئی ایجنٹ مارا گیا ہے؟"

"یہی تو مصیبت ہے۔ اس کیس پر کام کرنے والے ہمارے چار ایجنٹس مارے جاچکے ہیں اور اس وجہ سے بھی دوسرے ایجنٹس اس کیس کو لینے یا اس پر کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

"تو تمہیں اس لیے پولیس کی مدد کی ضرورت پڑی ہے؟" کارل گفتگو کے دوران میں نوٹ پیڈ پر نکات اتارتا جارہا تھا۔

"ہاں اور شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو کہ اس کیس پر کام کرنے کے لیے میرے پاس صرف تین فیلڈ ایجنٹس ہیں۔"

"مخبر بھی تو ہیں۔" کارل نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں لیکن وہ عملی طور پر میری کوئی مدد نہیں کرسکتے اور مجھے ایک ساتھی کی اشد ضرورت محسوس ہورہی تھی جو میرا ساتھ دے سکے۔"

"پانچ افراد۔" کارل نے پیڈ پر لکھا۔ "ان پانچ افراد کو کم سے کم دو جگہوں پر کام کرنا ہے۔ ایک ویئر ہاؤس اور دوسرے بندرگاہ۔" اس نے اینڈریو کی طرف دیکھا۔ "صرف پانچ افراد یہ کام کرلیں گے؟"

"کوشش کرسکتے ہیں۔"

"سوال یہ ہے کہ تمہارے محکمے نے اتنے بڑے کام کے لیے صرف تین ایجنٹس کیوں دیے ہیں؟"

"میں نے بتایا نا کوئی اس کیس میں آنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ یہ تین بھی بڑی مشکل سے مانے ہیں۔ چار ایجنٹس کی موت معمولی نہیں ہوتی سارا محکمہ ہل کر رہ گیا ہے۔"

کارل نے سوچا، وہ درست کہہ رہا تھا۔ جب کارل کو ڈاکوؤں نے زخمی کیا تھا تو وہ اتنا خوف زدہ نہیں ہوا تھا جتنا کہ اس کے ساتھی ہوگئے تھے۔ پولیس یا کسی ایجنسی میں ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خوف سے ماورا ہوگئے۔ وہ انسان تھے اور ان کے بھی گھر بار اور بیوی بچے تھے، وہ بھی سب کی طرح اپنے پیاروں کے لیے زندہ رہنا چاہتے تھے۔ دو گھنٹے بعد اینڈریو نے گاڑی ایک ریستوران کے سامنے روک دی۔

"یہاں کھانا اچھا ہوتا ہے۔"

ڈنر کرکے وہ آگے روانہ ہوگئے۔ اینڈریو نے کارل سے کہا کہ وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں سوجائے کیونکہ اس کیس پر کام کے دوران میں ان کو شاید بیشتر وقت گاڑی میں ہی رہنا پڑے۔ ویسے اس میں خاصی گنجائش تھی اور دو افراد آرام سے سو سکتے تھے۔ کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لیے کارل نے سوجانا ہی مناسب سمجھا۔ باہر موسم کسی قدر سرد تھا لیکن گاڑی کے اندر اس کا پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔ وہ آرام سے سوگیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو گاڑی رکی ہوئی تھی اور اینڈریو ڈرائیونگ سیٹ پر ہی بے خبر سو رہا تھا۔ باہر صبح کی روشنی نمودار ہورہی تھی اور وہ کورپس کرسٹی پہنچ چکے تھے۔ وین ایک عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ کارل نے اینڈریو کا شانہ ہلایا تو وہ بیدار ہوگیا۔

"تم جاگ گئے۔۔۔ ہم رات ایک بجے یہاں پہنچ گئے تھے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے اور اپنے آدمیوں سے رابطہ ہوا؟"

"ہاں، وہ کام پر ہیں۔ دو بندرگاہ پر ہیں اور ایک یہاں ویئر ہاؤس کی نگرانی کررہا ہے۔"

"یہ جگہ ویئر ہاؤس کے قریب ہے؟" کارل نے باہر دیکھا۔

"ہاں، کوئی نصف کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میرا اپنے آدمی سے ریڈیو پر رابطہ ہے۔"

"بندرگاہ والوں کی کیا رپورٹ ہے؟"

"ان کا کہنا ہے کہ ابھی تک ایسی کوئی مشکوک کشتی نہیں آئی۔"

"ہزاروں کشتیوں میں کسی ایک مشکوک کشتی کا پتا چلانا بہت مشکل ہے۔" کارل نے سوچ کر کہا۔ "خیر، کام تو کرنا ہے۔ کیا بندرگاہ پر کسٹم چیکنگ ہوتی ہے؟"

"نہیں لیکن کوئی بڑا سامان اتارا یا چڑھایا جائے تو ہاربر انتظامیہ اسے چیک کرتی ہے۔"

"لیکن انتظامیہ ہر چیز تو چیک نہیں کرسکتی یہاں سی فوڈ بھی اترتا ہوگا؟"

"بالکل، بہت بڑی مقدار میں اترتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ روز ایک ہزار ٹن سی فوڈ آتا ہے۔ پورے ٹیکساس کو یہیں سے سی فوڈ فراہم کیا جاتا ہے۔" اینڈریو نے بتایا۔ کارل نے کہا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی عام گاڑی نہیں ہے، یہ تو فوراً نظروں میں آجاتی ہے۔"

"گاڑی ہے اور کچھ دیر میں یہاں آجائے گی۔"

واقعی کچھ دیر بعد ایک سفید کریسلر آگئی۔ اسے لانے والے نے چابی اینڈریو کے حوالے کی اور خود پیدل ہی وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اینڈریو نے کہا۔ "یہ مقامی ایجنٹ ہے جو سہولتیں فراہم کرتا ہے۔"

وہ سیاہ وین وہیں چھوڑ کر کریسلر میں ناشتا کرنے روانہ ہوگئے۔ ناشتے کے بعد بندرگاہ کی طرف جانے سے پہلے اینڈریو نے کارل کو ویئر ہاؤس دکھایا۔ یہ اونچی چار دیواری والا ایک احاطہ تھا جس میں کوئی عمارت نظر نہیں آرہی تھی۔ "اندر ایک چھوٹا سا کمرا ہے۔" اینڈریو نے کہا۔

"یہاں کوئی ہوتا ہے؟"

"جارج مستقل یہیں پایا جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، وہ یہاں کا نگران ہے؟"

"ممکن ہے، ویسے وہ ہمہ وقت نشے میں دھت ہوتا ہے۔"

دس منٹ بعد وہ بندرگاہ پر تھے جو کھاڑی کے سب سے اندرونی حصے میں تھی اور پانی یہاں پر بھی بہت گہرا تھا اس لیے آسانی سے کوئی سو کے قریب برتھیں بن گئی تھیں جن پر ہزاروں کشتیاں اور چھوٹے بحری جہاز لنگر انداز تھے۔ بندرگاہ پر زبردست گہما گہمی تھی۔ خاص طور سے فشنگ کے لیے مخصوص برتھوں پر اس قدر ہجوم تھا کہ کوئی جگہ خالی نظر نہیں آرہی تھی۔ ماہی گیر کشتیاں اور ٹرالرز بندرگاہ میں داخل ہورہے تھے اور اتاری جانے والی سمندری خوراک گاڑیوں پر لاد کر روانہ کی جارہی تھی۔ کارل نے اس طرف دیکھا۔ "ماہی گیر کشتیوں سے کھیپ کی منتقلی بہت مشکل کام ہے۔ یہاں ہجوم دیکھ رہے ہو، اس میں کوئی کام چھپا کر کرنا ناممکن ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ اب رہ جاتی ہیں نجی کشتیاں تو ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔" اینڈریو نے بندرگاہ کے دہانے کی طرف اشارہ کیا جہاں نجی کشتیاں تسلسل کے ساتھ آاور جارہی تھیں۔ "ان میں اس کشتی کو تلاش کرنا جسے اسمگلنگ کے لیے استعمال کیا جارہا ہو، تقریباً ناممکن ہے۔"

کارل نے بندرگاہ کا جائزہ لیا۔ یہاں داخل ہونے کا ایک ہی زمینی راستہ تھا، اینڈریو کا ایک آدمی اس راستے کی نگرانی کررہا تھا جبکہ دوسرا فشنگ برتھوں کی طرف تھا۔ کارل نے کہا۔ "اگر صرف آنے جانے والے راستے کی نگرانی کی جائے تو؟"

"اس صورت میں ہم کیا پتا چلا سکتے ہیں؟ تم دیکھ رہے ہو جانے والی گاڑیاں بھی بہت ساری ہیں۔ لوڈنگ کا کام بعض اوقات برتھ پر ہوجاتا ہے۔"

کارل نے محسوس کیا کہ یہاں کام خاصا مشکل تھا۔ "بندرگاہ سے گہرے سمندر میں جانے والی کشتیوں کا ریکارڈ مل سکتا ہے؟"

"ہاں مل سکتا ہے لیکن اس سے کیا مدد ملے گی؟"

"اگر ہم جان سکیں کہ میکسیکو کے سمندر کے قریب جانے والی کشتیاں کون کون سی ہیں تو ہم ان کی واپسی پر ان کی نگرانی کرسکتے ہیں، ان کی تعداد تو زیادہ نہیں ہوگی۔"

"ہاں یہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔" اینڈریو سوچ میں پڑ گیا وہ دونوں بندرگاہ کے منتظم کورن بینٹ کے دفتر آئے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کسی قدر بیزار نظر آنے والا شخص تھا۔ اس نے ان کے کارڈ دیکھے اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

"مجھے کھلے سمندر میں جانے والی نجی کشتیوں کی فہرست درکار ہے۔"

اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ اس سے لوگوں کے شہری حقوق کی خلاف ورزی ہوگی۔ اپنی تفریح اور آمدورفت کو راز رکھنا ان کا حق ہے۔ صرف عدالت ہی اس قسم کا

www.kahopakistan.com

ریکارڈ طلب کرسکتی ہے۔''
''یہ تو ٹھیک ہے لیکن مسئلہ منشیات کی ایک بہت بڑی کھیپ کا ہے۔'' اینڈریو نے کہا۔ ''اگر وہ امریکا میں داخل ہوگئی تو بے شمار لوگ اس کا شکار ہوں گے۔''
''یہ تم لوگوں کا مسئلہ ہے۔'' اس کا لہجہ مزید روکھا ہوگیا۔ ''میں اپنی پوزیشن کلیئر کرچکا ہوں۔''
کارل نے اندازہ لگایا کہ یہ خرانٹ شخص کسی صورت نہیں مانے گا۔ اس نے اینڈریو کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، ہمیں کسی عدالت سے لیٹر لانا ہوگا۔''
اینڈریو نے کچھ کہنا چاہا لیکن کارل کھڑا ہوگیا۔ منتظم کے کمرے سے باہر آتے ہی اینڈریو نے کہا۔ ''یہ کیا حماقت ہے؟ کسی جج کے پاس جانے کا مطلب ہے، اسے کیس کی مکمل تفصیلات مہیا کرو اور ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ہے؟''
کارل مسکرایا۔ ''تم فکر مت کرو دوست، ابھی دیکھو معلومات کس طرح ملتی ہے۔''
انہوں نے آتے وقت دفتر کا ریکارڈ رکھنے والا حصہ دیکھ لیا تھا، وہاں کمپیوٹر لگے تھے اور کئی افراد ان پر کام کررہے تھے۔ کارل ایک موٹے فریم کی عینک والے نوجوان کے پاس آیا، اس نے اسے اپنا پولیس کارڈ دکھایا۔
''مجھے تمہارے کمپیوٹر سے ایک ای میل کرنی ہے۔''
پولیس کارڈ دیکھ کر نوجوان تعاون پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے کارل کے لیے کرسی خالی کردی اور اس نے کرسی سنبھال لی۔ اینڈریو نوجوان کو شانے پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف لے گیا۔ ''معاف کرنا دوست، یہ ذرا راز داری والا کام ہے، تم سمجھ رہے ہو نا؟''
نوجوان نے سر ہلایا۔ ''ہاں، میں سمجھ رہا ہوں۔''
''اور تم اس بات کو راز میں رکھو گے۔ سمجھ لینا ہم یہاں آئے ہی نہیں تھے۔''
اب نوجوان کو احساس ہوا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ''یہ کیا چکر ہے؟''
''تم فکر مت کرو، تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ بس تم اپنی زبان بند رکھنا۔''
''دیکھو، اس کمپیوٹر میں بندرگاہ کا آفیشل ریکارڈ ہوتا۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا۔
''ہم عام لوگ نہیں ہیں اور میں نے کہا نا تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' اینڈریو نے اسے تسلی دی۔ اس دوران میں کارل اپنا کام کرکے کمپیوٹر کا پرنٹر والا بٹن دبا چکا تھا اور فوراً ہی پرنٹر سے ایک چھپا ہوا کاغذ نکلنے لگا۔ کاغذ باہر آتے ہی کارل نے کمپیوٹر کا کیشے صاف کردیا، اب کوئی پتا نہیں چلا سکتا تھا کہ اس نے کون سی فائل پرنٹ کی ہے۔ اس نے کاغذ نکال کر اسے گول کرکے اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔
''تمہارا شکریہ دوست۔'' اینڈریو نے نوجوان سے کہا۔ ''اپنی زبان بند رکھو گے تو پریشانی سے بچ جاؤ گے۔''
وہ دفتر کی عمارت سے باہر آئے۔ اینڈریو جاننے کے لیے بے تاب تھا۔ ''کام ہوگیا؟''
''کیوں نہیں، میں نے ان ساری کشتیوں کی فہرست نکال لی ہے جو جنوب مغرب کی سمت گئی ہیں، یہ جگہ میکسیکو کی سرحد کے پاس ہے۔''
''یہ ہوا نا کام۔'' اینڈریو پُرجوش ہوگیا۔ ''کاش! تم پہلے میرے ساتھ ہوتے تو اب تک کیس ختم ہوچکا ہوتا۔''
کارل مسکرا دیا۔ وہ بندرگاہ سے باہر آئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر اینڈریو نے کہیں کال کی۔ وہ کوسٹ گارڈز کی مدد چاہتا تھا۔ اس نے اپنے باس سے بات کی تھی۔ فون بند کرکے اس نے کارل سے کہا۔ ''ہمیں کوسٹ گارڈز کے دفتر جانا ہوگا۔''
کوسٹ گارڈز کا علاقائی دفتر پاس ہی تھا اور وہاں ایک میجر ان کا منتظر تھا، اسے اوپر سے کال آگئی تھی۔ اس نے پہلے ان کے سامنے کافی رکھی اور پھر گرم جوشی سے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''
''ہمیں میکسیکو کی سمندری حدود کے پاس موجود امریکی نجی تفریحی کشتیوں کو چیک کرانا ہے۔'' اینڈریو نے بتایا۔
''وجہ؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
''منشیات کی ایک بڑی کھیپ میکسیکو سے سمندر کے راستے امریکا اسمگل کی جارہی ہے۔ اس مقصد کے لیے کسی نجی امریکی کشتی کو استعمال کیا جائے گا۔''
''کس کشتی کو۔۔۔ کیا تمہارے پاس اس سلسلے میں کوئی اطلاع ہے؟''
اینڈریو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کسی ایک کشتی کا نام نہیں ہے۔ اطلاع ہے کہ اسمگلر میکسیکو کی سمندری حدود میں موجود کسی بھی امریکی کشتی کو یرغمال بنا کر اسے منشیات لانے کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔''
''اگر وہ ایسا بھی کرتے ہیں تو وہ منشیات بندرگاہ سے تو نہیں نکال سکتے۔ یہاں چیکنگ ہوتی ہے۔''
''ہاں لیکن یہ چیکنگ اتنی سخت نہیں ہے۔''
''پھر بھی بڑی کھیپ بندرگاہ لانا بہت رسکی ہے، اسمگلروں کو بھی پتا ہے اس میں پکڑے جانے کا زیادہ امکان ہے۔''
''تب تمہارا کیا خیال ہے، وہ کیا کرسکتے ہیں؟''

''ایک بار کھاڑی میں داخل ہونے کے بعد وہ اسے دائیں بائیں موجود کنارے پر موجود کسی بھی جگہ اتار سکتے ہیں۔ یہاں سیکڑوں مکانات کے ساتھ بوٹ ہاؤسز ہیں۔''
اتفاق سے کارل اور اینڈریو دونوں نے کھاڑی نہیں دیکھی تھی۔ میجر نے ان سے کہا۔ ''ایسا کرو تم ایک نظر اس کھاڑی کو دیکھ لو۔ تمہیں زیادہ بہتر اندازہ ہوجائے گا۔''
وہ میجر اسٹارک کے ساتھ کوسٹ گارڈز کے لیے مخصوص برتھوں تک آئے اور ایک چھوٹی اسپیڈ بوٹ میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ بوٹ میجر چلا رہا تھا۔ بندرگاہ سے نکلتے ہی سامنے وسیع کھاڑی نظر آنے لگی۔ اس کی چوڑائی کم سے کم بھی چار پانچ میل تھی اور اس کے دونوں طرف سرسبز کناروں پر امرا نے بڑے بڑے مکان بنا رکھے تھے۔ تقریباً ہر مکان کے ساتھ بوٹ ہاؤس تھا۔ میجر نے درست کہا تھا، ان میں سے کسی مکان کی برتھ پر بہ آسانی منشیات کی کھیپ اتاری جاسکتی تھی اور اس کے لیے بندرگاہ تک آنا بالکل بھی ضروری نہیں تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں وہ پوری کھاڑی دیکھ کر واپس آگئے۔ کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ میجر نے ان کو اپنے ساتھ لنچ کی دعوت دی اور وہ دفتر کے میس میں آگئے۔ کھانے کے دوران اینڈریو، میجر سے بات کررہا تھا اور کارل سوچنے میں مصروف تھا۔ کھانے کے بعد وہ میجر کے دفتر میں آئے تو کارل نے کہا۔
''اگر تم ہمیں کچھ سہولتیں دے سکو تو۔۔۔''
''کس قسم کی سہولتیں؟''
''ہمیں ایک ہیلی کاپٹر مع پائلٹ کے درکار ہے، یہ صرف ہمارے لیے مخصوص ہو اور ایک عدد ہائی اسپیڈ بوٹ بھی درکار ہے۔''
میجر اسٹارک نے اپنی ہلکی سی داڑھی کھجائی۔ ''اس میں ذرا مسئلہ ہے اگر کچھ دیر کے لیے درکار ہوتی تو میں مہیا کردیتا لیکن اب آپریشن انچارج کی اجازت درکار ہوگی۔''
''تو اجازت مانگو۔۔۔ منشیات کی روک تھام کوسٹ گارڈ کے فرائض میں بھی شامل ہے۔''
میجر نے ان کے سامنے پھر کافی رکھی اور خود فون سنبھال کر مصروف ہوگیا۔ اینڈریو نے آہستہ سے کہا۔ ''تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟''
''میں نے ان کشتیوں کی فہرست نکالی ہے جنہیں آج شام یا کل تک بندرگاہ واپس آنا تھا اور ان کی تعداد دو درجن ہے، ہم فضا اور زمین سے ان کشتیوں کی نگرانی کرکے جاننے کی کوشش کریں گے۔''
اینڈریو کو یہ منصوبہ پسند آیا اور اس نے کہا۔ ''تم نے بہترین سوچا ہے۔ اس طرح ہمیں کوسٹ گارڈ کا تعاون حاصل ہوگا تو افرادی قوت کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔''
میجر بات کررہا تھا۔ وہ دھیمے لہجے اور بے تاثر چہرے کے ساتھ مصروف تھا اس لیے وہ اندازہ نہیں کرسکے کہ اس کی گفتگو کس رخ پر جاری ہے۔ خاصی دیر بعد اس نے فون رکھا اور ان کی طرف دیکھا۔ ''سوری۔۔۔ اوپر سے اجازت نہیں ملی ہے۔''
''مگر کیوں؟'' اینڈریو نے احتجاج کیا۔
''آپریشن انچارج کا کہنا ہے کہ فی الحال کوئی ہیلی کاپٹر فارغ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اسپیڈ بوٹ تمہیں مستقل دی جاسکتی ہے۔''
''دیکھو، یہ قومی کاز ہے۔'' کارل نے کہا۔
''درست ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت ہم مشرق کی طرف ایک ریسکیو آپریشن کررہے ہیں اور تمام ہیلی کاپٹر اس میں مصروف ہیں۔ غیر قانونی تارکین وطن کا ایک قافلہ جو کیوبا سے چھوٹی کشتیوں کے ذریعے امریکا آرہا تھا، وہ راستے میں ڈوب گیا ہے اور کشتیوں پر موجود افراد کو سمندر سے نکالا جارہا ہے۔''
کارل اور اینڈریو مایوس ہوگئے۔ کارل نے پھر کہا۔ ''اچھا ہیلی کاپٹر نہ سہی لیکن ایک کشتی مل جائے۔۔۔؟''
''اینٹی نارکوٹکس کی بوٹ نیو آرلینز میں ہے، اسے یہاں تک آتے آتے دو دن لگ سکتے ہیں۔'' اینڈریو نے کہا۔
''منشیات کی کھیپ بہت بڑی ہے۔ تم سوچ سکتے ہو کہ دو ٹن منشیات جس میں ہیروئن بھی شامل ہے ملک میں آگئی تو اس سے کتنی اموات ہوسکتی ہیں اور پھر اس سے حاصل شدہ رقم سے جرائم پیشہ عناصر کیا کیا کرسکتے ہیں۔'' کارل بولا۔
میجر کچھ دیر سوچتا رہا اور اپنی داڑھی کھجاتا رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہیں اپنے اختیارات کے تحت ایک کشتی دیتا ہوں لیکن کیا تم اسے چلا سکو گے؟''
''مجھے چلانی آتی ہے۔'' اینڈریو نے کہا۔ وہ خوش ہوگیا۔
''ہمیں ایک مدد اور درکار ہوگی۔ کوسٹ گارڈ کی کشتیوں کو کہو، ان ناموں والی کشتیوں پر نظر رکھیں اور جب وہ ساحل کی طرف آئیں تو ہمیں خبردار کردیں۔'' کارل نے پرنٹر کے بجائے ہاتھ سے لکھی کشتیوں کی فہرست میجر کی طرف بڑھا دی، اس نے یہ کام گاڑی میں کرلیا تھا۔ پرنٹر کے کاغذ پر بندرگاہ کا مونوگرام چھپا ہوا تھا اور اس سے بات کھل جاتی۔
''یہ کام ہوجائے گا۔'' میجر نے کہا۔ ''اس ریجن میں ہماری چار کشتیاں موجود ہیں بلکہ ان کشتیوں کی تلاشی کیوں نہ لی

www.kahopakistan.com

جائے؟"

"نہیں، اول تو ایسا کرنے سے اسمگلر ہوشیار ہو جائیں گے اور ممکن ہے وہ کوسٹ گارڈ کے آنے سے پہلے سامان سمندر میں گرا دیں یا واپس چلے جائیں۔ دونوں صورتوں میں ان کو پکڑا نہیں جا سکے گا۔"

"تم چاہتے ہو کہ وہ منشیات یہاں تک لائیں اور تم ان کو رنگے ہاتھوں پکڑ سکو؟" میجر اسٹارک نے سوچ کر کہا۔

"بالکل کیونکہ معاملہ صرف منشیات کی کھیپ کا نہیں بلکہ اس ریکٹ کو گرفتار کرنے کا ہے جو اسمگلنگ میں ملوث ہے۔"

میجر ان کے ساتھ باہر آیا اور اس نے برتھ پر موجود ایک تیس فٹ لمبی طاقت ور بوٹ ان کے حوالے کی۔ اس نے برتھ پر موجود نگرانوں کو کارل اور اینڈریو سے مکمل تعاون کرنے کو کہا۔ میجر کے جانے کے بعد اینڈریو نے کہا۔ "کام ہو گیا ہے۔"

"تم ایک بار گودام کی نگرانی کرنے والے سے رابطہ کرو اور اسے کہو کہ جیسے ہی حالات میں کوئی تبدیلی آئے، ہمیں مطلع کرے۔"

"اس کی وجہ؟"

"منشیات کی کھیپ وہاں آئے گی اور اس کے آنے کا سن کر وہ کچھ انتظامات تو کریں گے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔" اینڈریو نے غور کیا اور فون نکال کر اپنے ساتھی سے رابطہ کرنے لگا۔ فون بند کر کے اس نے کارل کی طرف دیکھا۔ "میں تمہیں اپنی مدد کے لیے لایا تھا لیکن تم تو کیس انچارج بن گئے ہو۔ میں شاید کبھی اس طرح سے کام نہیں کر سکتا تھا۔"

"پولیس اور ایجنسیز کا مزاج الگ ہوتا ہے۔ اس میں سوچنے والے اور ہوتے ہیں اور عمل کرنے والے دوسرے ہوتے ہیں۔ تم فیلڈ ورکر ہو اور تمہاری سوچنے کی تربیت نہیں کی گئی ہے۔ پولیس میں ہمیں سب کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں سوچنے کی تربیت بھی دی جاتی ہے اور عمل کرنے کی تربیت بھی۔"

"تم نے ٹھیک کہا ہے، ہمیں سوچنے کی تربیت نہیں دی جاتی ہے۔ بہرحال اب کیا کرنا ہے؟"

"ایک خیال ہے۔" کارل نے کہا۔ "دیکھو، بندرگاہ کی نگرانی بے کار ہے۔ کم سے کم دو افراد یہ کام نہیں کر سکتے بلکہ اگر بندرگاہ کی نگرانی کا کام بھی میجر کو دے دیا جائے تو وہ کر سکتا ہے یہاں اس کے پاس افرادی قوت ہے۔"

"میرے آدمی کیا کریں؟"

"تم ان کو یہاں بلا لو۔ بوٹ ان کے حوالے کر دو اور وہ کھاڑی کے دہانے کی نگرانی کریں۔ ہم بندرگاہ سے اس سارے معاملے کو دیکھتے ہیں، اگر ضرورت پڑی تو کچھ دیر کے لیے ہیلی کاپٹر مل سکتا ہے لیکن یہ صرف ہمیں ملے گا۔"

"ٹھیک ہے میں انہیں بلا لیتا ہوں۔" اینڈریو نے اس کی بات مان لی اور اپنے آدمیوں کو کال کرنے لگا۔ وہ دس منٹ بعد ان کے پاس تھے، انہوں نے بندرگاہ کے عملے جیسا حلیہ بنا رکھا تھا۔ کارل اور اینڈریو ان کے ساتھ میجر کے پاس آئے اور اس سے سارے معاملات طے کر لیے۔ وہ مان گیا کہ بہ وقتِ ضرورت ان کو ہیلی کاپٹر فراہم کر دے گا۔ ساتھ ہی اس نے ان کو کوسٹ گارڈ کی ریڈیو فریکوئنسی فراہم کی جس کی مدد سے وہ سمندر میں موجود کوسٹ گارڈ سے معلومات حاصل کر سکتے تھے۔

"لیکن اسے زیادہ استعمال مت کرنا۔ یہ چینل بہت مصروف رہتا ہے۔" میجر نے انہیں خبردار کیا۔

"فکر مت کرو دوست، ہمارا بھی ان سے گپ شپ کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔" کارل نے میجر کے دفتر سے نکلتے ہوئے کہا۔ اینٹی نارکوٹکس ایجنٹس کو کوسٹ گارڈ کی وردیاں فراہم کر دی گئی تھیں اور وہ کشتی لے کر بندرگاہ سے روانہ ہو گئے۔ ان کے پاس رابطے کے لیے ریڈیو تھے۔ کارل اور اینڈریو سیاہ وین لینے کے لیے روانہ ہو گئے۔ ریڈیو اس وین میں تھا۔ شام ہونے کو تھی اور سمندر کی طرف سے تیز ہوا چل رہی تھی۔ اینڈریو نے وین میں موجود ریڈیو آن کر کے اپنے سارے ساتھیوں سے رابطہ کر کے چیک کیا۔ انہوں نے کشتی میں جانے والے ایجنٹس کو ان کشتیوں کی فہرست فراہم کر دی تھی جو آج کل میں جنوب مشرقی سمندر سے آنے والی تھیں۔

"فرض کرو، وہ کسی ایسی کشتی کو یرغمال بنا کر کھیپ کی منتقلی کے لیے استعمال کرتے ہیں جو کئی دن بعد واپس آنے کا کہہ کر گئی ہو تو۔۔۔؟" کارل نے نکتہ اٹھایا۔ اینڈریو پریشان ہو گیا۔

"یہ بات تو ذہن میں آئی ہی نہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں، مجھے بھی ابھی خیال آیا ہے۔" کارل نے کہا۔ "ہمیں ہر صورتِ حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

وہ سیاہ وین میں واپس بندرگاہ آئے۔ کریسلر کارل چلا کر لایا تھا۔ انہوں نے اتفاق کیا تھا کہ ان کے پاس دو گاڑیاں ہونی چاہئیں تاکہ کسی ہنگامی صورت میں مشکل نہ پڑے۔ انہوں نے پارکنگ کے ایسے گوشے کا انتخاب کیا جو ذرا ہٹ کر تھا اور وہاں زیادہ گاڑیاں نہیں تھیں۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ اینڈریو کو گودام کی نگرانی کرنے والے ایجنٹ کی کال آئی، اس نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے دو گاڑیاں گودام میں آئی ہیں جن میں کم سے کم سات آٹھ افراد ہیں اور وہ سب حلیے سے بدمعاش نظر آ رہے ہیں۔

"لگتا ہے کھیل شروع ہو گیا ہے۔" اینڈریو نے فون رکھ کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کھیپ کو پس کرسٹی کی طرف آ رہی ہے۔" کارل نے کہا۔ "ہمیں کوسٹ گارڈ سے بھی رپورٹ لینی چاہیے۔"

اینڈریو نے اس سے اتفاق کیا اور ریڈیو پر کوسٹ گارڈ سے رابطہ کیا۔ مخصوص کوڈ بتانے پر کوسٹ گارڈ آپریٹر نے ان کا رابطہ سمندر میں موجود کشتیوں سے کرا دیا۔ اینڈریو نے فہرست کی کشتیوں کے بارے میں پوچھا۔ ان کے بارے میں پتا چلا کہ نصف کشتیاں ابھی تک واپس نہیں آئی تھیں اور باقی نصف بندرگاہ کی طرف آ رہی تھیں، ان کی تعداد ایک درجن بنتی تھی۔ کوسٹ گارڈ کے مطابق وہ رات آٹھ بجے سے لے کر بارہ بجے کے درمیان بندرگاہ میں داخل ہوتیں۔ کارل نے گھڑی دیکھی، چھ بج رہے تھے اور سورج غروب ہو چکا تھا۔

"یعنی ہمارے پاس اب دو گھنٹے ہیں۔"

وہ تیزی سے حرکت میں آئے۔ اینڈریو نے پہلے کشتی میں موجود ایجنٹوں کو خبردار کیا اور پھر میجر کو کال کی۔ اسے صورتِ حال بتا کر ہیلی کاپٹر اور بہ وقت ضرورت کوسٹ گارڈ کے ایلیٹ دستے کی خدمات مانگی تھیں۔ میجر نے کہا۔ "دستے کی تیاری کا حکم دے دیتا ہوں اور ہیلی کاپٹر دس منٹ میں تیار ہو گا۔"

"چلو۔" اینڈریو نے گاڑی سے اترتے ہوئے کارل سے کہا۔

"میری ایک تجویز ہے۔" کارل بیٹھا رہا۔

"کیا؟"

"تم ہیلی کاپٹر پر چلے جاؤ اور مجھ سے رابطہ رکھو۔ اگر اسمگلروں کی نشان دہی ہو گئی تو میں گاڑی میں وہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا جہاں اسمگلر کھیپ اتاریں گے۔"

"تم نے ٹھیک کہا، ہیلی کاپٹر میں ایک آدمی کافی ہے۔" اینڈریو نے کہا۔ "تمہارا دماغ بہت تیز چلتا ہے۔"

"پولیس والا جو ہوں۔" کارل ہنسا۔ اینڈریو کوسٹ گارڈز کے دفتر کی طرف چلا گیا۔ ہیلی کاپٹر وہیں تھا۔ کارل وین میں ہی رہا۔ اسے ہلکی سی بھوک لگ رہی تھی اس لیے وہ اسے بہلانے کے لیے چپس کا ایک پیکٹ کھول کر بیٹھ گیا۔ ریڈیو آن تھا۔ اینڈریو نے ہیلی کاپٹر کی پرواز کے ساتھ ہی اس سے رابطہ کر لیا۔ "ہم اس وقت کھاڑی کے دہانے کی طرف جا رہے ہیں۔"

"اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ کھاڑی کے درمیان رہیں تاکہ جب ان کی ضرورت ہو تو وہ کم سے کم وقت میں مطلوبہ جگہ پہنچ سکیں۔"

"میں ابھی کہتا ہوں۔" اینڈریو نے کہا۔

"تمہارے پاس نائٹ ویژن دوربین ہے؟"

"بالکل ہے ہیلی کاپٹر میں۔"

"تو اسے استعمال کرو۔ دیکھو، دو ٹن کھیپ کا مطلب ہے اسے کسی بڑی کشتی میں بار کیا گیا ہو گا جس میں اتنی جگہ ہو کہ دو ٹن منشیات چھپائی جا سکے اور تم کھاڑی کے دہانے سے داخل ہونے والی ہر بڑی کشتی کو ضرور چیک کرو، چاہے وہ ہماری فہرست میں شامل ہو یا نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" اینڈریو نے پائلٹ کو اس بارے میں ہدایت دی۔ گودام کی نگرانی کرنے والا ایجنٹ بھی ریڈیو پر آ گیا تھا اور اب وہ سب آپس میں رابطے میں تھے۔ اس طرح کام آسان ہو گیا تھا۔ گودام میں آنے والے افراد اندر کچھ کرنے میں مصروف تھے۔ ایجنٹ ان کو ایک نزدیکی بلند جگہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ لوگ لوہے کے بڑے زنگ آلود پائپ ایک جگہ جمع کر رہے ہیں۔"

"پائپوں کی تعداد کتنی ہے اور سائز کیا ہے؟" کارل نے پوچھا۔

"ان کی تعداد شاید سو سے اوپر ہے اور سائز چار انچ اور لمبائی دس فٹ ہے۔"

کارل نے تیزی سے حساب کتاب کیا۔ "فرض کر لیا جائے کہ ایک پائپ میں بیس کلوگرام منشیات آ جاتی ہے تو سو پائپوں میں دو ٹن منشیات آرام سے آ جائے گی۔"

"بالکل آ جائے گی، ہر پائپ میں اتنی گنجائش ہے۔" ایجنٹ نے تصدیق کی۔ "خود پائپ کا وزن شاید پچاس کلوگرام ہو گا۔"

"دو افراد اسے آسانی سے اٹھا سکتے ہیں اور اگر اسے کباڑ میں سب سے نیچے رکھ دیا جائے تو ان کا پتا چلانا بھی ممکن نہیں ہو گا۔"

"سامان کیسے لے جائیں گے؟" اینڈریو نے اپنے آدمی سے پوچھا۔ "کوئی گاڑی آئی ہے؟"

"نہیں، ابھی تو کوئی سامان لے جانے والی گاڑی نہیں آئی ہے۔"

اس دوران میں اینڈریو کا ہیلی کاپٹر کھاڑی کے دہانے تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے وہاں دوربین سے نگرانی شروع کر دی۔ "دو کشتیاں آ رہی ہیں لیکن یہ دونوں چھوٹی ہیں۔"

"اس کے باوجود ان کو نظر میں رکھنا ہے۔" کارل نے خبردار کیا۔ "یہ کام کشتی میں موجود ایجنٹس کریں، وہ مناسب فاصلے سے کشتی کا تعاقب کریں جب تک وہ بندرگاہ میں نہ داخل

www.kahopakistan.com

ہوجائے۔"

کشتی کے ایجنٹس تیار ہوگئے۔ وہ سب اینٹی نارکوٹکس کی ریڈیو فریکوئنسی پر بات کررہے تھے۔ اس لیے امکان نہیں تھا کہ کوئی اور ان کی بات سن سکے۔ صرف اینڈریو کوسٹ گارڈز کی فریکوئنسی استعمال کررہا تھا اور اس کام کے لیے ہیلی کاپٹر کا ریڈیو اس کے پاس تھا۔ دس منٹ بعد ایک بڑی کشتی کھاڑی میں داخل ہوئی اور بندرگاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ دہانے سے بندرگاہ تک کا فاصلہ کوئی پندرہ میل تھا اور یہ فاصلہ کشتیاں بیس سے پچیس منٹ میں طے کرتی تھیں اس لیے ان کا وقت بہت مصروف گزرنے لگا۔ ہیلی کاپٹر نصف راستے تک کشتی کا تعاقب کرتا تھا اور اس کے بعد اسے کشتی میں موجود ایجنٹس کے سپرد کردیتا تھا، وہ بندرگاہ تک تعاقب کرتے تھے۔ جب کشتی بندرگاہ کی حد میں داخل ہوجاتی تو وہ واپس آجاتے تھے۔ ایک بھاگ دوڑ تھی جو جاری تھی ان میں صرف گودام کا نگران ایجنٹ اور کارل سکون سے بیٹھے ہوئے تھے لیکن ذہنی طور پر وہ بھی کم مضطرب نہیں تھے۔

دس بج گئے اور اس دوران میں انہوں نے کوئی سات آٹھ کشتیوں کا تعاقب کیا لیکن وہ سب بندرگاہ میں داخل ہوئی تھیں۔ اب وہ مایوس ہونے لگے۔ ان کا اندازہ غلط ثابت ہورہا تھا۔ شاید اسمگلروں نے آج آنے والی کشتیوں میں سے کسی کو یرغمال نہیں بنایا تھا۔ لیکن گودام میں ہونے والی سرگرمی بتارہی تھی کہ کھیپ آنے والی ہے۔ دس بجے ایک بڑی کشتی کھاڑی کے دہانے سے اندر داخل ہوئی۔ اینڈریو نے کارل کو بتایا۔

"اسے بھی چیک کرلو۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "مجھے لگ رہا ہے ہم کہیں دھوکا کھارہے ہیں۔"

"اس کے باوجود ہم اپنا کام جاری رکھیں گے۔" اینڈریو نے کہا۔

ہیلی کاپٹر بلندی پر رہ کر کشتی کی نگرانی کررہا تھا۔ اچانک ہی اس کی روشنیاں بند ہوگئیں۔ اینڈریو نے کارل کو بتایا، وہ چونکا۔ "دہانے میں آنے کے بعد تو کشتیاں اپنی روشنیاں مزید جلالیتی ہیں۔"

"لیکن اس کی تمام بیرونی روشنیاں بند کی جاچکی ہیں اور ۔۔۔ یہ رخ بھی بدل رہی ہے۔ یہ دائیں کنارے کی طرف جارہی ہے۔ شمالی کنارے کی طرف۔"

"میں اس طرف آرہا ہوں۔" کارل نے کہا اور وین اسٹارٹ کی۔ وہ پارکنگ سے نکلا اور کھاڑی کے شمالی سرے کے ساتھ چلنے والی سڑک پر آگیا۔ اس نے اینڈریو سے پوچھا۔ "بوٹ بندرگاہ سے کتنی دور ہے؟"

"تقریباً دس میل دور ہے۔" اس نے جواب دیا۔

یعنی کارل کو خاصا فاصلہ طے کرنا تھا۔ رات ہونے کی وجہ سے سڑک سنسان تھی اور اس پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس نے طاقت ور وین کے انجن کو ریس دی۔ "کیا کشتی کسی نجی ڈاک کی طرف جانے کی کوشش کررہی ہے؟"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔ اب بندرگاہ سے نو میل دور ہے۔"

"جی پی ایس پر اپنی پوزیشن بتاؤ، کشتی کے بالکل اوپر رہتے ہوئے؟"

"ایک منٹ۔" اینڈریو نے کہا اور شاید پائلٹ کو ہیلی کاپٹر کشتی کے عین اوپر لانے کو کہا۔ ایک منٹ بعد اس نے لوکیشن بتائی۔ وین میں جی پی ایس تھا۔ کارل نے اس پر اپنی پوزیشن سے اس پوزیشن کا موازنہ کیا جہاں کشتی تھی، وہ درست سمت میں جارہا تھا۔ ایک منٹ بعد اینڈریو نے نئی پوزیشن بتائی اور بولا۔ "وہ ایک بڑے مکان کے ساتھ ڈاک پر لگ رہی ہے۔ ایک منٹ، میں تمہیں اس کی کوئی نشانی بتاتا ہوں۔"

ہیلی کاپٹر نیچے آرہا تھا۔ کارل کے ساتھ اینڈریو کشتی میں موجود اپنے آدمیوں کو بھی گائیڈ کررہا تھا۔ اس نے کہا۔ "مکان کے اوپری حصے میں ایک مینار نما ساخت ہے۔"

کارل تقریباً آٹھ میل آگے آچکا تھا اور جی پی ایس کی پوزیشن کے پاس ہی تھا۔ گھنے درختوں کی وجہ سے مکانات نظر نہیں آرہے تھے۔ اینڈریو نے تازہ ترین لوکیشن بتائی تو کارل نے وین سڑک سے دائیں طرف جانے والے راستے پر اتار دی۔ یہ شاید مکانوں کی طرف جانے والی سڑک تھی۔ جیسے ہی وہ ذرا آگے آیا، اسے مینار کی ساخت رکھنے والا مکان نظر آگیا۔ یہ دومنزلہ تھا اور اس کے وسطی حصے میں اوپر مینار بنا ہوا تھا۔

"کشتی سے کچھ اتارا جارہا ہے اور ڈاک پر دو بند وین موجود ہیں۔" اینڈریو نے چلا کر کہا۔ "کارل! مقامی پولیس کو کال کرو جلدی۔"

کارل نے ریڈیو پر پولیس کی مخصوص فریکوئنسی ملائی۔ "میں آسٹن کا پولیس افسر لیفٹیننٹ کارل میکس بات کررہا ہوں۔" اس نے اپنا بیج نمبر دہرایا۔ "منشیات کی ایک مشکوک کھیپ کریک کے شمالی سرے پر ایک مکان میں اتر رہی ہے۔ مجھے پتا نہیں معلوم، جی پی ایس نوٹ کرلو۔ یہاں پولیس کی فوری ضرورت ہے۔" اس نے پولیس آپریٹر کو لوکیشن نوٹ کرادی۔

"ٹھیک ہے، علاقے میں موجود پولیس کو انفارم کیا جارہا ہے۔"

"شکریہ۔" کارل نے کہا اور ریڈیو پر دوبارہ اینٹی نارکوٹکس کی فریکوئنسی سیٹ کردی۔ "میں نے پولیس طلب کرلی ہے، کیا پوزیشن ہے؟"

"کشتی سے بڑے سائز کے بکس گاڑیوں میں منتقل کیے جارہے ہیں۔"

"تمہارے آدمی کہاں ہیں؟"

"وہ کچھ دور ہیں۔"

"اوکے، میں اندر جارہا ہوں۔"

"نہیں تم اکیلے ہو، ہمارا اور پولیس کا انتظار کرو۔"

"نہیں اس میں دیر ہوجائے گی، ایک بار انہوں نے کھیپ گاڑیوں پر منتقل کرلی تو ان کو روکنا مشکل ہوجائے گا۔"

"کارل ۔۔۔" اینڈریو نے اسے روکنا چاہا لیکن اس نے ریڈیو آف کردیا اور وین سے نیچے اتر آیا۔ اس نے وین ایک طرف تاریکی میں کھڑی کی تھی۔ اس نے اپنا پستول نکال لیا اور مکان کی طرف بڑھا۔ مکان بھی مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔ ممکن ہے مالک مکان کہیں گیا ہو اور یہ لوگ اس کا فائدہ اٹھارہے ہوں۔ وہ عمارت کی بغل سے ہوتا ہوا عقب میں آیا جہاں ڈاک تھی۔ ان لوگوں نے روشنی نہ ہونے کے برابر رکھی تھی۔ اس وجہ سے کارل کو پہلے تو کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ کھاڑی کی طرف سے ہیلی کاپٹر کی آواز آرہی تھی۔ لیکن یہ اتنی کم تھی کہ اسمگلروں کو شبہ نہیں ہوا۔ وہ اطمینان سے اپنا کام کررہے تھے۔ کچھ دیر میں کارل کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوگئی تھیں۔ اس نے دیکھا، دو درمیانے سائز کی وین ڈاک پر موجود تھیں اور کشتی سے کارٹن اتار کر ان میں لادے جارہے تھے۔ یہ کام کرنے والے دو افراد تھے۔ ان کے علاوہ کم سے کم دو افراد نگرانی کررہے تھے اور ان کے پاس خودکار ہتھیار تھے۔ اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ یہ منشیات کی کھیپ ہے۔ کچھ افراد کشتی پر بھی تھے جو ڈاک پر موجود دونوں آدمیوں کو کارٹن پکڑا رہے تھے۔ پیکنگ اور واٹر پروفنگ سمیت کارٹن کا وزن بیس کلوگرام سے زیادہ نہیں تھا کیونکہ اٹھانے والے انہیں آسانی سے اٹھارہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ کشتی پر ایسے سو کارٹن تھے اور ان کو منتقل کرنے میں کچھ وقت لگتا۔

اس طرف سے مطمئن ہوکر کارل نے افراد کا جائزہ لیا۔ دو مسلح تھے لیکن باقیوں کے پاس بھی ہتھیاروں کی موجودگی لازمی تھی۔ پھر کشتی پر موجود افراد بھی تھے۔ کم سے کم چھ افراد یقینی طور پر موجود تھے۔ ان کے مقابلے میں وہ اکیلا تھا لیکن اسے ان کو روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ مسلح افراد بہت چوکنا تھے اور وہ ایک لمحے میں کسی پر بھی فائر کرنے کے لیے تیار تھے۔ کارل ان سے کوئی بیس گز دور مکان کی آڑ میں دبکا ہوا تھا اور یہاں سے اسے کشتی کی طرف دیکھنے میں دشواری ہورہی تھی کیونکہ درمیان میں گاڑیاں حائل تھیں۔ اس نے گھڑی دیکھی، اسے یہاں آئے ہوئے پانچ منٹ گزر چکے تھے اور ابھی تک نہ تو اینڈریو کے آدمی آئے تھے اور نہ ہی پولیس کا کچھ اتا پتا تھا پھر ایک وین کا دروازہ بند ہوا تو اسے احساس ہوا کہ وقت اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور یہ لوگ یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔

اس نے سوچا اور فیصلہ کرلیا، اسے مداخلت کرنا تھی ورنہ یہ نکل جاتے۔ اس نے لوڈ ہوجانے والی وین کے عقبی ٹائر کا نشانہ لیا۔ اسے اپنے نشانے پر اعتماد تھا، اس نے لگاتار دو گولیاں چلائیں اور وین کے دونوں عقبی ٹائرز برسٹ ہوگئے۔ اس کے فوراً بعد وہ دیوار کی آڑ میں نہ ہوگیا ہوتا تو مسلح افراد کی طرف سے چلائے جانے والے برسٹ اسے چاٹ جاتے۔ گولیاں دیوار سے لگیں تو سنگ ریزے اڑ کر اس تک آئے۔ ساتھ ہی ڈاک پر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ اسمگلر چلا رہے تھے اور وقفے وقفے سے کارل کی طرف گولیاں چلارہے تھے۔

مکان کے دونوں طرف ڈرائیو وے تھا اور جس وین کے ٹائر سلامت تھے، وہ دوسری طرف سے نکل کر جاسکتی تھی۔ کارل اسے کسی صورت نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس میں نصف منشیات کے ساتھ یقیناً سارے اسمگلر بھی ہوتے۔ ایک بار اس نے جذباتی ہوکر اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی اور مرتے مرتے بچا تھا لیکن اب اسے عقل آگئی تھی اور وہ بلاوجہ اپنی جان خطرے میں نہیں ڈال رہا تھا اس لیے جب تک اسمگلروں کی طرف سے فائرنگ ہوتی رہی، وہ دیوار کی آڑ میں دبکا رہا۔ وہ یہاں محفوظ تھا، جب تک کوئی خاص طور سے یہاں نہ آتا وہ اسے نشانہ نہیں بنا سکتا تھا اور ایسا کرنے والا پہلے خود اس کے ہاتھ سے مارا جاتا۔ پھر فائرنگ رک گئی۔ اس کی آڑ میں اسمگلروں نے جو کرنا تھا، وہ کرلیا تھا اور پھر کارل نے وین کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ وہ حرکت میں آیا اور دیوار کے بالکل نچلے حصے سے سر اور ہاتھ نکال کر اس نے دوسری وین کے ٹائروں کا نشانہ لے کر پستول کی باقی گولیاں خرچ کردیں۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا، وین کے کم سے کم دو ٹائر برسٹ ہوگئے تھے اور وہ ایک طرف جھکتے ہوئے رک گئی۔ ڈرائیور نے اس کے باوجود اسے چلانے کی کوشش کی تو وہ الٹ گئی۔

"وہ مارا۔" کارل نے خود کو شاباشی دی۔

الٹی وین سے کئی افراد نکلے اور کارل کی طرف فائرنگ کرتے ہوئے ڈاک کی سمت بھاگ نکلے۔ ان کا ارادہ شاید کشتی کی مدد سے فرار ہونے کا تھا۔ کارل پھر آڑ میں ہوگیا۔ اب ہیلی کاپٹر نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ کہیں اتر گیا تھا۔ پولیس کو کال کیے دس منٹ گزر چکے تھے

www.kahopakistan.com

اور اب تک پولیس کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ کارل کو غصہ آرہا تھا۔ آسٹن میں پولیس اتنی دیر میں شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی تھی جو کورپس کرسٹی کے مقابلے میں کہیں بڑا شہر تھا اور یہاں پولیس اب تک نہیں آئی تھی۔

کارل نے ڈاک کی سمت جانے والوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی، اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اینڈریو کے آدمی وہاں پہنچنے والے ہیں اور وہ کشتی کو جانے نہیں دیتے اور ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی اسمگلر ڈاک پر پہنچے، کوسٹ گارڈ کی کشتی نمودار ہوئی اور اسمگلروں نے بدحواسی میں اس پر فائرنگ کردی۔ ایجنٹس اس کے لیے بالکل تیار تھے۔ انہوں نے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے جوابی فائرنگ کی اور دو اسمگلر وہیں ڈھیر ہوگئے۔ باقی پسپا ہو کر وین اور دوسری چیزوں کی آڑ لے کر کشتی پر فائرنگ کرنے لگے۔ اسلحے اور افرادی قوت کے لحاظ سے اسمگلروں کا پلڑا ابھی بھی بھاری تھا۔ کارل کے اندازے کے برعکس ان کی تعداد آٹھ تھی اور دو افراد کے مارے جانے کے بعد وہ چھ تھے۔ وہ چیخ چیخ کر پولیس اور کوسٹ گارڈ کو گالیاں دے رہے تھے۔ پھر وہ پیدل ہی عمارت کی دوسری طرف جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس طرف کارل ان کا راستہ روکنے کے لیے موجود تھا لیکن وہ دوسری طرف نہیں جاسکتا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ کسی اور کو ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ پہلے ہی مقامی پولیس کی مدد حاصل کرلیتا تو اس وقت اس کی پوزیشن کہیں بہتر ہوتی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پولیس اسے محکمہ جاتی انا بھی بنا سکتی تھی۔

کارل ایک لمحے کے لیے سر نکال کر صورتِ حال دیکھ لیتا تھا لیکن وہ آڑ سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، اسے اپنے عقب کا خیال بھی رکھنا تھا اگرچہ بھاگتے مجرموں سے اس کی توقع محال تھی کہ وہ صرف اسے قتل کرنے کے لیے اس طرف آئیں گے۔ اچانک کارل کو ایک خیال آیا۔ وہ جس طرف جا رہے تھے اس طرف اینڈریو کی وین کھڑی تھی، اگرچہ اس کی چابی کارل کے پاس تھی لیکن شیشہ توڑ کر اندر گھسنا اور پھر انجن کو ہاٹ وائر کر کے اسٹارٹ کرنا ناممکن نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی کارل عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف لپکا اور جیسے ہی اس نے سامنے کی طرف جھانکا، عمارت کے دائیں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔

کارل نے سر پیچھے کرلیا لیکن اتنی دیر میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ کم سے کم دو افراد وین کے پاس تھے۔ پھر شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ کارل نے آڑ سے ہاتھ نکال کر وین کی طرف چند فائرز کیے اور فوراً ہی دوسری طرف سے اس کا جواب آگیا۔ کارل ہاتھ پیچھے کر رہا تھا کہ اسے لگا جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی دہکتا ہوا انگارا گھس گیا ہو۔ ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کا پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ گولی اس کی کلائی کے وسط میں سوراخ کرتی ہوئی دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ زخم بڑا تھا اور نسیں کٹ جانے سے خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ کارل نے جیب سے رومال نکالا اور زخم پر لپیٹ کر دانتوں کی مدد سے گرہ باندھ لی۔ اگرچہ تکلیف سے اس کا برا حال تھا لیکن اس وقت اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اسمگلرز ممکنہ طور پر جان گئے تھے کہ اسے گولی لگ گئی ہے اور وہ اسی طرف آرہے تھے۔ کارل نے پستول تلاش کیا اور جب وہ اسے نظر نہیں آیا تو وہ اسے بھول کر عمارت کے عقبی حصے کی طرف لپکا۔ اسمگلرز آتے ہی اسے شوٹ کردیتے۔ کارل کی وجہ سے ان کا مشن ناکام ہوگیا تھا اور کم سے کم نصف ارب ڈالرز کی منشیات یہاں پڑی رہ گئی تھی۔ گاڑیاں ناکارہ ہوجانے کی وجہ سے وہ اسے یہاں سے لے جا نہیں سکتے تھے۔ ان کے دو افراد مارے جاچکے تھے۔ ان کے دل میں کارل کے لیے انتقامی جذبات کا ہونا حتمی بات تھی۔

کارل دوبارہ عمارت کے اسی سرے پر پہنچا جہاں سے ڈاک نظر آرہی تھی۔ کوسٹ گارڈ کی کشتی کھڑی تھی اور اس پر موجود اینڈریو کے دونوں آدمی نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ خود بھی غائب تھا۔ کارل نے انہیں دل ہی دل میں بے نقط سنائیں۔ یہ ان کا کیس تھا اور وہ اسے کارل کے سر پر چھوڑ کر غائب تھے۔ وہ زخمی اور نہتا تھا اور اسمگلرز اسے تلاش کر رہے تھے۔ کارل نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور پھر خطرہ مول لے کر ڈاک والے حصے میں آگیا۔ اگر یہاں اسمگلروں کا کوئی آدمی ہوتا تو وہ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔ لیکن اس کی خوش قسمتی کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سوائے ان دو افراد کے جو ڈاک پر مردہ پڑے تھے۔

وین کی آڑ میں بیٹھ کر اس نے زخم کا معائنہ کیا اور اسی لمحے فضا میں پولیس سائرن کی آواز گونجی۔ پولیس کے اتنی دیر سے آنے کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی کہ وہ اب تک کارل کی تصدیق میں لگی ہوئی تھی حالانکہ پیٹرولنگ دستوں کو تو بھیجا جاسکتا تھا۔ اس کے فوراً بعد فائرنگ کا ایک بہت تیز اور بہت مختصر سا دور ہوا اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پولیس والے چلا چلا کر اسمگلروں سے ہتھیار پھینکنے کو کہہ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ان میں کچھ زندہ تھے، ورنہ مردوں سے ہتھیار کون پھنکواتا ہے۔ خون مسلسل بہہ رہا تھا اور اس کی کمی سے کارل کا سر چکرانے لگا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا تو اس کی نظر ایک مردہ پڑے اسمگلر پر گئی۔ وہ مردہ نہیں تھا اور اس کی گن بھی اس کے پاس ہی پڑی تھی۔ وہ اسے اٹھا کر اس کا رخ کارل کی طرف کر رہا تھا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اسمگلر کو روک پاتا یا یہاں سے کہیں بھاگ جاتا۔

دین کی آڑ میں جانے کے لیے بھی وقت درکار تھا۔ کارل بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا، اس نے کارل کی بے بسی محسوس کرلی تھی، وہ خون آلود لبوں کے ساتھ مسکرایا اور اس نے اپنی گن کا رخ کارل کی طرف کردیا۔

چند گز کے فاصلے سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کارل خود کو مرنے کے لیے ذہنی طور تیار کر رہا تھا۔ اسے رونی اور بچوں کا خیال آیا۔ اب انہیں باقی زندگی اس کے بغیر گزارنی ہوگی۔ رونی کا اندیشہ بالآخر درست ثابت ہوا تھا۔ کارل نے آنکھیں بند نہیں کیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ زخمی کا ہاتھ لرز رہا ہے وہ شاید آخری دموں پر تھا اور اس وقت بھی وہ کارل کو قتل کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے ٹریگر دبا دیا، ایک دھماکا ہوا اور کارل کو ایک جھٹکا لگا، وہ زمین پر جا گرا تھا۔ لیکن وہ پیچھے نہیں بلکہ بائیں طرف گرا تھا۔ اسے تعجب ہوا تھا اسے گولی بھی نہیں لگی تھی البتہ گرنے سے کلائی کے زخم نے تڑپا دیا تھا۔

پھر کارل نے اینڈریو کو اپنے سینے پر ہاتھ رکھے ڈگمگاتے دیکھا۔ اس نے کارل کو دھکا دیا اور گولی شاید اسے لگ گئی تھی۔ پھر وہ زمین پر گر گیا۔ کارل بڑی مشکل سے اٹھا۔ گولی چلانے والا زخمی دم توڑ چکا تھا، اس میں بس اتنی ہی جان تھی کہ ایک بار ٹریگر دبا سکتا۔ کشتی کی طرف سے روشنی آرہی تھی اور اس میں سے کچھ لوگ بھی اتر رہے تھے لیکن وہ اسمگلرز نہیں تھے۔ شاید اس کشتی کے اصل مسافر تھے جن کو یرغمال بنالیا گیا۔ روشنیاں انہوں نے کی تھیں۔ دوسری طرف سے پولیس والے آرہے تھے۔

کارل، اینڈریو کے پاس بیٹھ گیا۔ گولی اس کے دل سے ذرا نیچے لگی تھی۔ وہ ہوش میں تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ کارل کو دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ بس کھنچ کر رہ گئے۔ کارل کو لگا جیسے زندگی سے اس کا ناتا ٹوٹنے والا ہے۔ اینڈریو نے اس کی جان بچاتے ہوئے گولی کھائی تھی۔

"تم نے کیا کیا؟" کارل کا لہجہ بھرا گیا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے مشکل سے کہا۔ "میں تمہیں اس خطرے میں لایا تھا اور تمہیں بچانا میرا فرض تھا۔"

اس دوران میں ڈاکٹر آگیا۔ پولیس کے ساتھ ایمبولینس بھی آئی تھی۔ ڈاکٹر نے اینڈریو کا معائنہ کیا اور اسے فوری طور پر آکسیجن لگانے کو کہا۔ اس کے ساتھ آنے والا پیرامیڈک اسٹاف اینڈریو کو دیکھنے میں لگ گیا۔ اسے ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال بھیجنے کے بعد ڈاکٹر کارل کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے کلائی دیکھی۔

"ہڈی ٹوٹ گئی ہے، ابھی میں عارضی پٹی کردیتا ہوں۔

اس کا آپریشن ہوگا۔"

اس نے کارل کے زخم پر پٹی کردی۔ کارل نے جا کر سب سے پہلے گرفتار ہونے والوں کو دیکھا کیونکہ یہاں جو ہوا تھا اس میں سب سے زیادہ حصہ اسی کا تھا اس لیے پولیس والوں کو تفصیل بتانا اس کی ذمے داری تھی۔ اسمگلروں میں سے چار مر گئے تھے۔ دو زخمی تھے اور دو صحیح سالم گرفتار ہوگئے تھے۔ واقعے کی نوعیت کی وجہ سے آدھے گھنٹے بعد کورپس کرسٹی کا پولیس چیف خود آگیا۔ کارل نے اسے آپریشن کی بریفنگ دی اور منشیات کے بارے میں بتایا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اینٹی نارکوٹکس کا کیس ہے لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ کارل بھی پولیس والا ہے تو وہ خوش ہوگیا۔

"اس لحاظ سے تو یہ ہمارا کیس ہے۔"

"نہیں۔" کارل نے رکھائی سے جواب دیا۔ "انچارج اینڈریو ہے اور مجھے اس کے ماتحت دیا گیا تھا۔"

"لیکن سب تم نے کیا ہے۔ اینٹی نارکوٹکس والوں نے کیا کیا ہے؟" اس نے اعتراض کیا۔

"کیا تو مقامی پولیس نے بھی کچھ نہیں ہے۔" کارل نے طنز کیا۔ "میں نے پولیس کو ریڈیو سے کال کی اور اس نے آنے میں پورا آدھا گھنٹا لگا دیا۔ اگر ہم چند آدمی مزاحمت نہ کرتے تو یہ ہمیں مار کر یہاں سے منشیات سمیت جاچکے ہوتے۔"

پولیس چیف کھسیانا ہوگیا۔ "ہاں، یہ بات میرے علم میں آئی ہے۔ اصل میں تصدیق کرنے میں اتنی دیر ہوگئی۔"

کارل کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ "اس کے باوجود پیٹرولنگ دستوں کو فوری روانہ کیا جانا چاہیے تھا۔ تم لوگوں کی وجہ سے میں مرتے مرتے بچا اور اینڈریو میری جان بچاتے ہوئے شدید زخمی ہوا ہے۔"

پولیس چیف سچ مچ شرمندہ ہو رہا تھا۔ "میں معذرت خواہ ہوں اور اس واقعے کی انکوائری کرواؤں گا کہ پولیس اتنی دیر سے کیوں روانہ ہوئی۔"

جب اینٹی نارکوٹکس کے مقامی حکام آگئے اور انہوں نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو کارل بھی اسپتال کے لیے روانہ ہو گیا جہاں اس کا آپریشن کر کے ہڈی سیٹ کردی گئی۔ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے اینڈریو کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ اینڈریو آپریشن روم میں ہے اور ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب کارل کو آپریشن کے بعد ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی اور اس کے بازو کا درد بھی کم ہوگیا تھا۔ اس نے گھنٹی بجا کر نرس کو بلایا۔

"سسٹر، میرے ساتھ ایک زخمی آفیسر اور آیا تھا؟"

"مسٹر اینڈریو۔" نرس بولی۔ "اس کا آپریشن ہوگیا ہے

www.kahopakistan.com

اوراس کی حالت بہتر ہے۔لیکن وہ ابھی ہوش میں نہیں آیا ہے۔"

کارل نے اینڈریو کے بچ جانے کی خبر پر سکون کا سانس لیا۔ وہ چل پھر سکتا تھا۔ ناشتے اور دوسری ضروریات سے فارغ ہوکراس نے گھر کال کی اور رونی کو اپنی خیریت کی اطلاع دی۔ اسے رات میں پتا چل گیا تھا اور اس نے اسپتال کال کی تھی لیکن کارل آپریشن کے بعد سو رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر رونی کو قرار آیا۔ کارل نے اس سے کہا۔ "میں یہاں کے معاملات نمٹاتے ہی گھر آتا ہوں۔"

"میں اور بچے شدت سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" رونی نے بھرائی آواز میں کہا۔

"میں بھی تم لوگوں سے ملنے کے لیے بے تاب ہوں۔"

کارل نے اینڈریو کو جا کر دیکھا۔ اس کا آپریشن کامیاب رہا تھا لیکن اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ کارل نے اسے دیکھنے کے لیے آنے والے اینٹی نارکوٹکس کے مقامی چیف سے کیس کے بارے میں پوچھا۔ "گرفتار ہونے والوں نے زبان کھولی؟"

"ہمارے لوگ کام کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کل تک گرٹ کے وارنٹ نکل آئیں اور میں خصوصی طور پر تمہارا شکریہ کرنا چاہتا ہوں۔ کل رات تم نے اکیلے ہی ان آٹھ اسمگلروں کو روک کر شاندار کارنامہ انجام دیا ہے، اگر تم ذرا بھی ڈھیل دیتے تو وہ منشیات سمیت نکل جاتے۔ ملک کی تاریخ میں آج تک اتنی بڑی مقدار میں منشیات نہیں پکڑی گئی ہے اور اس کا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے۔"

"نہیں، اس کا کریڈٹ اینڈریو کو جاتا ہے جس نے میری جان بچاتے ہوئے خود کو زخمی کر لیا۔"

"اینڈریو ہماری فورس کا ایک اثاثہ ہے اور ہم سب اس پر فخر کرتے ہیں۔" چیف نے کہا۔ "جہاں تک تمہاری خدمات کا تعلق ہے تو جلد میرا محکمہ تحریری طور پر اس کا اعتراف کرے گا۔"

اینڈریو کو شام تک ہوش آیا تھا کارل اس وقت تک اس کے پاس ہی بیٹھا رہا۔ اس نے آنکھیں کھول کر کارل کو دیکھا اور مسکرا دیا۔ کارل بے تابی سے اس پر جھک گیا۔ "اب کیسے ہو دوست؟"

"اچھا ہوں، میں بچ گیا ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں خدا کا شکر ہے تم بچ گئے لیکن تم نے اچھا نہیں کیا مجھے بچانے کے لیے خود کو زخمی کر لیا۔"

اینڈریو کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ "تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے۔ تمہارے اتنے سارے چاہنے والے ہیں۔"

"تمہارے بھی چاہنے والے ہیں۔"

"نہیں، میرا ایسا کوئی چاہنے والا نہیں ہے۔" اینڈریو کے لہجے میں مایوسی آ گئی۔ "پھر تم میری ذمے داری تھے اس لیے میں نے تمہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔ بس مجھے ہیلی کاپٹر سے اتر کر آنے میں دیر لگی۔"

"ایسا نہیں ہے، میں اور تمہارے ساتھی تمہیں بہت چاہتے ہیں، صبح سے وہ بار بار آ کر دیکھ رہے ہیں۔"

"ہاں، ان کے بارے میں تم کہہ سکتے ہو۔" اینڈریو پھیکے انداز میں مسکرایا۔ "لیکن میریا کے بارے میں تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔"

"اس کو اطلاع کر دی گئی ہے۔"

"لیکن وہ آئے گی نہیں۔" اینڈریو نے کہا۔ "خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ آپریشن کا کیا بنا؟"

"منشیات کی کھیپ ہمارے ہاتھ میں ہے اور چار زندہ مجرم بھی۔ اگرچہ مجھے تفصیلات نہیں معلوم لیکن ایسا لگ رہا ہے انہوں نے انکشافات اور اعترافات کیے ہیں، آج کل میں گرٹ کے وارنٹ بھی نکل جائیں گے۔"

اس دوران میں ڈاکٹر آ گئے اور انہوں نے اینڈریو کا معائنہ کیا اور اس کی حالت کو تسلی بخش قرار دیا لیکن ساتھ ہی اس سے کسی کے ملنے جلنے پر پابندی لگا دی۔ "اسے کم سے کم چوبیس گھنٹے آرام کی اشد ضرورت ہے۔"

"اوکے۔" کارل کھڑا ہو گیا۔ "اب میں بھی آرام کروں گا اور جانے سے پہلے ایک بار تم سے ضرور مل کر جاؤں گا۔"

"میں انتظار کروں گا۔" اینڈریو بولا۔

کارل کمرے سے نکل رہا تھا کہ ایک جوان اور دل کش عورت اندر آئی۔ وہ اینڈریو کی طرف لپکی تھی۔ "اینڈی۔۔۔ میری جان کیسے ہو تم؟"

"میریا۔" اینڈریو کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"جیسے ہی تمہارے زخمی ہونے کی خبر سنی، میں چل پڑی تھی۔ ابھی یہاں پہنچی ہوں۔" وہ اس کے چہرے پر پیار کرتے ہوئے بولی۔ "آئی لو یو۔"

"ریئلی۔"

"یس آئی لو یو۔" میریا کے عملی اظہار پر اینڈریو کے اداس ہو جانے والے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ سچی اور اصلی مسکراہٹ۔ کارل اور دیگر لوگ کمرے سے نکل آئے۔ کارل نے دل میں دعا کی کہ میریا کی یہ محبت لمحاتی نہ ہو بلکہ ہمیشہ قائم رہے۔ اس لمحے اسے شدت سے رونی اور بچے یاد آنے لگے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جیسے ہی ڈاکٹروں نے اسے چھٹی دی، وہ گھر کی طرف روانہ ہو جائے گا۔

سرورق کے رنگ

تاوان

کاشف زبیر

پہلا رنگ

کائنات میں زندگی اپنے فطری تسلسل اور ایک قاعدے کے تحت رواں رہتی ہے... ایک وجود سے دوسرا وجود جنم لیتا ہے... اس طرح حیاتِ نو کا عرق جسم و جاں کو متحرک رکھتا ہے... چیزیں اپنا وجود کھو دیتی ہیں... لیکن زندگی کا سفر جاری و ساری رہتا ہے... تنہا انسان کی ذات بھی ایک کائنات ہے... اپنی ذات کی تلاش میں سرگرداں نوجوان کی جدوجہد... کائنات کی رنگینی و رعنائی کو چھوڑ کر وہ زندگی کے پھیلاؤ... تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں بہت کچھ جان لینے کا عزمِ صمیم رکھتا تھا...

جانی انجانی منزلیں سر کرنے کی خواہش میں اک نئی دنیا پا لینے والے شخص کی روداد حیات

اکتوبر کا آخر ہمیشہ خوش گوار ہوتا ہے۔ درختوں سے گھری اس نیم کمرشل اسٹریٹ پر یہ چھوٹا سا آئس کریم پارلر عام طور سے شام کے وقت خوب چلتا تھا۔ آنے والوں میں وہ دونوں بھی شامل تھے۔ لڑکی بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ اس نے گھٹنوں تک گلابی فراک پہن رکھی تھی اور نیچے نیلے رنگ کا چست پاجامہ تھا۔ مرد تر و تازہ لیکن سنجیدہ مزاج لگ رہا تھا۔ وہ متانت سے مسکرا رہا تھا اور لڑکی کی خوشی اور جوش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ باپ بیٹی تھے۔

"آپ کون سی آئس کریم لیں گی؟" باپ نے محبت سے پوچھا۔

www.kahopakistan.com

"وینیلا ود چاکلیٹ کرنچ۔" لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔ اس کے جسم میں جیسے پارا بھرا ہوا تھا۔

آدمی نے بیٹی کی پسند سے آئس کریم کا آرڈر دیا، اس نے اپنے لیے بھی آئس کریم منگوائی تھی۔ وہ بولتی تو اس کے انداز سے خوشی چھلکتی تھی۔ مرد اسے محبت سے دیکھ رہا تھا۔ آئس کریم آ گئی اور وہ دونوں آئس کریم کھانے لگے۔ اچانک آدمی کو بے چینی سی ہوئی۔ اس نے آس پاس دیکھا مگر اسے کوئی خاص چیز یا فرد نظر نہیں آیا مگر اس کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ جب اسے ایسی بے چینی ہوتی ہے تو کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کس طرح پتا چل جاتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے لیکن وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ جب اسے یوں بے چینی محسوس ہوتی تھی تو کوئی ناخوش گوار واقعہ ضرور پیش آتا تھا۔ اس نے بیٹی سے کہا۔

"رمشا! جلدی کرو۔"

بیٹی حیران ہوئی... اس نے احتجاج کیا۔ "پاپا! ہم ابھی تو آئے ہیں..."

"ہاں۔" آدمی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیٹی کو کس طرح سمجھائے۔ وہ ایک ہفتے سے آئس کریم کھانے کی ضد کر رہی تھی اور اسے آج کے دن فرصت ملی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی خواہش پوری کر سکے۔ اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اسی لمحے لڑکی کے ہاتھ سے آئس کریم کا چمچ سلپ ہوا اور اس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو کپ ہی میز سے نیچے جا گرا۔ وہ بے ساختہ کپ اٹھانے کے لیے جھکا۔ جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ کپ خراب ہو گیا ہے، وہ سیدھا ہوا۔ تب اس نے پہلی بار اس شخص کو دیکھا جو ان کی میز کے بالکل پاس کھڑا تھا۔ وہ ہلکی مونچھوں اور پیچھے کی طرف اٹھے بالوں والا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور سرد تاثر تھا۔ وہ یک ٹک رمشا کو دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی آدمی کی بے چینی مزید بڑھ گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتا یا پوچھتا، اس شخص کا ہاتھ بلند ہوا اور تب اس نے پہلی بار دیکھا۔ آنے والے کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔ اس کا رخ رمشا کی طرف تھا۔

اس کے بعد جو ہوا، وہ اسے کسی سلوموشن فلم کا سین لگا۔ ریوالور سے شعلہ نکلا۔ اسے آواز ہلکی اور موٹی سی آئی تھی۔ ریوالور کا چیمبر گھوما اور استعمال ہونے والے بلٹ کا خالی خول باہر گرا۔ پھر دوسرا شعلہ نکلا اور چیمبر پھر گھوما۔ تیسری بار شعلہ نکلا اور آواز آئی۔ وہ اٹھنے کی کوشش میں کرسی سے الجھ کر زمین پر جا گرا۔ اس شخص نے اسے دیکھا اور ریوالور کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا اگلا شکار وہی ہو گا۔ اس کا جسم تن گیا، وہ گولی کھانے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا لیکن اس شخص نے اچانک ریوالور کا رخ موڑا اور اس کی نال اپنی کنپٹی سے لگاتے ہوئے زیرلب بولا۔

"مجھے معاف کر دینا۔"

یہ کہتے ہی اس نے گولی چلا دی اور زمین پر گر گیا۔ وہ لرزتا ہوا زمین سے اٹھا اور اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو کرسی پر کسی تڑمڑ جانے والی گڑیا کی طرح پڑی تھی۔

☆☆☆

"میں ہی کیوں... صرف میں ہی کیوں؟" وہ اتنا بڑا آدمی بچوں کی طرح سسک سسک کر رو رہا تھا۔ آخر اس نے اپنی حالت پر قابو پایا اور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس اتنی بڑی دنیا میں کروڑوں لوگ ہیں... تو صرف میں کیوں... صرف میں کیوں... شاہ صاحب؟"

سفیر احمد شاہ نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ سفیر احمد بزنس مین تھے اور ان کا کاروبار دنیا کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ چھوٹی... آنکھوں اور کسی قدر کھردرے نقوش کے آدمی تھے لیکن ان کے جاننے والے جانتے تھے کہ وہ اندر سے بہت نرم خو ہیں۔ اس سے ان کا تعلق مرشد اور مرید کا سا تھا۔ اگرچہ یہ روایتی مرشد اور مرید کے تصور سے بھی دور تھا۔ وہ نرمی سے بولے۔ "کیا تم اللہ کی مصلحت سے منکر ہو؟"

وہ کانپ اٹھا۔ "بالکل بھی نہیں شاہ صاحب۔"

"تب یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ اس کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔"

"شاہ صاحب! وہ صرف نو سال کی بچی تھی۔" اس نے فریاد کی۔

"اللہ کے نزدیک ہر انسان ایک جیسا ہے... چاہے وہ نو سال کا ہو یا نوے سال کا۔" شاہ صاحب بولے۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے رومال سے چہرہ صاف کیا۔ "لیکن مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا۔"

"بات یہ ہے کہ تم جانتے بہت ہو لیکن مانتے نہیں ہو۔" شاہ صاحب نے گویا اس کی خامی بیان کی۔ "یاد رکھو، انسان کی اصل کمی لاعلمی نہیں ہے بلکہ اس کی اصل کمی سب کچھ جان لینے کے باوجود نہ ماننا ہے۔ یہ نہ ماننا ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ شیطان سے زیادہ اللہ کے نزدیک کون تھا لیکن اس کی ایک "انکار" نے اسے مردود کر دیا۔"

"شاہ صاحب! میں یہ سب جانتا ہوں۔" اس نے بے چینی سے کہا۔

"تب تم مان کیوں نہیں لیتے... راضی بہ رضا کیوں نہیں ہو جاتے؟"

اس نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔ "میرا دل صبر کے لیے آمادہ نہیں ہے۔"

"اس نے اپنے ان بندوں کے لیے بہت بڑا اجر رکھا ہے جو اس کی دی ہوئی آزمائشوں پر صبر کرتے ہیں اور زبان پر شکوہ نہیں لاتے۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں... لیکن آپ بھی جانتے ہیں میرے پاس سوائے ایک بیٹی کے اور کچھ نہیں تھا اور اب وہ بھی نہیں ہے۔ پھر اس طرح سے اس کی زندگی چھن جانا... وہ بیمار نہیں تھی، کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ اس شخص نے اسے ہی کیوں نشانہ بنایا؟ اسے میری بیٹی سے کیا پرخاش تھی؟"

"تم اس کی وجوہات جاننے کی کوشش کر سکتے ہو۔ تمہارے ذرائع وسیع ہیں۔" سفیر احمد نے اسے مشورہ دیا۔ یہ خیال اسے بھی آیا تھا مگر اس کے دل کو نہیں لگا تھا۔

"وجوہات جاننے سے کیا مجھے میری بیٹی واپس مل جائے گی؟"

"نہیں، میرے دوست... وہ اب کبھی واپس نہیں ملے گی۔" سفیر احمد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "تمہیں اس کی موت کو قبول کرنا پڑے گا۔"

شاہ صاحب کے الفاظ اسے پتھر کی طرح لگے۔ وہ ساکت ہو گیا پھر خاموشی سے اٹھ کر ان کے گھر سے نکل آیا۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ان کے پاس سے وہ تشنہ اور بے سکون ہو کر اٹھا تھا ورنہ شاہ صاحب کا ساتھ ہمیشہ اسے سکون اور سیری کی کیفیت عطا کرتا تھا۔

☆☆☆

صبیح سلطان کی مصروفیات کا آغاز شام کو ہوتا تھا۔ وہ ایک صحافی اور ٹی وی اینکر پرسن تھا۔ رات نو بجے اس کا لائیو ٹاک شو نشر ہوتا تھا اور عوام میں بے حد مقبول تھا۔ صبیح تقریباً چالیس برس کا تھا لیکن دیکھنے میں پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ اس کے اچھے نقوش اور سیاہ گھنے بال اسے ایک متاثر کن شخصیت بناتے تھے۔ دس سال پہلے اس نے شادی کی تھی اور اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔

ریحانہ سے اس کا مزاج نہیں ملتا تھا اور یہ شادی ان کی امیدوں کے برخلاف ثابت ہوئی تھی۔ ریحانہ سوشیالوجی میں ایم اے کرنے کے بعد ایک این جی او سے منسلک تھی جب اس کی ملاقات صبیح سے ہوئی اور اتفاق سے ان کی خاندانی واقفیت نکل آئی۔ ان کے والد آپس میں کلاس فیلو رہے تھے

حسنِ انتخاب

ایک صاحب دوست سے کہنے لگے۔ "میری بیوی نے الٹی میٹم دے رکھا تھا کہ میں تاش کھیلنا چھوڑ دوں یا وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

دوست نے کہا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔"

"ہاں۔" وہ صاحب بولے۔ "بیوی کے چلے جانے کا دکھ تو مجھے بھی ہے۔"

کراچی سے حمیرا اقبال کا انتخاب

اور ان کا رابطہ طالب علمی کے بعد منقطع ہو گیا تھا۔ جب صبیح نے ریحانہ کے باپ سے پہلی ملاقات میں اپنا خاندانی تعارف کرایا تو وہ چونک گئے اور یوں برسوں سے ٹوٹا ہوا رابطہ پھر سے بحال ہو گیا۔ اگرچہ صبیح اور ریحانہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن انہوں نے شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا مگر ان کے والدین نے اس بارے میں نہ صرف سوچا بلکہ انہوں نے انتظار کیے بغیر کہ ان کی اولاد ان سے اس بارے میں کچھ کہے، از خود رشتہ بھی طے کر دیا۔ اتفاق سے دونوں ہی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ اس لیے ان کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ ریحانہ کے والد ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے اور صبیح کے والد ایک چھوٹے درجے کے بزنس مین تھے۔ ان دونوں کے پاس اتنا پیسا تھا کہ اپنے ارمان نکال سکیں۔

لیکن شادی کے فوراً بعد ریحانہ اور صبیح نے محسوس کر لیا کہ انہوں نے ایک غلط فیصلے پر عجلت میں ہاں کر دی۔ ان کے مزاج نہیں ملتے تھے اور زندگی کے حوالے سے ان کے بنیادی نظریات میں اختلاف تھا۔ ریحانہ کے خیال میں اس کی بالکل ویسی ہی شخصیت تھی جیسی کہ صبیح کی تھی۔ وہ بھی صبح دفتر جانے اور شام کو وہاں سے آنے اور کمانے کی حق دار تھی۔ گھر میں اس کی اور صبیح کی ذمے داری برابر تھی۔ جبکہ صبیح بہ ظاہر ماڈرن ہوتے ہوئے بھی ایک قدامت پرست مرد تھا جس کے خیال میں عورت کا صحیح مقام اس کا گھر ہوتا ہے۔ شروع میں یہ اختلاف ہلکا رہا لیکن جب ایک سال بعد رمشا نے جنم لیا تو یہ اختلاف شدت اختیار کرنے لگا کیونکہ رمشا کے آنے کے بعد وہ اس کی ذمے داریاں اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے رمشا کے لیے آیا رکھ دی تھی اور وہ شام کو گھر آنے کے بعد اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ یہی صورت حال صبیح کے ساتھ تھی۔ وہ صبح ذرا دیر سے جاتا تھا لیکن اس کی

www.kahopakistan.com

واپسی رات گئے ہوتی تھی اور درمیان میں چار پانچ گھنٹے رمشا مکمل طور پر آیا کے رحم و کرم پر ہوتی تھی۔ اس وقت صبیح اپنا کیریئر بنانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ ملک میں الیکٹرانک میڈیا آنے کے بعد صحافیوں کے درمیان ٹی وی پر جگہ بنانے کے لیے دوڑ جاری تھی۔ اگرچہ صبیح شروع میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا تھا لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے کالموں اور کتابوں کی مدد سے ملک بھر میں اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقہ پیدا کرلیا تھا۔

ایک طرف گھر کی پریشانیاں تھیں تو دوسری طرف وہ ایک میڈیا گروپ کے ساتھ شامل ہونے پر غور کر رہا تھا کیونکہ اس میڈیا گروپ نے اپنا ٹی وی چینل لانچ کر دیا تھا اور وہ بڑی تیزی سے لوگوں میں اپنا مقام بنا رہا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جس میڈیا گروپ نے صبیح سلطان کو شہرت دی تھی، اسے چھوڑنا پڑتا۔ صبیح اسی کشمکش میں تھا کہ کیا کرے کیونکہ دوسرے میڈیا گروپ کا اخبار اگرچہ اچھی اشاعت رکھتا تھا لیکن وہ پہلے والے میڈیا گروپ کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی دوسرے میڈیا گروپ کے مالک آغا صابر سے بات چیت جاری تھی۔ اصل میں وہ صبیح سلطان کا دوست تھا۔ آغا صابر ایک صنعت کار اور صبیح کا فین تھا لیکن اس کی پسند کی اصل وجہ یہ تھی کہ صبیح نے کبھی آغا کی دولت سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس رات وہ دیر سے گھر آیا تو اتفاق سے ریحانہ بھی اسی وقت آئی۔ بارہ بجے تک وہ گھر سے باہر تھی۔ صبیح حیران ہوا۔ اس نے ریحانہ سے کہا۔ ''تم اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟''

''میری این جی او بے گھر لوگوں کے لیے فنڈ نگ کر رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے اتنی دیر سے آنا ضروری نہیں تھا۔'' صبیح نے ناگواری سے کہا۔ ''تمہیں یہ سوچنا چاہیے کہ تمہاری ایک ہی بیٹی ہے اور اسے تمہاری ضرورت ہے۔''

''یہ تم بھی سوچ سکتے ہو۔'' ریحانہ نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم اتنی دیر سے کیوں گھر آتے ہو؟''

''تم جانتی ہو میرا پروفیشن کیا ہے؟'' صبیح کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''پروفیشن۔'' ریحانہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔ ''کیا صرف تمہیں کسی پروفیشن کا حق ہے؟''

''میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے حق ہے یا تمہیں حق نہیں ہے لیکن اس بچی کو تمہاری ضرورت ہے۔ باپ محبت کر سکتا ہے لیکن بچوں کی ضرورت صرف ماں پوری کرسکتی ہے۔''

''یہ تمہارا خیال ہے اور میرا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔''

اس رات ان کی ازدواجی زندگی کا پہلا اور آخری شدید جھگڑا ہوا اور اسی رات انہوں نے طے کرلیا کہ اب وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے اور جتنی جلدی ہو ان کو ایک دوسرے سے الگ ہو جانا چاہیے لیکن یہ علیحدگی اتنی جلدی عمل میں نہیں آئی۔ جب رمشا دو سال کی ہوگئی اور صبیح کی والدہ مستقل اس کے پاس آگئیں، تب ریحانہ اور صبیح میں علیحدگی ہوگئی۔ صبیح کے والد اس کی شادی کے دوسرے سال انتقال کر گئے تھے اور والدہ بھی صرف چار سال اور زندہ رہیں۔ ان کے انتقال کے وقت رمشا چھ سال کی تھی اور اس نے دادی کی جدائی کو بہت شدت سے محسوس کیا۔ ان دنوں صبیح بہت زیادہ مصروف تھا۔ اس کا حلقۂ احباب پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہوگیا تھا۔ بیرونِ ملک آنے جانے کا سلسلہ بھی بڑھتا جا رہا تھا اور اسے سال میں کئی بار بیرونِ ملک جانا پڑتا۔ پھر ملک میں مختلف شہروں کے دورے ہوتے تھے۔ یوں اس کا آدھا سال شہر سے باہر ہی گزرتا تھا اور جب وہ شہر میں ہوتا، تب بھی اسے گھر آنے کا موقع کم ملتا تھا۔ آدھے سال وہ دن رات میں چند گھنٹے کے لیے گھر آتا تو اس میں وہ اپنی بیٹی کو وقت کہاں سے دیتا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بیٹی سے محبت نہیں کرتا تھا یا اسے اس کا خیال نہیں آتا تھا۔ وہ بیٹی کا دیوانہ تھا۔ گھر میں آتے ہی وہ سیدھا اس کے کمرے کا رخ کرتا۔ جب تک وہ اسے جی بھر کر پیار نہیں کرلیتا، اسے چین نہیں ملتا تھا۔ اس کے لیے زندگی کے خوش گوار ترین لمحات وہ ہوتے جو وہ اپنی بیٹی کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا لیکن اس کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں نے اسے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ وہ کوشش کے باوجود رمشا کے لیے وقت نہیں نکال پاتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دادی کے بعد وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگی ہے۔ جو آیا ریحانہ کے وقت سے رمشا کی دیکھ بھال کر رہی تھی، اسے صبیح نے ایک واقعے کے بعد نکال دیا تھا۔ وہ شام کو رمشا کو پارک لے جاتی تھی اور ایک بار اس کی نظر بچا کر رمشا سڑک پر چلی گئی جہاں ایک تیز رفتار کار شاید اسے کچل دیتی لیکن کسی شخص نے اسے بچالیا اور صبیح نے اس واقعے کے بعد ملازمہ کو نکال دیا۔

پھر خوش قسمتی سے اسے ایک اچھی ملازمہ مل گئی جو رمشا کا پورا خیال رکھتی تھی لیکن وہ اس کے لیے رشتوں کا نعم البدل نہیں ہوسکتی تھی۔ ماں کو مہینے دو مہینے میں ایک بار اس کا خیال آتا تھا اور وہ اس سے ملنے چلی آتی۔ رمشا کو ماں سے لگاؤ نہیں تھا اور وہ اس سے زیادہ گرم جوشی سے نہیں ملتی تھی۔ کبھی کبھار تو اس کا رویہ سرد مہری کی حد تک پہنچ جاتا۔ ریحانہ کو بھی اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ اگر لگاؤ ہوتا تو وہ اسے چھوڑ کر کیوں جاتی؟ وہ اپنی نئی زندگی میں خوش تھی۔

رمشا کئی دن سے اس سے باہر چل کر آئس کریم کھانے کا کہہ رہی تھی اور صبیح اسے ٹال رہا تھا کیونکہ ان دنوں بعض سرگرم سیاسی معاملات کی وجہ سے وہ صبح سے لے کر شام تک مصروف رہتا تھا۔ یہ معاملات ایسے تھے کہ ان کو چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ سارے میڈیا کی توجہ کا مرکز تھے۔ اگر وہ انہیں توجہ نہ دیتا تو وہ دوسرے اینکر پرسنز سے پیچھے رہ جاتا اور اس فیلڈ میں پیچھے رہنے کا کوئی تصور نہیں تھا... کیونکہ اینکر پرسن کے پیچھے رہنے کا مطلب تھا کہ اس کا ٹی وی چینل پیچھے رہ جائے گا اور یہ بات چینل مالکان کو کسی صورت گوارا نہیں تھی۔ وہ اینکر پرسن کو اسی بات کی بھاری بھرکم تنخواہ اور دوسری مراعات دیتے تھے کہ وہ عوام کو چینل کی طرف متوجہ رکھیں۔

اس روز اس کی ایک اہم سرکاری شخصیت سے ملاقات طے تھی۔ اس انٹرویو میں وہ بعض اہم نکات اٹھانے والا تھا اور شاید اسی وجہ سے سرکاری شخصیت نے اچانک انٹرویو ملتوی کر دیا اور اس نے صبیح کو فون پر اس کی اطلاع بھی کر دی تھی۔ یوں صبیح کو چند گھنٹے میسر آگئے اور اس نے رمشا کو سرپرائز دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اچانک ہی گھر پہنچ گیا اور اس نے رمشا کو تیار ہونے کو کہا تو وہ سمجھ گئی۔

''پاپا! ہم آئس کریم کھانے جا رہے ہیں؟''

''بالکل پاپا کی جان۔'' اس نے کہا۔ ''بس آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔''

رمشا تیار ہو کر آئی تو وہ گھر سے نکلے۔ آئس کریم پارلر ان کے گھر سے کچھ ہی دور تھا۔ صبیح کو خیال آیا تو اس نے رمشا سے کہا۔ ''بیٹا! آپ کے لیے فریج میں بے شمار آئس کریم موجود ہوتی ہیں تو آپ نے باہر کھانے کی فرمائش کیوں کی؟''

رمشا نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے اپنے ذہین باپ کی ناسمجھی پر افسوس ہوا ہو۔ ''پاپا! آپ کے ساتھ کے لیے۔'' اس نے جواب دیا۔

صبیح ہنسا۔ ''میں جانتا ہوں۔''

''پھر بھی پوچھ رہے ہیں؟''

''ہاں کیونکہ مجھے یہ سننا اچھا لگتا ہے کہ میری گڑیا میرے ساتھ آئس کریم کھانا چاہتی ہے۔''

وہ چلتے چلتے اس کے بازو سے لپٹ گئی۔ ''پاپا! مجھے آپ کے ساتھ کہیں جانا بہت اچھا لگتا ہے۔ کاش! آپ ہمیشہ میرے پاس رہا کریں۔''

''میری بھی یہی خواہش ہے۔'' صبیح نے سرد آہ بھری۔ ''لیکن بیٹا، زندگی میں انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔''

رمشا چنچل انداز میں ہنسی۔ ''لیکن ابھی تو میری خواہش پوری ہوگئی۔ پتا ہے کل رات میں نے اللہ تعالیٰ سے بہت ساری دعا کی تھی کہ آج میرے پاپا کو چھٹی مل جائے اور وہ مجھے آئس کریم کھلانے کے لیے لے جائیں۔''

وہ مسکرایا۔ ''آپ کی دعا قبول ہوئی۔''

اور پندرہ منٹ بعد وہ رمشا کے بے جان وجود کو گود میں لیے سوچ رہا تھا کہ کاش یہ دعا قبول نہ ہوتی۔

☆☆☆

وہ سر تھامے بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس آدمی کی پیش گوئی درست ثابت ہوگی جو ایک بار اس کے بچپن میں اس کے گھر آیا تھا۔ اس فقیر نما شخص نے جب صبیح کو دیکھا تو اس سے کچھ دیر کے لیے الگ ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس وقت صبیح صرف چار برس کا تھا۔ اس کے ماں باپ ڈر گئے ..... وہ تو اس فقیر کو کھانا کھلانا چاہتے تھے اور وہ ان کے بچے سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ صبیح کے والد شاید انکار کر دیتے لیکن اس کی والدہ فقیروں کو اچھا سمجھتی تھیں۔ انہوں نے شوہر کو قائل کرلیا کہ اگر فقیر گھر کے ایک کمرے میں صبیح کو دیکھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ بھی آس پاس ہوں گے۔ یوں صبیح کو اس فقیر سے علیحدگی میں ملاقات کا موقع مل گیا۔ اس لمبے تڑنگے اور کالا لباس پہنے فقیر نے صبیح کو غور سے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کا معائنہ کیا۔ پھر اس کی قمیص پشت سے اٹھا کر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو انگلیوں سے ٹٹولنے لگا پھر اس نے نہ جانے کیا کیا کہ صبیح کو لگا اس کے جسم میں کوئی چیز چمکی ہو اور ایک نامعلوم درد کی لہر سی اٹھی ہو لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ وہ دم بہ خود سا رہ گیا۔ فقیر نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''پُتر! میری بات یاد رکھنا... تُو زندگی میں بہت کچھ حیران کرنے والا دیکھے گا۔ تو بہت کامیابی حاصل کرے گا اور لوگ تیری عقل کی تعریف کریں گے لیکن تیری عقل تیرے بُرے انجام کی وجہ بنے گی۔ جب کبھی بُرا وقت آئے، اس سے لڑنا مت... اس کے آگے ہتھیار ڈال دینا۔''

فقیر یہ کہہ کر اٹھا اور بغیر کسی سے بات کیے ان کے گھر سے نکل گیا۔ صبیح کے ماں باپ بے قرار ہو کر اس کی طرف

www.kahopakistan.com

لیکے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا بچہ ٹھیک ہے بس کچھ گم صم سا ہوگیا تھا۔ صبیح نے اپنے ماں باپ کو نہیں بتایا کہ اس فقیر نے اس سے کیا کہا تھا لیکن اس کے الفاظ لفظ بہ لفظ اسے یاد رہے تھے۔ وہ اس کے ذہن کے پردے پر جیسے نقش ہو گئے تھے۔ اس پر اس سے بُرا وقت کبھی نہیں آیا اور وہ اس کے آگے ہتھیار ڈالنے کے بجائے اس سے لڑ رہا تھا۔ اس کا ذہن ابھی تک ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس کے ساتھ یہ سانحہ ہو چکا ہے۔ وہ جب اس بارے میں سوچتا، اس کے ذہن میں شدت سے سوال اٹھتا کیوں؟ اس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟... جبکہ اس نے کسی کا بُرا نہیں چاہا۔

رمشا کی تدفین پر اس نے غم سے نڈھال ریحانہ کو دیکھا۔ وہ پہلے ہی الگ ہو چکے تھے اور اب ان کے درمیان واحد مشترک ہستی بھی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو روتا دیکھ کر رہ گئے۔ رمشا کے بعد اس کی آیا بھی ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔ تب سے اس کا گھر اکیلا ہو گیا تھا۔ اب صرف ایک ملازم ارشد تھا جو گھر کی دیکھ بھال اور دوسرے ضروری کام کرتا تھا لیکن اسے کھانا بنانا نہیں آتا تھا۔ صبیح کھانا باہر ہی کھاتا.... ویسے بھی جب گھر میں کھانا بنتا تھا، تب بھی اسے کھانے کا موقع کم ملتا تھا۔ عجیب بات تھی کہ اب وہ زیادہ تر گھر پر وقت گزارتا۔ اس کی پیشہ ورانہ مصروفیات جاری تھیں لیکن شہر سے باہر جانا موقوف ہو گیا تھا۔ دفتر کے علاوہ وہ سارا دن گھر پر ہی رہتا تھا اور سوچتا کہ وہ پہلے ہی اپنی یہ مصروفیات چھوڑ کر کچھ وقت اپنی بیٹی کے ساتھ گزار لیتا... لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ رمشا اسے یوں اچانک چھوڑ کر چلی جائے گی۔ جب وہ سوچتا تو اسے لگتا ابھی تو بہت وقت ہے۔ جب وہ اپنے کاموں سے فارغ ہو جائے گا تو اپنی بیٹی کے ساتھ بہت وقت گزارے گا۔ اب بیٹی نہیں رہی تھی اور اسے وہ ساری جدوجہد اور بھاگ دوڑ فضول لگ رہی تھی۔ یہ سب بے کار تھا اس کے لیے... اصل اہمیت اس کی بیٹی کی تھی اور اب وہی اس کے پاس نہیں رہی تھی۔ جب وہ چلی گئی، تب اس کی اہمیت سمجھ میں آ رہی تھی۔

لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا اور سامنے رکھی شیشی اٹھا کر منہ میں انڈیل لی۔ درجنوں کے حساب سے گولیاں اس کے منہ میں بھر گئیں۔ جنہیں وہ چبا چبا کر حلق سے اتار رہا تھا۔ اس کے ساتھ عجیب مسئلہ تھا۔ وہ انڈا سالم نگل سکتا تھا لیکن دوائی کے نام پر چھوٹی سی گولی بھی اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ چاہے وہ ڈھیروں پانی کے ساتھ کیوں نہ کھانے کی کوشش کرے۔ جب تک وہ اسے چباتا نہیں تھا، وہ اس کے حلق سے نیچے نہیں جاتی تھی۔ اس وقت تو ڈھیروں گولیاں اس کے منہ میں تھیں۔ وہ ان کا کسیلا ذائقہ نظر انداز کرتے ہوئے انہیں چبا رہا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ تمام گولیاں چبالی ہیں تو وہ پانی کے ساتھ ان کو حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ گولیاں نیچے اتر گئیں لیکن ان کا کسیلا ذائقہ منہ میں باقی تھا۔ اب اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ انتظار کر رہا تھا اور جب دھند نے اس کے ذہن پر یلغار کی تو وہ سمجھ گیا کہ وقت قریب آ گیا ہے۔ وہ صوفے پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا اس لیے اسے امید تھی کہ وہ سکون سے بنا کسی مداخلت کے مر سکے گا۔

کچھ دیر بعد ارشد گھر میں داخل ہوا تو اس نے صوفے پر صبیح کو بے ہوش پایا۔ میز پر خواب آور گولیوں کی خالی شیشی تھی اس لیے اسے معاملہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس نے فوری طور پر ایمبولینس سروس کو کال کی اور یہ بتایا کہ اس کے صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ ایمبولینس دس منٹ میں وہاں موجود تھی اور ارشد اس دوران میں صبیح کے ٹی وی چینل کے مالک کو کال کر چکا تھا۔ اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ اسے قریبی اسپتال لے جا رہا ہے۔ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے صبیح اسپتال میں تھا اور اس وقت اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کا معدہ واش کر دیا تھا لیکن خواب آور دوا کا اثر ہو چکا تھا۔ اس کا بلڈ پریشر اور دل کی دھڑکن مستقل گر رہی تھی۔ آئی سی یو میں ڈاکٹر اور دوسرا عملہ اس کی جان بچانے کی سر توڑ کوششیں کر رہا تھا۔

''پندرہ۔'' اٹینڈنٹ نے پکار کر کہا۔ ''دس... پانچ...''

اور پھر دل کی دھڑکن ظاہر کرنے والی لائن سیدھی ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے مایوسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اٹینڈنٹ الیکٹرک شاک دینے والا آلہ گھسیٹ کر میز کے پاس لا رہے تھے۔ ایک ڈاکٹر نے آلہ اٹھایا، اس کا پیڈ نما حصہ سینے سے لگا کر رکھے ہوئے دل کو برقی جھٹکا دیا جاتا ہے تاکہ وہ پھر سے چل پڑے۔ ڈاکٹر نے اٹینڈنٹ سے کہا۔

''پاور ڈیڑھ سو واٹ کر دو۔''

''پاور ڈیڑھ سو واٹ۔'' اٹینڈنٹ نے کہا اور ڈاکٹر نے آلہ صبیح کے سینے سے لگا کر اسے شاکڈ دیا۔

☆☆☆

اس کے چاروں طرف گہری تاریکی اور خوف تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا مرنا ایسا ہوتا ہے؟ اگر یہ موت کے بعد کی زندگی ہے تو بہت خوف ناک ہے۔ وہاں سوائے تاریکی اور تنہائی کے کچھ نہیں تھا۔ وہ ہاتھ پھیلائے گھوم رہا تھا۔ کوئی چیز ملے... کوئی تو ہو جو اس تنہائی سے نجات دلائے لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ حد یہ کہ پیروں تلے زمین بھی نہیں تھی۔ وہاں محسوس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ ڈر گیا، وہ ایسی موت نہیں چاہتا تھا۔ اسے کچھ تو ملتا... بے شک سزا ملتی۔ اس نے خودکشی کی تھی اور اس کا ایمان تھا کہ خودکشی کرنے والے کو اللہ معاف نہیں کرتا... لیکن وہ خودکشی کرنے والے کو ایسی سزا دیتا ہے، اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ لرز گیا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ''نہیں... میرے اللہ! تو راضی ہو یا ناراض لیکن مجھ سے لاتعلق نہیں ہونا۔''

جیسے ہی اس نے دعا مکمل کی، اسے ایک طرف سے روشنی دکھائی دی۔ وہ اس طرف بڑھا۔ جیسے جیسے روشنی قریب آ رہی تھی، وہ سرنگ کی سی صورت اختیار کر رہی تھی۔ جب وہ اس سرنگ کے دہانے تک پہنچا تو اس کے دوسری طرف اسے رمشا نظر آئی۔ وہ بہت دور تھی لیکن بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ رمشا تھی، اس کی بیٹی... اور شاید اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھا لیکن سرنگ بہت طویل تھی۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا لیکن رمشا اور سرنگ کا دوسرا دہانہ اتنا ہی دور رہا۔ وہ بھاگنے لگا، وہ جلد از جلد رمشا تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کا اندر یوں بے تاب تھا جیسے ابھی اڑ کر بیٹی تک پہنچ جانا چاہتا ہو۔ وہ بیٹی جو اس سے چھن گئی تھی اور اب اس کے سامنے تھی۔ دوڑتے دوڑتے اچانک اسے جھٹکا لگا۔ اس کی رفتار کم ہونے لگی۔

☆☆☆

''پاور دو سو واٹ۔'' ڈاکٹر نے آلہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ پہلے جھٹکے نے دل پر کوئی اثر نہیں کیا تھا اٹینڈنٹ نے پاور بڑھا دیا۔

''پاور دو سو واٹ۔'' اس نے پکار کر کہا اور ڈاکٹر نے صبیح کے سینے سے لگاتے ہوئے آلے کو زور سے دبایا۔

☆☆☆

اس نے اس جھٹکے کے بعد سنبھل کر پھر دوڑنا چاہا لیکن دوسرا جھٹکا پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ وہ رک گیا، اس کی رفتار صفر ہو گئی تھی۔ اس نے فکرمندی سے سوچا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اس کی بیٹی اس کے سامنے ہے تو وہ اس تک کیوں نہیں جا پا رہا ہے۔ اس نے ہمت کر کے پھر آگے بڑھنا چاہا تو تیسرا جھٹکا لگا اور..... وہ واپس سرنگ کے داخلی دہانے کی طرف جانے لگا۔ اس نے چلا کر کہا۔

''نہیں، مجھے آگے جانے دو... وہاں میری بیٹی ہے۔ مجھے جانے دو۔''

مگر کوئی طاقت اسے بہت زور سے کھینچ رہی تھی اور وہ پھر اسی تاریکی میں آ گیا جہاں وہ کچھ دیر پہلے تھا۔ روشن سرنگ غائب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

دل بدستور بے حس و حرکت تھا۔ ڈاکٹر نے اٹینڈنٹ کی طرف دیکھا۔ ''پاور تین سو واٹ۔''

اس نے پاور تین سو واٹ کیا اور بولا۔ ''پاور تین سو واٹ۔''

ڈاکٹر نے اللہ کا نام لے صبیح کے سینے پر الیکٹرک پیڈ رکھے اور انہیں دبا دیا۔ اس کا فوری ردِعمل ہوا۔

دل چل پڑا تھا اور اس کی رفتار رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی اور دو منٹ کے اندر صبیح کے دل کی رفتار اور بلڈ پریشر خطرے کی حد سے باہر نکل آئے۔ آئی سی یو میں موجود لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ آج انہوں نے ایک اور جان بچالی تھی اور ان کو اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ کس کی جان تھی۔ ان کے لیے ہر جان ایک انسان کی جان ہوتی ہے۔

☆☆☆

صبیح کی آنکھوں کے سامنے بہت تیز روشنی تھی جو براہِ راست اس کی آنکھ کے پردے پر چبھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ روشنی کیسی ہے۔ اچانک ہی روشنی ہٹ گئی اور صبیح نے ایک اجنبی صورت دیکھی۔ اس نے سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔

''اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''میں کہاں ہوں؟'' صبیح نے آہستہ سے کہا۔ اس کا جسم اور دماغ ابھی تک سُن سی کیفیت میں تھے۔ روشنی ہٹ جانے کے باوجود اسے ڈاکٹر کے اطراف میں ایک روشنی دیتا ہالہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں میچ کر دوبارہ کھولیں لیکن ہالہ قائم تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی کیفیت بھانپ لی۔

''کیا آپ کو ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا؟''

''شاید۔'' اس نے زیرِلب کہا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

''آپ اسپتال میں ہیں اور آپ کی جان بچائی گئی ہے۔ آپ کے معدے سے خواب آور دوا کی اتنی مقدار نکلی ہے جو دو افراد کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہوتی۔'' ڈاکٹر نے اسے مطلع کیا۔ ''آپ کا دل رک گیا تھا اور اسے چلانے کے لیے الیکٹرک شاک دیے گئے۔''

'میں پھر بھی نہیں مرا؟' اس نے سوچا۔ اسے تاریکی، روشن سرنگ اور پھر رمشا یاد آئی جو اس سرنگ کے دوسرے

www.kahopakistan.com

دہانے پر تھی۔ کیا وہ سب خواب تھا یا وہ سچ مچ مر چکا تھا؟ اس نے بے خیالی میں کہا۔ ''تم لوگوں نے مجھے کیوں بچایا؟''

''کیونکہ انسان کی جان بچانا ہمارا فرض ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا اور اس کا شانہ تھپک کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ ساکت لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک لیڈی ڈاکٹر اندر آئی۔ اس کی عمر شاید پچیس یا چھبیس برس تھی۔ وہ آگے آئی۔

''ہیلو... کیا حال ہیں؟'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کی ڈاکٹر آئینہ ہوں۔''

''آئینہ۔'' اس نے زیرلب کہا۔ ''لیکن آپ میں میرا عکس تو نظر نہیں آرہا؟''

وہ پہلے حیران ہوئی پھر شرما گئی۔ حالانکہ صبیح کے لہجے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بنا کسی تاثر کے بات کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس وقت بھی پوری طرح ہوش میں نہ ہو۔ ڈاکٹر آئینہ نے اس سے کہا۔ ''آپ کے نظام پر خواب آور دوا کے اثرات پوری طرح ختم ہو گئے ہیں۔''

ڈاکٹر آئینہ نے کھڑکی سے پردہ ذرا سا سرکایا تو روشنی اندر آنے لگی۔

صبیح نے پوچھا۔ ''مجھے اسپتال کون لایا تھا؟''

''آپ کو ارشد نامی شخص لے کر آیا تھا۔'' وہ بولی۔ ''لیکن آپ کے تمام اخراجات مسٹر آغا ادا کر رہے ہیں جن کے چیمبل کے لیے آپ کام کرتے ہیں۔''

''آغا صاحب۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کوئی اور ملنے نہیں آیا مجھ سے؟''

''ہاں، ایک پولیس افسر ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''میں تو نہیں لیکن وہ ضرور پوچھے گا کہ...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی جسے صبیح نے مکمل کیا۔

''میں نے خودکشی کی کوشش کیوں کی؟''

''ہاں، وہ یہی پوچھے گا۔ ویسے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ آپ جیسا آدمی بھی خودکشی کی کوشش کر سکتا ہے۔''

''کیوں، میرے جیسا آدمی خودکشی کی کوشش کیوں نہیں کر سکتا؟''

''کیونکہ آپ سے تو لوگ جینے کا حوصلہ لیتے ہیں۔''

اسے تعجب ہوا۔ لوگ اس سے جینے کا حوصلہ لیتے تھے اور وہ خود حوصلہ ہار گیا تھا۔ شاید اسی کا نام زندگی ہے۔ جو سمجھا ہوتے ہیں وہی اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر آئینہ اس کا معائنہ کرنے لگی۔ اس کو چیک کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ابھی آپ کو ایک دن مزید کوئی چیز کھانے کے لیے نہیں دی جا سکتی۔ واش کے بعد معدہ کمزور حالت میں ہے۔''

ڈاکٹر آئینہ کے جانے کے بعد وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اسے وہ روشن ہالہ یاد آیا جو اس نے ڈاکٹر شہیر کے آس پاس دیکھا تھا۔ ایسا ہالہ اسے ڈاکٹر آئینہ کے آس پاس نظر نہیں آیا۔ شاید ہوش میں آنے کے باوجود اس کا دماغ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا اور اسے وہ چیزیں دکھا رہا تھا جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں تھا۔ اب اس کی حالت ٹھیک ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک پولیس افسر اس کے کمرے میں آیا۔ اس نے خانہ پُری کے انداز میں اس سے کچھ سوال کیے اور اسے تسلی دے کر واپس چلا گیا۔ شاید آغا صاحب نے پہلے ہی معاملہ سیٹ کر لیا تھا۔ ورنہ اصولاً اس وقت اسے پولیس کی حراست میں ہونا چاہیے تھا۔ ممکن ہے وہ اس ملک کا کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید اسے بچانے کی اتنی کوشش ہی نہ کی جاتی اور اگر وہ بچ جاتا تب بھی پولیس سے نہیں بچ سکتا تھا۔ لیکن اسے ان سب معاملات کی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ خواب آور دوا کے اثرات سے بچایا گیا تھا اس لیے ڈاکٹر اسے کسی قسم کی خواب آور یا مسکن دوا دینے سے گریز کر رہے تھے۔ اس لیے وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ ڈاکٹر آئینہ شام کو آف کرنے سے پہلے اسے ایک بار دیکھنے آئی.... وہ اس سے بات کر رہی تھی لیکن صبیح کا ذہن منتشر تھا۔

اگلے دن اسے ناشتے میں کھانے کے لیے ہلکی غذا دی گئی۔ ڈاکٹر آئینہ نے اسے بتایا کہ وہ جلد فارغ کر دیا جائے گا، شاید آج شام تک۔ وہ خاموشی سے لیٹا ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ملاقات کا وقت نہیں تھا اس لیے سفیر احمد شاہ کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ تیزی سے آگے بڑھے اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ ''شاہ صاحب! آپ نے کیوں زحمت کی؟''

وہ مسکرائے۔ ''بھول گئے... پہلی ملاقات کا معاہدہ کہ ہم دوست پہلے ہوں گے اور پیر و مرید بعد میں۔''

اسے سفیر احمد سے پہلی ملاقات یاد تھی۔ جب اس نے صحافت کے میدان..... میں قدم رکھا تو اسے مطالعے کا جنون ہو گیا۔ وہ دن رات پڑھتا تھا۔ اس میں موضوع کی کوئی تخصیص نہیں تھی، وہ سب کچھ پڑھتا تھا۔ پھر اسے روحانیت سے شوق ہوا۔ ہر وہ شخص جو بہت زیادہ پڑھتا ہو، اسے کبھی نہ کبھی شوق ضرور ہوتا ہے۔ وہ بھی اس دنیا کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اس دنیا کے بارے میں جاننے کا شوق اور جستجو اسے سفیر احمد شاہ تک لے آئی۔ وہ ہر قسم کے لوگوں سے ملا اور ان سے سیکھنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں اس نے سب سے زیادہ انسانوں کے بارے میں سیکھا کہ وہ لوگوں کو کس طرح اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ خود کو جو ظاہر کرتے ہیں، درحقیقت وہ اس کے بالکل برخلاف ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو خود کو دھوکا دیتے ہیں... لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا اندر باہر شیشے کی طرح ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور ان میں ایک سفیر احمد شاہ بھی تھے۔ بہ ظاہر وہ ایک کاروباری اور دنیا دار آدمی تھے لیکن ان کی باتیں بتاتی تھیں کہ وہ کسی اور دنیا کے آدمی ہیں۔ جب صبیح سلطان نے انہیں سمجھ لیا تو انہیں اپنا مرشد بنا لیا۔ وہ اس کی بیعت کی فرمائش پر ہنسے تھے لیکن صبیح پوری طرح سنجیدہ تھا۔

اس کی سنجیدگی دیکھ کر سفیر احمد بھی سنجیدہ ہو گئے۔ ''یار! تم چاہتے کیا ہو؟ ہم اچھے دوست ہیں اور بس۔''

''شاہ صاحب! میں جاننا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تم کیا جاننا چاہتے ہو؟'' شاہ صاحب نے استفسار کیا۔

''یہی کہ روحانی دنیا کیا ہوتی ہے... اس کا نظام کیسے چلتا ہے؟''

''دیکھو، اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میں اس دنیا کا کوئی اسپیشلسٹ ہوں تو تم غلطی پر ہو۔''

''لیکن آپ کچھ نہ کچھ تو جانتے ہوں گے؟''

''میں نے ارسطو کے الفاظ میں یہ جانا ہے کہ میں نے کچھ نہیں جانا ہے۔''

صبیح نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔ ''شاہ صاحب! آپ مجھ سے اس طرح جان نہیں چھڑا سکتے۔''

اس کے بہت اصرار پر سفیر احمد نے اسے ایک چھوٹا سا وظیفہ دیا۔ ''اسے پڑھتے رہو اور اس کے ساتھ نماز کی مکمل پابندی کرو تو اس کا اثر ہو گا۔''

''اثر کیا ہو گا؟''

''یہ کہنا مشکل ہے... لیکن روحانیت کے طالب علموں کو پہلی چیز دنیا کی آگاہی ملتی ہے۔ ان کو آنے والے وقت کا ادراک ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے تمہیں بھی ایسی کوئی چیز ملے۔ بہرحال، اسے پابندی سے پڑھنا، آگے بخشنے والا اللہ ہے۔''

صبیح نے یہ وظیفہ شروع کیا اور اس کے نتیجے میں اسے ہونے والے واقعات کا پیشگی احساس ہو جاتا تھا۔ اگر وہ واقعہ اچھا ہوتا تو کیفیت خوش گوار ہوتی... اور اگر ناخوش گوار ہوتا تو شدید بے چینی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس تجربے نے اسے مضطرب کر دیا۔ جب اس نے سفیر احمد سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے تصدیق کی۔ ''یہ اسی وظیفے کا اثر ہے اور اللہ کی طرف سے تمہیں یہ صلاحیت عطا ہوئی ہے۔''

''یہ کب تک رہے گی؟''

''جب تک تم وظیفہ پڑھتے رہو گے یا جب تک اللہ چاہے گا اور اصل بات یہی ہے۔''

صبیح اس تجربے سے خوف زدہ ہو گیا کیونکہ کئی بار ناخوش گوار واقعہ ہونے سے پہلے اسے شدید بے چینی کی کیفیت سے گزرنا پڑا۔ اس کیفیت کو برداشت کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اس تجربے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ روحانیت کا بحیثیت طالب علم مطالعہ ضرور کرے گا لیکن اب اسے براہِ راست استعمال کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ یہ بات اس نے شاہ صاحب سے بھی کہہ دی۔ انہوں نے کہا۔

''یار! اس فیلڈ میں صرف جاننا ٹھیک نہیں ہوتا... یا تو آپ عمل کے لیے جانیں یا انجان رہیں۔''

سفیر احمد کے خبردار کرنے کے باوجود اس نے اپنی ضد ترک نہیں کی۔ وہ جاننے پر مصر رہا۔ آج جب سفیر احمد اسپتال کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے تو وہ سوچ رہا تھا کہ اسے جاننے کا کیا فائدہ ہوا؟ کچھ بھی نہیں... اس کا طرزِ عمل تو ناواقفوں سے بھی گیا گزرا نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ سفیر احمد اسے لعنت ملامت کریں گے لیکن وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ وہ دو دن پہلے سنگاپور سے آئے تھے جہاں انہوں نے اسلامک سینٹر کے لیے لائبریری قائم کی تھی اور اس کا سارا خرچ خود برداشت کیا تھا۔ اس لائبریری میں وہاں کے لوگوں کو اسلام کے بارے میں بنیادی کتب حاصل کرنے میں آسانی رہتی۔

''آپ میرے بارے میں سن کر آئے ہیں؟'' صبیح نے پوچھا۔ اس نے ان کو تفصیل سے اپنی کیفیت سنائی۔

''اگر میں تمہارے بارے میں سن کر آیا ہوں تو اس میں کیا قباحت ہے؟''

''شاید میں اس قابل نہیں ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''یار! دوست صرف دوست ہوتا ہے، اس کے قابل ہونے یا نہ ہونے سے دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے گاؤں کا بچپن کا دوست فضل کمہار ہے۔ میں کہیں اور نکل گیا ہوں، وہ آج بھی کمہار ہے لیکن اس سے ہماری دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ وہ میرے لیے آج بھی فضلو ہے اور میں اس کے لیے سفیرا ہوں۔ ہمیں ایک دوسرے کی حیثیت سے کوئی غرض نہیں ہے۔''

''لیکن میں نے آپ کو مایوس ضرور کیا ہو گا؟'' صبیح

www.kahopakistan.com

نے اصرار کیا۔

''تم مجھے مایوس کرتے اگر تم مر جاتے لیکن تم زندہ ہو اور اس کا مطلب ہے کہ اللہ تم سے راضی ہے... تو میرے مایوس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

صبیح خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شاہ صاحب! اب میں کیا کروں؟''

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے؟''

''میرے پاس کرنے کو شاید کچھ نہیں رہا ہے۔''

''یہ سوچ ہے تمہاری... آدمی کے لیے ہر دن نیا ہوتا ہے اور اس دن میں کرنے کے لیے کچھ نیا ہوتا ہے۔ آدمی کو صرف دریافت کرنا ہوتا ہے کہ اس کے لیے نیا کیا ہے۔ کیا ہوش میں آنے کے بعد تمہیں کوئی نیا تجربہ نہیں ہوا؟''

سفیر احمد کی بات پر وہ چونک گیا۔ اسے ہوش میں آنے کے بعد کا تجربہ یاد آ گیا۔ اس نے سفیر احمد کو اس بارے میں بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں کسی اور شخص کے گرد یہ ہالہ نظر نہیں آیا؟''

''نہیں، مجھے صرف ڈاکٹر شبیر کے گرد یہ ہالہ نظر آیا تھا۔ ان کے علاوہ میں نے جتنے لوگوں کو دیکھا، کسی کے گرد یہ ہالہ نظر نہیں آیا۔''

''کیا تم نے دوبارہ ڈاکٹر شبیر کو دیکھا؟''

''نہیں، وہ بس ایک ہی بار آئے تھے۔'' صبیح نے بتایا۔ ''پھر میں نے انہیں نہیں دیکھا۔''

''صبیح! یہ بات مجھے غیر معمولی لگ رہی ہے۔ خاص طور سے تم نے بے ہوشی کے دوران میں اپنی جو کیفیت بتائی ہے، اسے مدِنظر رکھتے ہوئے اس ہالے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔''

''اس میں کیا غیر معمولی ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے، ہوش میں آنے کے بعد میری نظر نے پوری طرح کام نہ کیا ہو اور اس وجہ سے مجھے وہ ہالہ نظر آیا ہو۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے، اسے چیک کیا جا سکتا ہے۔ تم دوبارہ ڈاکٹر شبیر کو دیکھو اور اس کے گرد تمہیں ہالہ نظر نہ آئے تو سمجھ لینا کہ وہ نظر کی خرابی تھی۔''

''اور اگر نظر آئے تو؟''

''یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔'' سفیر احمد سنجیدہ ہو گئے۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ تم مزید کسی مشکل میں پڑنے والے ہو۔''

''مجھ پر جو گزر چکی ہے، اس سے زیادہ اور کیا گزرے گی؟''

''یہ سوچ ہے تمہاری... تم نہیں کہہ سکتے کہ آنے والے دنوں میں تم پر اور کیا مشکلیں پیش آئیں گی... لیکن ہو سکتا ہے ان مشکلوں کی وجہ سے تم پھر سے زندگی میں دلچسپی لینے لگو۔'' سفیر احمد نے کہا اور کھڑے ہو گئے۔ ''اب میں چلوں گا... ڈاکٹر نے مجھے صرف بیس منٹ رکنے کی اجازت دی ہے۔''

سفیر احمد کے جانے کے بعد وہ ان کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اسے یہ بات مضحکہ خیز لگی کہ وہ ... کسی مشکل میں پڑنے والا ہے۔ بھلا اس پر کیا مشکل آئے گی جو ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا ہو۔ دوپہر میں ڈاکٹر آئینہ آئی، وہ اس کا معائنہ کر رہی تھی اور خلافِ معمول کچھ سنجیدہ اور رنجیدہ تھی۔ صبیح نے اس سے کہا۔ ''کیا میں ڈاکٹر شبیر سے مل سکتا ہوں؟''

وہ چونکی۔ ''کیوں؟''

''میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

ڈاکٹر آئینہ نے اس کے بازو سے بلڈ پریشر اسٹرپ اتاری اور آہستہ سے بولی۔ ''آپ ان سے نہیں مل سکتے... گزشتہ روز ان کا انتقال ہو گیا۔''

صبیح ہل کر رہ گیا۔ ''کب... کیسے؟''

''آپ کا معائنہ کرنے کے بعد وہ آف کر کے چلے گئے تھے اور پھر وہ گھر نہیں پہنچے اور آج صبح ان کی لاش ایک ویران جگہ سے ملی ہے، کسی نے انہیں قتل کر دیا ہے۔''

''میرے خدا!'' صبیح نے بے ساختہ کہا۔

''سارا اسٹاف بہت دکھی ہے، وہ بہت اچھے انسان اور بہت اچھے ڈاکٹر تھے۔''

''ڈاکٹر! مجھے ڈسچارج کب کیا جائے گا؟''

آئینہ کو ذرا تعجب ہوا کیونکہ صبیح نے ڈاکٹر شبیر کے متعلق اس ایک لفظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا تھا، اس نے صبیح کی جان بچائی تھی اور آئینہ کو امید تھی کہ وہ تعزیت کے لیے کچھ کہے گا لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ آئینہ کسی قدر رکھائی سے بولی۔ ''آپ بالکل فٹ ہیں، چاہیں تو آج ہی گھر جا سکتے ہیں لیکن کم سے کم دو دن معمول کی مصروفیات سے پرہیز کریں۔''

''شکریہ ڈاکٹر۔'' وہ اٹھ بیٹھا۔ ''میں ابھی جانا پسند کروں گا۔ کیا مجھے ایک کال کرنے کی سہولت مل سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ وہاں سے صبیح نے ارشد کو کال کی اور اسے گاڑی لانے کو کہا۔ اس دوران میں ڈاکٹر آئینہ نے ایک نرس سے وہ کپڑے منگوا لیے جن میں صبیح اسپتال لایا گیا تھا۔ کپڑے دُھل کر استری کر دیے گئے تھے۔ صبیح نے اپنے کمرے میں آ کر کپڑے بدلے، اس دوران میں ارشد آ گیا۔ صبیح کا گھر اسپتال سے کچھ ہی دور تھا۔ اس کے علاج کے تمام اخراجات آغا صاحب نے پیشگی جمع کرا دیے تھے اس لیے اسے صرف سلپ پر سائن کرنا پڑے۔ ارشد بہت خوش تھا۔

''شکر ہے صاحب... آپ کو ٹھیک دیکھ رہا ہوں۔''

''میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔'' صبیح نے کہا۔

وہ اسپتال سے نکلا تو دنیا اسے اجنبی سی لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پہلی بار ان سب چیزوں کو دیکھ رہا ہے۔ ڈرائیونگ ارشد کر رہا تھا اور وہ پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا فٹ پاتھ سے گزرتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ سامنے سے ایک جوڑا آ رہا تھا۔ یہ ایک لڑکی اور لڑکا تھے اور ان کی شاید حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ ان کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ وہ میاں بیوی ہیں۔ جب کار ان کے پاس پہنچی تو اچانک ہی صبیح کو اس لڑکی کے آس پاس ویسا ہی روشنی کا ہالہ دکھائی دیا جیسا کہ ڈاکٹر شبیر کے آس پاس نظر آیا تھا۔ اس نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''ارشد! گاڑی روکو... روکو۔''

سڑک پر ٹریفک تھا اس لیے ارشد کو گاڑی روکتے روکتے کچھ وقت لگا۔ جیسے ہی گاڑی رکی، صبیح ٹریفک کی پروا کیے بغیر نیچے اتر آیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ نوجوان جوڑا فٹ پاتھ پر تھا اور دو افراد ان کے پاس کھڑے تھے۔ صبیح کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا اور وہ تیزی سے سڑک پار کر کے دوسری طرف پہنچا اور پھر جوڑے کی طرف بھاگا لیکن ابھی وہ کچھ دور تھا کہ فضا میں فائر کی آواز گونجی اور جوڑے کے پاس کھڑے دونوں افراد تیزی سے قریب کھڑی بائیک پر بیٹھے اور بھاگ نکلے۔ لڑکی نیچے گری ہوئی تھی اور لڑکا اسے بازوؤں میں سنبھال رہا تھا۔ صبیح بھاگ کر اس کے پاس پہنچا۔ لڑکی کے سینے پر عین دل کے مقام سے خون نکل رہا تھا اور اس کی کھلی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔

''یہ... یہ کیا ہوا؟'' صبیح نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

لڑکے نے دھندلائی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''وہ... زیور مانگ رہے تھے... اس نے سب دے دیا... لیکن یہ انگوٹھی نہیں دے رہی تھی... میں نے اسے منہ دکھائی میں دی تھی... انہوں نے اسے شوٹ کر دیا۔''

صبیح نے لڑکی کی طرف دیکھا جس کے ہاتھوں کی حنا بھی ماند نہیں پڑی تھی اور کھڑا ہو گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ وہاں جمع ہونے لگے۔ ارشد بھی آ گیا تھا۔ اس نے صبیح کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''چلیں صاحب۔''

صبیح دیکھ رہا تھا، وہ ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہ ارشد کے ساتھ چل پڑا۔ گھر آ کر وہ بہت دیر اس واقعے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر شبیر اور اس لڑکی کے گرد نظر آنے والے ہالے میں کیا چیز مشترک تھی؟ اس سوال کا جواب اچانک ہی اس کے ذہن میں آیا۔ وہ مشترک چیز تھی... موت۔ دونوں افراد مر چکے تھے اور ان کے مرنے سے کچھ دیر پہلے صبیح نے ان کے گرد روشنی کا ہالہ دیکھا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ بیٹھا۔

'کیا اس ہالے کا مطلب موت ہے؟' اس نے سوچا۔ 'مجھے کسی کے مرنے کی اس طرح سے پیشگی خبر ہوتی ہے؟'

اسے سفیر احمد شاہ کی بات یاد آئی، انہوں نے اس ہالے کو غیر معمولی کہا تھا اور ساتھ ہی اس کے مزید مشکلات میں پڑنے کی پیش گوئی بھی کی تھی۔ لیکن اگر کوئی مرنے والا ہے اور وہ اس کی موت سے پیشگی آگاہ ہو جاتا ہے تو اس میں مشکل کہاں سے آ گئی؟ ہاں! وہ اپنی موت دیکھ لے تو بات الگ ہے لیکن اب موت کا اس کے دل میں کوئی خوف نہیں رہا تھا، وہ اس کا تجربہ کر چکا تھا۔ اس کا کوئی ایسا قریبی عزیز اور رشتے دار بھی نہیں تھا جس کی موت سے پیشگی آگاہی اسے مشکل میں ڈال دیتی۔

روحانیت سے دلچسپی کے باوجود صبیح کا ذہن بہت منطقی تھا اور جو بات منطق پر پوری نہیں اترتی تھی، اس کا ذہن اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا ذہن یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ کسی کی موت سے پیشگی آگاہ ہو جاتا ہے۔ اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کی آنکھ میں کوئی مسئلہ ہے۔ اس نے فون اٹھایا اور اپنے ایک دوست آئی سرجن کا نمبر ملایا۔ ''یار! میں صبیح بات کر رہا ہوں۔''

''کیسے ہو؟'' اس نے گرم جوشی سے کہا۔ ''کل سے تمہارے گھر کا نمبر ملا رہا ہوں، موبائل تو بند پڑا ہے۔''

''ٹھیک ہوں یار۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔

''یار! میڈیا پر تیرے بارے میں کچھ خبریں چل رہی ہیں۔''

''وہ میں تیرے کلینک آ کر بتاتا ہوں۔ تُو فارغ ہے نا؟''

''تیرے لیے فارغ ہی فارغ ہیں... آ جا۔''

ڈاکٹر شہزاد بٹ صبح میں ایک سرکاری اسپتال میں ڈیوٹی انجام دیتا اور دوپہر میں ایک خیراتی اسپتال میں بیٹھتا تھا اور رات کو اپنے کلینک پر بیٹھتا۔ صبیح اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی آمد کا سن کر اس نے تمام ملاقاتیں منسوخ کر دیں۔ وہ گرم

www.kahopakistan.com

جوشی سے ملا اور پھر صبیح سے اسپتال جانے کی وجہ پوچھی۔ صبیح نے اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

''تیرا چینل تو مائنر ہارٹ اٹیک کی خبر دے رہا ہے لیکن اس کے حریف چینل کا کہنا ہے کہ تو نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔''

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ خیر، میں تیرے پاس ایک مسئلہ لے کر آیا ہوں۔''

صبیح نے اسے نظر آنے والے روشنی کے ہالے کے بارے میں بتایا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ میری آنکھ میں کچھ مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''ابھی دیکھ لیتے ہیں۔'' شہزاد بٹ نے کہا اور آلات کی مدد سے اس کی آنکھ کا مکمل معائنہ کیا۔ کام مکمل کر کے اس نے کہا۔

''بہ ظاہر تو کوئی خرابی نہیں ہے لیکن ایک ڈراپ دے رہا ہوں۔ دن میں دو تین بار ڈال لینا، اس سے فرق پڑے گا۔''

وہ کچھ دیر اس کے پاس رک کر ڈراپ لے کر واپس گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات کے وقت سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں اور وہ جس سڑک سے گزر رہا تھا، وہ ویسے ہی سنسان تھی۔ اچانک ہی اسے ایک بڑی کار رکی نظر آئی۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اسے کار کے نیچے لیٹے آدمی کے آس پاس روشنی کا ہالہ نظر آیا۔ یہ روشنی اس کے لیے اجنبی نہیں تھی، اس نے بے ساختہ بریک لگائے اور کار سڑک کے دوسری طرف روک دی۔ جب وہ کار سے اتر کر اس شخص کی طرف بڑھا تو ہالہ بدستور نظر آ رہا تھا۔ یہ پرانے ماڈل کی مرسیڈیز کار تھی اور آدمی اس کے نیچے گھس کر کچھ کر رہا تھا۔ اس نے کار کو اوپر اٹھانے کے لیے جیک لگا رکھا تھا۔ یہ جیک بھی پرانا اور خستہ حال تھا اور اس کی چوڑیاں یقیناً گھس چکی تھیں کیونکہ اس سے چوں چرا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیک سے کار کا بوجھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر آدمی کو آواز دی۔

''باہر آؤ... جیک گرنے والا ہے۔''

''فکر مت کرو، یہ ایسی آوازیں نکالتا رہتا ہے۔'' آدمی نے بے فکری سے جواب دیا۔ ''تم جاؤ، مجھے اپنا کام کرنے دو۔''

اسی لمحے جیک نے بڑی خوف ناک سی چوں کی آواز نکالی اور صبیح کو لگا جیسے اس آدمی کے گرد نظر آنے والی روشنی تیز ہو گئی ہے۔ اب وقت نہیں تھا۔ اس بار اس نے بولنے کے بجائے راست اقدام کیا اور اس کی ٹانگیں پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا۔ وہ چیخنے چلانے لگا لیکن صبیح نے اسے باہر کھینچ کر دم لیا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا اور اس کی عمر کم سے کم ساٹھ برس تھی۔ اس نے دہاڑ کر کہا۔

''تمہارا دماغ درست ہے۔''

صبیح خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر کے پاس روشنی اتنی واضح تھی کہ تاریکی میں بھی اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھا غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ صبیح کو خاموش پا کر اس نے ہاتھ میں پکڑا اوزار اسے مارنے کے لیے بلند کیا۔ اسی لمحے سڑک پر سامنے سے روشنی لہرائی۔ کوئی گاڑی اس طرف آ رہی تھی اور وہ بُری طرح لہرا رہی تھی پھر نزدیک آتے ہوئے وہ ان کی طرف لپکی تو صبیح نے بوڑھے کو فٹ پاتھ کی طرف دھکا دیا اور خود بھی فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ وہ بال بال بچے تھے کیونکہ گاڑی جیک پر چڑھی مرسیڈیز کو رگڑتی ہوئی گزر گئی تھی اور کار جیک سے اتر گئی تھی۔ بوڑھے کا غصہ خوف میں بدل گیا۔ اگر وہ کار کے نیچے ہوتا تو کار اسے روند چکی ہوتی۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تم نے مجھے بچایا ورنہ اس وقت میری لاش کار کے نیچے ہوتی۔''

صبیح نے اس کی طرف دیکھا تو ہالہ مٹ گیا تھا۔ اس کے سر پر آئی موت ٹل چکی تھی۔ اس کی بات کا جواب دیے بغیر وہ کار کی طرف بڑھا اور اسے اسٹارٹ کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کچھ دور جا کے اس نے کار سڑک کے کنارے روک دی اور اسٹیئرنگ سے سر ٹکا دیا۔ کیا اس نے اس شخص کو موت سے بچا لیا تھا؟ اس نے سوچا۔ 'کیا وہ خود کو دھوکا دے رہا ہے؟' اس کے ساتھ کچھ مسئلہ ہوا ہے اور یہ مسئلہ اس کی آنکھ میں نہیں ہے۔ اس نے جیب سے آئی ڈراپ نکالی اور اسے سڑک کی طرف اچھال دیا۔

☆☆☆

آغا صابر نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ ''تم جاب چھوڑنا چاہتے ہو... لیکن کیوں؟''

''یہ میں بھی نہیں جانتا لیکن اب میں جاب نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں کہیں اور سے آفر...''

وہ ان کی بات کاٹ کر بولا۔ ''آغا صاحب! آپ جانتے ہیں کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ سے صاف صاف کہہ دیتا۔''

''ٹھیک ہے لیکن کام چھوڑنے کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ معاوضے کا مسئلہ تو نہیں ہے؟''

www.kahopakistan.com

''نہیں... آپ جو مجھے ادا کر رہے ہیں، میں اس سے مطمئن ہوں۔''

آغا صابر اسے کچھ دیر غور سے دیکھتا رہا۔ ''صبیح! میں تمہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتا۔''

''مجھے بھی یہی خوش فہمی تھی۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''لیکن ایک ہی جھٹکے نے میرے کس بل نکال دیے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔'' آغا نے سوچ کر کہا۔ ''ایک تجویز ہے۔ تم کچھ عرصے کے لیے چھٹی لے لو...''

''میں ہمیشہ کے لیے چھٹی لینا چاہتا ہوں۔''

''پہلے میری بات تو سن لو، میں چینل کے مالک کی نہیں ایک دوست کی حیثیت سے تجویز دے رہا ہوں۔ تم طویل چھٹی پر چلے جاؤ... جب تک تمہارا دل واپس آنے کو نہ چاہے۔ اس دوران میں تمہیں آدھی تنخواہ ملتی رہے گی۔ میری طرف سے مدت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ چاہے تم مہینوں بعد آؤ یا سالوں بعد۔''

اس نے غور کیا، آغا کی پیش کش اچھی تھی لیکن وہ اس کے دل کو نہیں لگی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آغا صاحب! میں بنا محنت کے کمائی کا قائل نہیں ہوں۔ آپ اگر اصرار کرتے ہیں تو میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں جب بھی آیا، آپ کے پاس ہی واپس آؤں گا۔''

آغا نے بہت کوشش کی کہ وہ مان جائے لیکن صبیح کا انکار ہاں میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ اس نے استعفا دے دیا۔ ایک بزنس مین ہونے کے ناتے آغا صابر جانتا تھا کہ صبیح کی وجہ سے اس کے چینل کو بہت اچھا بزنس ملتا تھا اور اس کا ایک نام بن گیا تھا۔ صبیح کا متبادل کوئی نہیں تھا۔ بہرحال، وہ اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ صبیح اس کے دفتر سے نکلا تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ وہ کار لے کر نکلا اور شہر کے ایک مرکزی پارک میں چلا آیا۔ جب اسے فرصت ہوتی... تو وہ یہاں چلا آتا... پوش علاقے میں ہونے کی وجہ سے یہاں رش کم ہوتا تھا اور آنے والے لوگ بھی مہذب اور دوسروں کی خلوت کا احترام کرنے والے ہوتے اور کوئی اس کے سر پر مسلط ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ یہاں آ کر اسے سکون ..... شام کی ڈھلتی دھوپ اچھی لگ رہی تھی اور پارک میں بڑوں سے زیادہ بچے تھے۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھ کر ماحول اور دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ملازمت سے استعفا دے کر وہ خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر جو بوجھ طاری ہو گیا تھا، اس میں کچھ کمی آئی ہے۔ اس نے بینچ پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول کر آس پاس دیکھا اور فوراً ہی اسے وہ نوجوان لڑکی نظر آ گئی جس کے آس پاس روشن ہالہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اچھل پڑا۔ اس کے سامنے ایک اور انسان پر موت منڈلا رہی تھی۔ لڑکی پارک میں ایک طرف ٹہلتے ہوئے موبائل پر بات کر رہی تھی اور یقیناً اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی موت قریب ہے۔ صبیح نے اردگرد دیکھا۔ وہ بالکل نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ لڑکی کو کس طرف سے خطرہ ہے۔ پھر اس کی نظر پارک کے اوپر سے جانے والے بجلی کے تاروں پر گئی۔ اس میں سے ایک تار کچھ جھول رہا تھا۔ صبیح نے اس کا معائنہ کیا اور اس نے دیکھ لیا کہ تار جس کھمبے سے بندھا ہوا تھا اس سے آہستہ آہستہ نکل رہا ہے اور زمین کی طرف جھک رہا ہے۔ وہ بے ساختہ چلایا۔ ''اے ہٹ جاؤ... تم پر بجلی کا تار گرنے والا ہے۔''

اس طرح چلانے پر پارک میں موجود لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے... لیکن موبائل فون میں مگن لڑکی نے جیسے سنا ہی نہیں۔ صبیح دوبارہ چلایا اور اس بار بھی لڑکی نے نہیں سنا تو وہ اس کی طرف بھاگا۔ وقت بالکل نہیں رہا تھا کیونکہ تار کسی لمحے بھی گر سکتا تھا اور لڑکی عین اس کے نیچے تھی۔ لڑکی نے اسے آخری لمحے میں دیکھا اور اس کی آنکھوں میں خوف نمودار ہوا۔ ایک مرد کو یوں اپنی طرف جھپٹتے دیکھ کر اس کا خوف زدہ ہونا لازمی تھا۔ صبیح نے جست لگائی اور اسے بازو میں لیتا ہوا گھاس پر جا گرا۔ عین اسی لمحے تار ٹوٹ کر نیچے گرا۔ لڑکی اور صبیح دونوں بال بال بچے تھے۔ تار عین اس جگہ گرا تھا جہاں ایک لمحہ پہلے لڑکی موجود تھی... لڑکی چلائی لیکن جب اس نے بجلی کا تار دیکھا تو وہ چپ ہو گئی۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ انہوں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ صبیح نے لڑکی کی طرف دیکھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''

''جی، میں ٹھیک ہوں اور آپ...'' وہ جھجکی۔ ''آپ صبیح سلطان ہیں؟''

''نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے نرمی سے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔ آج اس نے ایک جان اور بچائی تھی۔ وہ گھر آیا تو خوش تھا۔ شاید خدا نے اسے یہ صلاحیت اسی لیے دی تھی کہ وہ اسے کام میں لا کر ان لوگوں کی جان بچائے جن کے سر پر حادثاتی موت منڈلا رہی ہو۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر کسی کی موت طبعی ہو تو کیا وہ اسے بھی بچا سکتا ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں تھا۔ اگر کسی کو کینسر کا آخری اسٹیج ہو تو وہ اسے کیسے بچا سکتا تھا؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا اسے ان لوگوں کے گرد روشن ہالہ نظر آتا؟ اس کا جواب وہ کسی ایسے مریض کو دیکھ کر ہی پا سکتا تھا جو اپنے مرض کی وجہ سے موت کے قریب ہو... لیکن ایسا مریض اسے کہاں ملتا؟ اس پر اسے ڈاکٹر آئینہ کا خیال آیا، وہ اس معاملے میں اس کی مدد کر سکتی تھی۔

☆☆☆

آئینہ اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پھر وہ خوش ہو گئی۔ ''میرا نہیں خیال تھا کہ آپ دوبارہ آئیں گے۔''

''یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟'' صبیح نے پوچھا۔

''بس آ گیا۔'' اس نے صبیح کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کہیے... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

''کیا آپ مجھے کسی ایسے مریض سے ملوا سکتی ہیں جو قریب المرگ ہو؟''

آئینہ حیران رہ گئی۔ ''جی... میں سمجھی نہیں؟''

''میں نے بہت آسان الفاظ میں کہا ہے۔ میں کسی ایسے مریض سے ملنا چاہتا ہوں جو عنقریب مرنے والا ہو اور ڈاکٹرز نے اسے جواب دے دیا ہو۔'' صبیح نے اپنی بات دُہرائی۔

''لیکن کیوں؟... آئی مین کہ آپ اپنے کام کے سلسلے میں کسی ایسے مریض سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''نہیں، میں اپنے کام کے سلسلے میں نہیں ملنا چاہتا۔'' اس نے جواب دیا اور پھر اسے بتا دیا۔ ''میں یہ کام چھوڑ چکا ہوں۔''

یہ آئینہ کے لیے مزید حیران کن بات تھی۔ ''آپ اپنا کام چھوڑ چکے ہیں... لیکن کیوں؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں پتا لیکن میں نے چھوڑ دیا ہے۔''

''اب آپ کیا کریں گے؟''

''میں نے اس بارے میں بھی نہیں سوچا ہے۔ یہ بتائیں کہ آپ میری مدد کر سکتی ہیں یا نہیں؟'' صبیح اس کے سوال جواب سے کسی قدر اکتا گیا۔

آئینہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ایک مریضہ ہے۔ برین ٹیومر کی وجہ سے وہ کومے میں جا چکی ہے اور میڈیکلی لحاظ سے اس کی موت واقع ہو چکی ہے۔''

''نہیں، مجھے کسی ایسے مریض کی تلاش ہے جو ابھی زندہ ہو... ہوش میں ہو۔'' صبیح نے انکار میں سر ہلایا۔

آئینہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''ایسے کسی مریض کے بارے میں مجھے معلوم کرنا پڑے گا۔ آپ انتظار کر سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' صبیح نے سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔ ''آپ کے قیمتی وقت اور تعاون کا شکریہ۔''

''اس میں شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولی تو اس کی آنکھیں ایک لمحے کو چمکیں۔ ''مجھے آپ سے تعاون کر کے دلی خوشی ہوئی ہے۔ اگر آپ کو جلدی نہیں ہے تو میرے ساتھ ایک کپ چائے پی لیں۔''

صبیح بیٹھ گیا۔ ''بالکل بھی جلدی نہیں ہے۔ اب میں فارغ ہوں۔ آج سے صرف دو ہفتے پہلے میرے پاس اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ آئس کریم کھانے کا وقت بھی نہیں تھا۔''

''مجھے افسوس ہے۔''

''وقت ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں ہم اس وقت جانتے ہیں جب وہ ہمارے ساتھ نہیں رہتا جسے ہمارے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''یہ زندگی کی حقیقت ہے... لیکن صبیح، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ صرف آپ کے ساتھ ہونے والے واقعے سے کوئی اپنا طرزِ عمل تبدیل نہیں کرے گا۔''

''میں جانتا ہوں۔''

ڈاکٹر آئینہ نے چائے منگوائی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''اب آپ میرے مریض نہیں ہیں اس لیے ایک سوال کی اجازت چاہوں گی۔''

''آپ پوچھ سکتی ہیں۔''

''کیا آپ اب بھی وہ کیفیت محسوس کر رہے ہیں جس کے زیرِ اثر آپ نے خودکشی کی کوشش کی تھی؟''

صبیح نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں... اگرچہ میری کیفیت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے لیکن اب میں خودکشی کی کوشش نہیں کر سکتا۔''

''آپ کے اس خیال کی وجہ؟''

''میرا مقدر پر ایمان ہے اور میرے خیال میں اگر میرے مقدر میں خودکشی سے مرنا لکھا ہوتا تو میں آج زندہ نہ ہوتا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا کام چھوڑنے کی بھی یہی وجہ ہے؟''

''شاید۔'' اس نے کہا۔ وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ ان دنوں وہ کس تجربے سے گزر رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ ڈاکٹر اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی تجسس کا شکار ہے اور یہ تجسس اس کی پیشہ ورانہ ذمے داری سے بڑھ کر تھا اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔

''آپ کے خیال میں کیا انسان مر کر زندہ ہو سکتا

www.kahopakistan.com

ہے؟''

وہ مسکرائی۔ ''یہ تو ہم آئے دن دیکھتے ہیں۔ بہ ظاہر مر جانے والا زندہ ہو جاتا ہے اور اچھا بھلا آدمی ہمارے سامنے زندگی ہار جاتا ہے... اور آپ کو تو اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔''

''کیا انسان سچ مچ مر کر زندہ ہو جاتا ہے یا یہ زندگی اور موت کے درمیان کوئی کیفیت ہوتی ہے؟''

''میرا خیال ہے جسم ہار مان لیتا ہے لیکن ابھی آدمی کی موت کا وقت نہیں آیا ہوتا... اس لیے وہ جینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''

صبیح کو خیال آیا جیسے وہ جینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ مر جانا چاہتا تھا... خاص طور سے جب اس نے روشن سرنگ کے دوسری طرف اپنی بیٹی کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد زندگی کی طرف لوٹنا اسے بہت ناگوار گزرا تھا۔ اسے ڈاکٹر آئینہ کی بات اچھی لگی۔ اس نے سر ہلایا۔ ''یہی بات ہے۔ جب تک اوپر والے کا حکم نہیں ہوتا... نہ کوئی مر سکتا ہے اور نہ کوئی جی سکتا ہے۔''

ایک نرس چائے لے آئی۔ آئینہ نے اس کے لیے کپ بنایا۔ اس نے شکریے کے ساتھ کپ لے لیا۔ ''ڈاکٹر شبیر کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''معلوم نہیں لیکن پولیس کا خیال ہے کہ انہیں ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے تھے اور لوٹ مار میں مزاحمت کے دوران قتل کر دیا گیا۔ ان کا موبائل اور پرس بھی غائب تھا۔''

''آج کل ایسی وارداتیں بہت ہو رہی ہیں۔ آپ بھی احتیاط کیا کریں۔'' صبیح نے کہا۔ ''اس اسپتال کے آس پاس خاصا سناٹا ہوتا ہے۔''

''میں محتاط رہتی ہوں کیونکہ مجھے ایک ہاسٹل جانا ہوتا ہے اور اکثر نائٹ ڈیوٹی کے بعد نکلتی ہوں تو پارکنگ میں سناٹا ہوتا ہے۔''

''آپ کی فیملی یہاں نہیں ہے؟''

''نہیں، وہ دوسرے شہر میں ہوتے ہیں۔ میں جاب کی وجہ سے یہاں ہاسٹل میں رہتی ہوں۔''

صبیح چائے ختم کر کے اٹھ گیا۔ ''تو میں کب آؤں؟''

''ایسا کریں اپنا موبائل نمبر دے دیں... جب بھی ایسی کوئی بات ہوگی تو میں آپ کو کال کر لوں گی۔''

صبیح نے اسے اپنا نمبر دیا اور اس کا نمبر لے لیا۔ ''میں امید کرتا ہوں کہ آپ جلد مجھے کال کریں گی۔''

''جیسے ہی آپ کا مطلوبہ مریض آیا تو...''

صبیح، ڈاکٹر آئینہ کے کمرے سے نکلا تو اچانک اسے خیال آیا اور وہ باہر آنے کے بجائے آئی سی یو کی طرف آیا۔ اسے دیر سے خیال آیا کہ وہ جس مقصد کے تحت آیا ہے شاید وہ آئی سی یو میں پورا ہو سکتا ہے۔ اس وقت بھی آئی سی یو میں کئی مریض اور حادثے کے شکار افراد آئے ہوئے تھے۔ ان میں ایک شخص شاید ہارٹ اٹیک کا شکار تھا اور طبی عملہ اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند لمحے کے لیے ڈاکٹر اس کے سامنے سے ہٹا تو صبیح نے اسے دیکھ لیا۔ اس کے آس پاس ویسا ہی روشن ہالہ نظر آ رہا تھا۔ وہ شخص بالکل ساکت لیٹا ہوا تھا۔ صبیح کی نظر کارڈیوگراف پر گئی۔ اس کی لکیر غیر مسلسل تھی اور پھر وہ اچانک سیدھی ہو گئی۔ اس شخص کا دل رک گیا۔ ڈاکٹر اس کے دل کو شاک دے کر چلانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر صبیح نے ایک عجیب منظر دیکھا، مر جانے والے شخص کے پاس سے ایک تیز روشنی تیر کی طرح اٹھی اور اوپر کی طرف چلی گئی۔ یہ بس ایک لمحے کے لیے تھی لیکن صبیح نے اسے واضح طور پر دیکھا۔ یہ کیا تھا... کیا مرنے والے کی روح تھی؟

اسپتال سے باہر آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اسے قدرت نے یہ صلاحیت کیوں دی ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ کسی مخصوص شخص کی جان بچا سکے؟ لیکن اسے لگ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ پھر اسے سفیر احمد کی بات یاد آئی کہ وہ کسی مشکل میں پڑنے والا ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ اگر وہ کسی کی موت سے پیشگی آگاہ ہو جاتا ہے یا اگر وہ کسی حادثے میں مرنے والے کو کوشش کر کے بچا لیتا ہے تو اس سے وہ کسی مشکل میں کس طرح پڑ سکتا ہے؟ گھر آنے سے پہلے وہ قبرستان گیا اور وہاں کچھ دیر رمشا کی قبر کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب سے اس نے کام چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا، اس وقت سے مستقل اس کے جاننے والوں اور پسند کرنے والوں کے فون آ رہے تھے۔ گھر کا فون اس نے ارشد کے حوالے کر دیا تھا اور وہ ہر کال کرنے والے کو یہی کہتا کہ.... صاحب ابھی کسی سے بات نہیں کر سکتے۔ کچھ ایسے تھے جو اس سے ملنے گھر تک چلے آتے تھے تو ارشد انہیں بھی ٹال دیتا تھا کہ صاحب کی طبیعت خراب ہے اور وہ سو رہے ہیں۔ ان دنوں اس کا کسی سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ سب سے الگ ہو کر رہنا چاہتا تھا۔ شاید اگر ارشد اس کے لیے ضروری نہ ہوتا تو وہ اب تک اس کو بھی رخصت کر چکا ہوتا۔ دوسرے دن شام کے وقت اسے ڈاکٹر آئینہ کی کال آئی۔

''صبیح! کیسے ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے رسمی انداز میں کہا۔ ''آپ کیسی ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں اور اتفاق سے کچھ دیر پہلے ایک مریض آیا ہے، وہ ہیپاٹائٹس بی کا مریض ہے اور اس کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسے دیکھ سکتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ شاید چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔''

صبیح کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور وہ آئی سی یو میں پہلے ہی اس قسم کا مریض دیکھ چکا تھا بلکہ وہ اس کے جسم سے روح نکلتے ہوئے بھی دیکھ چکا تھا اس لیے اب اسے ضرورت نہیں تھی... لیکن وہ آئینہ کو انکار نہیں کر سکا کیونکہ اس کے کہنے پر وہ ایک مشکل کام کے لیے راضی ہوئی تھی اور اب وہ انکار کر دیتا تو شاید وہ اس بات کو محسوس کرتی۔ اس نے کہا۔ ''آپ کی کوشش کا شکریہ، میں ابھی آ رہا ہوں۔''

وہ دن میں ایک وقت کھانے کے لیے نکلتا تھا اور باقی اوقات کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لے آتا تھا ورنہ ارشد سے منگوا لیتا تھا۔ اس دن اس نے صرف ناشتا کیا تھا اور دوپہر میں کھانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ گھر سے نکلا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور رات تیزی سے چھا رہی تھی۔ اس نے گاڑی کا رخ اسپتال کی طرف موڑ دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہاں سے واپسی پر کسی ریستوران میں جا کر کھانا کھا لے گا۔ وہ اسپتال پہنچا تو ڈاکٹر آئینہ اپنے کمرے میں اس کی منتظر تھی۔ اس نے کہا۔

''میری ڈیوٹی آف ہو گئی ہے لیکن میں آپ کی وجہ سے رک گئی۔''

''اوہ، آپ کو میری وجہ سے زحمت برداشت کرنی پڑی۔'' اس نے معذرت کی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں آپ کو مریض دکھا کر نکل جاؤں گی کیونکہ تاریکی ہونے کے بعد پارکنگ والی جگہ بہت ویران ہو جاتی ہے اور خاص طور سے کوئی خاتون وہاں اکیلے جاتے ہوئے ڈرتی ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' صبیح نے سر ہلایا۔ ''ایسا کرتے ہیں مریض کو دیکھنے کے بعد میں آپ کو پارکنگ تک چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں... نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے ورنہ آپ کو اپنی گاڑی کے لیے بہت دور پیدل جانا ہوگا۔ مجھے جانا بھی دوسرے دروازے سے ہے ورنہ میں آپ کو باہر وزیٹر پارکنگ میں چھوڑ دیتی۔''

''تو پھر چلیں۔'' صبیح نے کہا۔ وہ دونوں باہر آئے۔ ڈاکٹر آئینہ نے اپنا کمرا لاک کیا اور اسے لے کر انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں آئی۔ یہاں سارے ہی نجی پرائیویٹ کمرے تھے۔ اس نے ایک کمرے کے باہر شیشے کی بڑی سی کھڑکی سے اندر اشارہ کیا۔ ''یہ ہے وہ مریض۔''

صبیح نے دیکھا، وہ جوان آدمی تھا اور اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی لیکن اسے اس کے گرد مخصوص روشن ہالہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس کی موت کا وقت نہیں آیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر آئینہ کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے، یہ مرنے والا ہے؟''

''دیکھیے، زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کا کیس مکمل طور پر بگڑ چکا ہے۔ یہاں موجود تمام ڈاکٹرز نے اسے جواب دے دیا ہے۔''

صبیح نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ابھی نہیں مرے گا۔''

آئینہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''بس میرا اندازہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کم سے کم یہ فوری طور پر مرنے والا نہیں ہے۔''

آئینہ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شک کر رہی ہو لیکن اس نے منہ سے کچھ کہا نہیں۔ ''ٹھیک ہے پھر ہم چلیں؟''

''ہاں آیئے، میں آپ کو پارکنگ تک چھوڑ دوں۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو سامنے سے جانا ہے اور مجھے پیچھے سے جانا ہے۔ میں یہیں سے چلی جاؤں گی۔''

انتہائی نگہداشت کا وارڈ دوسرے فلور پر تھا۔ آئینہ ایک جگہ سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی اور صبیح واپس جانے کے لیے جس راستے سے آیا تھا، اسی پر چل پڑا۔ ایک گیلری سے گزرتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر نیچے دیکھا تو آئینہ اسے ایک بڑے دروازے کی طرف جاتی دکھائی دی جس پر ایگزٹ لکھا تھا اور یہ شاید باہر پارکنگ میں نکلتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتی، صبیح ٹھٹک گیا۔ اس نے آئینہ کے آس پاس روشن ہالہ نمودار ہوتے دیکھا۔

''میرے خدا!'' صبیح کے منہ سے نکلا۔ آئینہ کی موت پاس تھی اور یقیناً اسے کسی حادثے کا خطرہ تھا کیونکہ بہ ظاہر ایسی کوئی طبی وجہ نہیں تھی کہ وہ موت کا شکار ہوتی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دروازہ کھول کر پارکنگ میں نکل گئی۔ صبیح نے سوچا اور پلٹ کر واپس بھاگا۔ وہ کچھ ہونے سے پہلے ہر صورت اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

www.kahopakistan.com

ڈاکٹر آئینہ نے خوف زدہ نظروں سے نیم تاریک پارکنگ کی طرف دیکھا۔ وہاں روشنی کم تھی اور مارننگ شفٹ میں آنے کی وجہ سے اسے کار پارک کرنے کی جگہ بہت دور ملی تھی۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ہمت کر کے اپنی کار کی طرف چل پڑی۔ اسپتال بڑا ہونے کی وجہ سے یہاں اسٹاف کی اچھی خاصی گاڑیاں پارک تھیں۔ وہ محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ اچانک اسے لگا جیسے اس کے آس پاس کوئی چل رہا ہے۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

ڈاکٹر آئینہ کا خوف بے وجہ نہیں تھا۔ اس کا تعلق ایک چھوٹے شہر کے متوسط گھرانے سے تھا اور اس کا باپ ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ جب اس نے ایم بی بی ایس کر لیا تو ایک مقامی جاگیردار حمزہ خان نے اس کا رشتہ اپنے بیٹے رئیس خان کے لیے مانگا۔ اس کا بیٹا روایتی عیاش امیرزادہ تھا اور پہلے ہی دو شادیاں کر چکا تھا اور ان میں سے ایک بیوی کو طلاق بھی دے چکا تھا اس کی عیاشی کے قصے اس چھوٹے سے شہر میں سب جانتے تھے۔ اس لیے آئینہ نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا اور اس کے باپ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

اس جرم کی پاداش میں عنایت حسین کو اپنا گھر اور شہر چھوڑ کر ایک اور شہر میں اپنے بھائی کے پاس پناہ لینا پڑی اور آئینہ نوکری کے لیے یہاں چلی آئی لیکن خوف اور دہشت نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ دو ہفتے پہلے اس امیر زادے نے اسے فون کر کے دھمکی دی تھی کہ اس نے اسے انکار کر کے اپنے حق میں بُرا کیا ہے اور جلد اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ لوگ صرف دھمکی نہیں دیتے بلکہ اس پر عمل کرنا بھی جانتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ بہت خوف زدہ تھی۔ جب اس نے آس پاس پُراسرار آہٹیں محسوس کیں تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے رفتار تیز کی اور اپنی کار کی طرف لپکی۔ اسی لمحے اسے ایک سایہ سا جھپٹتا محسوس ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ چیخ مارتی، حملہ آور نے اس کا منہ دبا دیا اور اسے کھینچ کر دو گاڑیوں کے درمیان لے گیا۔ اس وقت وہ سمجھی کہ شاید حملہ آور اسے مارنا چاہتا ہے لیکن وہ اسے مزید کھینچ کر آگے لے جا رہا تھا۔ تب آئینہ نے اس وین کا پچھلا کھلا دروازہ دیکھ لیا اور وہ سمجھ گئی کہ حملہ آور اسے اغوا کر رہا ہے۔ یہ جان کر اس کے اندر ہمت سی آ گئی اور اس نے گاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے خود کو وین میں پھسلا لیا اور مزاحمت کرنے لگی۔ حملہ آور نے نقاب پہن رکھا تھا اور وہ طاقت ور آدمی تھا۔ لیکن آئینہ کی بھی جان پر بنی ہوئی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ اغوا کرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا اور وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ اس سے بہتر تھا وہ مزاحمت کر کے یہیں جان دے دے۔ حملہ آور اس کی مزاحمت پر مشتعل ہو گیا۔ اس نے اچانک آئینہ کے منہ سے ہاتھ ہٹایا تو اسے چیخ مارنے کا موقع ملا لیکن وہ پوری طرح چیخ بھی نہیں سکی تھی کہ حملہ آور نے اس کا گلا دبوچ لیا اور غراتے لہجے میں بولا۔

''کتیا... خان نے کہا تھا کہ اگر تجھے نہ لا سکوں تو تیری لاش چھوڑ کر آؤں۔ لگتا ہے اب تیری لاش ہی چھوڑنا پڑے گی۔''

اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ آئینہ جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگی لیکن محدود سی جگہ کے باعث اس کے لیے حرکت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اچانک ہی اس کے ہاتھ میں کوئی چیز آ گئی، اس نے اسے کھینچا یہ چاقو تھا جو حملہ آور کی بیلٹ سے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، آئینہ نے چاقو اس کے بازو پر مارا لیکن یہ کمزور سا وار تھا۔ اسے معمولی زخم آیا اور اس نے بہ آسانی دوسرے ہاتھ سے چاقو چھین لیا۔ آئینہ کی اس کوشش نے اسے مزید مشتعل کر دیا اور ممکن تھا کہ پہلے اس کا آئینہ کو قتل کرنے کا ارادہ نہ ہو لیکن زخم نے اسے پاگل کر دیا۔ اس نے چاقو سر سے بلند کیا۔ آئینہ نے اسے وار کرتے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ حملہ آور غرایا اور اس کا چاقو والا ہاتھ نیچے آنے لگا۔

☆☆☆

صبیح کو اسپتال کی راہداری میں دیوانہ وار بھاگتے دیکھ کر لوگ حیران تھے لیکن خیریت رہی، کسی نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی اور وہ عقبی پارکنگ تک پہنچنے میں کامیاب رہا لیکن جب وہ باہر آیا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ آئینہ کو نکلے ہوئے مشکل سے دو منٹ ہوئے تھے اور اگر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی، تب بھی اس کی گاڑی تو گیٹ کی طرف جاتی نظر آنی چاہیے تھی۔ صبیح کی چھٹی حس نے بتایا کہ وہ یہیں ہے اور شاید مشکل میں ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا، وہاں بے شمار گاڑیاں تھیں۔ پھر اسے خیال آیا اور اس نے دوسرے زاویے سے ان جگہوں کا معائنہ کیا جہاں تاریکی تھی لیکن اسے کہیں بھی مخصوص روشنی نظر نہیں آئی۔ ایک لمحے کو اس کا دل ڈوب گیا۔ کیا آئینہ اب اس دنیا میں نہیں تھی؟ لیکن اتنی جلدی اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا؟ اسی لمحے اسے ہلکی سی چیخ سنائی دی اور اسے سمت کا اندازہ ہو گیا، وہ اس طرف لپکا۔

گاڑیوں کے درمیان اسے دو سائے آپس میں گتھم گتھا نظر آئے۔ اسے شناخت میں کچھ دیر لگی۔ اس دوران میں ایک سایہ چاقو والا ہاتھ بلند کر چکا تھا۔ صبیح نے چھلانگ لگائی اور اس آدمی کو لیتا ہوا گاڑیوں سے آگے جا گرا۔ اب سایہ صبیح سے زور آزمائی کر رہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ چاقو صبیح کے سینے میں اتار دے۔ وہ بہت طاقتور تھا اور صبیح اسے روک نہیں پا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ چاقو جلد اس کے سینے میں اپنی جگہ بنا لے گا لیکن اس موقع پر غیر متوقع طور پر آئینہ نے ہمت کی اور اس نے اپنے پرس سے حملہ آور کے سر پر وار کیا۔ یہ وار اس کے لیے غیر متوقع تھا... ایک لمحے کو اس کی توجہ ہٹی اور صبیح نے اسے زور سے دھکا دیا۔ پھر وہ اٹھا ہی تھا کہ آئینہ چلانے لگی۔ سناٹے میں اس کی آواز یقیناً دور تک جا رہی تھی اور کچھ دیر میں دروازے سے یا اسپتال کے اندر سے لوگ آ سکتے تھے۔ حملہ آور ٹھٹک گیا، وہ چند لمحے ساکت کھڑا رہا پھر بھاگ کر وین میں گھس گیا اور وین حرکت میں آ کر گیٹ کی طرف چلی گئی۔ صبیح گاڑی کے بونٹ سے ٹکا ہوا ہانپ رہا تھا۔ آئینہ اس کی طرف لپکی۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' اس نے بہ مشکل کہا۔ اس کی اپنی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ دوسری چوٹوں کے علاوہ اس کے گلے میں بھی شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ حملہ آور نے خاصی طاقت سے اس کا گلا دبایا تھا۔ صبیح نے اپنے بازو سے ہاتھ ہٹایا تو اس سے خون رس رہا تھا۔ یہاں حملہ آور کا چاقو لگا تھا۔ آئینہ نے اوپر سے زخم دیکھا اور خون کی مقدار سے اندازہ لگایا کہ زخم گہرا ہے اور اسے طبی مدد کی ضرورت ہے۔ صبیح نے سر ہلایا۔

''میں ٹھیک ہوں اور آپ...''

''مجھے چوٹ نہیں لگی ہے لیکن آپ کو میڈیکل ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں۔''

''نہیں، آئیں میرے ساتھ۔'' آئینہ نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ ''مجھے اس واقعے کی رپورٹ بھی کرنی ہے۔''

دس منٹ بعد ایک میل نرس صبیح کے بازو کا زخم صاف کر کے اس پر ٹانکے لگا رہا تھا۔ چاقو سے کوئی چار انچ لمبا کٹ آیا تھا۔ آئینہ اسپتال کی انتظامیہ کو اس واقعے کی رپورٹ کرنے گئی۔ صبیح نے ڈریسنگ کے بعد قمیص پہن لی۔ اسی وقت آئینہ وہاں آ گئی۔ صبیح نے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ نے رپورٹ کر دی؟''

''ہاں، اسپتال والوں نے پولیس کو بھی بلا لیا ہے، آپ کی گواہی کی ضرورت پڑے گی۔''

''میں حاضر ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

آئینہ نے اس کے لیے کافی منگوا لی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ایک ایس آئی آیا اور اس نے واقعے کے بارے میں صبیح کا بیان لیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ یہ کارروائی خانہ پُری کے لیے تھی اور پولیس نے شاید پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ حملہ آور اس کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ جب آئینہ نے حمزہ خان اور اس کے بیٹے کے خلاف رپورٹ کرنے کو کہا تو اس نے آئینہ کو تھانے آ کر رپورٹ لکھوانے کا مشورہ دیا۔

''کسی کے خلاف ایف آئی آر وہیں لکھی جاتی ہے۔''

صبیح کو اس کی بات پر غصہ آ گیا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ ایف آئی آر کہاں اور کس طرح لکھی جاتی ہے۔ ابھی کسی بارسوخ آدمی کا معاملہ ہوتا تو پورا تھانہ بمع ایف آئی آر رجسٹر کے اٹھ کر چلا آتا۔''

ایس آئی اسے پہچان گیا تھا۔ اس لیے ڈھٹائی سے مسکرانے لگا۔ ''جناب عالی... غصہ کیوں کرتے ہیں؟ آپ کہتے ہیں تو رجسٹر یہیں لے آتے ہیں۔''

''چھوڑو۔'' آئینہ نے اچانک کہا۔ ''تم صرف رپورٹ لو اور جاؤ۔''

ایس آئی کے جانے کے بعد صبیح نے کہا۔ ''کیا تم نے ارادہ بدل دیا ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں، رپورٹ کرانا بے کار ہے۔''

صبیح نے سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے اب چلتے ہیں۔''

''آپ کہاں جائیں گے؟''

''مجھے کھانے کے لیے کسی ریستوران کا رخ کرنا ہو گا۔''

آئینہ ہچکچائی پھر کہا۔ ''آج آپ کھانا میرے ساتھ کھا لیں۔''

''آپ تو ہاسٹل میں رہتی ہیں۔''

''ہاں تو وہاں جینٹس کا داخلہ منع نہیں ہے، بس وہ وزیٹر لابی سے آگے نہیں جا سکتے۔''

''کھانا آپ خود کرتی ہیں؟''

''نہیں، ہاسٹل میں میس ہے، میں وہیں کھاتی ہوں اور مجھے ہفتے میں ایک فرد کو ساتھ کھلانے کی اجازت ہے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے انکار کیا۔

''پلیز۔'' اس کا لہجہ التجا آمیز ہو گیا۔ ''آج آپ نے میری جان اور شاید آبرو کو بھی بچایا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اور آپ سے کچھ بات بھی کرنا چاہتی

www.kahopakistan.com

ہوں۔“

صبیح نے سوچا پھر سر ہلا دیا۔ ”ٹھیک ہے لیکن میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔“

”میں بھی آپ کو زیادہ دیر نہیں روکوں گی۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ آئینہ نے کہا اور اسے ایک انجکشن لگایا پھر اس نے اسے اینٹی بایوٹک کیپسول دیے تاکہ زخم جلدی بھر جائے۔ یہ اسے دو دن تک تین وقت کھانے تھے۔ وہ اپنی اپنی گاڑیوں میں روانہ ہوئے۔ آئینہ جس ہاسٹل میں رہتی تھی، وہ ایک پوش علاقے میں تھا۔ ہاسٹل بہت بڑا اور... جدید سہولیات سے آراستہ تھا۔ اسے وزیٹر لابی میں چھوڑ کر آئینہ چینج کرنے اوپر چلی گئی اور حیرت انگیز طور پر پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آ بھی گئی۔ اس نے گلابی پھول دار شرٹ پر زعفرانی رنگ کا دوپٹا لے رکھا تھا اور کانوں میں موتی اور دھات کے ٹوپس پہن لیے تھے۔ لپ اسٹک لگا کر وہ تر و تازہ نظر آنے لگی تھی۔ صبیح نے غور سے اسے دیکھا تو وہ شرما گئی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”اچھی لگ رہی ہو۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ لاؤنج میں رش بہت کم تھا کیونکہ اس وقت کام سے آنے والی بیشتر خواتین آرام کر رہی تھیں یا تیار ہو رہی تھیں۔ یہی رش کھانے سے پہلے اور اس کے بعد دیکھنے میں آتا تھا، خاص طور سے ٹی وی لاؤنج میں۔ صبیح اور آئینہ نسبتاً ایک کونے میں بیٹھے تھے۔

”شکریہ... آپ کے لیے کچھ منگواؤں... ابھی کھانے میں کچھ وقت ہے۔ یہاں کافی اور چائے بھی بہت اچھی ملتی ہے۔“

”یہ بہت اچھا اور معیاری ہاسٹل ہے۔“ صبیح نے کہا۔

”اس کی مالک مسز ممتاز ایک سماجی کارکن بھی ہیں اور انہوں نے یہاں بہت اچھا ماحول بنا رکھا ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہاں کوئی ہمیں نہیں دیکھ رہا۔ اس کی بنیادی وجہ ماحول ہے جو مناسب آزادی دیتا ہے لیکن رات دس بجے کے بعد نائن ٹو فائیو ورکنگ وومین کو باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی... اور اگر کوئی جاتا ہے تو اس کی وجہ بتانی پڑتی ہے۔ آپ نے چائے یا کافی کا تو بتایا نہیں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے... تب تک تم وہ بات کر سکتی ہو جو کرنا چاہتی تھیں۔“

آئینہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”ہاں، میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟ آپ کا رویہ شروع سے کچھ پُراسرار سا ہے۔ ڈاکٹر شبیر کی موت پر آپ کا ردِعمل... پھر ایک ایسے مریض کو دیکھنا جو مرنے والا ہو اور آپ نے اس کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ وہ ابھی نہیں مرے گا۔ پھر آپ میرے پیچھے آئے اور مجھے اس شخص سے بچالیا۔ یقین کریں، آپ ایک لمحے کی تاخیر کرتے تو وہ چاقو میرے سینے میں اتار چکا ہوتا۔“

”اس میں کون سی بات پُراسرار ہے؟“

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ مجھ پر حملہ ہونے والا ہے؟“

”تم اسے میری چھٹی حس بھی کہہ سکتی ہو۔“

”اچھا آپ نے ایک ایسے شخص کو دیکھنے کی فرمائش کیوں کی جو مرنے والا ہو؟“

”بعض وجوہات ہیں جنہیں میں ڈسکس نہیں کر سکتا۔“

”چلیے آپ ڈسکس نہ کریں... یہ تو بتائیے آپ کو کیسے پتا چلا کہ ابھی اس کی موت نہیں آئی ہے۔“

صبیح نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر آئینہ ایک ذہین عورت تھی اور وہ واقعات کا درست تجزیہ کر رہی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، مجھے کس طرح پتا چلا کہ اس کی موت ابھی نہیں آئی ہے؟“

”جیسے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں کسی مصیبت میں پڑنے والی ہوں۔“

صبیح کو تعجب ہوا۔ وہ تقریباً صحیح بات جان گئی تھی۔

”لگتا ہے تم نے بہت گہرائی سے میرا تجزیہ کیا ہے؟“

”آپ چاہیں تو ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک تو میڈیا میں بہت سارے لوگوں کی طرح آپ میری پسندیدہ شخصیت ہیں اور پھر آپ میرے مریض رہے جو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ کیا آپ کو میرا اتنی گہرائی سے تجزیہ کرنا بُرا لگا؟“

”نہیں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”مگر فی الحال میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”جیسے آپ کی مرضی۔“

”ہاں اگر آپ چاہیں تو میری مدد کر سکتی ہیں۔“

”مدد... وہ کیسے؟“

”اگر کوئی شخص مر کر پھر سے زندہ ہو جائے تو میڈیکل سائنس اسے کیا کہتی ہے؟“

”ہم اسے عارضی موت کہتے ہیں۔“ آئینہ نے جواب دیا۔

”عارضی موت؟“ صبیح نے اسے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ نے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ پڑھا ہوگا۔ ہر ہزار میں سے ایک انسان کو عارضی موت کا تجربہ ہوتا ہے۔ یعنی طبّی طور پر وہ مُردہ ہو جاتا ہے اور پھر کوشش سے یا ازخود وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت کوما سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں میڈیکلی ڈیتھ واقع ہو چکی ہوتی ہے۔ ہم اسے عارضی موت کہتے ہیں۔“

”لگتا ہے تمہیں اس موضوع سے خاصی دلچسپی ہے؟“

”ہاں کیونکہ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے میں کئی افراد کو عارضی موت کے بعد زندہ ہوتے دیکھ چکی ہوں۔ ان لوگوں کے تجربات انوکھے ہوتے ہیں۔ یہ عام طور سے تاریک یا روشن پس منظر میں اپنے ان پیاروں کو دیکھتے ہیں جو اس دنیا سے گزر چکے ہوتے ہیں۔“

صبیح نے سر ہلایا۔ ”میں نے بھی یہی سنا ہے۔“

”لیکن ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس تجربے کے نتیجے میں کسی خصوصی صلاحیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔“

”کیا ایسا کوئی واقعہ تمہاری نظر سے گزرا ہے؟“

آئینہ نے سر ہلایا۔ ”میں ایک لڑکی کو جانتی ہوں۔ وہ ایک حادثے کے نتیجے میں عارضی موت سے دوچار ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ جھوٹ اور سچ کے بارے میں جان جاتی تھی۔“

”جھوٹ... سچ؟“ صبیح نے اسے غور سے دیکھا۔

”اگر کوئی جھوٹ بولتا تو لڑکی کو اس کا چہرہ نیلا نظر آتا تھا اور سچ بولتا تو رنگ سبز ہو جاتا تھا۔“ آئینہ نے وضاحت کی۔ ”لیکن وہ بچی مشکل میں پڑ گئی۔ اس کے ماں باپ تک اس سے کترانے لگے تھے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے پھر نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوا؟“

”حیرت انگیز۔“ صبیح نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیا کسی اور کو اس سے ہٹ کر بھی کوئی صلاحیت مل سکتی ہے؟“

”ممکن ہے... جہاں تک میری معلومات ہیں اس میں انسان کو دوسرے انسانوں کے بارے میں آگاہی کی صلاحیت ملتی ہے۔ جیسے کسی کو یہ صلاحیت مل جائے کہ وہ دوسروں پر آنے والی دشواریوں کو قبل از وقت جان لے۔“ اس نے غور سے صبیح کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”تمہارا خیال ہے کہ مجھے ایسی کوئی صلاحیت مل گئی ہے؟“

”میرا خیال ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ایک بات کہوں اگر آپ بُرا نہ مانیں؟“

”کہو۔“

”یہ ٹھیک تو نہیں ہے کہ انسان دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے کٹ جائے۔“ اس نے دبی زبان میں کہا۔

”میں کٹا نہیں ہوں۔“ اس نے تردید کی۔ ”فی الحال میں خود کو معمولات کے لیے تیار نہیں پا رہا۔“

”مشکل وقت معمول سے دور رہ کر نہیں گزرتا۔ یہ مصروفیات ہیں جو آدمی کو مشکل وقت گزارنے میں مدد دیتی ہیں۔“ صبیح اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آئینہ کو کس طرح سے منع کرے۔ اس نے خود ہی یہ بات محسوس کر لی۔ ”سوری... میرا خیال ہے میں کچھ زیادہ ہی پرسنل ہو گئی ہوں۔“

”نو پرابلم۔“ صبیح نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

آئینہ نے موضوع بدل دیا۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی اور غیر محسوس انداز میں صبیح سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی پھر اس نے اچانک پوچھا۔ ”آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟“

صبیح ایک لمحے کو حیران ہوا پھر اس نے خود پر قابو پا کر کہا۔ ”شاید اپنی بیٹی کی وجہ سے... اور ویسے بھی مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا۔“

”ہاں، یہی وجہ ہو سکتی ہے ورنہ آپ کو کوئی کمی تو نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

اس ملاقات میں صبیح نے محسوس کیا کہ وہ اس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی ہے۔ میس میں اس کی ملاقات آئینہ کے گروپ سے ہوئی جو ایک جگہ رہنے کی وجہ سے خود بہ خود بن گیا تھا۔ وہ سب اچھے اخلاق والی مہذب اور کسی قدر شوخ خواتین تھیں لیکن کسی نے بھی صبیح سے ایک حد سے زیادہ فری ہونے کی کوشش نہیں کی۔ صبیح کو اپنے کاموں کے سلسلے میں بار بار خواتین سے ملنے کا موقع ملا تھا لیکن اس طرح وہ خواتین کے ایک گروپ کے سامنے اکیلا مرد نہیں رہا تھا۔ اسے لطف بھی آیا اور یہ تجربہ نیا محسوس ہوا۔

گھر کی طرف جاتے ہوئے صبیح کا ذہن ایک بار پھر ان واقعات میں الجھ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس صورتِ حال سے اکیلے نبرد آزما نہیں ہو سکتا، اسے کسی کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔ مدد کے نام پر اس کے ذہن میں آنے والا واحد نام سفیر احمد شاہ کا تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں وہی تھے جن سے وہ ہر بات کر لیتا تھا اور ان سے مدد مانگنے میں اسے جھجک بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لیکن وہ اس وقت ملک سے باہر تھے۔ گھر پہنچ کر اس نے ان کا موبائل نمبر ملایا جو ہر جگہ ان کے پاس ہوتا تھا اور اس کا علم صرف ان کی فیملی اور چند لوگوں

www.kahopakistan.com

کو تھا جن میں صبیح بھی شامل تھا۔

''صبیح... کیسے ہو یار؟'' وہ اس کی آواز سن کر بولے۔

''میں ٹھیک نہیں ہوں شاہ صاحب... مجھے آپ کی مدد اور راہنمائی کی ضرورت ہے۔''

''میں حاضر ہوں دوست۔'' وہ بولے۔

''آپ کے پاس وقت ہے؟''

''نماز تک کا اور اس دوران میں اگر موت نہ آجائے تو وقت ہی وقت ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

صبیح نے گہرا سانس لیا اور بولنا شروع کر دیا۔ گزشتہ چند دن میں اسپتال میں ہوش میں آنے کے بعد سے لے کر اس پر جو گزری تھی، اس کی ایک ایک تفصیل اس نے سفیر احمد کو بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا اور نہ ہی اس کی بات کاٹی۔ اس کا انداز بتانے سے زیادہ دل کی بھڑاس نکالنے والا تھا اس لیے انہوں نے اسے دل کی بھڑاس نکالنے دی۔ جب تک وہ خود چپ نہیں ہو گیا، وہ سنتے رہے۔ اس کے چپ ہونے کے بعد انہوں نے کہا۔

''صبیح... مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے تم سے ٹھیک کہا تھا۔ تم پر مشکل آنے والی ہے۔''

''یہ سب کیا ہے شاہ صاحب؟''

''یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن قدرت کے کاموں میں مداخلت کسی صورت بہتر نہیں ہوتی۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ میں نے ان لوگوں کو حادثات سے بچا کر غلط کیا ہے؟'' اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔

''میں نے یہ نہیں کہا کیونکہ اس قسم کی صورتِ حال میں یہ کہنا دشوار ہے کہ آدمی نے ٹھیک کیا ہے یا نہیں۔ لیکن فرض کرو، اگر تمہیں یہ صلاحیت نہ ملی ہوتی تو تم ان کاموں میں مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔''

''گویا مجھے صلاحیت مل جانے کے بعد بھی مداخلت نہیں کرنی چاہیے تھی؟'' اس نے کہا۔

''بالکل... دیکھو، روحانی دنیا کا یہ اولین اصول ہے۔ یہاں سب سے پہلے آگاہی ملتی ہے اور اس راہ پر وہی آدمی ثابت قدم رہ سکتا ہے جو آگاہی کے باوجود خود پر قابو رکھے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جو قدرت کی منشا کے خلاف ہو۔''

''لیکن شاہ صاحب، میرے سامنے ایک شخص موت کے منہ میں جانے والا ہو تو کیا میں اسے بچانے کی کوشش نہ کروں؟''

''وہ عمومی صورتِ حال میں ٹھیک ہوتا لیکن اس طرح یہ مناسب نہیں ہے۔ میں نے کہا نا کہ تم مشکل میں پڑنے والے ہو۔ اب کوشش کرنا کہ گھر سے نہ نکلو اور انتظار کرو... تم نے جو کیا ہے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔''

''اس کا کوئی نتیجہ نکلے گا؟''

''بالکل صبیح... تم نے مداخلت کی ہے اور اس کا نتیجہ لازمی نکلے گا۔ بس دعا کرنا کہ وہ بہت زیادہ منفی نہ ہو۔''

''منفی... میں سمجھا نہیں؟''

''یار! میں تمہیں سمجھا بھی نہیں سکتا کیونکہ میرے ذہن میں خود واضح نہیں ہے۔ تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔ اچھا، اب یہاں نماز کا وقت ہو گیا ہے اگر تمہیں مزید بات کرنی ہو تو بیس منٹ بعد کال کر لینا۔''

فون بند کر کے وہ کشمکش میں پڑ گیا۔ اس کا ذہن سفیر احمد کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے بیس منٹ بعد فون اٹھایا لیکن پھر واپس رکھ دیا۔ سفیر احمد نے اس سے کہا تھا کہ اس نے جو کیا ہے، اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ سامنے آئے گا۔ وہ کمرے میں آیا اور کپڑے بدل کر لینا تو وقت گزاری کے لیے ٹی وی لگا لیا... کیونکہ وہ نیوز کی دنیا کا آدمی تھا اس لیے اس نے نیوز چینل ہی لگایا اور اپنا چینل لگایا جس کا وہ کل تک ملازم تھا۔ خبریں آرہی تھیں۔ ہیڈ لائنز آچکی تھیں اور اب خبروں کی تفصیل دی جا رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کسی ٹریفک حادثے کے بارے میں بتا رہی تھی جس میں ایک تیز رفتار کار سوار نے سڑک کے کنارے بس کے انتظار میں کھڑے ایک شخص اور اس کے دو کمسن بچوں کو کچل ڈالا تھا۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ تینوں موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ پولیس نے کار کے ڈرائیور کو گرفتار کر کے اس کے خلاف مقدمہ درج کر لیا تھا۔ پھر لاک اپ میں قید اس شخص کی ویڈیو دکھائی جانے لگی جس نے آدمی اور اس کے دو بچوں کو کچل کر ہلاک کیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی صبیح اچھل پڑا۔ یہ وہی مرسیڈیز والا بوڑھا تھا جس کی اس نے جان بچائی تھی اور آج اس نے تین افراد کی جان لے لی تھی۔ رپورٹر اس سے سوال کر رہا تھا اور وہ اپنی غلطی کا اقرار کر رہا تھا۔ پھر اسکرین پر غم سے نڈھال عورت کا چہرہ ابھرا جس کا سہاگ ہی نہیں اجڑا تھا بلکہ اس کی گود بھی اجڑ گئی تھی۔ اس کی کل کائنات یہی تین لوگ تھے جو آنے والی سردی کی شاپنگ پر نکلے تھے اور ان کے گھر لاشے آئے تھے۔ صبیح سن ذہن کے ساتھ یہ سب دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ٹی وی بند کر کے سر تھام لیا۔

''میرے خدا! یہ کیا ہوا؟ میں نے تین معصوموں کے قاتل کو بچایا تھا۔ میں اس گھر کی تباہی کا ذمے دار ہوں۔''

اسے سفیر احمد کی بات یاد آگئی کہ اس نے جو کیا تھا، اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلے گا اور انہوں نے اسے دعا کرنے کو کہا تھا کہ یہ نتیجہ بہت زیادہ منفی نہ نکلے لیکن جو ہو چکا تھا، اس سے زیادہ منفی نتیجے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اس کے لیے یہ آگاہی کیا مشکلات لانے والی تھی۔ ایک نتیجہ وہ دیکھ چکا تھا۔ اس نے تین افراد کی جان بچائی تھی۔ اس کا دل لرزنے لگا اور اس نے دعا کی کہ خدا اسے اب ایسی کوئی چیز نہ دکھائے۔ یہ رات اس نے شدید بے چینی اور کرب میں گزاری۔ تنگ آکر اس نے نیند کی گولی لینا چاہی تو پتا چلا کہ کیبنٹ سے نیند کی گولیاں ہی غائب ہیں اور یہ یقیناً ارشد کا کام تھا لیکن وہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا، وہ رات کو چھپی کر کے گھر چلا جاتا تھا۔ اسے صبح کے قریب نیند آئی اور چند گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا تو سر درد میں کسی قدر کمی آئی۔۔۔ ارشد آگیا تھا، اس نے ناشتے کا پوچھا لیکن صبیح نے اس سے تیز گرم کافی مانگی اور اس کے ساتھ دو سردرد کی گولیاں نگل لیں۔

صبح وہ لازمی اخبار دیکھتا تھا۔ ایک تو یہ اس کی عادت تھی اور دوسرے پیشہ ورانہ ضرورت بھی تھی۔ اس کے گھر میں کوئی درجن بھر اخبارات آتے تھے اور وہ ان سب کو پورا پڑھتا تھا۔ قدرتی طور پر اس کے مطالعے کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ادارے کا اخبار لیا۔ پہلے صفحے پر ایک سرخی نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ ''بیٹی کے گھر سے فرار پر مشتعل باپ نے بیوی اور دو دوسری بیٹیوں کو قتل کر کے خودکشی کر لی۔''

یہ خبر دیکھتے ہی صبیح کے اندر خدشات سر سرانے لگے۔ اس نے تفصیل سے خبر دیکھی۔ اس کے مطابق نوشابہ نامی لڑکی کی کسی لڑکے سے موبائل پر دوستی ہوئی اور وہ اس کے اکسانے پر گھر سے بھاگ گئی۔ اس کے باپ نے صدمے سے پاگل ہو کر اپنی بیوی اور دو دیگر جوان بیٹیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور پھر خود بھی خودکشی کر لی۔ خبر کے ساتھ لڑکی کی تصویر نہیں تھی۔ یہ اسے دوسرے اخبار میں مل گئی اور گھر سے بھاگ جانے والی لڑکی کی تصویر دیکھتے ہی اس کے خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کی اس نے پارک میں جان بچائی تھی اور وہ وہاں ٹہلتے ہوئے یقیناً اسی لڑکے سے بات کر رہی تھی۔ صبیح کا سر گھومنے لگا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ اس نے جن جن کو بچایا تھا، وہ خود دوسروں کی موت کی وجہ بن رہے تھے۔ اگر کار والا بوڑھا اس روز مارا جاتا تو اس کی کار کے نیچے آکر باپ اور بچے نہ مارے جاتے۔ اسی طرح وہ اس لڑکی کو مرنے دیتا تو کل اس کے پورے گھرانے کو بے موت نہ مرنا پڑتا۔

'میرے خدا! یہ کیا اصرار ہے؟ تیری کیا مرضی ہے؟' اس نے بے بسی سے سوچا۔ پھر اسے آئینہ کا خیال آیا۔ اس نے کل رات اس کی جان بھی تو بچائی تھی... تو کیا وہ بھی کسی اور فرد یا کئی افراد کی موت کی وجہ بننے والی تھی؟ اور اس میں اس کا ہاتھ بھی ہوتا کیونکہ اصل ذمے دار وہی تھا۔ اس نے سوچا کہ سفیر احمد کو فون کرے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ ان کو کیا بتاتا کہ ان کے خدشات درست نکل رہے تھے۔ نہ جانے کتنی دیر وہ سر تھامے بیٹھا رہا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجنے پر، اس نے چونک کر دیکھا۔ باہر کا نمبر تھا، اس نے کال ریسیو کی۔ ''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' دوسری طرف سے سفیر احمد نے کہا۔ ''میرا خیال ہے صورتِ حال تم پر واضح ہو گئی ہے؟''

وہ حیران ہوا۔ ''ہاں... لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''جیسے مجھے بہت ساری دوسری باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔'' وہ بولے۔ ''صبیح! تم بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو چکے ہو اور اس سے نکلنے کی کوشش میں تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔''

''شاہ صاحب! مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے لیکن میں اس اذیت سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے کسی کی جان جائے، یہ مجھے کسی صورت گوارا نہیں ہے۔''

''صبیح! بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ یہ خرابی بہت دور تک جا سکتی ہے اگر اسے روکا نہیں گیا۔''

''کیسی خرابی شاہ صاحب... اور اسے کیسے روکا جا سکتا ہے؟''

''صبیح! اب جو کرنا ہے تمہیں کرنا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں اشارہ کیا گیا ہے کہ میں اس معاملے سے بالکل الگ رہوں۔ تم سمجھ رہے ہو نا اس کا مطلب؟''

''جی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''یعنی مجھے خود اس مسئلے کو حل کرنا ہو گا۔ لیکن کیا آپ مجھے کوئی مشورہ بھی نہیں دیں گے؟''

''اس شخص کے بارے میں جاننے کی کوشش کرو جس نے تمہاری بیٹی کو قتل کیا تھا۔ اس سے بہت ساری گتھیاں سلجھ جائیں گی۔'' سفیر احمد نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ ریسیور لیے ساکت بیٹھا رہ گیا۔ اسے جو کرنا تھا..... خود کرنا تھا لیکن سفیر احمد نے ایک مشورہ تو دیا تھا۔ اسے اس شخص سے آغاز

www.kahopakistan.com

کرنا تھا جس نے اس کی بیٹی کو قتل کیا تھا۔ حیرت ہے، اس کے تجسس پسند ذہن میں اب تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا... آخر اس نے ایسا کیوں کیا اور پھر خودکشی کیوں کر لی؟ پھر دروازے پر دستک سن کر وہ چونکا۔ یہ ارشد تھا۔

''صاحب! ایک عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔''

''میں ابھی کسی سے نہیں ملنا چاہتا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''میں نے بھی اسے یہی کہا تھا لیکن وہ بہت اصرار کر رہی ہے۔''

''تم نے وجہ پوچھی؟''

''وہ تو نہیں بتا رہی صاحب... اس کا کہنا ہے کہ ملاقات کی وجہ آپ کو ہی بتائے گی لیکن اس کا کہنا ہے کہ وہ رمشا بی بی کی پرانی آیا ہے جسے آپ نے ملازمت سے نکال دیا تھا۔''

''رمشا کی آیا۔'' اس نے زیرلب کہا اور بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے، میں ملتا ہوں۔''

رمشا کی سابق آیا گھر کے پورچ میں موجود تھی۔ وہ صبیح کو دیکھ کر بے ساختہ آگے آئی۔ ''سلام صاحب... کیسے ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں زرینہ بی بی... تم سناؤ؟''

''مجھے رمشا بی بی کا پتا چلا تھا، بہت افسوس ہوا جی سن کر۔''

صبیح کو امید تھی کہ وہ کسی خاص وجہ سے آئی ہو گی مگر صرف تعزیت کے الفاظ سن کر اسے مایوسی ہوئی۔ ''بس اللہ کی جو مرضی۔''

''صاحب! مجھے تو رمشا بی بی کے قاتل کو دیکھ کر حیرت ہوئی ہے۔''

صبیح چونکا۔ ''اسے تم نے کہاں دیکھ لیا؟''

''ٹی وی پر صاحب... یہ وہی آدمی تو تھا جس نے بی بی کو گاڑی کے نیچے آنے سے بچایا تھا۔''

زرینہ بی بی کے الفاظ ایسے کسی ٹھوس چیز کی طرح لگے۔ ''کیا... کیا کہا تم نے... یہ وہی شخص تھا؟''

''ہاں صاحب جی! میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں؟'' وہ بولی۔ ''اس کا چہرہ مجھے یاد تھا۔''

صبیح کو لگا کہ اس کا جسم لرز رہا ہے۔ ارشد اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی سے صبیح کو سہارا دیا اور زرینہ بی بی سے کہا۔ ''اب تم جاؤ۔ صاحب کی حالت ویسے ہی ٹھیک نہیں ہے، اوپر سے تم نے آ کر انہیں پریشان کر دیا ہے۔''

زرینہ بھی اس کی حالت دیکھ کر ڈر گئی، اس نے جلدی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں جا رہی ہوں۔''

ارشد اسے سہارا دے کر اندر لایا اور بستر پر لٹا دیا۔ اس نے صبیح کو پانی پلایا تو اس کے حواس کسی قدر بحال ہوئے۔

''زرینہ کہاں ہے؟''

''وہ تو چلی گئی صاحب۔''

''چلی گئی... کیوں چلی گئی؟ اسے بلاؤ۔'' اس نے خفگی سے کہا تو ارشد اسے بلانے دوڑا لیکن اتنی دیر میں وہ جا چکی تھی۔ ارشد نے واپس آ کر صبیح کو بتایا۔

''صاحب! وہ جا چکی ہے۔ گلی میں کہیں نظر نہیں آ رہی۔''

صبیح سوچنے لگا..... زرینہ کی بات سن کر اور ہوش میں آنے کے بعد وہ جیسے جیسے اس بارے میں سوچ رہا تھا، اسے ایک عجیب سے خوف کا احساس ہوتا جا رہا تھا۔ آخر اس شخص نے رمشا کی جان بچائی تھی تو پھر اس نے رمشا کی جان کیوں لی؟ یہ کیا اسرار تھا۔ اس نے صرف رمشا کی جان نہیں لی تھی بلکہ اس نے اپنی جان بھی لے لی تھی۔ اسے پھر سفیر احمد کے الفاظ یاد آئے... اسے اس معاملے میں خود ہی کچھ کرنا تھا۔

☆☆☆

اس نے اپنی بیٹی کے قاتل کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب اسے پتا چلا تھا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب شخص تھا۔ وہ کالج میں شعبۂ تاریخ کا پروفیسر تھا اور اپنے کالج اور طلبا میں اس کی ساکھ بہت اچھی تھی۔ وہ کبھی کسی متنازعہ سرگرمی میں ملوث نہیں رہا تھا اور نہ ہی کبھی اس سے کسی کو تکلیف پہنچی تھی۔ ایسے شخص نے اس کی بیٹی کو قتل کر دیا جو صرف نو سال کی تھی؟ کار ڈرائیو کرتے ہوئے صبیح کے ذہن میں یہ ساری باتیں آ رہی تھیں۔ یہ تمام معلومات اس نے گزشتہ دو دن میں جمع کی تھیں۔ اس شخص کا نام پروفیسر عبدالحمید خان تھا۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق شمالی علاقے سے تھا لیکن وہ کئی نسلوں سے یہاں آباد تھے۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کی بیوی اور ایک بیٹا بھی تھا۔ صبیح نے گاڑی اس درمیانے درجے کی کوٹھی کے سامنے روکی اور اتر کر کال بیل بجائی۔ چند منٹ بعد ایک ملازمہ نظر آنے والی عورت نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مسز عبدالحمید گھر پر موجود ہیں؟''

''جی موجود ہیں، آپ کون ہیں؟''

''میرا نام صبیح سلطان ہے۔ میں بیگم صاحبہ سے ملنے آیا ہوں۔''

''جی میں انہیں بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔ صبیح انتظار کرنے لگا۔ ملازمہ کوئی پانچ منٹ بعد واپس آئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کو کہا۔ کوٹھی اندر سے خوب صورت اور خاص طور سے لان بے شمار پھول دار پودوں سے سجا ہوا تھا۔ ملازمہ اسے خوب صورتی سے سجی ایک نشست گاہ میں لے آئی۔

''آپ بیٹھیں... بیگم صاحبہ ابھی آ رہی ہیں۔''

کچھ دیر بعد ایک تقریباً پینتیس برس کی خوبصورت عورت اندر آئی۔ صبیح کھڑا ہو گیا۔ ''السلام علیکم... مجھے صبیح سلطان کہتے ہیں۔''

''عظمت عبدالحمید۔'' اس نے تعارف کرایا۔ ''میں آپ کو جانتی ہوں، آپ کو تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔''

صبیح کچھ دیر خاموش رہا۔ عظمت اس کی مشکل بھانپ گئی۔ اس نے خود کہا۔ ''میں آج تک نہیں جان سکی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟''

''ان دنوں ان کی کیفیت کیسی تھی؟''

''بہت اچھی ہوئی... میں بتا نہیں سکتی کہ وہ بالکل بدل کر رہ گئے تھے۔''

''ان کا رویہ درشت ہو گیا تھا؟''

''نہیں، اس کے برعکس وہ بہت نرم اور خاموش ہو گئے تھے مگر بعض اوقات ان کے تاثرات ایسے ہو جاتے تھے کہ مجھے بھی ڈر لگتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے اندر کوئی بہت خوف ناک چیز چھپی ہے جو باہر آ گئی تو نہ جانے کیا ہو گا؟''

''یہ تبدیلی کب سے آئی تھی؟''

''جب سے انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا، اس کے بعد سے ان کی یہ کیفیت تھی۔''

صبیح چونکا۔ ''ہارٹ اٹیک... کتنی شدت کا تھا؟''

''بہت شدید۔'' عظمت نے بتایا۔ ''جب انہیں اسپتال پہنچایا گیا تو وہ طبی طور پر مر چکے تھے لیکن ڈاکٹروں نے کوشش کر کے ان کے دل کو پھر چلا دیا تھا۔''

صبیح ہل کر رہ گیا۔ بالکل وہی ہوا تھا جو اس کے ساتھ ہوا تھا اور اب تک ہو رہا تھا۔ ''آخری دنوں میں وہ زیادہ تر کیا کرتے تھے؟''

''ان کا بیشتر وقت اپنی اسٹڈی میں گزرتا تھا اور وہاں سے وہ صرف کھانے کے وقت یا کہیں باہر جانے کے لیے نکلتے تھے۔''

صبیح کو خیال آیا اور اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں عبدالحمید کی اسٹڈی دیکھ سکتا ہوں؟''

عظمت نے اسے دیکھا۔ ''مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں نے اپنا شوہر کھویا ہے لیکن اس کی وجہ سے آپ نے اپنی اکلوتی بچی کھو دی ہے۔ مجھے آپ کے لیے کچھ کر کے خوشی ہو گی۔ آپ ضرور میرے شوہر کی اسٹڈی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے آپ کچھ لینا پسند کریں گے؟''

''صرف ایک گلاس پانی۔'' اس نے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کسی کے گھر آ کر کچھ کھانے پینے سے انکار حد درجے بدتہذیبی ہوتی ہے۔ عبدالحمید اس کی بیٹی کا قاتل تھا لیکن اس میں اس کے گھر والوں کا کوئی قصور نہیں تھا جبکہ وہ خود بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ عظمت نے اصرار کیا تو وہ چائے کے لیے مان گیا۔

پہلے ملازمہ اس کے لیے چائے لائی اور چائے کے بعد عظمت اسے عبدالحمید کی اسٹڈی میں لے کر آئی۔ یہ شان دار اور بے شمار کتابوں سے سجی ہوئی اسٹڈی تھی جس میں لکھنے اور دوسرے کاموں کے لیے ایک بڑی سی میز تھی جو آبنوس سے بنی تھی۔ عبدالحمید خاصا دولت مند آدمی لگ رہا تھا۔ یقیناً ایک پروفیسر کی آمدنی اتنی نہیں ہوتی کہ وہ ایسی کوٹھی بنا سکے یا اس میں اتنی شان دار اسٹڈی سجا سکے۔ شاید اس کا کوئی اور بھی ذریعۂ آمدنی تھا۔

''آپ یہاں جو چاہے اور جب تک چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔'' عظمت نے اس سے کہا۔ ''میں ذرا اپنے کچھ کام نمٹا لوں۔''

''ضرور۔'' صبیح نے سکون کا سانس لیا ورنہ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی موجودگی میں وہ کس طرح کھل کر اسٹڈی میں اپنے مطلب کی چیز دیکھ سکے گا۔ عظمت کے جانے کے بعد اس نے سب سے پہلے میز پر بکھرے کاغذات کا جائزہ لیا اور ایک اسکیچ شدہ کاغذ نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ یہ دوسرے کاغذات کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ باہر کھینچا۔ یہ عام سا پیلے رنگ کا اسکیچ پیپر تھا۔ اس پر چار نام لکھے تھے اور ہر نام کے ساتھ ایک انسانی اسکیچ تھا۔ اس کی توجہ آخری نام نے مبذول کرا لی۔ یہ نام رمشا کا تھا اور اس کے سامنے ایک بچی کا اسکیچ تھا۔ اس سے اوپر تین نام تھے۔ صمد اللہ، ہاشم خان اور منور خاور۔ یہ تینوں نام اس کے لیے اجنبی تھے۔ اس نے کاغذ ایک طرف رکھ دیا پھر دوبارہ کاغذات کھنگالنے لگا۔ اسے ان میں کمپیوٹر پرنٹ آؤٹ کا ایک پلندا ملا جو انٹرنیٹ سے ڈاؤن

www.kahopakistan.com

لوڈ کر کے پرنٹ کیے گئے تھے۔ اس نے ان کا معائنہ کیا تو اسے دھچکا لگا۔ یہ سارے مضامین انسان پر طاری ہونے والی عارضی موت کے بارے میں تھے۔ اس نے اس قسم کے سارے پرنٹ آؤٹ جمع کیے۔ ان کو تفصیل سے دیکھنے کا تو موقع نہیں تھا۔ مسز عبدالحمید کا تعاون پر مبنی رویہ دیکھ کر اسے امید تھی کہ وہ اسے یہ کاغذات لے جانے کی اجازت دے دیں گی۔ جب وہ کاغذات سمیٹ رہا تھا تو اسے ان کے نیچے سے ایک ہرے رنگ کی چھوٹی سی اور بہت پرانی کتاب ملی جس کا نام "AFTER LIFE" تھا۔ اسے 1935 میں ممبئی کے کسی اسمتھ بک ہاؤس نے شائع کیا تھا۔ اس کا مصنف جے پی ابراہام ایک انگریز تھا اور اس کتاب کا موضوع مر کر زندہ ہونے والے افراد کے تاثرات پر مبنی تھا۔ اس نے کتاب بھی الگ کر لی۔ وہ اسٹڈی سے باہر آیا تو ملازمہ اس کی منتظر تھی۔

''کیا مسز عبدالحمید زحمت کریں گی؟ اب مجھے جانا ہے۔''

''میں بلاتی ہوں۔''

ایک منٹ بعد عظمت اسٹڈی میں تھی۔ صبیح نے اسے اسکیچ والا کاغذ نہیں دکھایا، وہ اس نے پرنٹ آؤٹ کے درمیان رکھ دیا تھا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ شاید وہ اسے لے جانے کی اجازت نہ دے۔ ''مسز عبدالحمید! مجھے یہ چیزیں کچھ کام کی لگی ہیں۔ ممکن ہے ان سے آپ کے شوہر کی اس ذہنی کیفیت پر کچھ روشنی پڑے جس میں وہ آخری دنوں میں تھے۔ کیا میں انہیں دیکھنے کے لیے لے جا سکتا ہوں؟ یہ میرے پاس آپ کی امانت ہوں گے۔ میں دیکھ کر واپس کر دوں گا۔''

''کیوں نہیں۔'' عظمت نے کتاب اور کاغذات دیکھے۔ اس کے انداز میں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سادہ گھریلو عورت تھی جسے ان معاملات کا علم نہیں تھا۔ ممکن ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو صبیح کو اتنی آسانی سے یہ چیزیں لے جانے کی اجازت نہ ملتی۔ اس کا شکریہ ادا کر کے وہ وہاں سے نکل آیا۔ گھر آتے ہی اس نے اپنے اسٹڈی روم کا رخ کیا اور وہاں جاتے ہوئے ارشد سے کافی اور سینڈوچز بنانے کو کہہ دیا۔ اب اس کا ارادہ باہر جانے کا نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے ان چیزوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے کتاب دیکھی لیکن نصف کتاب کے مطالعے سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ پرنٹ آؤٹس کی طرف متوجہ ہوا۔ ان میں کئی کام کی چیزیں تھیں۔ یہ ساری چیزیں جدید تحقیق یا مضامین پر مشتمل تھیں۔ صبیح ان کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نظر ایک مضمون پر پڑی۔ اس کا عنوان تھا ''قدرت میں مداخلت۔''

صبیح کو یہ دلچسپ لگا۔ مضمون میں لکھنے والے نے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جن لوگوں کو قدرت کی طرف سے کسی قسم کی آگاہی ملتی ہے اور وہ اسے غلط استعمال کرتے ہیں تو ان کو اس کا تاوان بھی دینا پڑتا ہے۔ عام طور سے یہ تاوان اپنے اور اپنے پیاروں کی زندگی کی قربانی کی صورت میں دینا پڑتا ہے۔ صبیح کے لیے ان مضامین میں زیادہ... دلچسپی کا سامان نہیں تھا۔ البتہ بعض باتیں قابلِ توجہ تھیں۔ خاص طور سے اس مضمون کی۔

'کیا مجھے تاوان دینا ہوگا؟' اس نے سوچا۔

اس کی قدرت کے کاموں میں مداخلت کا جو نتیجہ نکلا تھا، اس نے اسے دہلا دیا تھا۔ کتنی معمولی سی بات تھی، اس نے دو حادثاتی طور پر مرنے والے افراد کی جان بچائی تھی اور انہوں نے دوسروں پر کیا قیامت ڈھادی تھی۔ تیسری فرد صرف آئینہ باقی تھی اور اس کا بچایا جانا کیسا تباہی لاتا اس کا پتا آنے والے وقت میں ہی چلتا۔ اچانک اسے خیال آیا۔ کیا وہ اس تباہی کو روک نہیں سکتا؟ یہ اس کی ذمے داری تھی کیونکہ اس نے آئینہ کی موت کو روک دیا تھا۔ اسے یہ بات عجیب سی لگی۔ اس کا ایمان تھا کہ جب موت آتی ہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس نے ان لوگوں کو بچایا کیونکہ ابھی ان کا وقت نہیں آیا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ڈاکٹر کسی مریض کو موت کے منہ سے واپس کھینچ لیتا ہے اور یہ یقیناً قدرت کے کاموں میں مداخلت نہیں ہوتی۔ وہ خود کو تسلی دے رہا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب طفل تسلی ہے۔ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کے سامنے تھا۔

عبدالحمید کے ہاتھ کا بنا ہوا اسکیچ... پھر اس نے جو مضامین پرنٹ آؤٹ کیے تھے اور یہ کتاب وضاحت کے لیے کافی تھی کہ اس پر اصل میں کیا گزری تھی۔ وہ بھی صبیح کی طرح عارضی موت کا شکار ہوا اور بچنے کے بعد اسے بھی دوسروں کی موت کو قبل از وقت دیکھ لینے کی صلاحیت ملی تھی۔ اس نے چار افراد کی جان بچائی جس میں اس کی بیٹی رمشا بھی شامل تھی۔ پھر اس نے رمشا کو قتل کر دیا۔ اس نے اسکیچ نکالا اور اس میں باقی تین افراد کے نام پر غور کیا۔ اس نے عظمت سے اس اسکیچ پر لکھے ناموں کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا کیونکہ اس نے اسے اسکیچ کے بارے میں... نہیں بتایا تھا۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ اسے پوچھنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے، وہ ان کے بارے میں جانتی ہو۔ اس کے پاس عبدالحمید کے گھر کا نمبر تھا، اس نے کال کی۔ فون ملازمہ نے اٹھایا۔ صبیح نے تعارف کرا کے کہا۔

''مجھے عظمت بیگم سے بات کرنی ہے۔''

''ایک منٹ انتظار کیجیے گا صاحب۔'' اس نے کہا اور چلی گئی۔

چند منٹ کے بعد عظمت لائن پر تھی۔ ''جی صبیح صاحب... فرمائیے؟''

''پہلے تو میں زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' صبیح نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ نرمی سے بولی۔ ''میں آپ کو پہلے بھی کہہ چکی ہوں، مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہوگی۔''

''میرے پاس کچھ نام ہیں جو آپ کے مرحوم شوہر نے ایک جگہ کاغذ پر تحریر کیے ہیں۔ میں نام دہرا رہا ہوں، آپ یہ بتائیں کہ آپ ان سے واقف ہیں؟''

''آپ نام بتائیے؟''

صبیح نے اسے نام بتائے لیکن وہ ان سے ناواقف نکلی۔ ''سوری صبیح صاحب... میں ان ناموں سے انجان ہوں۔ ہمارے جاننے والوں میں یہ نام نہیں ہیں۔''

صبیح کو مایوسی ہوئی۔ ''کوئی بات نہیں مسز عبدالحمید... میں ایک بار پھر زحمت دینے کی معذرت چاہوں گا۔''

فون بند کر کے اس نے اسکیچ والا کاغذ اٹھایا۔ ''صمد اللہ، ہاشم خان، منور خاور۔'' اس نے نام دہرائے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان کے بارے میں کس طرح معلوم کرے؟ اسے خیال آیا اگر ان ناموں والے افراد کے ساتھ کوئی واقعہ ہو چکا ہے تو اس کا ذکر یقیناً اخبار میں آیا ہوگا۔ شام ہو چکی تھی، اس نے ارشد کو بلایا۔ وہ آ گیا۔ ''جی صاحب!''

''ارشد... گزشتہ کتنے عرصے کے اخبار گھر میں موجود ہیں؟''

''دو مہینے کے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''جب آپ پڑھ لیتے ہیں تو میں اسٹور روم میں ان کو ترتیب سے رکھ دیتا ہوں... جیسا کہ آپ نے حکم دے رکھا ہے۔''

صبیح کو یاد آیا، اس نے اپنے کام کی وجہ سے اخبارات کو مخصوص ترتیب سے رکھنے کا حکم دیا ہوا تھا اور ساتھ ہی گھر میں کم سے کم دو مہینے کے اخبارات رکھنے کو کہا تھا تاکہ اسے کسی مخصوص دن کے کسی اخبار کی ضرورت ہو تو وہ آسانی سے مل جائے۔ اس نے ارشد کو ایک اخبار کا نام بتایا۔ ''یہ گزشتہ دو مہینے کے پورے نکال کر یہاں لے آؤ... ابھی۔''

''جی صاحب! میں لاتا ہوں۔'' ارشد نے کہا اور چلا گیا۔ اخبار خاصا بڑا ہوتا تھا اور دو مہینے کے شماروں کا وزن ٹھیک ٹھاک بن جاتا تھا اس لیے ارشد کو تمام اخبارات اسٹڈی تک لانے میں کئی چکر لگانے پڑے۔ پھر صبیح نے اپنی نگرانی میں ان اخبارات میں سے کام والے حصے نکلوائے اور جو بے کار تھے، ان کو واپس اسٹور میں رکھوا دیا۔ اس کام میں رات ہو گئی۔ ارشد پہلے ہی اپنے وقت سے زیادہ رک گیا تھا۔ اسے چھٹی دے کر صبیح نے باہر کھانے کا سوچا۔ آج اس نے بہت متحرک دن گزارا تھا اور اس لیے اسے بھوک لگ رہی تھی۔ پرانے اخبارات میں مٹی تھی، اس کا حلیہ بھی خراب ہو گیا تھا اس لیے اس نے پہلے نہا کر کپڑے بدلے۔ وہ جب کپڑے پہن رہا تھا تو موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل دیکھا۔ اس پر ڈاکٹر آئینہ کا نمبر آ رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو... کیسے ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں اور تم کیسی ہو؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ میں نے سوچا کہ آپ کی خیریت معلوم کر لوں۔''

''کیوں، کیا میری خیریت کو کچھ ہونا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی۔'' اس نے کہا۔ ''کیا آپ کو اچھا نہیں لگا؟''

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے تمہارا کال کرنا اچھا لگا ہے۔'' صبیح نے کہا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں ابھی ہاسٹل کی طرف جا رہی ہوں۔''

''میں ڈنر کے لیے نکل رہا ہوں، اگر تم کہو تو تمہاری طرف آ جاؤں؟ آج ڈنر تم میرے ساتھ کرو۔''

آئینہ خوش ہو گئی۔ ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔''

''مجھے کوئی زحمت نہیں ہوگی۔'' اس نے کہا۔ ''میں کتنی دیر میں پہنچوں؟''

''مجھے بس آدھا گھنٹا لگے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے ہاسٹل تک آنے میں اتنا وقت تو لگ جائے گا۔ میں بس نکل رہا ہوں۔'' صبیح نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی گاڑی میں آئینہ کے ہاسٹل کی طرف جا رہا تھا۔ ابھی ساڑھے سات بجے تھے اسے امید تھی کہ وہ دس بجے سے پہلے آئینہ کو اس کے ہاسٹل چھوڑ دے گا۔ اسے اچانک ہی آئینہ کو ڈنر پر مدعو کرنے کا خیال آیا تھا۔ اس کی کوئی واضح وجہ اس کے ذہن میں نہیں تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے آئینہ کو کیوں کہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ واحد فرد رہ گئی تھی جس

www.kahopakistan.com

کی اس نے جان بچائی تھی اور اب وہ اس سے وابستہ تباہی کا انتظار کر رہا تھا۔ کیا وہ اسے روکنا چاہتا تھا؟ اس سوال کا جواب اس کے ذہن میں واضح نہیں تھا۔ سڑکوں پر خاصا رش تھا اس لیے کئی جگہ اسے رفتار کم کرنا پڑی۔ وہ ہاسٹل پہنچا تو آئینہ تیار ہو کر اس کی منتظر تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ ساڑی میں اس کا سراپا دلکش لگ رہا تھا۔ وہ اس کی نظریں محسوس کر کے شرما گئی۔

''کیسے ہیں آپ؟''

صبیح جیسے چونکا۔ ''ہاں، ٹھیک ہوں۔''

''آپ کے بازو کا زخم کیسا ہے؟ آپ نہائے ہیں نا؟''

''اب تو بالکل خشک ہو گیا ہے۔'' اس نے آئینہ کو تسلی دی۔

کچھ دیر بعد دونوں شہر کی سڑکوں پر تھے۔ شہر کے پُرسکون گوشے میں ایک چھوٹا سا چائنیز ریسٹوران تھا اور یہ صبیح کا پسندیدہ تھا۔ اس لیے جب چائنیز کا موڈ ہوتا تو وہ یہیں کا رخ کرتا تھا۔ اس نے آئینہ سے پہلے ہی پوچھ لیا تھا، اسے بھی چائنیز پسند تھا۔ وہ ریسٹوران دیکھ کر بولی۔ ''ارے... یہاں تو میں کئی بار آ چکی ہوں۔''

''اوہ، میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں سرپرائز دوں گا۔'' اس نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ ''یعنی تمہیں یہاں کے ذائقوں کا پتا ہے۔''

''سارے تو نہیں لیکن سوپ اور فرائڈ رائس واقعی کمال کے ہوتے ہیں۔''

''اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔''

وہ اندر آئے، ہیڈ ویٹر صبیح کو پہچانتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے کہاں بیٹھنا پسند ہے۔ وہ اسے وہیں لایا۔ یہ دوسری منزل پر ٹیرس کے ساتھ گولائی میں ایک چھوٹی سی جگہ تھی جس کی کھڑکیاں سامنے پارک کی طرف کھلتی تھیں۔

''کتنی خوب صورت جگہ ہے۔ میں پہلے یہاں نہیں آئی۔ ہم کولیگ آتے تو زیادہ تر نیچے ہی بیٹھتے ہیں اور گرمی زیادہ ہو تو عقبی باغ میں چلے جاتے ہیں۔''

''میں جب آتا ہوں، یہیں بیٹھتا ہوں۔ چاہے سردی ہو یا گرمی۔'' اس نے کہا۔ ''کھانے سے پہلے کیا لو گی؟''

''ظاہر ہے سوپ۔'' آئینہ نے جواب دیا۔

صبیح نے سوپ کا آرڈر دیا۔ آئینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''آپ چند دن میں کچھ کمزور ہو گئے ہیں۔''

''اچھا۔'' وہ حیران ہوا۔ ''مجھے تو محسوس نہیں ہوا۔''

''میں نے اس دن بھی آپ کو دیکھا تھا جب آپ نے مجھے بچایا تھا اور آج بھی دیکھا ہے تو خاصا فرق ہے۔ اتنا کہ محسوس ہوتا ہے۔''

''شاید۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''آپ کسی ٹینشن میں ہیں؟''

''ٹینشنز تو زندگی کے ساتھ ہیں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''چھوڑیں، آپ انجوائے کریں۔''

''صبیح! اگر آپ ٹینشن میں ہوں گے تو میں بھی انجوائے نہیں کر سکوں گی۔''

''وہ کیوں؟'' صبیح نے اسے دیکھا۔

''پتا نہیں لیکن میں ایسا محسوس کرتی ہوں۔'' اس نے نظریں چرائیں۔ ''اور... اور ان دنوں میں آپ کو بہت سوچتی رہی ہوں۔''

''آئینہ! مجھ میں سوچنے یا کھوجنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''یہ آپ کا خیال ہے۔'' وہ اب بھی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ وہ اپنی بات پر قائم تھی۔ دونوں چپ ہو گئے۔ کچھ دیر میں سوپ آ گیا۔ پیالوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور ایک چھوٹی سی ٹرے میں ساسز تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی پسند کے لحاظ سے ساسز ڈالے اور سوپ پینے لگے۔ صبیح نے اچانک کہا۔

''تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

وہ اس سوال پر کچھ دیر کے لیے خاموش رہی پھر نیپکن سے منہ صاف کیا۔ ''کیونکہ ابھی تک میں اپنے گھر والوں کی کفالت کرتی آئی ہوں۔''

''تمہارے والد، بھائی نہیں ہیں؟''

''سب ہیں لیکن ہم پر ایک مشکل آ گئی تھی۔'' اس نے کہا اور اسے اپنے گھر کی کہانی سنانے لگی۔ ''اب تک میرے گھر والے میرے چچا کے گھر رہ رہے تھے لیکن اب میں نے انہیں یہیں بلانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی نے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما مکمل کر لیا ہے۔ اسے یہاں جاب مل جائے گی۔ اس سے چھوٹی بہن ہے، وہ اسکول میں ہے۔ میں ہاسٹل میں رہنے کے بجائے کرائے پر گھر لے لوں گی۔ میرا گھر پھر سے مکمل ہو جائے گا۔''

''میرا سوال ابھی باقی ہے۔''

''جب میرے بھائی کو ملازمت مل جائے گی، تب میں اس ذمے داری سے سبکدوش ہو جاؤں گی۔'' وہ مسکرائی۔ ''اور اس میں اب زیادہ وقت باقی نہیں رہا ہے۔''

اس کی ذمے داریاں ختم ہونے میں واقعی زیادہ وقت نہیں رہا تھا لیکن وہ اس تباہی سے بے خبر تھی جو اس پر یا اس کی وجہ سے کسی دوسرے پر منڈلا رہی تھی... اور اس کی وجہ صرف صبیح کی طرف سے اس کی جان بچانا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے یہ بات کس طرح بتائے اور اگر وہ بتائے گا تو کیا وہ اس کی بات کا یقین کر لے گی؟ وہ آئینہ کی آواز پر چونکا۔ ''آپ کس سوچ میں گم ہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بولا۔ ''تمہارا کوئی آئیڈیل ہے؟''

اس نے غور سے صبیح کو دیکھا۔ ''ابھی تک تو نہیں تھا لیکن اب کچھ کچھ ہو گیا ہے۔''

''اکثر آئیڈیل دھوکا دے جاتے ہیں۔'' صبیح نے کہا۔

''ہاں، آئیڈیل دھوکا کھانے کا نام ہے لیکن انسان اپنی پسند کا دھوکا کھانا چاہے تو اس میں کیا حرج ہے؟'' آئینہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

''کسی نے تمہیں پروپوز کیا؟''

''ہاں کیا کچھ لوگوں نے۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''ایک تو وہی امیر زادہ ہے جس کی وجہ سے ہم دربدر پھر رہے ہیں۔''

''میرا مطلب ہے، کسی نے خلوص سے تمہیں پروپوز کیا ہے؟''

''نہیں... یہاں ایک ڈاکٹر تھا جو پینے پلانے کا عادی تھا اور چاہتا تھا کہ میں اس سے شادی کر کے اس کا گھر چلاؤں تاکہ وہ بے فکری سے اپنی کمائی شراب میں خرچ کر سکے۔''

''اوہ... لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی نہ کوئی اچھا آدمی ضرور ملے گا۔''

''اچھا آدمی۔'' اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ''ابھی تک تو کوئی اچھا آدمی مجھے ملا تو اس نے بس یہی دعا دی ہے۔''

صبیح کو احساس تھا کہ بات ذرا غلط سمت میں جا رہی ہے اس لیے اس نے بات کا رخ بدل دیا۔ ''تم کھانے میں کیا پسند کرو گی؟''

آئینہ کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ اپنی حد سے نکل رہی ہے اس لیے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ''اوہ... میں بھول گئی تھی کہ مجھے زبردست بھوک لگی ہے اور اس سوپ نے بھوک مزید چمکا دی ہے۔''

وہ ڈشز پسند کرنے لگی اور صبیح نے ویٹر کو بلا کر اسے ڈشز نوٹ کرائیں۔ ویٹر کے جانے کے بعد آئینہ نے کہا۔ ''سوری صبیح... میں شاید اپنی حد سے تجاوز کر گئی تھی۔''

صبیح نے گہری سانس لی۔ ''ڈونٹ وری... ہر انسان کبھی نہ کبھی اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔''

''آپ خیال مت کیجیے گا۔ بعض اوقات لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنے والے خود بھی مرہم کے محتاج ہوتے ہیں۔''

''یہاں ہر فرد اندر سے زخمی ہے۔'' صبیح نے کہا۔

کچھ دیر میں ویٹر کھانا سرو کرنے لگا اور وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ جب ڈنر ختم ہوا تو ساڑھے نو بج چکے تھے اور آئینہ کو آدھے گھنٹے کے اندر واپس ہاسٹل پہنچنا تھا اس لیے وہ اٹھ گئے۔ صبیح نے تیز ڈرائیونگ کی اور اسے ٹھیک دس بجنے میں دو منٹ پہلے ہاسٹل کے گیٹ پر پہنچا دیا۔

''اتنے اچھے ڈنر اور بروقت پہنچانے کا شکریہ۔'' آئینہ نے کہا اور نیچے اتر گئی۔ وہ گھوم کر اس کی طرف والی کھڑکی پر آئی اور ذرا جھک کر بولی۔ ''ویسے وہ اچھے آدمی آپ ہی کیوں نہیں بن جاتے۔''

اس سے پہلے کہ صبیح کچھ کہتا، وہ پلٹی اور دوڑتی ہوئی گیٹ کے اندر چلی گئی جس پر اس وقت تالا لگا دیا جاتا تھا اور اس کے بعد ہاسٹل کی مالکن کی مرضی کے بغیر نہ کوئی باہر آتا تھا اور نہ کوئی اندر جاتا تھا۔ صبیح کو کچھ دیر سے سمجھ میں آیا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے۔ 'آئینہ! تم نے غلط آدمی منتخب کیا ہے۔' اس نے تھکے ہوئے انداز میں سوچا۔ 'میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'

وہ واپس گھر میں داخل ہوا تو اسے گھر کا سناٹا شدید تر محسوس ہوا۔ ماں باپ... پھر ریحانہ اور رمشا بھی اس کی زندگی سے نکل گئی۔ وہ ایک سیلیبرٹی تھا۔ اس کا نام تھا اور اس کے چاہنے والے بے شمار تھے۔ فیس بک پر اس کا فین کلب تھا اور اس کے الفاظ کی اہمیت اقتدار کے ایوانوں تک میں تھی۔ مادی خوشحالی بھی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے پاس اب کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ اتنا بھی نہیں رہا کہ وہ کسی کو کچھ دے سکے۔ کپڑے بدل کر اس نے اسٹڈی میں جا کر اخبارات دیکھے اور اچانک اس کا موڈ بدل گیا۔

وہ شروع سے جاننے کا شیدائی تھا۔ اس کا ذوقِ جستجو انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔ بچپن میں ایک فقیر نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ وہ اپنے علم سے نقصان اٹھائے گا کیونکہ صرف جان لینا کافی نہیں ہوتا جب تک کہ اس پر عمل نہ کیا جائے۔ اس سے یہی غلطی ہوئی۔ اس نے علم تو بہت حاصل کیا لیکن اس پر عمل بہت کم کیا اور آج اس کے پاس گنوانے کے لیے سوائے دنیا کے اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

www.kahopakistan.com

اسے لگا جیسے آج اس کی جاننے کی بھوک بھی مٹ گئی ہے۔ اب وہ جاننا نہیں چاہتا، اسے معلوم تھا کہ ان اخبارات سے اسے مطلوبہ خبریں مل جائیں گی یا ممکن ہے، وہ خبریں سامنے آئی ہی نہ ہوں مگر وہ اندر سے جان گیا تھا۔ اب اسے ظاہری طور پر جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسٹڈی کی روشنی بند کر کے باہر آ گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کل ارشد سے کہہ دے گا کہ یہ اخبارات دوبارہ اسٹور میں رکھ دے۔ وہ سب جان چکا تھا اور اسے مزید جاننے کی جستجو نہیں رہی تھی۔ سوائے ایک بات کے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آئینہ کو بچانے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

☆☆☆

آئینہ اپنی بات کہہ کر خود بھی ششدر رہ گئی کیونکہ یہ جملہ کہنے سے ایک لمحے پہلے تک اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے جب اس نے کہہ دیا تو وہ بوکھلا گئی اور پھر دوڑتی ہوئی اندر آ گئی۔ چوکیدار اس کی جلدی دیکھ کر کہنے لگا۔ ''آرام سے بی بی! ہم اتنی جلدی نہیں بند کرے گا۔ آپ آرام سے آؤ۔''

لیکن وہ اس کی بات سنے بغیر اسی طرح دوڑتی ہوئی اندر آئی البتہ لابی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اپنی چال نارمل کر لی تھی... کیونکہ وہاں بہت سی لڑکیاں اس کی منتظر تھیں۔ وہ اندر آئی تو سب نے اسے گھیر لیا۔ ''بی بنو! مزے کر کے آ گئیں۔ کیا کھلایا انہوں نے؟''

''چائنیز۔'' اس نے پرس صوفے پر رکھا۔ اگر وہ تھکن کا کہتی تو اسے بہت سے معنی خیز جملے سننے کو ملتے اس لیے وہ اس وقت تک ان سے بیٹھ کر باتیں کرتی رہی جب تک وہ اس کی طرف سے مایوس نہیں ہو گئیں۔ ایک نے تو جل کر کہہ دیا۔ ''طے کر کے آئی ہو کہ کیا کہنا ہے اور کیسے پوز کرنا ہے۔''

''تم جو چاہو سمجھو۔'' وہ مسکرائی اور اٹھ گئی۔ ''میں ذرا چینج کر لوں۔ کوئی اللہ کی بندی میرے لیے چائے کا کہہ دے۔''

وہ کپڑے تبدیل کرنے اوپر آئی تو کمرے میں آتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ وہ نہیں جانتی تھی کیوں رو رہی ہے مگر وہ خود کو روک نہیں پا رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی روتی رہی جب تک اس کا دل ہلکا نہیں ہو گیا۔ پھر اس نے اٹھ کر منہ دھویا اور کپڑے بدلے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ صبح صبیح کو کال کر کے اپنی بات پر معذرت کر لے گی۔ وہ اس پر کوئی بوجھ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اسے چائے کی خواہش نہیں رہی اس لیے وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ اسے تھکن محسوس ہونے لگی تھی حالانکہ وہ تین گھنٹے کے اندر واپس آ گئی تھی اور زیادہ چلی پھری بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود بدن میں جیسے تھکن سرایت کر گئی تھی۔ وہ کچھ دیر میں بے خبر سو گئی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ پہلے تو وہ سمجھی نہیں پھر وہ چونکی، سرہانے رکھا موبائل رہ رہ کر بج رہا تھا۔ اس کی آنکھ گھنٹی کی آواز کی وجہ سے کھلی تھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا، ایک اجنبی نمبر آ رہا تھا۔ اس نے کال کاٹ دی اس وقت وہ کوئی اجنبی نمبر ریسیو نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن جیسے ہی اس نے موبائل واپس رکھا اور کروٹ لے کر دوبارہ سونے کی کوشش کی بیل پھر بج اٹھی۔ اس بار اس نے غصے میں اٹھایا مگر اپنے بھائی کا نمبر دیکھ کر اس کا غصہ تشویش میں ڈھل گیا۔ وہ اس وقت کیوں کال کر رہا تھا، رات کے تین بجے تھے۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''شاہ نواز! خیریت تو ہے... اتنی رات کو کیوں کال کی؟''

''یہ شاہ نواز نہیں ہے۔'' دوسری طرف سے کسی نے بدتمیزی سے کہا۔

''تم کون ہو؟'' وہ گھبرا گئی۔ ''شاہ نواز کہاں ہے؟''

''شاہ نواز ہمارے پاس ہے۔ صرف شاہ نواز نہیں بلکہ تیرا باپ اور چھوٹی بہن بھی ہمارے پاس ہے۔''

آئینہ کے ہوش اڑ گئے۔ ''بکواس کر رہے ہو تم... جھوٹ بولتے ہو۔''

''اچھا۔'' وہ ہنسا۔ ''اپنے بھائی کا نمبر دیکھ کر بھی یقین نہیں آیا؟ تو ہمارا نمبر نہیں اٹھا رہی تھی اس لیے اس کے نمبر سے کال کی ہے۔ اب یقین نہیں آ رہا تو تیرے بھائی سے بات کراؤں؟''

''ہاں کراؤ۔'' وہ بولی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کا بھائی، باپ اور بہن کن لوگوں کے قبضے میں تھے۔ کچھ دیر بعد فون پر شاہ نواز کی آواز ابھری۔

''آئینہ باجی۔''

''شاہ نواز۔'' وہ تڑپ گئی۔ ''میرے بھائی، یہ کون لوگ ہیں؟ بابا اور میمونہ بھی تیرے ساتھ ہیں؟''

''ہاں باجی... ان لوگوں نے ہمیں پکڑ لیا ہے۔'' شاہ نواز بہت سہما ہوا لگ رہا تھا۔

''کون ہیں یہ لوگ؟''

''یہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' شاہ نواز کے بجائے اسی آدمی کی آواز آئی۔ ''ہم خان صاحب کے بندے ہیں۔''

''حمزہ خان؟'' وہ بولی۔

آدمی ہنسا۔ ''ٹھیک پہچانا... اب غور سے سنو اگر اپنے باپ، بھائی اور بہن کی زندگی چاہتی ہو تو کل دوپہر تک اپنے آبائی گھر پہنچ جاؤ۔''

''کیوں؟'' اس نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

''کیونکہ کل دوپہر تیرا رئیس خان سے نکاح ہے۔ اس کے بعد تیرے گھر والوں کو چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن اگر تو نہیں آئی تو...'' آدمی کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ ''تب بھی تیرے گھر والوں کو چھوڑ دیں گے لیکن ان میں سے ہر ایک کے کم سے کم چار ٹکڑے ہوں گے اور اپنی بہن کے بارے میں جانتی ہے نا؟ جوان ہے وہ۔'' یہ کہتے ہوئے آدمی کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

''سنو... میری حمزہ خان یا رئیس خان سے بات کراؤ۔'' آئینہ نے التجا کی۔ ''میرے گھر والوں کو چھوڑ دو۔''

''اگر تو رئیس خان کی گھر والی بن جائے تو تیرے گھر والوں کو چھوڑ دیں گے۔'' وہ ہنسا۔ ''یاد رکھنا... کل دوپہر بارہ بجے تک... اور اگر تو نہ آئی تو پھر ان تینوں کو دفنانے کے لیے تو آنا ہو گا نا... اور یاد رکھ، پولیس یا کسی اور کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ ان کو ہم نے اٹھایا ہے۔''

''میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔'' آئینہ کی آواز لرز رہی تھی۔

''تیری بہتری اسی میں ہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کر... کل دوپہر بارہ بجے تک آ جانا۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ آئینہ کانپ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کس سے مدد طلب کرے؟ پھر اسے صبیح کا خیال آیا۔

☆☆☆

صبیح دیر سے سویا تھا۔ بہت دیر تک اسے نیند نہیں آئی تھی اور جب نیند آئی تو اس کے کچھ دیر بعد ہی موبائل کی بیل نے اسے بیدار کر دیا۔ نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور وہ بہ مشکل اٹھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ وہ جھنجلا رہا تھا لیکن جب اسکرین پر آئینہ کا نام دیکھا تو اس کی جھنجلاہٹ تشویش میں بدل گئی۔ اتنی رات گئے کال کرنے کا مطلب تھا کہ وہ کسی مشکل میں ہے۔ صبیح کی چھٹی حس نے بتایا کہ وہ سچ مچ کسی مشکل میں ہے اور اس نے مدد کے لیے اسے کال کی ہے۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ دوسری طرف آئینہ ہذیانی کیفیت میں تھی۔

''صبیح پلیز... مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے... وہ میرے گھر والوں کو مار دیں گے... وہ مجھے بھی مار دیں گے۔'' آواز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کانپ رہی ہو۔

''آئینہ! آرام سے... آرام سے... کون تمہارے گھر والوں کو مار دے گا؟''

آئینہ خود پر قابو پانے لگی۔ ''حمزہ خان اور اس کا بیٹا رئیس خان... انہوں نے میرے بابا، بھائی اور بہن کو اغوا کر لیا ہے۔ ابھی ان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے میرے بھائی شاہ نواز سے میری بات بھی کرائی ہے۔''

صبیح کا ذہن اب پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اس طرح کال کرنے کا کوئی مقصد تو ہو گا؟ انہوں نے تمہارے سامنے کوئی مطالبہ رکھا ہے؟''

''ہاں، فون کرنے والے نے کہا ہے کہ اگر میں کل دوپہر تک اپنے آبائی گھر نہیں پہنچی تو میرے بابا، بھائی اور بہن کو قتل کر دیا جائے گا۔ بہن کے حوالے سے اس نے اور بھی دھمکیاں دی ہیں۔''

صبیح جانتا تھا کہ وہ بدمعاش، عورت کے حوالے سے کیا دھمکی دے سکتے تھے۔ ''اگر تم کل دوپہر تک اپنے آبائی گھر پہنچ جاؤ تو اس کے بعد کیا ہو گا؟''

''رئیس خان سے میرا نکاح۔'' آئینہ کے لہجے میں تلخی آ گئی پھر وہ رونے لگی۔ ''صبیح پلیز... کچھ کریں ورنہ میں مر جاؤں گی۔ اس ذلیل شخص سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں خودکشی کر لوں لیکن میں اپنے پیاروں کو مرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتی۔''

صبیح کو لگا کہ وہ آئینہ کے حوالے سے جس حادثے کا منتظر تھا، وہ قریب آ گیا ہے۔ اس نے کہا۔ ''تم حوصلہ رکھو... میں آ رہا ہوں۔''

''آپ کیا کریں گے؟''

''یہ میں وہیں آ کر بتاؤں گا لیکن تم خود کو لمبے سفر کے لیے تیار رکھنا۔''

''اوکے۔''

صبیح نے وقت دیکھا۔ ابھی صبح کے چار بجے تھے۔ اس نے آئینہ سے کہا۔ ''ہاسٹل کا گیٹ کتنے بجے کھلتا ہے؟''

''چھ بجے لیکن ایمرجنسی میں کسی وقت کہیں بھی جا سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم تیار رہو... میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔''

صبیح نے اٹھ کر کپڑے بدلے اور پھر اسٹڈی میں موجود اپنا سیف کھول کر کچھ چیزیں نکالیں۔ ارشد صبح دیر سے آتا اس لیے اس نے اس کے لیے ایک پرچہ لکھ کر رکھ دیا کہ

www.kahopakistan.com

وہ شہر سے باہر جا رہا ہے۔ بعد میں فون پر اس سے رابطہ کرے گا۔ آئینہ کا آبائی شہر دارالحکومت سے کوئی سو میل جنوب مشرق میں تھا۔ وہاں تک طویل فاصلے کا سوچ کر صبیح نے راستے میں ایک پیٹرول اسٹیشن سے گاڑی میں گیس اور پھر پیٹرول بھروا لیا تاکہ راستے میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ آئینہ سردی میں بھی ہاسٹل کے گیٹ کے سامنے موجود تھی اور بے قراری سے ٹہل رہی تھی۔ اس کی کار دیکھ کر وہ تیزی سے آگے آئی۔ اس نے ہاتھ میں ایک چھوٹا بیگ تھام رکھا تھا۔ صبیح نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور وہ اندر آ گئی۔ صبیح نے پوچھا۔

''ان لوگوں کی طرف سے پھر کوئی کال آئی؟''

''نہیں بلکہ وہ کال ریسیو بھی نہیں کر رہے ہیں۔ جس نمبر سے پہلے آئی تھی، وہ آن ہے۔ میرے بھائی کا نمبر اب بند جا رہا ہے۔''

''تمہارے گھر والے کہاں مقیم ہیں؟''

آئینہ چونکی۔ ''یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں۔'' اس نے موبائل نکال کر کوئی نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد رابطہ ہوا۔ ''چاچا جی! میں آئینہ بات کر رہی ہوں۔ بابا اور شاہ نواز کہاں ہیں؟'' وہ خاموش ہو کر سننے لگی۔ ''کب گئے اور کون تھا وہ؟''

پھر اس نے کال منقطع کر دی اور صبیح کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے شہر سے کوئی آدمی آیا تھا اور بابا اس کے ساتھ بھائی اور بہن کو لے کر چلے گئے۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہارے بابا سمجھ دار آدمی ہیں۔ یقیناً ان لوگوں نے کوئی دباؤ استعمال کیا ہوگا۔''

''کیسا دباؤ؟''

''ممکن ہے ان سے یہ جھوٹ بولا ہو کہ تم ان کے قبضے میں ہو اور وہ ان کے ساتھ جانے پر مجبور ہو گئے ہوں۔''

''ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اگر ایسی بات تھی تو وہ مجھ سے رابطہ کر سکتے تھے۔''

''بعض اوقات آدمی اتنا بدحواس ہو جاتا ہے کہ اسے سامنے کی بات سمجھ میں نہیں آتی اور جب سمجھ آتی ہے تب تک وہ پھنس چکا ہوتا ہے۔''

آئینہ پریشان تھی۔ ''اب کیا ہوگا؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''پہلے یہ تو بتاؤ اس معاملے میں تمہاری ترجیح کیا ہے؟''

''میں ہر صورت میں اپنے گھر والوں کو بچانا چاہتی ہوں۔''

''چاہے اس کے لیے تمہیں رئیس خان سے شادی کرنا پڑے؟''

آئینہ ہچکچائی۔ ''اگر اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہا تو یہ بھی کر گزروں گی۔''

صبیح اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ وہ جس سانپ سے بچ کر اپنے گھر سے نکلے تھے، وہی سانپ ایک بار پھر اس گھرانے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور اس بار بچنے کی کوئی امید بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ صبیح نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''تم مجھ سے کیا مدد چاہتی ہو؟''

اس نے بے بسی سے صبیح کی طرف دیکھا۔ ''سچی بات ہے، میں نہیں جانتی کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔ جب مجھ پر یہ افتاد پڑی تو اتنے بڑے شہر میں مجھے آپ ہی واحد آدمی نظر آئے جس سے میں مدد مانگ سکتی تھی۔''

صبیح نے کوئی جواب نہیں دیا، اس نے صرف سر ہلا دیا۔ وہ تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا اس لیے سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔

سات بجے وہ ہائی وے پر سفر کر رہے تھے جو آئینہ کے آبائی شہر تک جاتی تھی لیکن ناہموار راستوں اور پہاڑوں پر بل کھانے کی وجہ سے یہ اصل فاصلے سے کہیں زیادہ طویل راستہ تھا۔ ذرا آگے آنے والے ایک ریستوران کا بورڈ نظر آیا تو صبیح نے اس سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ناشتا کر لیا جائے۔''

آئینہ صبیح کی خاموشی اور کسی حد تک سپاٹ رویے سے دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ اس نے ایک تعلق کی بنا پر اسے کال کی تھی اور صبیح کے رویے میں اس تعلق کی ہلکی سی جھلک ہی نظر آئی تھی۔ اس نے یہ تک نہیں کہا تھا کہ وہ اس کا مسئلہ حل کر دے گا۔ آئینہ جانتی تھی کہ وہ قومی سطح کا جانا پہچانا شخص ہے اور اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ وہ چاہے تو اس کے گھر والوں کو بہ آسانی حمزہ خان کی قید سے نکلوا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے صبیح کو بتایا تھا کہ انہوں نے اس کے گھر والوں کی صحیح سلامت رہائی کے بدلے کیا شرط رکھی تھی۔ لیکن اس نے اب تک ایسا کوئی عندیہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے اثر رسوخ سے اس کی مدد کرے گا۔ ہاں، وہ اس کے ساتھ ضرور جا رہا تھا۔

آئینہ نے دوسری طرف دیکھا۔ ''میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''حالات کی وجہ سے؟''

''ظاہر ہے۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''میں آپ کی طرح اتنے مضبوط اعصاب نہیں رکھتی کہ ہر صورت میں نارمل رہوں۔''

''میرے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ ہر صورت میں نارمل رہیں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور کار کا رخ آنے والے ریستوران کی طرف موڑ دیا۔ ''ناشتا نہ سہی، تم چائے کافی تو لے لوگی۔''

آئینہ کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر وہ مجبوراً اس کے ساتھ ریستوران میں آ گئی۔ یہ درمیانے درجے کا ریستوران تھا۔ آئینہ کو حیرت ہوئی جب صبیح نے صرف چائے کا آرڈر دیا۔ اس نے ناشتا نہیں منگوایا تھا۔ یعنی اس کا بھی کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ آئینہ نے کہا۔ ''آپ میری وجہ سے بھوکے مت رہیں، کچھ کھا لیں۔''

''نہیں، مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔ میں دو وجہ سے یہاں رکا ہوں۔ ایک تو ابھی دوپہر میں بہت وقت ہے اور ہم یہاں سے ایک گھنٹے میں تمہارے شہر پہنچ جائیں گے اور دوسرے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

آئینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ صبیح کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ ''کیا بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟''

صبیح سوچ میں پڑ گیا۔ جب آئینہ کی کال آئی تو وہ بے ساختہ بغیر سوچے سمجھے حرکت میں آ گیا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے آنے کی وجہ وہ نہیں تھی جو وہ شروع میں سوچ رہا تھا۔ آئینہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ویٹر نے چائے اور اس کے لوازمات لا کر رکھ دیے۔ آئینہ نے دونوں پیالیوں میں چائے نکالی۔ اس نے چائے صبیح کی طرف بڑھائی۔ ''آپ نے بتایا نہیں؟''

صبیح نے پیالی تھام لی۔ ''آئینہ! تم نے ایک بات سوچی... اگر اس روز میں تمہیں اس حملہ آور سے نہ بچاتا تو آج تمہارے گھر والوں پر یہ آفت نہ آتی؟''

آئینہ ایک لمحے کو ششدر رہ گئی پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ ''کیا... کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مطلب تو میں خود بھی نہیں سمجھا ہوں۔'' صبیح نے سرد آہ بھری۔ ''بس ایک بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ قدرت کے کاموں میں مداخلت کبھی اچھی نہیں ہوتی۔ خاص طور سے جب ان کاموں کا تعلق کسی اور فرد سے ہو۔''

آئینہ اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''میں نے کہا نا کہ سمجھا تو میں بھی نہیں ہوں۔ لیکن میں نے جو جانا ہے، وہ تمہیں ضرور بتانا چاہ رہا ہوں۔''

صبیح نے اسے شروع سے بتایا جب اس نے خودکشی کی کوشش کی اور ڈاکٹرز نے اسے بچ بچ موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنے مسیحا کی موت دیکھی۔ پھر اس نے دوسروں کو بھی اسی روشن ہالے کے ساتھ دیکھا جس کا صاف مطلب موت تھا۔ صبیح نے اپنی اس صلاحیت کو انسانوں کو بچانے کے لیے استعمال کیا۔ جب اس نے یہاں تک بتایا تو آئینہ نے پوچھا۔

''تو کیا آپ نے کسی کو بچایا؟''

''تین افراد کو۔'' صبیح نے سر ہلایا۔ ''ان میں ایک بہت بوڑھا آدمی تھا، ایک تو جوان لڑکی اور تیسری فرد...''

''میں ہوں۔'' آئینہ نے اس کی بات مکمل کی۔

''درست۔'' صبیح نے سر ہلایا۔ ''لیکن میری اس مداخلت کا نتیجہ اتنا خوف ناک نکلے گا، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''کیوں... کیا ہوا؟'' آئینہ ڈر گئی۔ صبیح کے الفاظ سے زیادہ اس کے چہرے کے تاثرات نے اسے ڈرا دیا۔ صبیح نے اسے بتایا کہ بوڑھے اور لڑکی کو موت سے بچانے کا کیا نتیجہ نکلا تھا۔ آئینہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''یہ اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے؟''

''نہیں، یہ اتفاق نہیں ہے۔ اگر میں اس بوڑھے کو مرنے دیتا تو وہ تین افراد نہ مارے جاتے اور اگر لڑکی مر جاتی تو اس کے پورے گھر کو اس بھیانک انجام سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔''

آئینہ کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ مجھے بچانے کا بھی ایسا ہی کچھ نتیجہ نکلے گا؟ اور یہ سب جو ہو رہا ہے اسی وجہ سے ہو رہا ہے؟''

''مجھے یقین تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ نتیجہ یہ نکلے گا۔ تم خود دیکھ لو، حالات کس طرف جا رہے ہیں۔''

صبیح نے اسے عبدالحمید کے بارے میں نہیں بتایا جو اس کی بیٹی کا قاتل تھا۔ جو ایک بار پہلے اسے موت سے بچا چکا تھا اور تاوان میں اس نے اس کی جان بھی لی اور اپنی جان بھی دے دی۔ صبیح نے سوچا اور پھر آئینہ کو اس بارے میں بھی بتا دیا۔ آئینہ مزید زرد پڑ گئی۔ اس نے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ میں اس دنیا میں نہ رہوں؟''

''نہیں، ہو سکتا ہے اس کے علاوہ بھی کوئی حل ہو اور میں اسی حل کی تلاش میں تمہارے ساتھ وہاں جا رہا ہوں لیکن آئینہ... میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں نے جو کیا ہے، مجھے اس کا

www.kahopakistan.com

تاوان دینا پڑے گا... چاہے وہ کسی صورت میں بھی ہو۔''

آئینہ کانپ اٹھی۔ ''اگر یہ تاوان دینا لازمی ہے تو اس کے لیے سب سے بہتر میری جان ہے کیونکہ آپ نے مجھے بچایا اور یہ سب اسی وجہ سے ہو رہا ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے اگر اس روز میں اس حملہ آور کے ہاتھ ماری جاتی تو آج میرے گھر والے اس مشکل میں نہ ہوتے۔ صبیح! آپ مجھے... مجھے مار دیں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

صبیح نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہا نا، ہم اس مسئلے کا کوئی اور حل نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

آئینہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں... یہ مسئلہ رہے گا۔ وہ بہت زور آور لوگ ہیں، ہم ان سے لڑ بھی نہیں سکتے...''

''آئینہ! مجھے ایک کوشش کر لینے دو، اس کے بعد جو... ہوگا دیکھا جائے گا۔''

''جب وقت گزر جائے گا تو پھر کس طرح دیکھا جائے گا؟'' آئینہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ اس کے وجود میں اتنا ہیجان بھر گیا تھا کہ اگر یہ عوامی جگہ نہ ہوتی تو شاید وہ چیخ پڑتی۔

''پلیز! مجھ پر اعتماد رکھو۔'' صبیح نے دھیمے لیکن مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اگر مجھ پر نہیں ہے تو اللہ پر تو اعتماد ہوگا؟''

آئینہ خود پر قابو پانے لگی... کچھ دیر بعد اس کا ہیجان کم ہوا تو اس نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے... آپ خلوصِ دل سے میری مدد کر رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، میں نے بُرا نہیں منایا۔ میں خود بھی اس طرح کے مشکل حالات سے گزر چکا ہوں۔''

وہ چائے پی چکے تھے۔ آئینہ نے کہا۔ ''اب چلیں؟''

''نہیں، ہمیں کچھ وقت یہاں گزارنا ہوگا۔ ہم مقررہ وقت سے کچھ پہلے وہاں پہنچیں گے۔''

''تب وقت بالکل نہیں رہ جائے گا۔'' آئینہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ ہماری سوچ ہے۔ وقت ہمیشہ ہوتا ہے اور ہمیشہ رہے گا کیونکہ کاتبِ تقدیر نے جو لکھ دیا ہے، وہ ضرور پورا ہو گا۔''

''لیکن میرا موت سے بچ جانا...''

''میرا ایمان ہے کہ یہ ویسا ہی ہے جو کاتبِ تقدیر نے لکھا ہے۔''

''تب یہ سزا... یہ تاوان؟''

''یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی قتل کرے اور پھر اس کی سزا بھگتے۔ دونوں اس کی تقدیر میں لکھ دیے گئے ہوں گے۔''

''قاتل نہیں جانتا لیکن آپ اور میں جان گئے ہیں۔''

''جان کر کیے جانے والے کاموں کی سزا بھی زیادہ ہوتی ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

آئینہ اس کی بات سن کر چپ ہوگئی پھر بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن رئیس خان سے شادی مجھے کسی صورت منظور نہیں ہے۔''

''انسان، انسان کے آگے کبھی بھی مجبور نہیں ہوتا۔''

صبیح نے دوبارہ چائے منگوائی، ان کو کچھ دیر یہاں رکنا تھا اور یہ ریستوران اس قسم کا نہیں تھا جہاں آدمی کچھ کھائے پیے بغیر زیادہ دیر رک سکے۔ لیکن نو بجے تک وہ دونوں خود بھی اکتا چکے تھے۔ آئینہ نے کہا۔ ''اب چلیں... یہاں وحشت ہو رہی ہے۔''

صبیح بھی اٹھنے کی سوچ رہا تھا، وہ باہر نکل آئے۔ وہ کار میں آگئے۔ سورج کی تیز روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہائی وے پر جا رہے تھے۔ اس بار صبیح نے رفتار کم رکھی۔ رفتہ رفتہ پہاڑیاں اور ناہموار علاقہ کم ہو رہا تھا اور میدانی زمین ابھر رہی تھی۔ کوئی سوا گھنٹے بعد وہ شہر میں داخل ہوگئے۔ اسی وقت ایک جیپ تیزی سے ان سے آگے نکلی اور اس نے اچانک بریک لگائے۔ اگر صبیح بروقت کار کو نہ روکتا تو وہ جیپ سے ٹکرا جاتی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، آئینہ نے خوف زدہ انداز میں اس کا بازو پکڑ لیا۔

''یہ حمزہ خان کے آدمی ہیں۔''

جیپ سے تین مسلح افراد کودے اور انہوں نے کار کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں تھیں۔ ایک نے للکار کر کہا۔ ''لڑکی... باہر آجا۔''

''آئینہ! تم یہیں رکو۔'' صبیح کہتا ہوا نیچے اترا اور اس نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ ''کیا بات ہے، ہمیں کیوں روکا ہے؟''

''ہمیں یہ لڑکی چاہیے۔'' وہی آدمی بولا۔

''یہ لڑکی تمہیں نہیں مل سکتی؟''

''کیوں... تیری گھر والی ہے کیا؟'' اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

اس کی بات نے صبیح کو چونکا دیا اور اس نے بے ساختہ سر ہلایا۔ ''ہاں، میری گھر والی ہے۔''

آدمی نے بے یقینی سے کہا۔ ''اوئے... اس نے تجھ سے شادی کر لی؟''

''ہاں، چند دن پہلے ہی ہماری شادی ہوئی ہے۔ اب تم ہمیں حمزہ خان کے پاس لے چلو۔''

آئینہ دم بخود بیٹھی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ صبیح ایسی بات کہے گا۔ حمزہ خان کے آدمی بھی پریشان ہو گئے۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈاکٹر آئینہ کے گھر والوں کو کیوں اغوا کیا گیا ہے اور وہ یہاں کیوں آرہی ہے۔ انہیں حکم ملا تھا کہ شہر میں داخل ہونے والے راستے پر رہیں اور جیسے ہی ڈاکٹر آئینہ نظر آئے، اسے اپنے ساتھ حمزہ خان کی حویلی لے آئیں مگر یہاں یہ مسئلہ ہوگیا تھا۔ صبیح ان کا تذبذب دیکھ رہا تھا اور اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ زبردستی آئینہ کو نہ لے جائیں، وہ ان کو نہیں روک سکتا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ''دیکھو، اگر ایسی صورتِ حال میں تم مجھے نہیں لے کر جاؤ گے تو تمہارے آقا مشکل میں پڑ جائیں گے۔ تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو، میں صحافی صبیح سلطان ہوں۔''

''اوئے... مجھی کہوں یہ جانا پہچانا کیوں لگ رہا ہے۔'' دوسرا بولا۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ ٹی وی پر آتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، لے چلو دونوں کو۔'' ان کے سرغنہ نے بالآخر فیصلہ کر لیا۔

''میری کار...'' صبیح نے کہنا چاہا لیکن انہوں نے اسے دھکیل کر جیپ میں بٹھا دیا۔ وہ آئینہ کو بھی کار سے اتار کر لے آئے تھے۔ صبیح کو خاموشی سے بیٹھتے دیکھ کر اس نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ دو آدمی آگے بیٹھے تھے اور دو ان کے سامنے نشستوں پر بیٹھ گئے۔ جیپ گھوم کر ایک اور راستے سے آگے کی طرف روانہ ہوگئی۔ صبیح کی کار کو انہوں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ ایک کچے راستے سے گزر کر حمزہ خان کی حویلی میں داخل ہو رہے تھے۔

حمزہ خان مقامی جاگیردار تھا اور اس کے پاس کئی سو ایکڑ زمین تھی۔ اس نے اپنی بدمعاشی کا سکہ بٹھانے کے لیے کچھ اور چکر بھی چلا رکھے تھے۔ اس کے پاس کئی اشتہاری اور جیلوں سے بھاگے ہوئے مجرم تھے جن سے وہ کام لیتا تھا اور انہوں نے علاقے پر اس کی دہشت بٹھا رکھی تھی۔ اس کے بیٹے رئیس خان کو ڈاکٹر آئینہ پسند آگئی تھی اور اس نے اس یقین کے ساتھ رشتہ مانگا تھا کہ ماسٹر عنایت حسین انکار نہیں کرے گا۔ لیکن جب اس نے انکار کیا تو اس کا بیٹا بپھر گیا۔ عقل مند عنایت حسین اس کے عتاب کا شکار ہونے سے پہلے ہی گھر والوں کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔

آئینہ کے گھر والوں کے جانے کے بعد رئیس خان بہت عرصے انگاروں پر لوٹتا رہا۔ کئی سال گزر جانے کے بعد اس کی ضد کمزور ضرور ہوئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ پھر اتفاق سے اس نے آئینہ کو دارالحکومت میں دیکھ لیا اور اس بار اس کا صبر بالکل جواب دے گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بھیجا کہ وہ آئینہ کو اغوا کر لائیں اور اگر اس میں ناکامی ہو تو اسے قتل کر دیں۔ اس کے آدمی دونوں کام کرنے میں ناکام رہے۔ پھر اس نے دوسرا منصوبہ سوچا اور آئینہ کے باپ، بھائی اور بہن کو چالاکی سے اپنے قبضے میں کر کے یہاں بلوا لیا۔ حمزہ خان کو بعد میں پتا چلا تھا۔ اس پر اس نے بیٹے کو سخت سست کہا کیونکہ اپنے علاقے سے باہر کارروائی کرنے سے یہ خطرہ تھا کہ حالات اس کے قابو سے باہر ہو جائیں۔ ویسے بھی وہ ان دنوں قتل کے ایک کیس میں پھنسا ہوا تھا کیونکہ معاملہ سپریم کورٹ کے ازخود نوٹس میں چلا گیا تھا اور وہاں تک اس کی رسائی نہیں تھی۔ اس نے رئیس خان سے کہا۔

''یہ تو نے کیا نیا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے؟''

''اب تو کر دیا ہے بابا... مجھے ہر صورت وہ لڑکی چاہیے۔''

''تیرا کیا خیال ہے، وہ آجائے گی؟'' حمزہ خان نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ کسی ٹی وی چینل تک چلی گئی تو کل تک ہمارا نام ملک کا بچہ بچہ جان جائے گا۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑے گا بابا؟'' رئیس خان بے پروائی سے بولا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو ان تینوں کو کسی نامعلوم قبر میں دفن کرا دوں گا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ وہ آئے گی۔''

حمزہ خان اگرچہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن جاہل بھی نہیں تھا، حالات کو سمجھتا تھا۔ اس کا میٹرک پاس بیٹا کم عقل تھا جسے کسی چیز کا احساس نہیں تھا اور وہ صرف اپنی من مانی کرنا جانتا تھا۔ اس کی پہلے بھی ایک بیوی تھی جسے وہ منہ نہیں لگاتا تھا۔ جب اس کے آدمی جیپ میں آئینہ کو لے کر حویلی میں داخل ہوئے تو اس نے فخر سے باپ کو دیکھا۔ ''میں نہ کہتا تھا، وہ آئے گی۔''

لیکن حمزہ خان آئینہ سے زیادہ صبیح سلطان کو دیکھ کر دم بخود تھا۔ وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ ''یہ کہاں سے آگیا؟''

''یہ کون ہے بابا؟'' رئیس خان نے پوچھا۔

''تیرا باپ۔'' حمزہ خان نے بلبلا کر کہا۔ ''یہ بہت بڑا صحافی ہے۔ وزیراعظم تک پہنچ ہے اس کی۔''

رئیس خان نے بے یقینی سے دیکھا۔ ''تو یہ اس کے ساتھ کیوں آیا ہے؟''

www.kahopakistan.com

"ظاہر ہے، اس کی حمایت اور مدد کے لیے۔" حمزہ خان پریشان ہو گیا۔ "رئیس! تُو نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوتا بابا... دیکھ لیں گے۔" رئیس خان بے پروائی سے بولا۔ دونوں باپ بیٹے حویلی کے لان میں موجود تھے۔ صبیح اور آئینہ کو ان کے آدمی وہیں لے آئے۔ آئینہ خوف زدہ تھی لیکن صبیح پُرسکون تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"تم میں سے حمزہ خان کون ہے؟"

"آرام سے بات کر خان صاحب کے سامنے۔" ان کو لانے والا غرایا۔ "ادھر کسی کو بولنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"تو چپ کر۔" حمزہ خان نے خلافِ توقع اسے ڈانٹ دیا اور صبیح سے کہا۔ "میں ہوں حمزہ خان۔"

"میں صبیح سلطان ہوں۔" اس نے ہاتھ آگے کیا تو حمزہ خان نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ کو کون نہیں جانتا... آپ مشہور ٹی وی والے ہو۔"

رئیس خان کو اپنے باپ کی گرم جوشی پسند نہیں آئی۔ اس نے آئینہ کی طرف دیکھا۔ "تو کیا سمجھتی تھی، مجھ سے بچ جائے گی؟"

"اس کے بجائے مجھ سے بات کرو۔" صبیح نے کہا۔

"تجھ سے کیوں؟" رئیس غرایا۔

"کیونکہ یہ میری بیوی ہے۔"

رئیس خان کا منہ کھلا رہ گیا۔ پھر وہ دہاڑا۔ "بکتا ہے تُو... جھوٹ ہے یہ۔"

"یہ سچ ہے۔" صبیح نے جواب دیا۔ "ابھی تین دن پہلے ہم نے کورٹ میرج کی ہے۔"

"کیا ثبوت ہے تیرے پاس؟"

"ثبوت بھی لے آتے لیکن چھٹیوں کی وجہ سے ہمیں نکاح نامہ نہیں ملا ہے۔ ویسے تم چاہو تو اس کی تصدیق بھی ہو سکتی ہے۔"

حمزہ خان صورتِ حال سمجھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "آپ نے اس لڑکی سے شادی کر لی ہے؟"

"ہاں، یہ سچ ہے۔"

"اگر یہ تیری بیوی ہے تو تیرے پاس کیوں نہیں ہے، ہاسٹل میں کیوں رہ رہی ہے؟"

"اسے آج ہی میرے گھر منتقل ہونا ہے کیونکہ آج شام ولیمے کی تقریب ہو گی۔"

رئیس خان کو اس کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "ابھی تیری بچی کو مرے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا ہے اور تُو نے شادی رچا لی؟"

"میری بچی کی موت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" صبیح نے تحمل سے کہا۔ "اور آدمی کسی وقت بھی شادی کر سکتا ہے۔"

حمزہ خان نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ "اب تُو کیا کہتا ہے، میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ اس معاملے کو چھوڑ دے۔"

"اتنی آسانی سے نہیں بابا۔" رئیس خان کا لہجہ خطرناک ہو گیا۔ "یہ اب میری ضد بن گئی ہے۔"

صبیح نے محسوس کیا کہ حمزہ خان اس معاملے کو پُرامن طریقے سے حل کرنے کا خواہش مند ہے لیکن ساتھ ہی وہ کسی حد تک بیٹے سے دبتا بھی تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کا وارث تھا۔ وہ نہ ہوتا تو اس کی جاگیر بیٹیوں میں بٹ جاتی۔ صبیح نے ذرا جرأت کر کے حمزہ خان کا ہاتھ پکڑا۔ "خان صاحب! ذرا میری بات سننا... ادھر آ کر۔"

حمزہ خان اس کے ساتھ لان کے ایک گوشے میں چلا آیا۔ "کہو..."

"دیکھو، اب آئینہ میری بیوی ہے اور تم مجھے بھی جانتے ہو۔ تم اتنا تو سمجھتے ہو گے کہ میں ایسے ہی اپنی بیوی کے ساتھ یہاں تک نہیں آ گیا۔ پیچھے بہت سارے لوگوں کو علم ہے کہ میں کہاں ہوں۔ اس صورت میں تمہارے لیے بہتر ہے کہ آئینہ کے گھر والوں... کو چھوڑ دو اور ہمیں جانے دو۔ اس کے بدلے میرا وعدہ ہے کہ یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے یہیں دفن ہو جائے گا۔"

حمزہ خان نے کسی قدر بے بسی سے کہا۔ "تم نے رئیس کو دیکھا ہے، وہ بہت خود سر ہے۔"

"وہ تمہارا بیٹا ہے اور اگر وہ تباہی کے راستے پر چل رہا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اسے روکو اور اگر وہ زبان سے نہ رکے تو اسے ہاتھ سے روکو۔ ورنہ وہ خود کو اور تمہیں بھی تباہ کر دے گا۔"

صبیح کی بات نے حمزہ خان کو ڈرا دیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں کوشش کرتا ہوں۔"

"فرض کرو، وہ تمہاری بات نہیں مانتا، تب بھی آئینہ تو اسے نہیں ملے گی۔ وہ میری بیوی ہے اور جب تک میں اسے چھوڑ نہ دوں یا وہ بیوہ نہ ہو جائے، رئیس اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ وہ کیا کرے گا، مجھے زبردستی طلاق پر مجبور کرے گا تو میں یہاں سے جاتے ہی کورٹ میں کیس کر دوں گا اور اگر اس نے مجھے قتل کر دیا تب بھی وہ نہیں بچے گا۔ رئیس اتنا سمجھ دار نہیں ہے لیکن تم تو سمجھ دار آدمی ہو۔"

حمزہ خان کے ذہن میں بات واضح ہو گئی۔ اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، آؤ میرے ساتھ۔"

رئیس خان احمق تھا لیکن اس نے اپنے باپ کے تاثرات سے اندازہ کر لیا کہ وہ اس کے خلاف فیصلہ کر کے آ رہا ہے۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ حمزہ خان نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "وہ تینوں کہاں ہیں؟"

"وہ تینوں جہاں ہیں، وہیں رہیں گے۔" رئیس خان بولا۔ "جب تک مجھے یہ لڑکی نہیں مل جاتی۔"

"یہ اب کسی کی بیوی ہے۔" حمزہ خان نرمی سے بولا۔ "یہ تجھے نہیں مل سکتی اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تو ان تینوں کو چھوڑ دے اور یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے یہیں ختم کر دیا جائے۔"

"اتنی آسانی سے نہیں۔" رئیس خان کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ "اس سے کہو کہ اگر یہ معاملہ یہیں ختم کرنا چاہتا ہے تو آئینہ کو ایک دن کے لیے میرے حوالے کرے اور اس کے بعد بے شک اسے لے جائے۔"

صبیح نے آئینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ "ایسا تم صرف میری لاش سے گزر کر ہی کر سکتے ہو۔"

"یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" رئیس خان نے اپنے لباس سے ایک عدد پستول نکال لیا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

حمزہ خان بولا۔ "رئیس! کیا کر رہا ہے؟ اسے رکھ لے۔"

"بابا! تم اس معاملے میں دخل مت دو۔" رئیس خان غرایا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی لہرانے لگی۔ اس نے پستول صبیح کی طرف سیدھا کر لیا۔ "اسے ادھر بھیج دے ورنہ ابھی تیری لاش گرے گی اور یہ ہو گی میرے قبضے میں۔"

"تم مجھے گولی مار سکتے ہو۔" صبیح ایک قدم آگے آیا۔ اس کے انداز میں بے خوفی تھی۔ "تم مجھے جیتے جی مجبور نہیں کر سکتے۔"

"میں تین تک گنوں گا۔" رئیس خان نے کہا۔ "ایک... دو... تین..."

"رک جاؤ۔" آئینہ چلائی۔

رئیس گولی چلاتے چلاتے رک گیا۔ اس نے آئینہ کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "تیرے کہنے پر رک گیا... بول کیا کہتی ہے... اسے چھوڑ دوں یا مار دوں؟"

"آئینہ! تم چپ رہو۔" صبیح نے تیز لہجے میں کہا۔ "چلانے دو اسے گولی۔"

"نہیں۔" وہ ڈبڈبائی آواز میں بولی۔ "قصور میرا ہے... تاوان بھی مجھے دینا ہو گا۔"

"قصور تمہارا نہیں ہے۔" صبیح اس کی بات سمجھ رہا تھا۔

حمزہ دم بخود سا کھڑا تھا۔ وہ اپنے آدمیوں کو حکم دے سکتا تھا اور ان کی جرأت نہیں تھی کہ اس سے انحراف کرتے لیکن وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو نہ تو حکم دے سکتا تھا اور نہ منوا سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے مداخلت کرنے کی کوشش کی تو رئیس ابھی صبیح کو گولی مار دے گا اور اس کے بعد حالات ان کے لیے نہ جانے کیا رخ اختیار کریں۔ آئینہ نے صبیح کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ آپ نے اس حد تک میرا ساتھ دیا ہے لیکن اب خود سامنا کروں گی۔"

"یہ تم ٹھیک نہیں کر رہی ہو۔" صبیح نے کہا۔ "تم جانتی ہو میرا اور تمہارا رشتہ کیا ہے، میں تمہیں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

باقی لوگوں کے لیے ان کی گفتگو کا مفہوم سادہ تھا لیکن یہ آئینہ اور صبیح ہی جانتے تھے کہ ان کی باتوں کا اصل مفہوم کیا ہے۔ آئینہ بولی۔ "آپ اپنا فرض پورا کر چکے ہیں۔ اب مجھے اپنی جنگ خود لڑنی ہو گی۔"

وہاں دو مسلح افراد موجود تھے اور ان کے علاوہ رئیس خان بھی مسلح تھا۔ صبیح نے ان سب کو دیکھا۔ اسے سب کے چہرے نارمل نظر آ رہے تھے... یعنی ان میں سے کسی کو موت کا سامنا نہیں تھا جبکہ یہاں حالات ایسے تھے کہ ان میں سے کسی نہ کسی کو موت کا سامنا تھا۔ وہ کون ہو سکتا تھا؟ تب اس کی نظر حمزہ خان کے سن گلاسز پر گئی۔ اس کی پالش والی سطح پر صبیح کو اپنا عکس دکھائی دیا اور اسے اپنے سر کے آس پاس روشنی کا ہالہ سا دکھائی دیا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ کیا اس کی موت قریب تھی؟ کم سے کم یہ ہالہ تو یہی بتا رہا تھا۔ آئینہ، رئیس خان کی طرف جا رہی تھی۔ صبیح اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ کوشش کر کے بھی رئیس خان تک نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اس سے دور تھا اور پاس آنے سے پہلے اسے گولی مار دیتا۔ صبیح غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹا۔ اس وقت سب کی توجہ آئینہ پر تھی۔ دونوں مسلح آدمی بھی اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صبیح نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا لیکن جدید وضع کا پستول نکال کر اچانک ہی حمزہ خان کے سر سے لگا دیا۔

"خبردار! کوئی حرکت نہ کرے۔" اس نے چلا کر کہا۔ "ورنہ میں حمزہ خان کو گولی مار دوں گا۔"

آئینہ نے مڑ کر دیکھا اور لپک کر اس کے پاس آ گئی۔

www.kahopakistan.com

"یہ... یہ کیا کر رہے ہیں؟" اس نے اضطراب سے کہا۔ "یہ آپ کو مار دیں گے۔"

"اگر ان کو موقع ملا تو ضرور مار دیں گے۔" اس نے کہا اور حمزہ خان کو سامنے کر لیا۔ "سب اپنے ہتھیار پھینک دو۔" اس نے رئیس خان کی طرف دیکھا۔ "اب گنتی میں گنوں گا، ایک... دو... تین۔"

"ارے... تم لوگ منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" رئیس خان چلایا۔ اس نے پستول پھینک دیا۔ ان کے دونوں ساتھیوں نے بھی ہتھیار پھینک دیے۔ صبیح نے آئینہ سے کہا۔ "یہ ہتھیار اٹھا کر دور پھینک دو... جلدی۔"

آئینہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن صبیح کے تاثرات دیکھ کر رک گئی۔ اس نے تینوں ہتھیار اٹھائے اور لان میں ایک طرف بنے آرائشی تالاب میں پھینک دیے۔ ابھی تک کسی اور طرف سے مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ رئیس خان نے کہا۔ "اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"آئینہ کے گھر والے کہاں ہیں؟ انہیں بلاؤ۔"

"وہ یہاں نہیں ہیں۔" رئیس خان سپاٹ لہجے میں بولا۔

"ان کو آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہاں ہونا چاہیے ورنہ میں پہلے میں تمہیں گولی ماروں گا اور اس کے بعد حمزہ خان تمہاری باری آئے گی۔"

"رئیس... ان کو بلاؤ۔"

رئیس کے سارے کس بل نکل گئے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ جا کر ماسٹر عنایت حسین اور اس کے بچوں کو لے آئیں۔ پھر اس نے صبیح سے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو، اس طرح بچ جاؤ گے؟ ابھی تو میں بابا کی وجہ سے مجبور ہوں۔"

"جب تک تم مجبور ہو، تب تک ٹھیک ہے... اس کے بعد دیکھی جائے گی۔" صبیح نے کہا۔ "لیکن یاد رکھنا، کوئی دھوکا ہوا تو میں اکیلا نہیں مروں گا۔ تم میں سے کوئی نہ کوئی جائے گا۔"

رئیس خان کے بجائے حمزہ خان نے جواب دیا۔ "کوئی دھوکا نہیں ہوگا، میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں۔"

"حمزہ خان! شاید تم واقعی اپنے الفاظ میں مخلص ہو لیکن میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" صبیح نے کہا۔ آئینہ اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور وہ شاید اس کے عقب کی حفاظت کر رہی تھی کہ کہیں کوئی پیچھے سے حملہ نہ کر دے۔ لان میں ان چاروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد حمزہ خان کے آدمی ماسٹر عنایت، شاہ نواز اور ممونہ کو لے آئے۔ آئینہ نے ان کو دیکھا تو بھاگتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔ عنایت حسین اپنی بیٹی کو دیکھ کر خوش بھی تھا اور فکر مند بھی۔

"آئینہ! تم یہاں کیسے آئیں؟"

"ان کے ساتھ بابا۔" آئینہ نے صبیح کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ اس کا شوہر ہے۔" رئیس نے زہریلے لہجے میں عنایت حسین سے کہا۔ "پوچھ اس سے... تیرے منہ پر کالک مل کر شادی کی ہے اس سے۔"

عنایت حسین نے بیٹی کی طرف دیکھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔"

صبیح نے حمزہ سے کہا۔ "اب ان لوگوں کو یہاں سے جانے دو۔ جب یہ دور نکل جائیں گے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

یہ سن کر آئینہ تڑپ گئی۔ "کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ آپ کو مار دیں گے۔"

"آئینہ! میں نہیں جا سکتا۔" صبیح نے کہا اور جیپ کی چابی مانگی۔ حمزہ کے آدمی نے اشارہ پا کر جیپ کی چابی اسے دے دی۔ صبیح نے چابی آئینہ کے حوالے کی۔ "یہ لو اور نکل جاؤ... میری گاڑی تک اس میں جاؤ اور جب میری کار میں ہائی وے تک پہنچ جانا تو مجھے موبائل پر اطلاع کرنا۔"

"آپ کیوں نہیں چل رہے... آپ بھی تو چل سکتے ہیں؟" آئینہ نے کہا۔

"میں نہیں جا سکتا۔" صبیح نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

آئینہ اس کے پاس آئی۔ "صبیح! میری طرف دیکھیں... کیا بات ہے؟"

صبیح نے گہری سانس لی۔ "میں نے حمزہ کے سن گلاسز میں خود کو دیکھا تھا۔"

آئینہ کی سمجھ میں کچھ دیر سے آیا۔ "گگ... کیا آپ نے..."

صبیح نے سر ہلایا۔ "اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اب جاؤ، دیر مت کرو۔"

آئینہ نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے اپنے باپ اور بہن بھائی کی طرف دیکھا۔ "آپ جا کر جیپ میں بیٹھیں۔"

ان کے جانے کے بعد اس نے صبیح سے کہا۔ "میں... میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔"

صبیح نے سر ہلایا۔ "اب جاؤ، دیر مت کرو۔"

آئینہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیپ لے کر حویلی سے نکل گئی۔ صبیح نے حمزہ خان کے سن گلاسز میں اپنا عکس دیکھا۔ اس کے چہرے کے آس پاس روشن ہالہ موجود تھا۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر دیکھا۔ اس پر سگنل آ رہے تھے۔ آئینہ کا پرس اور موبائل اس کی کار میں رہ گیا تھا۔ اسے امید تھی کہ کچھ دیر میں وہ لوگ کار تک پہنچ جاتے۔ رئیس خان کے چہرے پر خطرناک سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تم نے سوچا، تم یہاں سے کیسے جاؤ گے؟"

"تم میری فکر مت کرو۔" صبیح کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "وہ لوگ یہاں سے نکل جائیں، اس کے بعد میں خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"رئیس خان۔" حمزہ خان نے سخت لہجے میں کہا۔ "تو کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا۔"

"بالکل نہیں بابا۔" رئیس خان بولا۔ "آپ فکر نہ کریں، میں جو کروں گا ٹھیک کروں گا۔"

نصف گھنٹے بعد موبائل نے بیل دی۔ آئینہ کی کال تھی۔ اس نے ریسیو کی۔ "کہاں ہو تم... کسی نے روکا تو نہیں؟"

"نہیں... کسی نے نہیں روکا... ہم آپ کی کار میں ہائی وے کی طرف جا رہے ہیں۔" آئینہ بولی۔ اس کا لہجہ روتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ "پلیز... صبیح... پلیز... آپ بھی آ جائیں۔"

"تم جانتی ہو، یہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

"صبیح..."

"تم کتنی دیر میں ہائی وے تک پہنچ جاؤ گی؟" صبیح نے اس کی بات کاٹی۔ "تیزی اور توجہ سے ڈرائیونگ کرو اور ہائی وے تک پہنچ کر مجھے کال کرنا۔" اس نے موبائل بند کر دیا۔ اسے دھیان نہیں رہا تھا... اس دوران میں رئیس خان آہستہ آہستہ اپنی پوزیشن بدل رہا تھا۔ صبیح پہلے کی طرح مستعد نہیں رہا۔ اس نے سن گلاسز میں اپنا عکس دیکھا، روشنی تیز ہو گئی۔ شاید وقت قریب آ گیا تھا اور اس وقت سے اب مفر ممکن نہیں تھا۔ دس منٹ بعد موبائل نے پھر بیل دی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"صبیح! ہم ہائی وے پر پہنچ گئے ہیں۔"

"گڈ! اب واپس چلی جاؤ اور میری کار کہیں بھی چھوڑ دینا اور اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دینا۔ اب اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔"

بات کرتے ہوئے اس کا پستول والا ہاتھ نیچے آ گیا۔ یہ دیکھ کر رئیس نے اپنے کُرتے کے اندر ہاتھ ڈالا۔ حمزہ خان اسے دیکھ رہا تھا اور آنکھوں کے اشارے سے اسے منع کر رہا تھا۔

"اور آپ؟" آئینہ پھر رونے لگی۔

"مجھے بھول جانا۔" صبیح نے آہستہ سے کہا۔

اسی لمحے رئیس نے اپنے کُرتے سے ایک پستول نکال کر صبیح پر گولی چلا دی، وہ اس کے بائیں پہلو میں دل سے ذرا نیچے لگی۔ فائر کی آواز اور اس کی کراہ سن کر آئینہ تڑپ اٹھی۔

"گگ... کیا ہوا ہے؟"

"کچھ... نہیں تم... سفر جاری رکھو۔" صبیح نے مشکل سے کہا، وہ ابھی تک اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ اس نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے رئیس خان کو دیکھا اور اچانک ہاتھ بلند کر کے اسے گولی مار دی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ رئیس خان اپنا دفاع ہی نہیں کر سکا۔ گولی اس کے سر پر لگی اور عقب سے کھوپڑی میں سے نکل گئی۔ وہ زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

"رئیس۔" حمزہ خان چلایا۔ "میرے بچے۔" وہ اس کی طرف لپکا اور اس کا سر اٹھا کر اسے جھنجوڑنے لگا۔ صبیح کے پیروں کی طاقت جواب دے گئی تھی، وہ بیٹھ گیا۔ اس نے موبائل نہیں چھوڑا تھا جس پر آئینہ چلا چلا کر رو رہی تھی۔

"آئینہ! اب تمہیں... کوئی خطرہ نہیں ہے۔" اس نے کہا اور موبائل زمین پر پھینک دیا۔ پھر وہ خود بھی زمین پر گر گیا۔ حمزہ خان کے ایک آدمی نے اس سے پستول چھین لیا۔ صبیح چت لیٹ گیا تھا۔ اس نے سر گھما کر بیٹے کا ماتم کرتے حمزہ خان کو دیکھا اور رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

☆☆☆

ایک بار پھر وہ تاریکی میں تھا۔ اس کا جسم خلا میں تیر رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا۔ اللہ اس سے ناراض ہے؟ لیکن اب تو اس نے خود کشی نہیں کی تھی۔ اس نے جو غلطی کی تھی، اس کا تاوان بھی ادا کر دیا تھا۔ پھر اس کے مقدر میں تاریکی کیوں تھی؟ کیا اس سے پھر کوئی خطا سرزد ہو گئی؟ اس نے گھبرا کر اللہ کو پکارا۔ "میرے رب!"

جیسے ہی اس نے یہ کہا، اسے پہلے کی طرح روشنی نظر آئی، وہی روشن سرنگ جس کے پاس اسے اپنی بیٹی نظر آئی تھی۔ وہ مسکرایا اور اس اعتماد کے ساتھ سرنگ کی طرف بڑھنے لگا کہ اس کی بیٹی اس پار اس کی منتظر ہو گی اور اس بار اسے کوئی نہیں روکے گا... کوئی واپس نہیں بلائے گا۔

www.kahopakistan.com

دلدل

احمد اقبال

تبدیلیوں کا عمل ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا..... آہستہ آہستہ ان بدلتے ادوار میں بہت سے تغیرات رونما ہو رہے ہیں..... مگر فی زمانہ جذبات و خیالات میں جو تبدیلیاں آرہی ہیں..... انہوں نے انسانی اقدار کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے..... یہ تبدیلیاں چمکتی دمکتی خوبصورت دلدل کی صورت میں ذہنی طور پر کمزور ہر شخص کے لیے بہت متاثر کن اور مقناطیسی کشش رکھتی ہیں..... ہر شخص اس سنہرے زنداں میں قید نظر آتا ہے.....

انسانی فطرت اور قدرت کے قائم کردہ توازن سے انحراف کرنے والوں کا دردانجام

اگر چائے کے ایک کپ میں سگریٹوں کے ٹوٹے لاشوں کی طرح پھول کے تیر رہے تھے۔ ایک کپ کارپٹ پر اوندھا پڑا ہوا تھا... ایک میرے قدیم اور خستہ حال ٹی وی پر عین عاصمہ کی مسکراتی ہوئی تصویر کے فریم کو چھو رہا تھا... ایک غالباً کسی کی ٹھوکر سے فٹ بال کی طرح باتھ روم کے دروازے تک جا کے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا... میری میز کے نیچے نظر آنے والا ڈسٹ بن (پلاسٹک کی خوب صورت گلابی گڑیا جو فالتو کاغذ کے ٹکڑوں اور گولوں کو ہضم کرنے کے لیے اپنا منہ کھول دیتی تھی اور صائمہ نہ جانے کہاں سے خاص طور پر میرے لیے تحفہ لائی تھی) عین درمیان میں رکھا ہوا تھا اور اس میں جو تھا، لیورنگ ہو چکا تھا کیونکہ رات بھر اس میں پان کی پیک تھوکی گئی تھی۔

اگر میری دو پتلونیں کتابوں رسالوں کے ڈھیر پر... ایک ٹی شرٹ جوتوں پر... دو رنگ کی دو میلی (ایک پھٹی ہوئی) جرابیں فون پر اور میں خود ایک میلی کچیلی چادر والے اپنے بستر پر پڑا تھا کہ ایک تکیہ پیروں کی طرف تھا تو دوسرا میرے سر کے نیچے... اور میرے قریب ہی اس باقی بچے ہوئے کھانے کی ٹرے رکھی تھی جو میں نے گزشتہ دوپہر خود تیار کیا تھا (دال + چاول) لیکن کھا نہیں سکا تھا تو میرے خیال میں کمرے کا منظر دیکھنے والے کو یہ احساس دلاتا تھا کہ اس چار دیواری میں شخصی آزادی ہے... جمہوریت ہے اور کوئی بیوی نہیں ہے۔

اگر یہ آخری چیز ہو تو گھر ایک چڑیا گھر ہو جاتا ہے جس میں کوئی کاٹھ کا الو شوہر ہر وقت ڈانٹ پھٹکار سنتا رہتا ہے... اُف یہ باتھ روم کے چپل کچن میں لے آئے... یہ میلی پتلون ٹیبل فین پر کیوں لٹکی ہوئی ہے... پیاز منگوائے تھے ٹماٹر لا کے بستر پر ڈال دیے... حالانکہ ان چیزوں کے کہیں بھی ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

چونکہ یہ چیز... یعنی بیوی تا حال مجھ پر نازل نہیں ہوئی اس لیے میں رات بھر جاگنے کے بعد صبح گیارہ بجے بھی بڑے سکون سے سو رہا تھا اور ایک ایسا خواب دیکھ رہا تھا جو بیوی کے ہوتے آپ دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکتے... ایسی بیویاں ہوتی ہیں جو شوہروں کے خوابوں پر بھی نظر رکھتی ہیں... کیا صائمہ ایک ایسی ہی آئی ایس آئی برانڈ بیوی ہوگی، یہ سوچ کے اکثر مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی اور اپنی موجودہ آزاد زندگی کا موازنہ مستقبل سے کر کے میں لرز اٹھتا تھا... لیکن ہائے رے یہ عشق کی مجبوریاں... صائمہ کے بغیر جینا بھی اتنا ہی محال ہے۔

اچانک جیسے زلزلہ آ گیا... کائنات کا سکون درہم برہم ہو گیا... میرے نیلے خواب کا وہ آخری سین جو گویا حاصلِ خواب تھا ایسے غائب ہو گیا جیسے ٹی وی ڈرامے کے کلائمکس پر لائٹ چلی جائے... میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور باتھ روم کی طرف دوڑا کیونکہ اپنے لباسِ شب خوابی یعنی ایک ڈھیلی الاسٹک والی مختصر نیکر میں میرا وجود عریانی و فحاشی کی جیتی جاگتی تصویر لگتا تھا... یہ اپنی اپنی عادت ہے... جو چاہے لباسِ قدرت میں سوئے جس کا دل چاہے سوٹ اور ٹائی جوتے موزے سب پہن کر سوئے۔

جب میں صائمہ جیسی معزز خاتون کے سامنے معقول لباس میں باتھ روم سے برآمد ہوا تو صائمہ میرے غریب خانے کا بہت اچھی طرح پوسٹ مارٹم کر چکی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ "یہ کیا حال بنا رکھا ہے کمرے کا...؟ رات بھر چنڈال چوکڑی جمع ہوگی یہاں...؟"

میں صائمہ کے اس کڑی کمان والے پوز کی دلکشی پر غور کر رہا تھا... کمر کے خم پر اس کا ایک ہاتھ جسم کے اوپر والے حصے کی سرکشی اور دلکشی میں اضافہ کر رہا تھا... ایک شانے پر جھولتا دوپٹا اور ایک گال پر لہراتی بالوں کی شوخ لٹ اس کی ادائے حسن کو اشتعال انگیز بنا رہی تھی... چنانچہ میں نے اسے بازوؤں میں جکڑ کے اس کی آواز اپنے ہونٹوں سے بند کر دی تو میری اس غلطی پر اس نے مجھے جھٹکے سے آگے دھکیلا اور چلائی۔

"آخر تم انسان کے بچوں کی طرح کیوں نہیں رہ سکتے؟"

میں نے جواب دیا۔ "یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے جب تم مجھے اپنی زوجیت میں قبول کر لو۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میری ایک ہی شرط ہے اور جب تک تم اس چنڈال چوکڑی سے جان نہیں چھڑاؤ گے... یہ شرط پوری نہیں کر سکتے۔"

☆☆☆

یہ شرط وصلِ لیلیٰ بظاہر جتنی مختصر اور آسان نظر آتی ہے درحقیقت اتنی ہی مشکل ہے... بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی... یعنی میرا یہ خیال ہے کہ فرہاد کے لیے پہاڑ کاٹ کے شیریں کے لیے دودھ کی نہر نکالنا آسان تھا... صائمہ کہتی ہے۔ "مجھے اپنا گھر چاہیے۔"

اصولاً تو مجازی خدا کا گھر بیوی کا گھر ہوتا ہے خواہ وہ کسی پہاڑ کی کھوہ میں ہو... لیاری ندی کے مہکتے کنارے پر یا کسی درخت پر گھونسلے کی صورت میں... یہ کرائے کا دو کمروں والا فلیٹ سو فیصد میرا ہے اور ایک صائمہ کیا دو بیویاں اس میں بسی

www.kahopakistan.com

خوشی رہ سکتی ہیں لیکن اس کا کہنا ہے کہ اس کے حقوق ملکیت ہمارے نام ہوں... ہر ماہ مالک مکان کی منحوس شکل دکھائی نہ دے... وہ کرایہ نہ دینے پر تمہارا اسباب سڑک پر پھینکنے کی دھمکی اور تم صحافت کے زعم میں اس کو کسی بھی الزام میں بند کرانے کی دھمکی نہ دو۔

اب میں ایک معمولی صحافی... روزنامہ ''حقیقت ساز'' میں ہر ہفتے ایک مزاحیہ کالم اور ہر روز ایک مزاحیہ قطعہ لکھنے والا جسے معاوضہ بھی صائمہ کے بوسے کی طرح منت سماجت کے بعد بھی ملتا ہو اور کبھی نہ ملتا ہو... وہ اتنی مشکل شرط کیسے پوری کرے... اخبار کے مالک اور مدیر جناب تفنگ چنگیزی جنہیں ساری دنیا توپ صاحب کے نام سے جانتی ہے... گزشتہ دس برس کے واجبات بڑھتے بڑھتے اب اتنے ہو گئے ہیں کہ میں عدالت سے اخبار کے اثاثے نیلام کرانے کا حکم حاصل کرلوں پھر بھی شاید پورے وصول نہ ہوں۔

صائمہ کو ایک اعتراض یہ ہے کہ میں ہڈحرام ہوں اور بلاوجہ توپ صاحب کے در پر پڑا ہوا وضعداری نبھا رہا ہوں... اگر میں کوشش کروں تو اپنی ساکھ کی بنیاد پر کسی بھی اچھے اخبار میں دگنی چوگنی تنخواہ حاصل کرسکتا ہوں... توپ صاحب سے اس کے چڑنے کی ایک وجہ اور بھی ہے... یہ توپ صاحب ہی ہیں جنہوں نے میرے نام... بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی... کے پہلے الفاظ سے بزدل کا نام ایجاد کیا اور گویا دریا کو کوزے میں سمیٹ دیا... اصل نام سے اب مجھے کوئی جانتا ہی نہیں۔

لیکن صائمہ کا اصل مسئلہ چنڈال چوکڑی ہے جس میں میرے چار لنگوٹیے یار شامل ہیں... اور بقول صائمہ کے... سب لنگوٹی چور ہیں... مثلاً میرا ایک دوست موٹر پارٹس میں ڈیل کرتا ہے اور کاروبار کی ابتدا اس نے ایک پڑوسی کی کار کے وہیل کیپ اور دوسرے کی کار سے ٹیپ ریکارڈر نکال کے کی تھی... ہمتِ مرداں مددِ خدا... آج وہ کباڑی مارکیٹ میں ان چیزوں کا سب سے بڑا ڈیلر ہے اور شاگردوں کو یہ کارِ خیر بلامعاوضہ سکھاتا بھی ہے۔

دیگر تین احباب کے مشاغل بھی صائمہ کے نزدیک افسوسناک ہیں... سب سے زیادہ اعتراض اسے ایک بات پر ہے کہ ادھر میری جیب میں کسی غیر متوقع ذریعے سے یا کوئی کارنامہ سرانجام دینے کے بعد بھاری رقم آتی ہے ادھر ان کی ناک کتے کی طرح نوٹوں کی بو سونگھ لیتی ہے... اس سے پہلے کہ وہ رقم صائمہ کے قائم کردہ ''ہاؤس فار میرج'' فنڈ میں جمع ہو، وہ تاش کی گڈی لیے میرے فلیٹ پر دھاوا بول دیتے ہیں اور رات بھر میں مجھے کنگال کر کے ہنسی خوشی رخصت ہو جاتے ہیں... دو بار ایسا بھی ہوا ہے کہ صائمہ ان کے آنے سے پہلے رقم ضبط کرنے میں کامیاب رہی ورنہ اسے پتا ہی اس وقت چلتا تھا جب میں پھر پھکڑ ہو جاتا اور اسے قرضِ حسنہ کی درخواست پیش کرتا تاکہ ہم کہیں ڈنر کرسکیں۔

سوال آپ کے ذہن میں یہ ہوگا کہ آخر اس غریب صحافی اور شاعر بزدل کے پاس بھاری رقم کہاں سے آتی ہے... اصل کہانی تو خاصی لمبی ہے... میں اختصار کے ساتھ بتاؤں کہ عرصہ چھ سات سال پہلے پولیس نے کہیں ڈاکوؤں کو محصور کرلیا... اب وہ اندر سے ڈھن... ڈھن گولیاں چلا رہے اور پولیس والے باہر سے... متاثر ہو رہے ہیں ادھر ادھر کے لوگ... معلوم نہیں کیوں ڈاکوؤں نے پولیس کے سامنے ایک شرط رکھ دی کہ اگر بزدل کو بلا کے گواہ بنا لیا جائے تو ہم ہتھیار ڈالنے پر تیار ہیں... ورنہ ہم گرفتار ہونے سے پہلے تمام اہلِ خانہ کو ہلاک کر دیں گے... دراصل انہیں ڈر تھا کہ پولیس انہیں جعلی مقابلے میں ہلاک کردے گی۔

پولیس مجھے اٹھا کے لے گئی... میرے سامنے ہتھیار ڈالے گئے اور میری گواہی کے باعث ڈاکو زندہ رہے... جیل گئے اور باعزت طور پر رہا ہوئے... ان کا یقین غلط نہیں تھا... پولیس انہیں گرفتار کر کے تفتیش کرنے چالان مکمل کرنے اور عدالتی پیشی میں گواہ اور ثبوت لانے کا سارا چکر ہی ختم کردینا چاہتی تھی... میری موجودگی میں ایسا نہ ہوسکا... پھر تو جیسے یہ معمول بن گیا... دو جگہ اور میری موجودگی میں ہتھیار ڈالے گئے اور ڈاکو زندہ سلامت گرفتار ہوگئے یا اچھے وکیل... رشوت اور دھمکی جیسے موثر حربے استعمال کر کے باعزت بری ہو گئے یا دو چار ماہ جیل کے مہمان رہ کے آگئے۔

میری پوزیشن ایسی تھی کہ... میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں... لیکن ڈاکو احسان مند ہو گئے... میری وجہ سے وہ مارے نہیں گئے اور ان کا بزنس چلتا رہا... انہوں نے صرف زبانی میرا شکریہ ادا نہیں کیا بعد میں ہر کامیاب ڈاکے کے بعد وہ مالِ غنیمت میں سے پیر و مرشد بزدل کے نام کا حصہ نکالنا اور پہنچانا شروع کردیا... وکالت میں نے پڑھ رکھی تھی لیکن کبھی کام نہیں آئی تھی... ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے مجھے وکیل کر لیا... جب وہ باعزت طور پر بری ہو گئے تو اس میں کمال میرے دلائل کا نہیں تھا... ان کے دیگر ساتھی گواہوں کو اپنی مرضی کا بیان دینے پر راضی کرچکے تھے اور پولیس تو بہر حال ان کے ساتھ تھی...

اس کے بعد تو میری دھاک بیٹھ گئی... سارے چور، ڈاکو

مجھے وکیل کرنے لگے... مجھے تگڑی فیس ملتی اور جب وہ باعزت رہا ہوتے تو میں اپنے کالم میں پولیس کی خبر لیتا تھا کہ وہ شرفا کو ڈاکو اور ڈاکوؤں کو شرفا بنانے پر تلی ہوئی ہے... پھر ایک واقعہ ایسا ہوا کہ کسی خاندانی شخص کے خاندانی نوادرات چوری ہو گئے اور چوروں نے میرے ذریعے رابطہ کیا کہ اتنی رقم ادا کردی جائے تو ہم وہ کاٹھ کباڑ لوٹا دیں گے... خاندانی شخص فوراً مان گیا اور اس رقم کا ایک حصہ مجھے بھی ملا۔

ایسا ہر روز نہیں ہوتا تھا... سال میں دو چار مرتبہ کوئی واردات ہو جاتی تھی جو میری خدمات کی ضرورت پڑتی تھی... بدخواہ تو مجھے چوروں کا ایجنٹ ہی کہتے تھے لیکن میں نے کبھی برا نہیں مانا... مجھے معلوم تھا کہ وہ کس قسم کے چور ہیں... کچھ انکم ٹیکس کے چور تھے... کچھ بجلی چور... کچھ سرکاری فنڈز کے چور تھے تو کچھ عوام کے اعتماد کے چور... تاہم وہ اپنے اوپر خود ہی شرافت کا لیبل لگائے ہوئے تھے۔

جب میرے موکل یا مرید مجھے حقِ خدمت پہنچاتے تھے تو اس کے ساتھ ہی میرے یار... صائمہ کے الفاظ میں چنڈال چوکڑی... کو نوٹوں کی خوشبو پہنچ جاتی تھی اور وہ میرے ساتھ ویک اینڈ منانے پہنچ جاتے تھے... وہ پینے پلانے کے شوقین بھی تھے... ہم محض تفریح کے لیے تاش لے کر بیٹھتے تھے اور صبح تک میری کمائی ان کی جیب میں پہنچ جاتی تھی... صائمہ کو یقین تھا کہ وہ پتے باز مجھے لوٹتے ہیں لیکن اس الزام سے ہماری دوستی کے جذبات میں فرق نہیں پڑتا تھا۔

اب ظاہر ہے کہ صرف روزنامہ ''حقیقت ساز'' کی آدھی ادھوری کبھی کبھی ملنے والی تنخواہ سے میرا کنوارا گھر مشکل سے چلتا تھا تو شادی شدہ ہونے کے لیے اپنا گھر کیسے بنتا... نتیجہ یہ کہ ڈاکٹر صائمہ ہوسٹل میں زندگی گزار رہی تھی اور اس نے شادی کے لیے جو فنڈ قائم کر رکھا تھا، اس میں چار سال بعد بھی اتنی ہی رقم جمع ہوسکی تھی کہ شاید اس گھر کا کچن بن جاتا... یہ بھی زیادہ تر صائمہ کی تنخواہ کی بچت تھی... میری ساری آمدنی شامل ہوتی تو یہ گھر کب کا بن گیا ہوتا... صائمہ دلہن بن کے اس گھر کو آباد کرنے کے بعد ماں بھی بن چکی ہوتی۔

میرا یہ عذر صائمہ ہمیشہ مسترد کردیتی تھی کہ وہ حرام کی کمائی ہے جو ہمارے گھر کی تعمیر میں استعمال نہیں ہونی چاہیے۔

☆☆☆

مجھے... صائمہ کو اور ہمارے تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ یہ تفصیل آپ کے گوش گزار کی جائے۔

میں بے بسی سے صائمہ کو نازنین سلیقے کا مظاہرہ کرتے دیکھتا رہا۔ ''ذرا حال دیکھو کمرے کا... کباڑ خانہ اس سے بہتر

اسرائیل کے علاوہ
دنیا کے کسی بھی کونے میں اور ملک سے باہر
ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کرکے رسید حاصل کرسکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس
(فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35802551 فیکس: 35895313

www.kahopakistan.com

ہوتا ہے... توبہ توبہ... تم اس چادر پر سوتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں... رات بھر بیٹھ کے کلامِ اقبال پڑھتا ہوں۔''

''مجھے ایک کام تھا تم سے...'' اس نے میری بات ان سنی کرتے ہوئے اپنا کلام جاری رکھا۔

''میری ایک کزن ہے... نورین... اس کے بھائی کا قتل ہو گیا ہے۔'' اس نے برتن دھو کے فریزنے سے رکھے اور ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''ایک ہی بھائی تھا اس کا... ظاہر ہے جتنا دکھ اسے ہے... اس سے زیادہ نورین کے باپ کو ہے۔''

میں نے کہا۔ ''قتل کا سراغ لگانا پولیس کا کام ہے۔''

''بالکل ہے۔'' اس نے چائے کے لیے کیتلی میں پانی الٹے رکھ دیا اور خود فریج میں سے ناشتے کے لیے انڈے، مکھن، ڈبل روٹی نکالنے لگی۔ ''یا میرے خدا... یہ فریج ہے؟''

میں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ''ہاں... فریج ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''کیا کچھ سڑ رہا ہے اس میں... تمہارا بس چلے تو جوتے بھی اس میں رکھ دو... اب یہ ٹی وی کا ریموٹ... اور یہ چوہے دان۔''

میں نے خفت سے کہا۔ ''وہ دراصل... ایک چوہا دیکھا تھا میں نے فریج میں... ٹی وی کا ریموٹ میں خود تلاش کر رہا تھا... تم کسی نورین کے بھائی کے قتل کی بات کر رہی تھیں؟''

''ہاں... پولیس جان چھڑانا چاہتی ہے تفتیش سے... انہوں نے خود ہی ایک کہانی گھڑی ہے اور اس پر قائم ہیں کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ ذرا ناشتا بنا لوں پھر بتاتی ہوں... آج اتفاق ایسا ہوا کہ میری آنکھ بھی دیر سے کھلی... میس میں گئی تو ناشتا نہیں ملا۔''

جب اس نے ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ کے اور کچھ شرما کے مجھ سے کہا۔ ''اب ناشتا کرو نا... مجھے کیا تک رہے ہو؟''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''آخر وہ زمانہ کب آئے گا بلبلِ جان گولی مار والی... جب ہر روز اسی طرح تمہارے دستِ حنائی سے ہمارے گھر میں تھی...''

اس کے چہرے پر لالی سی آئی مگر وہ میری اس قسم کی باتوں کو بکواس قرار دے کر ٹال دیتی تھی۔ ''تم کو پتا چلانا ہے کہ قتل کس نے کیا ہے اور پولیس اس کیس سے اپنی جان کیوں چھڑا رہی ہے۔''

میں اس کے ہاتھ کی نرمی اور گرمی سے پگھل گیا۔ ''اگر تمہارا یہی حکم ہے تو سر آنکھوں پر... ذرا مجھے تفصیل تو بتاؤ... نورین کی عمر کیا ہے؟ رنگ گورا ہے کہ سانولا... اور دبلی پتلی ہے تمہاری طرح یا...''

''اس کا باپ سبزی منڈی کا ایک آڑھتی ہے... لیکن اور بھی بہت سے کام کرتا ہے... اب اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہے اور اس کی صحت بھی کوئی اتنی اچھی نہیں رہتی۔''

''ساٹھ سال زیادہ تو نہیں ہوتے۔''

''ہاں لیکن اکثر لوگ اپنی صحت کی طرف سے انتہائی بے پروا ہوتے ہیں... نورین سیکنڈ ہے میری... میٹرک کے بعد ماں باپ نے خاندان کی روایتی سوچ کے مطابق طے کیا کہ اتنی تعلیم بھی بہت ہے... بلکہ نورین زیادہ ہی پڑھ گئی ہے... اس کی بہنوں کو چار چھ جماعتوں سے آگے نہیں پڑھنے دیا گیا اور ان کی شادی کر دی گئی... یہ چھوٹی اور ذرا لاڈلی تھی، اس نے ضد کی تو میٹرک کر لیا لیکن اس کے بعد کالج جانے کا وقت آیا تو کوئی ضد نہ چلی۔ پہلے ماموں نے کہا کہ اتنا کافی ہے... اسے کون سی نوکری کرنی ہے... پھر ماں نے اس کی حمایت کی... ان کے نزدیک کالج کی پڑھائی عورت کو صرف بے حیائی سکھاتی ہے اور بے مہار کرتی ہے... یعنی وہ حقوق مانگتی ہے جو ازروئے شرع بھی اس کو حاصل ہیں اور قانون بھی دیتا ہے... نورین نے کہا کہ وہ برقع میں جائے گی تو ماموں نے اس پر بھی اعتراض کر لیا۔''

''ماشاء اللہ ماموں جان خاصا تجربہ رکھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''نورین کی شادی بھی ماموں کے بیٹے سے طے ہو چکی تھی جو بالکل ان پڑھ ہے... ظاہر ہے نورین اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی... لیکن اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟''

میں نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔ ''بالکل... وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔''

''باپ اور بھائی ایک طرف... جورو کا بھائی اور جورو ایک طرف... ابھی میں بے گھر افراد کے ایک کیمپ میں مردان گئی تھی تو نورین سے بھی ملی... وہ وہاں کچھ رضا کار خواتین کے ساتھ ضرورت مندوں کے لیے کھانا لاتی تھی۔''

''وہ مردان میں رہتی ہے؟''

''نہیں... راولپنڈی بلکہ اسلام آباد میں ایک جگہ ہے کراچی کمپنی... اس کے باپ کا بزنس وہیں ہے... رات کو میں اس کے گھر بھی گئی... ہم کھانے کے بعد باتیں کرتے رہے... اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا... اس کے بھائی کو باپ نے کسی کام سے بھیجا تھا... ادھر ادھر سے اس نے تقریباً ساڑھے چار لاکھ کی وصولی کی۔ اسی میں رات ہو گئی... سردیوں کے دن تھے... اسلام آباد کی سڑکیں جلدی ویران ہو جاتی ہیں...

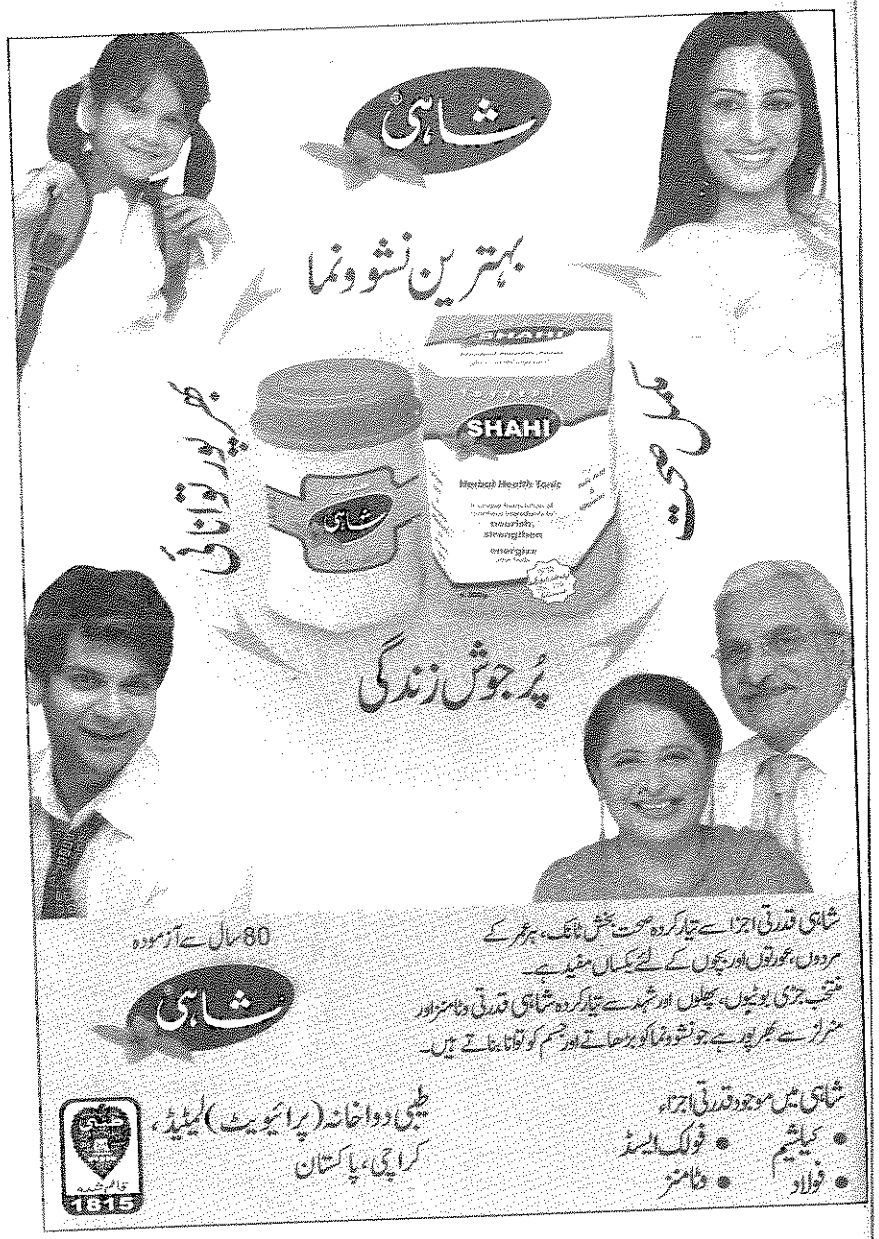

www.kahopakistan.com

واپسی میں وہ کشمیر روڈ کی طرف سے جا رہا تھا کہ کسی نے اس کو لوٹ کے قتل کر دیا... اس کی لاش صبح ملی... وہیں اس کی موٹر سائیکل بھی تھی... یہ پولیس کی کہانی ہے۔''

''اس میں غلط کیا ہے؟''

''پہلی بات تو یہ کہ جہاں قتل ظاہر کیا گیا... قتل وہاں نہیں ہوا۔''

''یہ کیسے پتا چلا؟''

''دیکھو... اسلام آباد میں پولیس بہت مستعد ہے... وی آئی پی جو رہتے ہیں... یہ ناممکن ہے کہ ایک لاش ساری رات پڑی رہے اور کوئی نہ دیکھے... وہاں اتنے سیکیورٹی... ناکے ہیں... ایک کشمیر روڈ پر بھی ہے... اس جگہ سے ایک فرلانگ دور جہاں لاش ملی اور موٹر سائیکل...''

''کیا وہاں سے ٹریفک گزرتی ہے؟''

''بہت کم... لیکن غلام رسول کو... یہ نورین کے بھائی کا نام ہے... دیر ہوئی تو باپ نے اسے فون کیا... اس کے موبائل نمبر سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا... باپ وقفے وقفے سے فون کرتا رہا... رات بارہ بجے تک اس نے ہر جگہ پوچھ لیا... جہاں جہاں بیٹا گیا تھا... اس کے علاوہ دوستوں اور جاننے والوں سے معلوم یہ ہوا کہ اس نے آخری وصولی مغرب کے وقت کی تھی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ کسی کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گیا تھا... دوستوں نے تو انکار کر ہی دیا تھا کہ وہ ان سے نہیں ملا تھا... تو نو بجے تک فارغ ہوا ہوگا۔''

''پھر یہ کس وقت پتا چلا کہ اس کا قتل ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے باپ کا نام خدا بخش ہے... خدا بخش نے رات بارہ بجے کے قریب کسی جاننے والے پولیس افسر سے بات کی اور اس کے مشورے سے غلام رسول کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے چلا گیا... تھانے میں حسب توقع اسے ٹرخانے کی کوشش کی گئی کہ ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے اور تم لاپتا ہونے کی رپورٹ درج کرانے آگئے... جوان لڑکا ہے، کوئی بچہ تو نہیں ہے... خدا بخش نے اس پولیس افسر کا حوالہ دیا جس کے مشورے پر وہ تھانے آیا تھا تو پولیس کا رویہ کچھ بدلا اور انہوں نے بہت سے فضول سوالات کرنے کے بعد روزنامچے میں اندراج کر لیا... تاہم لاش صبح چھ بجے ٹریفک پولیس کے ایک سارجنٹ نے دیکھی اور اس نے آگے اطلاع دی... مقتول کی موٹر سائیکل بھی وہیں پڑی تھی۔''

''یہ کیسے معلوم ہوا کہ اسے قتل کیا گیا تھا؟''

''اس کے سینے اور سر میں دو گولیاں لگی تھیں... لیکن نورین کے باپ خدا بخش نے یہ کہہ کے مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ اس کے بیٹے کی موت کا سبب وہ گولیاں نہیں تھیں۔''

''پھر کیا اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا؟''

''نہیں... خدا بخش کوئی بہت پڑھا لکھا اور ہوشیار آدمی نہیں ہے... لیکن اس کے پاس عمر کا تجربہ ہے... پولیس نے اسے لاش اور موٹر سائیکل اٹھانے کے بعد اطلاع دی اور اسپتال بلایا کہ وہ بیٹے کو شناخت کرے اور پوسٹ مارٹم کے بعد لاش لے جائے... وہ غم کا مارا صبح دس بجے اسپتال پہنچا تو ضابطے کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی... پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کا سبب انہی زخموں کو بتایا گیا تھا جو گولیاں لگنے سے آئے تھے۔''

''پولیس نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا... ورنہ لواحقین تو ایم ایل او کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم کرو تاکہ ہم لاش کو تدفین کے لیے لے جائیں اور وہ مصروفیت کے عذر پر ٹالتے رہتے ہیں دو دو دن تک... ہاں پیسا مل جائے تو دو گھنٹے میں سب ہو جاتا ہے... تمہیں شرم آنی چاہیے کہ تمہاری ڈاکٹر برادری کیا کر رہی ہے۔''

''جتنی شرم آتی ہے اس سے زیادہ مجھے دکھ ہوتا ہے... ایسے لوگ بہت کم ہیں مگر ہیں... اور ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا ہے... کمی نہیں... پہلے پولیس بدنام تھی یا ایکسائز کے محکمے والے... اب کوئی ادارہ کوئی فرد مستثنیٰ نہیں... قوم کی مجموعی اخلاقی حالت میں جو زوال آیا ہے اس کا اثر سب پر پڑا ہے سب پیسا کمانا چاہتے ہیں اور فوراً... آنے والے دن کا بھروسا نہیں... خیر...'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں جذباتی ہو گئی تھی... خدا بخش نے لاش گھر لانے کے بعد غسل دیتے وقت یہ دیکھا کہ غلام رسول کے گلے پر انگلیوں کے نشانات ہیں۔ گہرے نیلے نشانات... اور غالباً یہی موت کا سبب ہیں... وہ نہ ماہر بنتا ہے اور نہ بااختیار... پوسٹ مارٹم رپورٹ کو کیسے چیلنج کرتے... تین تدفین کے مرحلے میں لاش پھر اٹھا کے اسپتال لے جاتے اور میڈیکو لیگل افسر سے لڑتے کہ تم نے غلط رپورٹ دی ہے... غلام رسول گولیوں کے زخم سے نہیں مرا... وہ ان کی کہاں سنتا... انہیں بھگا دیا جاتا کہ جاؤ اس رپورٹ کو چیلنج کرو... اب طریقہ بڑا مشکل اور لمبا ہے... وہ سیشن کورٹ میں جا کے فریاد کرتے... لاش اٹھائے پھرتے... پولیس کے اور ڈاکٹر کے خلاف مقدمہ کرتے... اس کے لیے کرمنل وکیل درکار تھا... پولیس اپنی بات پر قائم تھی کہ کسی نے اس سے ساڑھے چار لاکھ چھین کے اسے قتل کر دیا... اس نے کہا کہ یہ سیدھی سادی ڈکیتی کی واردات ہے... وہیں سے موٹر سائیکل بھی پڑی ملی ہے... قتل تو قتل ہے... بیٹا تمہارا گلا گھونٹنے سے ہلاک ہوا یا گولیاں لگنے سے... اب کیا فرق پڑتا ہے... کیوں لاش کی بے حرمتی کراتے ہو اور خود بھی خوار ہوتے ہو... بس صبر کرو... اور دعا کرو کہ ڈاکو پکڑے جائیں... خدا بخش کیا کرتا... اس نے بیٹے کو دفن کر دیا۔''

ایک عام آدمی بھی پولیس کی اسٹوری میں دس خامیاں تلاش کر لیتا... جس انداز سے سارے کیس کو ہینڈل کیا گیا تھا، اس سے تو یہ لگتا تھا کہ ساڑھے چار لاکھ کی رقم بھی پولیس نے غائب کر دی... یا غلام رسول کو پہلے کسی اور جگہ لے جا کے لوٹا گیا... پھر گلا گھونٹ کے ہلاک کیا گیا اور لاش کو موٹر سائیکل سمیت وہاں لا کے ڈال دیا گیا جہاں سے لاش ملی... اسے ڈکیتی اور قتل کی واردات بنانے کے لیے دو گولیاں اس کے سر اور سینے میں بھی مار دی گئیں... پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی فوراً حسب منشا حاصل کر لی گئی اور مردے کے قبر میں روپوش ہوتے ہی کیس داخل دفتر ہو گیا... ڈاکو بھلا کبھی پکڑے جاتے ہیں...

ایک صحافی کی حیثیت سے میں عام آدمی کے مقابلے میں کچھ زیادہ جانتا ہوں کہ قتل کیسے ہوتے ہیں... کیسے کرائے جاتے ہیں... کیسے چھپائے جاتے ہیں اور کیسے دبائے جاتے ہیں... سزا کس کو ملتی ہے اور کس کو نہیں ملتی... ایسے گلے کیسے تلاش کیے جاتے ہیں جن میں پھانسی کا پھندا فٹ آجائے۔

شاید اب عام آدمی بھی یہ سب جانتا ہے... قتل، حادثات زندگی کے معمولات ہو گئے ہیں... صبح ایک اخبار کی سرخیوں پر سرسری نظر ڈالنے والا ان کو ذرا اہمیت نہیں دیتا... میں بھی سوچ رہا تھا کہ ایک عام سے قتل کے کیس سے اپنی جان کیسے چھڑاؤں اور کیسے صائمہ کو قائل کروں کہ نورِ چشم راحتِ جاں... اپنی کزن سے کہو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے... جو مر گیا اسے بھول جاؤ... یاد رکھو بس انہیں جو نظر کے سامنے ہوں۔

لیکن ایک سے زیادہ وجوہ کی بنا پر میں نے صائمہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ایک تو میں بزدل ہوں۔ خوب صورت عورت کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کے بڑے بڑے بہادر مردوں کا پتا پانی ہوتا ہے... اپنی رپورٹ کے آخری حصے تک آتے آتے صائمہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے... یہ اتنا خوب صورت نظارہ تھا کہ میں دم بخود بیٹھا دیکھتا رہا... جیسے کوئی سیاح مبہوت ہو کے نیاگرا فال کو دیکھتا ہے... اس کے آنسوؤں میں بھی اتنی ہی قوت تھی جتنی نیاگرا کے آبشار سے گرنے والے پانی کے پُرشور دھارے کی۔ رہی بات حسن کی تو وہ دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے... انکار کرنا میرے لیے ناممکن تھا... میں اس بات سے بھی ڈرتا تھا کہ وہ پھر روٹھ گئی تو آٹھویں بار ناک سے زمین پر لکیریں نکال کے بھی روٹھی حسینہ ماننے کی نہیں کہ یہ تو روز کا ڈراما ہے۔

اچانک صائمہ نے آنسو پونچھ کے کہا۔ ''ایسے کیا الّو کی طرح دیدے گھما رہے ہو... کچھ بولو۔''

''مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا کہ تمہاری آنکھوں سے رستے موتیوں کے بارے میں کیا کہوں... یہ ایسا منظر تھا جس کا حسن میری آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی... کیونکہ تم سے محبت صرف مجھے ہے...''

وہ ناز و ادا سے مجھ سے لگتے ہوئے بولی۔ ''تم صرف محبت کرتے ہو... محبت کے لیے کچھ کرتے نہیں۔''

میں ڈرا کہ وہ پھر اپنا گھر والا سیاپا شروع کر دے گی چنانچہ میں نے عیاری سے کہا۔ ''دراصل سویٹ ہارٹ... وہ مجنوں کی طرح صحرا میں پھرنے کا زمانہ تو گزر گیا... فلموں کے رومانی منظر والا کوئی گانا اس وقت مجھے یاد نہیں... اور میں گاؤں گا تو پھر گانے والے کہاں جائیں گے؟''

''باتیں مت بناؤ... جس کام کے لیے میں آئی تھی، وہ تم کرو گے یا نہیں؟'' وہ الگ اور سنجیدہ ہو کے بیٹھ گئی۔

''یار تم کیا چاہتی ہو... میں کراچی سے اسلام آباد جاؤں صرف نورین کے لیے؟''

''نورین کے لیے نہیں... میرے لیے۔'' اس نے میرے کان کھینچے۔

''ذرا میری موٹر سائیکل ٹھیک ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے جہاز پر تمہاری سیٹ بک کرا دی ہے... اور اپنی بھی... ابھی چار گھنٹے ہیں... میں تمہارا سامان پیک کر دیتی ہوں... اپنا سوٹ کیس تو میں گاڑی میں رکھ لائی تھی۔''

''صائمہ... آج مجھے بہت کام ہے۔''

اس نے کہا۔ ''وہاں سے مری صرف پچاس کلو میٹر ہے... کیا تم نے کبھی سنو فال دیکھی ہے؟''

''کبھی گرمیوں میں ہوئی ہی نہیں... اور سردیوں میں تو سنا ہے وہاں لوگ بات بھی کرتے ہیں تو الفاظ منہ سے دھواں کی طرح گرتے ہیں۔''

دنیا جاتی ہے دسمبر کی چھٹیوں میں وہاں برف باری دیکھنے۔''

''تو تم جاؤ دنیا کے ساتھ۔''

اس نے بڑی ادا سے کہا۔ ''میری دنیا تو تم ہو۔''

میری مزاحمت کے غبارے کی ساری ہوا نکل گئی۔ میں نے ایک آخری کمزور سی کوشش کی۔ ''صائمہ ڈارلنگ... !تم

www.kahopakistan.com

بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہو... کنواری بیوہ کہلانے کا۔''

☆☆☆

اگر آپ نے کبھی اسلام آباد انٹرنیشنل پر کسی کو مجمع عوام و خواص کے درمیان کھلی آنکھوں کے ساتھ اور بقائمی ہوش و حواس لیٹا ہوا دیکھا ہے تو یقین کیجیے... وہ میں تھا۔

کرنا خدا کا کچھ یوں ہوا کہ جب میں لاؤنج سے باہر آنے کے بعد صائمہ کے پیچھے پیچھے صفر درجۂ حرارت میں لرزتا تھرکتا باہر کی جانب رواں تھا تو نہ جانے کس سمت سے آکے ایک شخص نے میری ٹانگوں میں سے گزرنے کی کوشش کی...

اب میری سطح زمین سے بلندی عام لوگوں سے کافی زیادہ ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں... محض اس قد کے باعث جب صائمہ میرے ساتھ چلتی ہے تو بہت سے حاسد ہمیں گلی ڈنڈا بھی کہتے ہیں۔

میری ناک اور منہ سے اسٹیم انجن کی طرح بخارات نکل رہے تھے اور میں کوشش کر رہا تھا کہ صائمہ کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دوں جو بڑے مزے سے پورٹر کے ساتھ اپنی ہائی ہیل اور لیڈیز کوٹ میں شولڈر بیگ ہلاتی جا رہی تھی... اس کی نظر مجھ پر نہیں کسی آشنا چہرے کی تلاش میں تھی اور اسے یقین تھا کہ میں دُم ہلاتا اس کے پیچھے آرہا ہوں... دم شیر کی بھی ہوتی ہے۔

ایسے میں نہ جانے کدھر سے وہ میرے قد کا نصف شخص نمودار ہوا اور میری ٹانگوں میں سے گزرنے لگا... اس نے وال کلاک جیسے گول چہرے پر بتیسی چمکاتے ہوئے چلا کے کہا۔ ''ڈرپوک صاحب...!'' میں نے اسے روکنے کی کوشش کی اور بس... انجام یہ ہوا کہ میں ایک طرف سر کے بل گر کے چت ہوا تو وہ دوسری طرف لڑھک گیا۔

میں کھڑے ہوتے ہوئے دہاڑا۔ ''یہ کیا بکواس ہے... میں ڈرپوک نہیں ہوں۔''

''مجھے پتا ہے آپ ڈرپوک صاحب ہیں... مشہور صحافی... میں آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔''

غصے پر قابو پا کے میں نے کہا۔ ''شٹ اپ... میں ڈرپوک نہیں... بزدل ہوں... چلو راستہ چھوڑو میرا۔''

''میں... آپ کا ایک قدرداں... دیکھیے اب آپ یہاں آئے ہیں تو ہمیں بھی خدمت کا موقع دیں۔'' میرے کچھ بولنے سے پہلے اس نے زبردستی ایک کارڈ میرے ہاتھ میں تھمایا اور جیسے ہجوم میں سے نمودار ہوا تھا ویسے ہی... بھیڑ میں گم ہو گیا... بید دیکھے بغیر کہ میں نے کارڈ کو جیب میں ڈال لیا۔

صائمہ اکیلی کھڑی تھی۔ ''کہاں رہ گئے تھے تم؟'' اس نے میرے بجائے سامنے پھیلے ہوئے وسیع کار پارک پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی تشویش ظاہر کی۔ ''نورین نظر نہیں آرہی۔''

اس کے برعکس سردی سے تھرتھرانے کے علاوہ اگر میں کچھ کر رہا تھا تو اس مسخرہ نظر آنے والے شخص کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا مقصد ہرگز مجھے مجمع عام میں سجدہ ریز کرنا نہیں تھا... اس نے اظہار عقیدت کے طور پر میری قدم بوسی کرنے کی کوشش کی تھی... بس عجلت یا گھبراہٹ میں یہ کام وہ سلیقے سے نہیں کر پایا تھا... ایک سوال یہ تھا کہ آخر اسے عجلت اور گھبراہٹ کس بات کی تھی... یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر میری راہ میں حائل ہونے پر مجبور کیا ہو۔

لیکن اس سے زیادہ اہم یہ تھا کہ وہ شخص جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ ہرگز میرا فین یا عقیدت مند نہیں تھا... ایسا ہوتا تو اسے میرا نام کیسے بھولتا... اس نے بزدل سنا تھا لیکن گھبراہٹ میں یہ نام ذہن سے اتر گیا اور اسے ڈرپوک یاد رہا... مطلب ایک ہو لیکن بات نام کی تھی جو اس نے غلط لیا تھا اور پھر یہ ضد تھا کہ وہ میرا پنکھا ہے... اگر وہ فین تھا تو نیل فین۔

اچانک سامنے آکے رکنے والی ایک گاڑی نے مجھے متوجہ کرلیا۔ اس میں سے ایکسٹرا لارج سائز پیٹ اور مونچھوں والا ایک شخص ڈرائیور کی سیٹ سے اترا اور ہماری طرف بڑھا... شلوار قمیص اور اونی گرم شال کی بکل مارے وہ ادھیڑ عمر شخص اپنے چہرے کے کرخت نقوش سے کوئی سابق تھانے دار لگتا تھا لیکن اس نے اپنے بدوضع پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اپنا بھاری پنجہ آگے بڑھا دیا۔ ''آپ بزدل صاحب ہوں گے... اور یہ آپ کی بیگم صاحبہ... ڈاکٹر شائستہ...''

میں نے اس سے ہاتھ ملا لیا۔ ''اور آپ؟''

''میں نورین کا ماموں ہوں... راجا اکبر... معاف کرنا مجھے آنے میں کچھ دیر ہو گئی... آپ تشریف رکھو۔'' اس نے صائمہ کا سوٹ کیس اٹھا لیا۔

صائمہ نے نئی کرولا کو دیکھا۔ ''وہ خود نہیں آئی؟''

''لو جی... ہم ہیں نا مہمانوں کو لانے لے جانے کے لیے... پھر گھر کی عورتوں کو کیا ضرورت ہے۔'' اس نے سوٹ کیس ڈگی میں رکھ دیے۔

میں اور صائمہ پیچھے بیٹھ گئے۔ جتنا کچھ مجھے نورین کے بارے میں صائمہ نے بتایا تھا اس سے صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ ایک زمانے میں صائمہ کی ماں اور نورین کی ماں میں بڑی دوستی تھی۔ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں اور ان کے گھر بھی قریب قریب تھے چنانچہ ہر وقت کا آنا جانا بھی تھا۔

نورین نے صائمہ کے ساتھ ہی گورنمنٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان دیا۔ نورین کالج نہیں گئی تھی اس کی فیملی میں لڑکیوں کو کالج یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم دلانے کا رواج ہی نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے فائدہ نہیں نقصان ہوتا ہے... یہ وہی مخصوص مردوں کے معاشرے کی سوچ تھی جس میں اخلاقیات کی ساری پاس داری صرف عورت پر فرض تھی... یہ طے تھا کہ صرف لڑکیاں زیادہ پڑھ لکھ جائیں تو خودسر ہو جاتی ہیں۔ بے حیا یعنی بدکردار ہو جاتی ہیں اور ان کا تو کام صرف بچے پیدا کرنا ہے... نوکری کرنا نہیں کہ اعلیٰ تعلیم ضروری ہو۔

نورین کے لیے کہا یہ گیا کہ بس اب بہت جلد اس کی کہیں بات پکی کر دیں گے۔ رشتے تو بہت آرہے ہیں... لیکن صائمہ کے انٹر پاس کر کے میڈیکل کالج میں پہنچنے تک نورین اپنے والدین کے گھر ہی بیٹھی تھی... پہلے اور دوسرے سال میں وہ چھٹیوں میں پنڈی جاتی تھی ورنہ میڈیکل کالج کے ہوسٹل میں رہتی تھی۔ یوں نورین سے اس کا ملنا جلنا کم ہو گیا۔

جب صائمہ نے سیکنڈ ایئر کا امتحان دیا تو اس کے والدین ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے... وہ بیٹی سے ملنے لاہور آئے تھے اور واپس جا رہے تھے کہ بس کو حادثہ پیش آگیا۔ دو بس والوں کی ریس لگی اور تنگ سڑک پر... اس زمانے میں جی ٹی روڈ دو طرفہ نہیں تھی۔ سامنے سے آنے والا ایک ٹرک بدمست ہاتھی کی طرح بس میں گھس گیا۔ مسافر کوئی زندہ نہیں بچا۔

☆☆☆

اچانک صائمہ نے کہا۔ ''یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

ڈرائیور نے پیچھے مڑ کے دیکھے بغیر کہا۔ ''گھر اور کہاں؟''

''کس کے گھر... ہم بائیس نمبر چنگی سے گزر چکے ہیں اور تم سیدھے کہاں سے لال کڑتی جاؤ گے۔''

''راستہ تو یہ بھی ہے... ادھر لالہ زار کالونی سے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا لمبا راستہ لینے کی ضرورت کیا تھی؟''

اس نے کہا۔ ''دراصل بات یہ ہے نورین اور اس کی ماں آج کل میرے ساتھ ہیں... اور میں ادھر ہی رہتا ہوں... ڈھمیال کیمپ سے آگے قائداعظم کالونی ہے... اس سے ذرا آگے۔''

بہت سے شکوک اور شبہات صائمہ کی آنکھوں میں دیکھے جا سکتے تھے لیکن اس نے مجھ سے کچھ کہا نہیں۔ گاڑی چلانے والا نورین کا ماموں راجا اکبر اپنے سامنے لگے ہوئے بیک ویو مرر سے مسلسل ہمیں گھورتا نظر آتا تھا۔ اس کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ ہم اس کے لیے بن بلائے مہمان ہیں اور وہ ہماری تشریف آوری سے خوش نہیں ہے۔

میں نے اسے کریدنے کے لیے کہا۔ ''راجا صاحب! نورین غالباً آپ کی بہو بنے گی؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں جی... اکرم میرا بیٹا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''خیر سے کیا کام کرتا ہے؟''

''بس جی... زمینوں کی دیکھ بھال... وہی جو ہم کرتے رہے... اب کنسٹرکشن کا بزنس بھی کر رہا ہے... ادھر چکری روڈ پر بہت ترقیاتی کام ہوا ہے جب سے موٹر وے انٹرچینج بنا ہے... ایک ہاؤسنگ سوسائٹی بنائی ہے اپنی۔''

میں نے کہا۔ ''انجینئر ہو گا؟''

''او نہیں جی... اس کے لیے کوئی انجینئر ہونا ضروری ہے؟ اینٹ پر اینٹ رکھتے جاؤ... مکان کھڑا ہو جاتا ہے... لو جی ہم پہنچ گئے۔'' اس نے گفتگو کا سلسلہ ایک دم ختم کر دیا۔

گاڑی جس مکان کے سامنے رکی تھی، وہ شہر سے باہر اور نیا بنا ہوا تھا... اس کا رقبہ ایک کنال سے اوپر ہی ہو گا کیونکہ گاڑی اندر داخل ہونے کے بعد جس راستے پر روکی گئی، اس کے دائیں جانب خاصا کشادہ صحن تھا۔ اسے تھوڑی سی محنت سے ایک خوب صورت لان میں تبدیل کیا جا سکتا تھا مگر وہاں دھول اڑ رہی تھی۔ سامنے قدِآدم دیوار تھی... عمارت میں بھی تعمیر کے حسن کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ یہ صرف اینٹوں کی بنی ہوئی عمارت تھی جس پر پلستر تک نہیں ہوا تھا... پرانی طرز کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

اندر جاتے ہی مجھے گھر کے ماحول کا اندازہ ہو گیا... صائمہ اندر چلی گئی اور راجا اکبر کی راہنمائی میں مجھے ایک ڈرائنگ روم جیسے حصے میں پہنچا دیا گیا جہاں نہ کوئی ترتیب تھی اور نہ آرائش... ایک دیوار کے ساتھ چار کرسیاں رکھی تھیں... دوسری دیوار کے ساتھ ایک پرانا صوفہ تھا... درمیان میں وہ میز جو نہ صوفوں سے میچ کرتی تھی نہ کرسیوں سے... دیواروں پر چونا پھیرا گیا تھا... روشنی کے لیے ایک دیوار پر لگے ہوئے ہولڈر میں ساٹھ واٹ کا بلب جل رہا تھا جس کی لائٹ اس کمرے کے صرف ایک حصے کو روشن کر رہی تھی۔

میرے بیٹھتے کے ساتھ ہی ایک اور شخص اندر سے آگیا جو راجا اکبر کا بیٹا ہی ہو سکتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کے چہرے پر داڑھی تھی، اس نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ ''تو آپ ہو وہ صحافی...

www.kahopakistan.com

ڈرپوک... میرا مطلب ہے بزدل صاحب!"

اس رکی نوعیت کے جملے نے بھی مجھے چونکا دیا۔ صحافت کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے چند ماہ بعد ہی میرا نام بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی سے بزدل ہو گیا تھا... گزشتہ کئی برسوں میں مجھے بزدل کے بجائے ڈرپوک کہنے کی غلطی کسی نے بھی نہیں کی تھی... اور یہ بات مذاق کی نہیں تھی... صرف ایک گھنٹے میں دو افراد نے مجھے غلطی سے ڈرپوک کہا تھا۔

میرا ذہن اسے غلطی تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا... اسے اتفاق بھی نہیں سمجھا جا سکتا... ان دونوں غلطی کرنے والوں کے درمیان ایک تعلق اور بھی تھا، وہ دونوں جھوٹے تھے... ان میں سے کسی نے بھی پہلے نہ میرے کالم پڑھے تھے اور نہ قطعات لیکن وہ خود کو میرا فین ظاہر کر رہے تھے... ایک سوالیہ نشان خود بہ خود سانپ کا پھن بن گیا تھا اور میرے دماغ میں سر اٹھا رہا تھا۔

کمرے میں ایک ناقابلِ فہم بوجھل خاموشی غالب تھی...... اکبر اور اس کا بیٹا دوستوں سے مجھے گھور رہے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ان سے کیا بات کروں... پھر ایک ادھیڑ عمر کا بھاری بھرکم شخص چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آیا... ٹرے میں چار کپ تھے اور ان سے چائے چھلک کے ٹرے میں گر چکی تھی۔

میں نے ایک پیالی اٹھا کے کہا۔ "مجھے نورین کے والد خدا بخش سے ملنا تھا۔"

اکرم نے کہا۔ "یہی ہے خدا بخش۔"

چائے لانے والا خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے رسماً کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہوا آپ کے بیٹے کے قتل پر۔"

اکرم نے کہا۔ "زندگی اللہ کی امانت ہے، وہ جب چاہے جیسے چاہے واپس لے لے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یعنی اگر کوئی قتل کر دے تو ہمیں اسے بھی اللہ کی مرضی سمجھ کے معاف کر دینا چاہیے؟ قاتل نے اللہ کی مرضی کی تو پھر قصاص اور دیت کا حکم کس لیے؟"

اکرم نے سٹپٹا کے کہا۔ "آپ میری بات کا غلط مطلب نکال رہے ہو جی۔"

"میں تو آپ سے بات ہی نہیں کر رہا۔ نورین نے ڈاکٹر صائمہ کو بتایا تھا کہ غلام رسول کا قتل ڈاکوؤں نے نہیں کیا... نہ اس کی موت گولیاں لگنے سے ہوئی... اسے گلا گھونٹ کے مارا گیا ہے۔"

"نورین تو بے وقوف ہے۔"

"اپنی رائے کو محفوظ رکھو... جب میں اس سے بات کروں گا..."

اکرم گرم ہو گیا۔ "دیکھو جی بزدل صاحب... آپ ہمارے گھر میں مہمان ہو اس لیے میں لحاظ کر رہا ہوں... وہ میری منگیتر ہے... میری ہونے والی بیوی... وہ آپ سے بات نہیں کرے گی... ہم پردے کے قائل ہیں۔"

"ٹھیک ہے... میں خدا بخش سے بات کرنا چاہتا ہوں... اکیلے میں۔"

"جو بات کرنا ہے ہمارے سامنے کرو۔"

میری اب اکرم سے کھلی جنگ ہو گئی۔ "او کے... اس گھر میں تمہارا حکم چلتا ہے... لیکن میں نے کراچی سے اسلام آباد تک کا سفر جھک مارنے کے لیے نہیں کیا ہے... جب یہ کیس ری اوپن ہوگا تو بات ہوگی پولیس اسٹیشن میں یا سی آئی اے سینٹر میں... خدا بخش سے بھی اور نورین سے بھی... اب آپ مہربانی کریں اور اندر سے ڈاکٹر صائمہ کو بلا دیں... میرا خیال ہے کہ ہم نے یہاں آ کے غلطی کی۔"

اب راجا اکبر نے بیٹے کو گھورا۔ "تو بند کر اپنی بک بک... اور دفع ہو جا یہاں سے... یہ میرے مہمان ہیں، تیرے نہیں۔"

اکرم غصے میں اٹھا اور واک آؤٹ کر گیا۔ اب خدا بخش نے لجاجت سے کہا۔ "آپ ناراض نہ ہوں سر... اس کا مزاج کچھ تیز ہے۔"

اکبر نے کہا۔ "دراصل ہم یہ نہیں چاہتے کہ گڑے مردے اکھاڑے جائیں... قتل ایسے ہوا یا ویسے... غلام رسول تو اب واپس آنے سے رہا۔"

میں نے کہا۔ "یعنی آپ نہیں چاہتے کہ قاتل کا سراغ لگایا جائے؟ آخر کیوں؟"

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "اس سے کیا حاصل ہوگا... بدنامی کے سوا۔"

"کس کی بدنامی؟ آپ کو اپنے دشمن کی بدنامی کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

اب غلام رسول کا باپ بولا۔ "وہ جی... میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ میری عقل بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ ایسے ہی بات کی تھی میں نے اپنی بچی سے... اس نے آپ کو پریشان کر دیا۔"

اکبر یوں مسکرایا جیسے یہ بیان اس کی مرضی کے مطابق دیا گیا ہو۔ "بس ہم سب نے صبر کر لیا ہے... اللہ انصاف کرنے والا ہے... قاتل روزِ حشر تو سزا سے نہیں بچ سکیں گے... آپ کی بڑی مہربانی جو اتنی دور سے ہمارے لیے وقت نکالا... ہم آپ کے آنے جانے کا سارا خرچ دے دیں گے... ویسے گھر آپ کا ہے جب تک چاہو رہو۔"

اس کی بات بہت واضح تھی جب تک چاہو رہو لیکن قتل کے معاملے پر اپنی زبان بند رکھو... اور جانا ہے تو یہ لو ٹکٹ کے پیسے اور دفع ہو جاؤ... کوئی بات ضرور ایسی تھی کہ وہ قاتل کو دنیا میں سزا دلوانا نہیں چاہتے تھے۔ سزا کو یومِ آخرت تک التوا میں رکھنا چاہتے تھے۔

میرے دوبارہ مطالبہ کرنے سے پہلے ہی صائمہ اندر سے نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ ہی سب کچھ کہہ رہا تھا... غصہ... پشیمانی... بے بسی اور دکھ کے سارے جذبات کی تحریر کو میں الگ الگ پڑھ سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے بس ایک لفظ کہا۔ "چلو۔" اور میں چل پڑا۔

"ہم نے غلطی کی یہاں آ کے۔" صائمہ نے اونچی آواز میں انہیں سنانے کے لیے کہا جو ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔

"کوئی بات نہیں... ہم پہلی فلائٹ سے واپس چلے جاتے ہیں۔"

... اکبر آگے بڑھا۔ "چلیے میں آپ کو ائرپورٹ چھوڑ دوں۔"

میں نے ایک دم پلٹ کے کہا۔ "تھینک یو... ہم چلے جائیں گے۔"

احتجاجی انداز میں ہم نے سڑک تک مارچ کیا..... اکبر ہمیں منانے کے لیے پیچھے پیچھے آیا۔ درحقیقت وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ہم واپس جانے کے معاملے میں کس حد تک سنجیدہ ہیں چنانچہ پہلی ٹیکسی جو پیچھے سے آئی تھی میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ "ائرپورٹ جانا ہے۔" اس کے اقرار میں سر ہلاتے ہی ہم دونوں پیچھے بیٹھ گئے۔ راجا اکبر نے ہاتھ ہلا کے ہمیں خدا حافظ کہا لیکن ہم اتنے خفا تھے کہ جواب میں ہاتھ بھی نہیں ہلایا۔

ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی میں نے صائمہ کی طرف دیکھا اور اس نے میری طرف... پھر ایک ساتھ ہم دونوں ہنس پڑے۔ "یہ ہم کس پاگل خانے میں پہنچ گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"مگر ہم واپس بالکل نہیں جا رہے ہیں۔"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جو حکم سرکار... بندہ حکم کا غلام۔"

صائمہ نے آنکھوں سے ٹیکسی والے کی طرف اشارہ کیا۔ "انہیں بھی تو سمجھا دو۔"

میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔ "بھائی کرایہ آپ جو مناسب ہو لے لینا مگر اب ہم ائرپورٹ نہیں... صدر جائیں گے۔"

صدر کے ایک بہت اچھے چینی ریستوران میں لنچ تناول فرماتے ہوئے میں نے صائمہ کو اکرم کے ساتھ ہونے والی جھڑپ کا احوال سنایا۔

"ہمیں وہاں جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔" صائمہ بولی۔

"لیکن ہم کون سا اپنی مرضی سے گئے تھے۔ ہمیں وہاں لے جایا گیا تھا۔"

صائمہ نے کہا۔ "وہاں بات نہیں ہو سکتی... نورین کو اور اس کے والدین کو اسی لیے وہاں لایا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہ کہہ سکیں۔"

"ذرا سوچو مس صائمہ... تمہاری اس سہیلی کے ساتھ یہ شخص شادی کے بعد کیا سلوک کرے گا... ابھی سے اس کا مجازی خدا بن بیٹھا ہے اور اس پر پابندیاں لگا رہا ہے۔"

صائمہ نے اپنی ماہرانہ رائے ظاہر کی۔ "تم دیکھ لینا... اسی اکرم نے اپنے سالے کو قتل کیا ہوگا۔"

"وہ معلوم ہو جائے گا... یہ بتاؤ نورین کا رویہ کیسا رہا؟"

"ناقابلِ یقین... اس نے صاف انکار کر دیا کہ میں نے تمہیں کب بلایا... ایک بات منہ سے نکل گئی تھی باتوں میں کہ ابا نے کچھ ایسی بات کی تھی لیکن ابا ہوش میں کہاں تھے اس وقت... ابھی تک اس صدمے سے ان کا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ نورین کی ماں زیادہ بڑھ بڑھ کے بولنے لگی کہ اللہ بھلا کرے میرے بھائی کا... وہ اپنے گھر لے آیا ورنہ نورین کا ابا تو بالکل ہی پاگل ہو رہا تھا۔ مجھے شک بے وجہ نہیں ہے... نورین کے ماموں نے معاملے کو دبایا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کو بچایا اور نورین کی ماں نے بیٹی کے سہاگ کو... داماد کو پھانسی کیسے چڑھ جائے... بیٹا تو مر گیا... اب ہم کیا کریں گے؟"

مجھے اچانک اس شخص کا خیال آیا جس نے قدم بوسی کے بہانے مجھے چت کر دیا تھا اور ایک کارڈ تھما کے غائب ہو گیا تھا... اس نے بھی ڈرپوک کہا تھا مجھے... کہاں ہے وہ کارڈ... میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"کیا ہوا... کچھ کھو گیا؟"

"نہیں مل گیا... یہ کارڈ لیکن اس پر تو صرف ایک نمبر ہے۔" میں نے کہا۔

غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ میرے اس

www.kahopakistan.com

مجھ سے جمیل فین کا فون نمبر ہو سکتا ہے۔ ایک خیال کے تحت میں نے یہ نمبر ملا دیا۔ پہلی ہی گھنٹی پر کسی نے کہا۔ ''آواز میں وہی شان تھی جو کسی مرغی خانے میں سو مرغیوں کے اکلوتے شوہر کی بانگ میں ہو سکتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''یہ نام بدل لو ورنہ سوچ لو ملک میں حکومت کس پارٹی کی ہے۔ وہ تمہیں مرغا بنا دیں گے اور کہیں گے انڈا دو۔''

''اوئے یہ کون بکواس کر رہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں بزدل بول رہا ہوں۔ جسے تم نے ڈرپوک قرار دیا تھا۔''

اس نے حلق سے ایک ایسی آواز نکالی جو مرغی انڈا دیتے وقت نکالتی ہے۔ ''آپ... معاف کرنا جناب عالی! آپ کی شان میں بڑی گستاخی ہوگئی... بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔''

''تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں میں... کسی انٹرنیشنل ائرپورٹ پر مجھے چاروں شانے چت گرانے کی سعادت صرف تم نے حاصل کی تھی۔''

''آپ اس وقت کہاں ہو؟ اس کانے دجال کے گھر میں... مجھے پچھ بتانا تھا آپ کو۔''

میں نے کہا۔ ''کون کانا دجال؟''

''وہی اکرم... اس کی ایک آنکھ نقلی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس کے ساتھ نہیں ہوں... تمہیں جو بھی بتانا ہے، فون پر بتا سکتے ہو۔''

''کوئی اور ہے جو آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہے... میں اس کا نام بھی فون پر بتانا نہیں چاہتا... زمانہ ایسا ہے کہ برا وقت آئے تو پولیس موبائل فون کی ساری گفتگو کا ریکارڈ بھی حاصل کر لیتی ہے... آپ کو تو پتا ہوگا؟''

میں نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو بتاؤ میں تم سے کہاں ملوں۔''

''آپ ابھی تشریف لے آؤ... میں تو دکان چھوڑ کے رات سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔ نام ہے میر اظفر اللہ عباسی۔''

''ٹھیک ہے... میں رات کو کہاں آؤں... اگر میں آنا چاہوں...''

''لو جی اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے... میں ادھر لالہ زار میں رہتا ہوں... بھائی کو بھی ساتھ لاؤ... رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے یہاں کے راستوں کا پتا نہیں۔''

''پھر میں خود آپ کو اپنی گاڑی میں لینے آ جاؤں گا... وہ بندہ بھی ادھر ہی رہتا ہے... میرے گھر کے قریب۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا... میں تمہیں فون پر بتا دوں گا۔''

میں نے فون بند کیا تو صائمہ نے پوچھا۔ ''یہ کس سے ہو رہی تھی ایسی بے تکلف گفتگو؟''

میں نے کہا۔ ''ہے ایک مرغی والا... مجھے شک تھا کہ اسے ائرپورٹ پر مجھے گرانے کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا اور جب میں ایک سراغ رساں کی طرح سوچتا ہوں تو غلط نہیں سوچتا... اس نے رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے... مصر تھا کہ بیگم صاحبہ کو بھی ساتھ لاؤں۔''

''کوئی بیگم صاحبہ ہے تو لے جانا ساتھ... مگر پہلے یہ سوچو کہ نورین سے اور اس کے باپ سے اکیلے میں کیسے بات کی جائے؟''

''یہ میں نے پہلے ہی سوچ لیا ہے بیگم صاحبہ... اب یہ بتاؤ کہ تھانے جانا ہے یا نہیں اور...''

ایک گھنٹے بعد میں نے وہ تھانہ تلاش کر لیا جہاں نورین کے بھائی غلام رسول کے قتل کی رپورٹ لکھی گئی تھی۔ کمرا بند کر کے کرسی پر جھولے میں مصروف ڈیوٹی افسر نے میرے بلا اجازت اندر آ کے اس کی نیند میں مخل ہونے کا خاصا برا منایا۔

''بندے کو کسی سرکاری افسر کے کمرے میں دستک دے کے جانا چاہیے۔''

میں بے تکلفی سے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا اور صائمہ کو دوسری کرسی پر بیٹھنا کا اشارہ کیا۔ ''سرکاری افسر سو رہا ہو تو دستک کی آواز بھی نہیں سن سکتا... دوسرے یہ کہ میں تم سے نہیں... انچارج صاحب سے ملنے آیا ہوں۔''

''وہ نہیں ہیں۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔

''کیا مطلب؟ اس تھانے میں کوئی انچارج نہیں ہے؟''

وہ غرا کے بولا۔ ''وہ گشت پر ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مٹرگشت پر کہو... ان کا جانشین ڈیوٹی افسر سرکاری کرسی پر سو رہا ہے... فریادی باہر خوار ہیں۔''

وہ لال پیلا ہو کے بولا۔ ''تم کیا تھانے کے انسپکشن پر آئے ہو... آخر تم ہو کون؟''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''میں بزدل ہوں۔''

''بزدل ہے تو بات ایسے کیوں کرتا ہے پالے خاں کی طرح۔''

میں نے میز پر ہاتھ مار کے کہا۔ ''انچارج صاحب کو فون کرو اور میرا یہی نام بتاؤ... آ گئی بات سمجھ میں۔''

وہ کچھ محتاط ہو گیا کیونکہ تھانے میں اونچی آواز سے بات کرنے کی ہمت عام آدمی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے موبائل فون سے ایک کال کی۔ ''سر جی! ایک بندہ آیا ہے ادھر... بڑے رعب میں ہے کہتا ہے تھانے دار صاحب کو بلاؤ فوراً... نام... جی نام بتاتا ہے بزدل۔''

میں نے اس کے چہرے کا رنگ اور لہجہ بدلتے دیکھا۔ اس نے تین بار یس سر اور دو بار نو سر کہنے کے بعد فون رکھا اور اپنے ماتھے کے تین چوتھائی بنجر حصے کو صاف کیا جس پر سردی میں بھی پسینا چمکنے لگا تھا۔ ''آپ ادھر تشریف رکھو جناب عالی... انچارج صاحب کے کمرے میں...'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''وہ آ رہے ہیں آپ پہلے ہی فرما دیتے کہ صحافی ہو۔''

تھانہ انچارج انسپکٹر شرافت علی کے آنے سے پہلے ہماری خاطر تواضع ایک گاڑھے مشروب سے کی جا چکی تھی جس میں تین چوتھائی دودھ اور باقی چینی تھی مگر اسے چائے کا نام دینے کے لیے تھوڑی سی پتی کا تڑکا بھی لگا دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے انسپکٹر میں صرف نام کی شرافت تھی لیکن میرے نام کی شہرت سے زیادہ میرے دوست انسپکٹر رحم دل خاں کے فون نے بڑی دھاک بٹھا دی تھی۔ رسمی تعارفی کلمات کے بعد میں نے مطلب کی بات کی۔

''غلام رسول کے قتل کا مقدمہ اسی تھانے میں درج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ واردات اسی علاقے میں ہوئی تھی۔ لاش بھی آپ نے ہی اٹھوائی ہوگی اور باقی ساری قانونی کارروائی بھی آپ نے کی ہوگی۔''

''ہاں جی... ہم نے لاش اٹھوا کے سرکاری اسپتال بھجوا دی تھی۔ وہاں سے لواحقین لے گئے۔''

''آپ کو یہ اطلاع کس نے دی تھی؟''

''پتا نہیں... اس نے اپنا نام غلط بتایا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''فون نمبر تو صحیح ہوگا۔''

''ہم نے معلوم کیا تھا لیکن کچھ پتا نہیں چلا... لوگوں نے بوگس نام پتے پر سم لے رکھی ہیں۔''

''لاش اٹھانے کون گیا تھا۔ ظاہر ہے آپ خود تو نہیں گئے ہوں گے؟''

''تھانے کا عملہ تھا... ایک حوالدار اور ایک کانسٹیبل۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ان میں سے کوئی اس وقت ڈیوٹی پر ہے؟''

حسب توقع اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایک چھٹی پر ہے... ایک بیمار ہے... اور حوالدار کی پوسٹنگ دوسرے تھانے میں ہو گئی ہے... راولپنڈی کے صدر تھانے میں... حوالدار خادم حسین۔''

میں نے کہا۔ ''ذرا میری اس سے فون پر بات کرا دیں۔ میں کسی عینی شاہد سے ملنا چاہتا ہوں جو مجھے جائے واردات کے بارے میں کچھ بتا سکے۔''

اس کا موڈ خراب ہونے لگا۔ ''جو تفتیش پولیس کرتی ہے اس میں مداخلت کا اختیار آپ کو کس نے دیا... آپ صحافی ہو... کیا پولیس آپ کے کام میں دخل دے سکتی ہے؟''

''دخل میں بھی نہ دیتا... اگر پولیس واقعی تفتیش کر رہی ہوتی لیکن میری معلومات کے مطابق کیس کو داخل دفتر کر دیا گیا ہے... یا کر دیا جائے گا۔''

''آپ کی معلومات غلط ہیں... ہم ان ڈاکوؤں کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں جنہوں نے اسے پہلے لوٹا اور پھر قتل کر دیا۔''

''پھر آپ اپنی کوشش جاری رکھیں... یہ سمجھ لیں کہ اس کار خیر میں آپ کے ساتھ میں بھی ہوں... اس لیے کہ غلام رسول کے رشتے کی بات جس لڑکی فرزانہ سے چل رہی تھی، وہ ان کی کلاس فیلو ہے...'' میں نے صائمہ کی طرف اشارہ کیا۔ شرافت علی کچھ چونکتا ہوا۔

''یہ تو مجھے کسی نے نہیں بتایا۔'' وہ صائمہ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''یہ کون ہیں؟''

''یہ ڈاکٹر صائمہ ہیں۔ کرم داد خان کی بھانجی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کون کرم داد خان؟''

میں نے کہا۔ ''کمال ہے آپ راجا کرم داد خان کو نہیں جانتے۔ اپنے ڈی آئی جی صاحب... پہلے یہاں تھے... آج کل پرائم منسٹر ہاؤس میں ڈیوٹی ہے۔''

میں نے بڑی فراخدلی اور اعتماد کے ساتھ یہ جھوٹ اس سے بولا تھا کہ ایک انسپکٹر کسی عام ڈی آئی جی کو فون کرنے کا سوچے تو اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں اور وہ پرائم منسٹر ہاؤس کا ہو تو بیٹھے بیٹھے بھی تھانے دار کی پتلون ڈھیلی یا گیلی ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ وہ کیسے تصدیق کرنے کا سوچ سکتا تھا کہ ڈاکٹر صائمہ آپ کی بھانجی ہیں یا نہیں ہیں۔

''بزدل صاحب! آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں جمع کا صیغہ استعمال کروں گا... شکایت نہیں شکایات ہیں... پہلی تو یہی کہ پولیس نے تفتیش کا رخ موڑا... قتل سے ایک بے بنیاد کہانی منسوب کی۔''

''یہ شک کیوں ہے آپ کو؟''

www.kahopakistan.com

''یہاں سے سیکڑوں میل دور بیٹھے کسی صحافی کو الہام تو ہو نہیں سکتا۔ ایک متاثرہ فریق نے مجھے یہ سب بتایا۔ اس نے کہا کہ مقتول کو گلا گھونٹ کے مارا گیا تھا۔ اس کی موت گولی لگنے سے نہیں ہوئی تھی۔''

''کون ہے وہ متاثرہ فریق... سامنے آکے بات کرے۔''

میں نے کہا۔ ''یہی تو مسئلہ ہے اب وہ آزادی سے میرے سامنے آکے بات بھی نہیں کر سکتا... میں نے کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے گھر میں ہے بھی نہیں۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں سر... اسے ابھی بلا لیتے ہیں۔''

''نہیں... آپ یہاں نہ بلائیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کے سامنے بھی وہ طوطے کی طرح بولے گا... یاد رٹایا ہوا سبق دہرائے گا۔''

''تو اس کے گھر چلتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! وہ اپنے سالے کی قید میں ہے اور شک مجھے اسی سالے پر ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا تو پھر وہ اصل قاتل کو بچا رہا ہے۔ آپ بات کریں گے ثبوت کی... مجھے معلوم ہے اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی بڑی عجلت میں تیار کر کے وارثوں کو تھما دی گئی کہ جاؤ اللہ تمہیں صبر دے... اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کو عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔''

''رائٹ... مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کی ٹانگیں توڑ کے کہا جائے کہ جاؤ تمہیں کس نے روکا ہے... ماؤنٹ ایورسٹ سر کر لو... جو میرے سامنے لب نہیں کھول سکا، وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج کرنے کا حوصلہ کہاں سے لائے گا اور ایسا وہ چاہتا بھی نہیں کہ ایک تو اس کا اکلوتا بیٹا گیا... دوسرے اس کی قبر کھود کے لاش کی بے حرمتی ہو۔''

''لیکن یہ کام میں کروں گی۔'' صائمہ نے یکلخت کہا۔

میں دم بخود رہ گیا۔ ایسا اتفاق پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ صائمہ نے میرے کسی جھوٹ پر سفید جھوٹ بولا ہو۔ ''میں... شی از اے ڈاکٹر...''

''میں ویسے ہی معلوم کر لوں گی کہ رپورٹ کس ڈاکٹر نے دی تھی اور کیوں... میں جانتی ہوں کہ موت تو موت ہی ہوتی ہے لیکن ایک موت دوسری سے کس طرح مختلف ہوتی ہے... ضرورت پڑی تو ماموں سے بھی مدد لوں گی مگر آپ فکر مند نہ ہوں... آپ کی پوزیشن محفوظ ہے ابھی تک۔''

تھانے دار کی پریشانی اس کی صورت سے عیاں تھی۔

''ڈاکٹر صاحبہ! میری ریٹائرمنٹ قریب ہے... تیس سال کی سروس کے بعد میری یہ خواہش فطری ہے کہ میں ڈی ایس پی کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ لوں۔''

صائمہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''یہ ہو بھی سکتا ہے بشرطیکہ آپ اس سازش میں فریق نہ ہوں جو اصل قاتل کو تحفظ دینے کے لیے کی گئی تھی... اور آپ کو بھی کورٹ میں اپنی صفائی پیش نہ کرنی پڑے۔''

''کورٹ میں؟''

''جی... اگر ضرورت ہوگی تو میں فریق بنوں گی... میں درخواست دوں گی کہ قبر کشائی کے بعد دوسرے پوسٹ مارٹم کے لیے میڈیکل بورڈ تشکیل دیا جائے... اور مجھے پتا ہے اس میں ڈاکٹر میری مرضی کے ہوں گے اور کسی کی مرضی کے نہیں۔''

''آپ بتائیے... میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''ابھی تو آپ کچھ نہ کریں۔ کسی طرح یہ بات اس کانٹے اکرم... یا اس کے باپ کے کان میں ڈال دیں کہ وہ جو کراچی سے اسلام آباد آئے ہیں... جھک مارنے نہیں آئے ہیں... انہیں تمہارے رویے کی وجہ سے شک ہو رہا ہے چنانچہ بھلا کام تم یہ کرو کہ اپنے ماموں کی فیملی کو ان کے گھر جانے دو۔'' میں نے کہا۔

صائمہ نے کہا۔ ''شک یہ ہو رہا ہے کہ قتل تم نے کیا یا کرایا اور اب اس پر پردہ ڈالنا چاہتے ہو... تم خود نورین سے شادی کرنا چاہتے تھے اور اس کا بھائی غلام رسول اس رشتے کے خلاف تھا... چنانچہ تم نے اسے راستے سے ہٹا دیا یا ہٹوا دیا... حمایت میں صرف تمہاری ماں تھی باپ بھی اس رشتے سے خوش تھا۔''

میں دل ہی دل میں سخت حیران تھا کہ یہ آج صائمہ کو کیا ہو گیا ہے پہلے اس نے میرے جھوٹ کو سفید جھوٹ بتایا۔ اب خود ایک جھوٹ بڑی روانی سے بول رہی تھی۔ تاہم اپنی حیرانی کو میں نے صورت سے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا اور صائمہ کے بیان کی تائید میں سر ہلاتا رہا۔ صائمہ یقیناً اپنی بچپن کی سہیلی کے لیے بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔

ایک اہم ڈی آئی جی کی ڈاکٹر بھانجی کی خوشنودی حاصل کرنا اب تھانے دار کے لیے پہلی ترجیح بن گیا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ! کیوں نہ میں ان باپ بیٹا کو تھانے بلا کے اچھی طرح خبر لے لوں... آپ کہو تو اعتراف جرم بھی کرا لوں؟''

صائمہ نے ہنس کے کہا۔ ''وہ تو آپ ان سے بھی کرا سکتے ہیں جو مرحوم ہو چکے... لیکن اس کی ضرورت نہیں۔''

''جس سے چاہیں تو رکھا ہے انہوں نے بہن بہنوئی کو۔ اس کی شکایت بھی کسی نے نہیں کی... آپ بس اتنا ہی کریں جتنا ہم نے آپ سے گزارش کی ہے۔''

''سر جی! وہ اپنا دوست رحم دل خان کہہ رہا تھا کہ آپ کے قلم میں بڑی طاقت ہے۔ ہم تو دیکھ رہے ہیں میڈیا کتنی بڑی طاقت بن چکا ہے دیکھتے ہی دیکھتے... ایک کالم میں اگر ہمارا بھی ذکر ہو جائے...''

میں نے کہا۔ ''کوئی ایسا کارنامہ سر انجام دیا ہے تم نے؟ ظاہر ہے تم بھی ویسے ہی تھانے دار ہو جیسے پاکستان کے ہر گاؤں، تحصیل، ضلع اور شہر کے تھانوں میں فرعون بنے بیٹھے ہیں اور عوام کی جان و مال کے ہر دشمن کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جرائم کی سرپرستی کر رہے ہیں اور بے گناہوں کو پولیس مقابلوں کا نام دے کر ہلاک کر رہے ہیں۔''

تھانے دار کا چہرہ پرانے پھٹے ہوئے جوتے کے بھیگے ہوئے سول کی طرح بگڑ گیا مگر یہ ساری ذلت اس نے برداشت کی کیونکہ اس کے سامنے ایک نہیں دو توپیں نصب تھیں۔ ایک بڑا دھانسو صحافی تھا اور دوسری ڈی آئی جی کی بھانجی... اس کے لبوں پر مسکراہٹ کچھ ویسی ہی تھی جیسی قربانی کے بعد بکرے کی الگ رکھی ہوئی سری میں نظر آتی ہے۔

اب میں نے بات کو ایک سوالی دریچے پر گھما کے یوٹرن لیا۔ ''لیکن شرافت صاحب! ظالم خان کیسے پکا تھانے دار بن گیا اسی جگہ جبکہ وہ اس قابل بھی نہ تھا کہ کچا حوالدار ہوتا۔ صرف میری دوستی کی وجہ سے... تمہارے بارے میں بھی یہ تو لکھا جا سکتا ہے کہ تم نے اپنے علاقے کو چوروں، ڈاکوؤں سے پاک کر دیا... گاڑی چوری کی وارداتیں تمہارے آنے کے بعد بہت کم ہو گئیں... منشیات فروش غائب ہو گئے اور جوئے کے اڈے تو بالکل ہی نہیں رہے... کون مائی کا لال ہے جو بزدل کے لکھے کو چیلنج کرے اور ثابت کرے کہ اس نے جو لکھا رشوت لے کے غلط لکھا... تم سے میری کوئی یاری رشتے داری تو ہے نہیں۔''

تھانے دار کا چہرہ آہستہ آہستہ روشن ہوتا گیا۔ بجھا ہوا دیا پانچ سو واٹ کے بلب جیسا نظر آنے لگا۔ ''سر جی! یہ ہو سکتا ہے۔''

میں نے ایک شان سے کہا۔ ''میرا نام کیا ہے؟ بزدل... تو میرا قلم ایک میزائل ہے... جو چل جائے تو پھر رکتا نہیں... اچھا تم ہمیں ایک ٹیکسی منگوا دو... ڈاکٹر صاحبہ کی کار ہنڈا موٹرز کے آبپارہ والے شوروم میں سروس کے لیے گئی ہوئی ہے... شام کو ملے گی... یہ ادھر ہی رہتی ہیں تاجی سکس میں... میں تو خیر دو دن کے لیے ہوں یہاں۔''

تھانے دار نے دراز میں سے ایک چابی نکالی۔ ''سر! آپ کچھ ہمیں بھی خدمت کا موقع دیں۔ ہمارے ہوتے آپ ٹیکسی میں جائیں... یہ میری گاڑی حاضر ہے جب تک چاہیں استعمال کریں۔''

تھوڑے تکلف کے بعد میں نے تھانے دار کے بے حد اصرار پر چابی لے لی۔ ''رات کو آپ کی گاڑی واپس آ جائے گی۔''

اس کی شان دار کرولا احاطے میں کھڑی بشکارے مار رہی تھی لیکن اس کی اصل شان اس نمبر پلیٹ میں تھی جس کو قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پولیس کی سرکاری نمبر پلیٹ جیسا بنایا گیا تھا۔ بڑی غلطی سے کوئی اس کے پیچھے بھی آ جاتا تو بعد از مرگ اس کا چالان ہی ہوتا... رپورٹ نہ لکھی جاتی۔

تھانے سے باہر نکلنے کے بعد میں نے صائمہ کی طرف دیکھا تو میری ہنسی کا رکا ہوا سیلاب سارے بند بہا کے لے گیا۔ ''کیوں! بات بنی ہوا استاد؟ یوں چٹکی بجاتے میں تمہیں وی آئی پی بنا دیا... ایسی شان دار گاڑی دلوا دی۔''

ہنسی صائمہ کو بھی آ رہی تھی مگر کچھ جھینپی ہوئی۔ ''مجھے تو پتا تھا کہ جھوٹ بولنے میں استاد ہو تم... ایسا برجستہ جھوٹ بولتے ہو۔''

پہلے میں نے اس کے چٹکی لی۔ ''لیکن یہ آج یقین آیا کہ تم بھی کسی سے کم نہیں۔ جیسے استاد ویسے شاگرد...'' پھر اسے چومنے کی کوشش کی۔ اس نے میرے ایک ہاتھ مارا۔ ''شرافت سے بیٹھو۔ سڑک پر ہیں ہم... بے شرم۔''

''اچھا ایک سچ بولنے کی اجازت ہے بخدا اس کار میں تمہارے حسن کی شان ہی کچھ ایسی ہے کہ دل بے اختیار مچل جاتا ہے... کیا زبردست گاڑی ہے۔''

''نہ بڑے مت ہو... ایسی گاڑی کے ہم خواب بھی کیوں دیکھیں... کار وہی سب سے اچھی جو اپنی ہو۔''

''وہ... اس فولادی ڈبیا کو تم کار کہتی ہو۔'' میں نے حقارت سے کہا۔ ''جس میں یوں لگتا ہے جیسے میں چوہے دان میں پھنسا ہوا چوہا ہوں... جب تک تمہارے ساتھ رہتا ہوں سر گھٹنوں میں چھپانا پڑتا ہے... تم ہی چاہتی ہو نا؟''

وہ خفگی سے بولی۔ ''تو مت بیٹھا کرو... پھرا کرو اپنی اسی جنگ عظیم کے زمانے کی موٹر سائیکل پر جس کے نہ پرزے ملتے ہیں نہ مکینک... اس منحوس صورت مستری کے سوا۔''

میں نے کہا۔ ''سویٹ ہارٹ! کیا ہم یہاں لڑنے آئے

www.kahopakistan.com

ہیں۔ چلو میں ساری عمر تمہاری اس کار میں تمہارے ساتھ بیٹھنے کا معاہدہ کرتا ہوں... بشرطیکہ تم میرے لیے چھت میں ایک سوراخ کرادو۔''

صائمہ نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ ''لڑے بغیر محبت کا کیا مزہ...''

تھانہ صدر میں حوالدار خادم حسین نے باہر آ کے مجھے سیلوٹ مارا۔ جو دراصل گاڑی کے لیے تھا۔ پھر بڑی پھرتی سے اپنی پتلون کو سنبھالا جو اس کی توند کے گنبد پر سے زمین کی کشش کے باعث نیچے اترنے پر آمادہ تھی۔

میں نے کہا۔ ''حوالدار خادم حسین پیچھے بیٹھو۔''

اس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے میں نے اسے گرم توے پر بیٹھنے کا حکم دے دیا ہو۔ لیکن تعمیل کیے بنا اس کے لیے چارہ نہ تھا۔ وہ دروازہ کھول کے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ''میرے لیے کیا حکم ہے سر؟''

''تم نے چند روز پہلے اسلام آباد سے ایک لاش اٹھائی تھی۔ مرنے والے کا نام غلام رسول تھا۔''

''جی سر! اسے ڈاکوؤں نے...''

میں نے کہا۔ ''میں نے تم سے اسٹوری سنانے کے لیے نہیں کہا تم جائے واردات تک میری راہنمائی کرو گے۔''

''ٹھ... جی سر۔'' اس کے حلق سے مردہ سی آواز نکلی۔

وہ بڑے مؤدبانہ انداز میں مجھے راستے بتاتا رہا اور دائیں بائیں موڑنے کے لیے کہتا رہا۔ اسلام آباد کی سڑکوں، سیکٹرز اور سب سیکٹرز کے نمبروں سے مجھے شناسائی نہ تھی۔ وہ بار بار اسے ڈانٹتا۔ ''یہ کیا ہے؟ جی ایٹ فور... چوک سے کس طرف جانا ہے... یہ بتاؤ۔''

ایک نسبتاً ویران سڑک پر اس نے کہا۔ ''گاڑی ادھر روک لیں سر! اس کھمبے کے پاس...''

میں گاڑی سے اترا تو میرے ساتھ صائمہ بھی اتر آئی۔ حوالدار باادب کھڑا مجھے جائے واردات کا معائنہ کرتے دیکھتا رہا۔ پیٹ پر پتلون پکڑنے کے ساتھ اس نے شکل ایسی بنا رکھی تھی کہ لگتا تھا اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہوں۔

میں نے کہا۔ ''حوالدار! ٹھیک اس جگہ کھڑے ہو کے بتاؤ جہاں سے تم نے لاش اٹھائی تھی بلکہ لیٹ کر دکھاؤ... لاش کی پوزیشن کیا تھی؟''

اس نے یہ نادر شاہی حکم بے یقینی سے سنا۔ ''یہاں... سڑک پر لیٹ جاؤں... کوئی گاڑی گزر گئی اوپر سے تو؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی دور دور تک کوئی گاڑی نہیں ہے... اور آئے گی تو میں اسے روک دوں گا۔''

وہ مردہ قدموں سے آگے بڑھا۔ بیٹھا اور پھر لیٹ گیا۔ اسے لاش والا پوز بنانے میں کچھ دیر لگی۔ میرے اشارے پر وہ یوں اٹھا جیسے وہ سچ مچ مرنے سے بچ گیا ہے۔ ''اس بندے کی موٹر سائیکل کہاں پڑی تھی خادم حسین؟''

اس نے چند قدم چل کے ایک جگہ نشان دہی کی جو سڑک سے ہٹ کر تھی۔ ''اب یہ بتاؤ جہاں لاش پڑی تھی وہاں کتنا خون تھا؟''

''کتنا... کافی خون تھا جناب۔''

''کافی کتنا... ایک لیٹر... دو لیٹر... کتنی دور تک پھیلا ہوا تھا؟''

وہ گھبرا گیا۔ ''خون سڑک پر پھیل گیا تھا سر جی۔''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''ہوں... اچھا حوالدار خادم حسین! فرض کرو تم اس موٹر سائیکل پر ہوتے اور ڈاکو تمہیں دو گولیاں مارتے... ایک سر میں اور دوسری سینے میں...''

''اللہ نہ کرے جناب۔'' وہ ہکلا کے بولا۔

''صرف فرض کرو... تو تمہارے جسم سے کتنا خون نکلتا اور کہاں جاتا... ادھر نشیب ہے... ظاہر ہے ادھر ہی بہتا... گولی سر میں کہاں لگی تھی؟''

اس نے پہلے پیچھے ہاتھ رکھا۔ پھر سامنے۔ ''یہاں پیشانی پر۔''

''اس کا مطلب ہے گولی سامنے سے ماری گئی۔ اور بہت قریب سے فائر کیا گیا۔ ایک آدمی جو موٹر سائیکل پر جا رہا ہو... اس خالی سڑک پر اس کی رفتار کافی ہوتی ہے۔ اس کے سامنے کون آئے گا؟ ہم مان لیتے ہیں کہ وہ راستہ روکے کھڑے تھے۔ پھر غلام رسول کی جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟ بریک لگاتے... دائیں بائیں سے نکلنے کی کوشش کرتے یا موٹر سائیکل کو واپس گھماتے؟''

''پتا... پتا نہیں سر۔''

''چلو چھوڑو... یہ بتاؤ اگر تم موٹر سائیکل پر ہو اور تمہیں اچانک گولی لگ جائے... ایک سر میں دوسری سینے میں... تو کیا تم وہیں گر جاؤ گے؟ یا تمہاری موٹر سائیکل بے قابو ہو جائے گی اور تم اس کے ساتھ ہی کہیں دائیں بائیں جا کے گرو گے؟ کیا موٹر سائیکل پر خون تھا؟''

خادم حسین کی ایسی حالت ہو گئی جیسے وہ کسی اعلیٰ سطح کے تحقیقاتی کمیشن کے سامنے اس ملزم کی طرح کھڑا ہے جس کے خلاف قتل عمد کے سارے ثبوت اور گواہ موجود ہیں اور بس کچھ ہی دیر میں اسے تختۂ دار پر لٹکانے کا حکم صادر ہونے والا ہے۔ وہ گھگیانے لگا۔ ''جناب عالی! آپ کیوں پوچھ رہے ہو ایسے

سوالات مجھ سے... میں نے کچھ نہیں کیا... میں یہ سب کیسے بتا سکتا ہوں... آپ بڑے لوگ ہو پھانسی کا پھندا ہمیشہ چھوٹے لوگوں کے گلے میں ڈالتے ہو۔''

میں آرام سے ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا اس کی صورت دیکھتا رہا۔ وہاں سے گزرنے والی اکا دکا گاڑی والوں میں سے کسی نے بھی ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ ایک بہت اعلیٰ قسم کی پولیس نمبر پلیٹ والی گاڑی کھڑی ہے اور ایک باوردی حوالدار اٹینشن کھڑا ہے۔ اسے وہ ڈرائیور ہی سمجھے ہوں گے لیکن یہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ پولیس کا کوئی اعلیٰ افسر ساڑھے چھ فٹ لمبا اور بالکل کھمبا کیسے ہو سکتا ہے اور پھر وہ خوب صورت سی لڑکی... یعنی کیا پتا آئی ایس آئی یا آئی بی کا اعلیٰ افسر ہو۔

''کیا تم نے اب تک سب سچ کہا ہے خادم حسین؟'' میں نے پرسکون لہجے میں بے نیازی سے پوچھا۔

''خدا کی قسم میں نے سچ بتایا ہے... قرآن کی قسم...''

''شٹ اپ... جب سچ بولا ہے تو پھر قسم کھا کے تم اسے جھوٹا کیوں بنا رہے ہو۔ اس کا پتا چل ہی جائے گا... ابھی جو کچھ تم نے کہا... کسی دباؤ کے بغیر کہا ہے نا؟''

''دباؤ... کیسا دباؤ سر؟''

''دباؤ رشوت کا... کسی با اختیار افسر کا... کسی خطرناک نتائج کی دھمکی کا... ابھی بتا دو گے تو محفوظ رہو گے ورنہ بعد کے نتائج کا میں ذمے دار نہیں ہوں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں سر... جو میں نے دیکھا، وہ بتا دیا۔''

میرے لیے اس پر یقین کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا یقین نہ کرنا۔ ''اچھا اب ہم واپس جائیں گے ڈرائیونگ کر سکتے ہو؟''

''یس... یس سر۔'' وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''اپنی نظر سڑک پر رکھنا خادم حسین۔'' میں نے صائمہ کے ساتھ پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اور کان ہماری آواز پر۔''

پیچھے بیٹھ کے میں نے صائمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور اس نے مسکرا کے دوسرے ہاتھ کا انگوٹھا مجھے دکھایا جس کا مطلب تھا کہ ویل ڈن۔ پھر آہستہ سے میرے کان میں بولی۔ ''اس وقت تو اصلی شرلاک ہومز بھی تمہارے سامنے ہوتا تو شرم سے ڈوب مرتا۔''

میں نے جوابی سرگوشی کے بہانے اس کے کان کی لو کو چوما۔ ''پھر کیا خیال ہے اب؟''

اس نے میری پسلی میں کہنی ماری۔ ''بہت اچھے جا رہے ہو تم... کاش تم اس صحافت اور شاعری کے چکر میں نہ پڑتے... پولیس سروس جوائن کر لیتے تو بہت کامیاب رہتے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں، میرے دو چار بنگلے ہوتے ڈیفنس میں۔ ایسی دو چار گاڑیاں ہوتیں۔ اور تم جیسی دو چار بیویاں... لیکن نظر آتا میں اس حوالدار کی طرح۔ میرے چہرے پر پھٹکار ہوتی اور میدانِ حشر میں اَن گنت مظلوم اور مقتول میرا گریبان تھامتے۔''

''بکواس فرماتے ہیں آپ... پولیس میں ایمان دار اور فرض شناس افسر بھی ہوتے ہیں۔''

''اچھا! یہ انکشاف ہے میرے لیے کبھی کوئی ملے تو مجھے بھی ملوانا... میں کالم لکھوں گا کہ اسے دیدارِ عام کے لیے قومی عجائب گھر میں رکھا جائے۔ خادم حسین... تمہارا اصطبل... میرا مطلب ہے تھانہ آ گیا۔ اس مشینی گھوڑے کی لگام مجھے تھما دو اور تم جا کر رات کو نیند نہ آئے تو ڈاکٹر صائمہ کو سب سچ بتا دینا۔ ان شاء اللہ سکونِ قلب حاصل ہو گا۔''

وہ کچھ سمجھا یا نہیں سمجھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس وقت تک خادم حسین تھانے کے دروازے پر ہکا بکا کھڑا تھا۔ میں نے صائمہ سے سوال کیا۔ ''عزیزہ... تمہارا کیا خیال ہے یہ سچ بول رہا تھا؟''

میرے مزید تبصرہ کرنے سے پہلے صائمہ کا فون بولنے لگا اور اس نے نمبر دیکھ کے کہا۔ ''نورین...'' اور پھر بولی۔ ''ہیلو... ہاں کیوں کیا ہوا... اچھا کب؟ آئی ایم سوری۔'' پھر اس نے موبائل فون کا اسپیکر آن کر دیا۔

''صائمہ... میرے ماموں یا ان کے بیٹے نے تو قتل نہیں کیا تھا میرے بھائی کا۔'' وہ خاصی اپ سیٹ تھی۔ ''انہیں کیوں اٹھایا گیا ہے؟''

''نورین! پولیس تفتیش تو کرے گی... وہ بے گناہ ہوں گے تو چھوٹ جائیں گے۔''

''دیکھو... میری ماں بہت پریشان ہے اپنے بھائی کے لیے... یہ تم نے کہا تھا کہ اکرم مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔''

''میں نے ایسا بالکل نہیں کہا۔ مجھ پر یقین کرو۔''

''پھر پولیس ایسا کیوں سمجھتی ہے۔ اچھا تم کہاں... کیا تم میرے گھر آ سکتی ہو؟''

''ابھی... اس وقت؟'' نورین میں پہلے تمہارے پاس ہی آئی تھی۔ وہاں کیا ہوا؟ نہ تم نے سیدھے منہ بات کی نہ کسی اور نے۔ صاف نظر آتا تھا کہ تمہاری ماں سمیت اس کے بھائی اور تمام گھر والے نہیں چاہتے تھے کہ ہم کوئی بھی بات

www.kahopakistan.com

کریں یا تم مجھے کچھ بتاؤ۔''

''مگر اب تو ہم اپنے گھر میں ہیں۔''

میرے اشارے پر صائمہ نے کہا۔ ''لیکن اس وقت ہم نہیں آسکتے۔ ہم بہت دور ہیں۔ ہم کہیں رات کے کھانے پر مدعو ہیں، ہم صبح آئیں گے۔''

میں نے صائمہ کے کندھے پر تھپکی دی۔ وہ سیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کامیابی کے راستے پر چلنے کے لیے صرف دواؤں کے نام معلوم ہونا یا انسانی جسم کو مہارت سے کاٹ کے بیماری سے نجات دلانے کی صلاحیت ہی کافی نہیں ہوتی، اس کی اپنی زندگی کے تجربات نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا پھر اکیلے رہ کے اور اب میرا ساتھ دے کر اس پر زندگی کے سارے رنگین و سنگین پہلو عیاں ہو رہے تھے۔

مجھے پس منظر میں ایک مرد اور عورت کے اونچا بولنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد نورین نے کہا۔ ''دیکھو صائمہ! میری ماں مجھ سے سخت خفا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کے بھائی پر یہ مصیبت میری وجہ سے آئی ہے۔''

''نوری، تم ہی ان کی غلط فہمی دور کر سکتی ہو۔ میں تو تمہارے کہنے سے آگئی تھی۔ تم بھی چاہتی ہو کہ تمہارے بھائی کے قاتل پکڑے جائیں۔''

''وہ ٹھیک ہے لیکن اپنے سگے بھائی کو وہ پولیس کو بتانے کہ میرے ماموں یا اکرم نے کچھ نہیں کیا، انہیں چھوڑ دے۔''

''آئی ایم سوری نورین! قتل کے کیس میں پولیس تفتیش کے لیے کسی کو بھی گرفتار کر سکتی ہے جس پر شک ہو... اکثر وہ بے گناہوں کو بھی پکڑ لیتے ہیں لیکن پھر چھوڑ دیتے ہیں۔''

''وہ تفتیش کریں... تشدد نہ کریں... یہ تو ہو سکتا ہے اگر تم ان سے کہو... بزدل صاحب سے۔''

''ہاں یہ کوشش میں ضرور کروں گی اور انشا اللہ ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ اپنی ماں کو سمجھا دو... باقی باتیں ہم کل کریں گے رائٹ؟ تمہاری تسلی کے لیے ایک بات اور بتاؤں پولیس نے اس کیس کو بڑے بھونڈے طریقے سے دبایا تھا، اصلیت سامنے آجائے گی۔ مجھے یقین ہے میں کوئی دعویٰ نہیں کرتی مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ قاتل کا پتا چل جائے گا۔ اب وہ کوئی بھی ہو۔''

نورین نے کہا۔ ''کوئی بھی ہو؟''

''ہاں، وہ تمہارے لیے غلام رسول سے بڑھ کر تو نہیں ہو سکتا نا... جو تمہارا ایک ہی بھائی تھا۔'' صائمہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میری نظریں باہر پنڈی پولٹری پروڈکٹ کا سائن بورڈ تلاش کر رہی تھیں۔ اندھیرے کے ساتھ دھند بھی اُتر آئی تھی۔ میری آنکھیں بیک وقت سڑک پر بھی تھیں اور دکانوں کے سائن بورڈز پر بھی۔ اور میرے کان صائمہ اور نورین کے درمیان ہونے والی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ اچانک وہ سائن بورڈ میرے سامنے آگیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس پر ایک دائرے میں ''پی پی پی'' لکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے انیس سو پینسٹھ... جس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ دکان اس سال قائم ہوئی تھی جب انڈیا پاکستان میں جنگ ہوئی تھی۔ دکان کا وہ چھوٹا سا مالک مجھے عمر میں اتنا بڑا نہیں لگا۔

میں گاڑی سے اترا تو اس نے کہیں اندر سے مجھے دیکھا اور شیشے کا دروازہ کھول کے میری طرف لپکا۔ ''آپ آگئے ڈرپوک صاحب! میں آپ ہی کے انتظار میں بیٹھا تھا ورنہ دکان تو آٹھ بجے بند ہو جاتی ہے۔''

میں نے احتیاطاً اسے ایک فٹ کے فاصلے پر روک لیا۔ ''میرا نام بزدل ہے... تم پھر بھول گئے۔''

وہ میرے پیٹ سے گلے ملا۔ ''لو جی معاف کرنا... میرا حافظہ ذرا کمزور ہو گیا ہے سلاماً لیکم بھائی جی... بڑی مہربانی کی آپ نے کہ مجھ غریب کی دعوت قبول کی۔ آئیں میں آپ کو مرغیاں دکھاؤں۔''

صائمہ نے میری طرف دیکھا۔ ''مرغیاں بہت دیکھی ہیں میں نے۔''

''نہیں جی... ایسی کہاں دیکھی ہوں گی... ایک دن میں دو انڈے دینے والی اور وہ بھی مرغے کی مدد کے بغیر... اور جناب مالٹے کے برابر انڈا دینے والی... افریقہ کی اور آسٹریلیا کی... ایک مرغی بالکل مور کی آواز نکالتی ہے... ڈانس کرنے والی مرغی دیکھی ہے کبھی آپ نے... میں لگاؤں گا کیسٹ پر نصیبو لال کا گانا اور وہ نرگس کی طرح مٹکنے لگے گی۔''

میں نے صائمہ کو بچانے کے لیے کہا۔ ''تمہارا یہ پولٹری میوزیم ہم کل فرصت میں دیکھنا چاہتے ہیں ابھی اس میں لگ گئے تو پھر کھانا رہ جائے گا۔ ہمارے پاس وقت کچھ کم ہے ڈی آئی جی صاحب سے بھی ملنا ہے۔''

اسے جیسے شاک لگا۔ ''ڈی آئی جی...''

میں نے بے نیازی سے کہا۔ ''ہاں جن کی گاڑی لیے پھر رہے ہیں ہم... دکان بند کرو اور چلو ہمارے ساتھ۔''

مرغی والا گاڑی میں بیٹھنے تک ایک چگی داڑھی والے کو ہدایات دیتا رہا کہ رات بھر میں اسے کس مرغی کے ساتھ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا اور اگر صبح کسی مرغی نے زیادتی کی شکایت کی تو پھر اس کے ساتھ کیا ہوگا۔

''یہ میرا منیجر ہے۔'' اس نے گاڑی میں پیچھے بیٹھ کے بتایا اور اس کی بہت سی افسوسناک فطری خرابیوں کا ذکر کیا جن کی اصلاح باقی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یہ جو تم نے بورڈ پر لکھا ہے... پی پی پی... تو کیا پیپلز پارٹی والوں نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ وہ کیس کر سکتے ہیں تم پر۔''

''بس جی اپنے ڈرپوک صاحب! کیس میں نے نہیں کیا... والد مرحوم نے... اللہ ان کو جنت نصیب کرے یہ کاروبار پہلے شروع کیا تھا بس نام کو رجسٹر نہیں کرایا تھا۔ پیپلز پارٹی بعد میں بنی تھی اور اب آپ سے کیا پردہ... یہ جو اپنے علاقے کے نمائندے ہیں ان کے بیٹے کے ولیمے کے لیے مرغی میں نے ہی سپلائی کی تھی۔ اب سرکاری تقریبات کا ٹھیکا مل جاتا ہے۔'' وہ مرغی کے کڑکڑانے کے انداز میں ہنسا۔

اس کا گھر اور گھر والی دیکھ کے میں دم بخود رہ گیا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے توقع تھی کہ وہ بھی اسی جیسی کوئی چیز ہوگی، مرغی نما۔ کڑکڑ کرتی اور فضول بولنے میں شوہر سے چار ہاتھ آگے لیکن وہ اس تصور سے سو فیصد مختلف ثابت ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ وہ دراز قد اور خوب صورت تھی، اس کا لباس اور انداز گفتگو بھی بہت دلنشیں تھا۔ وہ گھر اس کے حسن ذوق اور سلیقے کی جیتی جاگتی تصویر تھا اور اس کے دونوں بچے بھی۔ معلوم نہیں کیوں ہم شریک زندگی میں یکسانیت اور ہم آہنگی تلاش کرتے ہیں۔ روشنی تو تب ہوتی ہے جب نیگیٹو اور پازیٹو دو تاریں ملتی ہیں... عرش یا فرش کہیں نہیں ملتے مگر ازل سے ساتھ ہیں اور ابد تک رہیں گے۔

کھانا بہت عمدہ تھا اور بڑے سلیقے سے سرو بھی کیا گیا۔ میں بار بار سوچتا رہا کہ کیا وہ گھر بھی ایسا ہی ہوگا جس کا خواب صائمہ اپنی آنکھوں میں لیے پھرتی ہے۔ اس کے اور میرے درمیان میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ قد کا... صورت کا... مزاج کا... پیشے کا...

مرغی والے نے اچانک کہا۔ ''بھئی آپ لوگ کچھ دیر باتیں کرو چائے پیو ہم ابھی آتے ہیں... آؤ جی اپنے ڈرپوک صاحب۔''

اس اچانک اعلان کے لیے نہ میں تیار تھا نہ صائمہ۔ ہم کھانا تو کھا ہی چکے تھے لیکن مجھے یاد آگیا کہ اس نے مجھے اپنے گھر مرغی کھانے نہیں بلایا تھا... چکن تکہ... چکن پلاؤ... چکن کڑاہی... بس چکن کا حلوا نہیں تھا... صائمہ نے میری طرف دیکھا اور میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

میں نے اب اپنا نیا نام قبول کر لیا تھا اور احتجاج کو لاحاصل سمجھ کے چھوڑ دیا تھا۔ ہڈیوں میں اتر جانے والی سردی کے باوجود میں باہر نکلا تو اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''آپ سے کہا تھا میں نے ایک بندہ ہے جو آپ سے خود ملنا چاہتا ہے... اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔''

''اسی کیس کے سلسلے میں؟''

گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے مرغی والے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ویسے قدرداں بھی ہے آپ کا... ہم تو خیر ان پڑھ ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ غلام رسول کا دوست تھا اور وہ بہت کچھ جانتا ہے نام ہے اس کا فاروق... اپنی کچھ ایسی تکڈم تھی کہ آٹھویں جماعت تک ہم ساتھ رہے غلام رسول... میں اور فاروق... پھر والد نے مجھے لگا دیا مرغیوں کے پیچھے... فاروق اور غلام رسول نے میٹرک ایک ساتھ کیا۔ کالج میں بھی ساتھ رہے۔ گورنمنٹ کالج سے دونوں نے بی اے پاس کیا۔ بس جی یہ گھر آگیا فاروق کا... یہ لال والا گیٹ۔''

میں نے گاڑی روک دی۔ دونوں ہاتھوں کو رگڑ کر ملتے ہوئے مرغی والے نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور پھر چلا کے گالی دی۔ ''سالا اسے ٹھیک نہیں کراتا... اور میں بھی بے وقوف... ہر بار بھول جاتا ہوں کہ کرنٹ لگے گا۔''

فاروق دو منٹ بعد نمودار ہوا۔ ''گھنٹی تو نہیں بجی۔ تیری بانگ سن لی تھی میں نے ککڑ دے پتر...'' وہ بولا اور پھر میری طرف پلٹا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ ''میں بزدل ہوں۔''

''نہیں جی... آپ بہت بہادر ہو۔'' اس نے بڑے جوش سے مصافحہ کیا۔ ''جو آپ لکھ دیتے ہو حکومت کے خلاف... ہم اپنی گھر والی کے خلاف نہیں بول سکتے۔''

''وہاں میری بولتی بھی بند ہو جاتی ہے۔ یہ بین الاقوامی مسئلہ ہے... شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم ایک چھوٹے سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ فاروق کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ ممکن ہو تو گرم کافی ورنہ چائے۔ اس کی بیوی پردہ نشیں قسم کی خاتون ہوگی کہ وہ گیا اور چند منٹ میں کافی کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوا۔ غالباً وہ پہلے سے تیار کیے بیٹھی تھی۔

میں نے کہا۔ ''مسٹر فاروق! رات بہت ہو گئی ہے اس لیے تکلف برطرف... کام کی بات پہلے...''

وہ کچھ مایوس ہوا۔ ''جیسا آپ کا حکم... ورنہ میری بڑی خواہش تھی کہ آپ سے کچھ کالم کی بات کروں۔ کوئی قطعہ

www.kahopakistan.com

سنوں۔ میرا نام تو اس نے آپ کو بتا دیا ہوگا... غلام رسول میرا دوست تھا اور کلاس فیلو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کام کیا کرتے ہیں؟''

''میں... ٹریفک پولیس میں ہوں... میری بدقسمتی۔''

''ایسا سمجھنے کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''جی بتاتا ہوں۔ میں اسلام آباد ٹریفک پولیس میں ہوں... سب انسپکٹر... وہاں یہ نوکری مشکل کام ہے۔ ڈیوٹی کبھی کہیں لگ جاتی ہے کبھی کہیں۔ ہر سڑک پر سے وی آئی پی گزرتے ہیں اور وی وی آئی پی... ان کے آنے جانے تک ہماری جان سولی پر اٹکی رہتی ہے۔ ایک بکری کا بچہ بھی سڑک پر ان کے طوفانی کاروں کی راہ میں آجائے تو نہ بکرے کو سزا ملے گی نہ بکری کو... بکری والا بھی پکڑ جائے گا۔ ہماری نوکری خلاص ہونا لازمی... لیکن تنخواہ اچھی ہے اور نوکری آج کل ملتی کہاں ہے۔ ابا بھی پولیس میں تھے۔ سچ مچ کے پولیس مقابلے میں مارے گئے تھے۔ ان کی جگہ مجھے نوکری دے دی گئی۔ انہیں میڈل بھی ملا تھا لیکن یہ نوکری نہ ہوتی تو میڈل نہ میرا پیٹ بھرتا نہ میری ماں کا۔ اب تو وہ بھی نہیں رہی۔ یہ گھر میں نے رشوت کی کمائی سے نہیں بنایا۔ آپ مانو یہ نہ مانو... میرے والد کی شہادت کے بعد حکومت کی طرف سے ایک پلاٹ ملا تھا ان کی انشورنس کی رقم تھی۔ فنڈ تھا... اور بیس لاکھ کا نقد انعام ملا تھا۔ خیر، میرا مقصد نہ اپنے والد کی بہادری کی تعریف کرنا ہے اور نہ اپنی ایمان داری سے آپ کو متاثر کرنا۔ ایک ایسی بات معلوم ہے مجھے جو میں کسی کو نہیں بتا سکتا۔ میں بزدل ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''پھر مجھے کیوں بتا رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ابھی پتا چل جائے گا آپ کو۔ یہاں سے دو گھر چھوڑ کے ایک بیوٹی پارلر ہے۔ اس وقت لائنس آف ہیں ورنہ میں آپ کو دکھاتا۔ اس کے بعد والے گھر میں پہلے عظمت صاحب تھے۔ انکم ٹیکس کے بہت بڑے افسر تھے۔ اب ان کی بیوہ ہے... اور ان کا بیٹا جمی۔ نام تو اس کا جمشید ہے لیکن سب جمی ہی کہتے ہیں اس کا اسلام آباد کے بلیو ایریا میں ایک لیڈیز اسٹور ہے۔ لیڈیز کے کپڑے، جوتے، بیگ، نقلی مگر اصلی جیسی مہنگی جیولری... پرفیوم... اور خواتین کی دیگر ضروریات کی چیزیں۔ بلیو ایریا میں دکان ہونا ہی سونے کی کان جیسی بات ہے پھر وہ اسٹور... وہاں اعلیٰ طبقے کی خواتین آتی ہیں۔ انہی وی آئی پی اور وی وی آئی پیز کی بیگمات جن کے راستے پر میرے جیسا معمولی سب انسپکٹر ڈیوٹی دینے کے لیے دھوپ، بارش اور سردی میں ایک ٹانگ پر کھڑا رہتا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''یہ اپنی اپنی قسمت ہے فاروق۔''

''میں گلہ نہیں کر رہا سر۔''

میں نے کہا۔ ''میں تمہارا سر نہیں ہوں کہ تم مجھے سر کہو۔ مہمان ہوں۔''

''بری عادت سمجھ لیں اسے... اس مرغی والے نے آپ کو بتا دیا ہوگا کہ غلام رسول میرا دوست تھا۔ قریبی لنگوٹیا تو نہیں مگر بچپن سے ساتھ تھا۔ میں اس کے گھر آتا جاتا تھا۔ وہ میرے گھر میں۔ چنانچہ میں اس کے گھر کے سب افراد کو جانتا ہوں اور وہ مجھے جانتے ہیں۔ میں اس کے جنازے میں بڑے دکھ کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ اصل بات میں آخر میں بتاؤں گا جب میں اس کے سوئم میں گیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کیا لکھا گیا ہے اس کے والد کی حالت خراب تھی۔ اتفاق سے مجھے ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کے مجھے وہی بات بتائی کہ غلام رسول کے گلے پر انگلیوں کے نشانات تھے۔ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ان کے سالے نے ان کو مجھ سے بات کرتے دیکھ لیا اور اس نے بڑی بدتمیزی سے کہا کہ یہ تو پاگل ہو گئے ہیں، بیٹے کی موت کے صدمے سے۔ آپ ان کی بات کو اہمیت نہ دیں۔ میں خاموش ہو گیا۔ بات یہ ہے بزدل صاحب! کہ جواب تو میں اسے دے سکتا تھا لیکن یہ مصلحت کا تقاضا تھا... جب میں چلنے لگا تو اتفاق سے غلام رسول کی بہن میرے سامنے آ گئی۔ وہ مجھے جانتی ہے۔ اس نے مجھے سلام کیا تو میں نے رسمی تعزیت کے الفاظ دہرائے اور صبر کی تلقین کی۔ وہاں موقع ہی نہیں تھا کہ میں اس سے وہ بات ڈسکس کرتا جو اس کا باپ کہہ رہا تھا۔ وہ رونے لگی اور بولی کہ میں اپنے بھائی کے قاتل کو چھوڑوں گی نہیں۔ بے وقوف لڑکی... جذباتی ہو رہی تھی... مگر اچانک اس نے کہا کہ آج میری ایک سہیلی ڈاکٹر صائمہ کا فون آیا تھا... بہت عرصے بعد... میں نے اس کو بتایا تو اس نے باتوں باتوں میں آپ کا ذکر کیا۔ نورین نے کہا کہ صائمہ... تم بزدل صاحب سے کہو... پوچھو وہ کچھ کر سکتے ہیں... تو صائمہ نے کہا کہ وہ میری بات نہیں ٹال سکتے، وہ آ رہے ہیں دونوں... ابھی اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ نورین کا ماموں زاد کاکا اکرم آ گیا... میں نے اس سے بھی تعزیت کی۔ نورین تو فوراً اندر چلی گئی۔ میں بھی آ گیا لیکن اس روز میں نے طے کر لیا تھا کہ آپ سے مل کے یہ بات ضرور کروں گا کہ غلام رسول کا باپ پاگل نہیں ہے... وہ ٹھیک کہتا ہے۔''

میں چونکا۔ ''یہ تم کیسے جانتے ہو؟''

فاروق نے کہا۔ ''سردی بہت ہے۔ ایک کپ کافی اور ہو جائے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں، یہ بات زیادہ سردی دور کرنے والی ہے۔''

''یہاں میرے گھر کے سامنے ایک پارک ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا... یہ دس گھر پارک فیسنگ ہیں... یہاں سردی گرمی لوگ واک کرنے آتے ہیں۔ میں اور میری بیوی شام کو نیرس میں بیٹھ کے نظارہ کرتے ہیں اور شام کی چائے پیتے ہیں۔ میں اسے بہت اکساتا ہوں کہ دیکھو کتنی خواتین خود کو فٹ رکھنے کے لیے واک کر رہی ہیں۔ وہ روز بروز پھولتی جا رہی ہے۔ لیکن وہ کہتی ہے مجھے شرم آتی ہے۔ شرم کیا بہانے بازی ہے... ابھی مہینے پھر پہلے... آج کیا تاریخ ہے... اٹھارہ اور دن ہے ہفتے کا تو اس حساب سے اس دن اتوار تھا۔'' اس نے حساب لگایا اور پھر اپنے موبائل فون پر کیلنڈر دیکھ کے تصدیق کی۔

میں نے کہا۔ ''دن سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''دراصل ہمارے لیے اتوار بھی سوموار ہو جاتا ہے۔ اگر ڈیوٹی لگ جائے۔ اس روز میری ڈیوٹی لگی تھی۔ میں تھک کر آیا اور نیرس میں بیٹھ گیا۔ بیوی سے کہا کہ چائے کے ساتھ کچھ کھاؤں گا تو وہ پکوڑے بنانے لگی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک کار بیوٹی پارلر کے سامنے رکی۔ جسے ایک لڑکی چلا رہی تھی۔ سفید رنگ کی مہران... جب وہ اتری تو مجھے اس کی صورت دیکھی ہوئی لگی... لیکن میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ دوسری لڑکی بھی اتری لیکن وہ بیوٹی پارلر میں نہیں گئی۔ وہ اس کے ساتھ والے گھر میں چلی گئی۔ جمی کے گھر میں... پھر میری بیوی آ گئی اور چائے پینے کے بعد ہم بازار چلے گئے۔ میں اس بات کو بھول گیا لیکن چار پانچ دن بعد پھر ایسا ہی ہوا۔ وہی کار بیوٹی پارلر کے سامنے آ کے رکی مگر اندر ایک ہی لڑکی گئی۔ دوسری جمی کے گھر میں داخل ہو گئی۔ دروازے دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ بیوٹی پارلر کا مین گیٹ باؤنڈری وال کے دوسری طرف ہے۔ ایک چھوٹا گیٹ ہے جو آنے جانے والے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ملا ہوا جمی کا مین گیٹ ہے۔ اندر اس کی گاڑی ہوتی ہے اور باہر ایک سیکیورٹی گارڈ بیٹھا رہتا ہے۔ اس نے لڑکی کو سیدھا اندر جانے دیا۔ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی۔ ایک تو وہ بیوٹی پارلر کچھ بدنام ہے۔ اس میں فٹنس سینٹر اور مساج پارلر بھی ہے۔ کہنے کو چائنیز مگر یہ سب دھوکے کی بازی ہے۔ آنے والوں کے لیے بھی اور یہ تاثر دینے کے لیے بھی کہ یہاں غیر ملکی ہیں۔ کوئی پنگا نہ لے۔ ایسے بہت سے پارلر محض عیاشی کے اڈے ہیں... کئی چھاپوں کے بعد بند بھی ہوئے مگر سب چلتا ہے... میں سنی سنائی نہیں کہتا... یہاں رہتا ہوں اس لیے جانتا ہوں۔ دوسری طرف جمی کوئی شریف آدمی نہیں سمجھا جاتا۔ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی۔ اکیلا رہتا ہے کوٹھی میں... دکان پر ہر قسم کی عورت آتی ہے۔ پڑوس میں یہ بیوٹی پارلر ہے۔ اکثر اس کی گاڑی میں خواتین نظر آتی ہیں جن کو آپ بھی دیکھ کر اچھی رائے قائم نہیں کر سکتے۔

''ایسا تیسری مرتبہ میں نے کوئی ایک ہفتے بعد دیکھا۔ اس مہران کار کا نمبر مجھے یاد تھا۔ وہ ایک خاص وقت پر آتی تھی۔ ایک لڑکی بیوٹی پارلر میں چلی جاتی تھی۔ دوسری جمی کے گھر میں داخل ہو جاتی تھی۔ تیسری بار میں نے غور سے دیکھا تو میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ کیونکہ جمی کے گھر میں جانے والی لڑکی نورین تھی۔ غلام رسول کی بہن۔''

میں تقریباً اچھل پڑا۔ ''نورین؟''

''جی... میرے دوست کی بہن۔ جسے میں بچپن سے دیکھتا آیا ہوں۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔''

''اور وہ لڑکی جو مہران ڈرائیو کر کے لاتی تھی؟''

''اس کی صورت ٹی وی کی ایک ایکٹریس سے ملتی تھی مگر وہ نورین کی سہیلی تھی۔ یہ میں نے بعد میں معلوم کیا۔ اس کا نام ناہید ہے اور وہ دونوں ایک ہی محلے میں رہتی ہیں۔ نورین کا جمی سے تعلق میری سمجھ میں نہیں آیا۔ دونوں لڑکیاں آتی تھیں تقریباً چھ بجے... جمی عام طور پر دس بجے اسٹور بند کرتا تھا۔ اس وقت تک وہ کاؤنٹر کے پیچھے ہوتا تھا۔ پھر نورین کس سے ملنے آتی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نورین سے ملنے کے لیے جمی اسٹور کو سیلز مینوں پر چھوڑ کے گھر آ جاتا تھا۔ مجھے پریشانی لاحق ہو گئی کیونکہ وہ بہرحال ایک دوست کی بہن تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک سہیلی کے ساتھ جمی سے ملنے آتی تھی۔ ظاہر ہے وہ گھر والوں کو دھوکا دے رہی تھی۔ وہ سہیلی کے گھر جاتی تھی ممکن ہے وہ دونوں واک کرنے کا بہانہ کرتی ہوں۔

''میں نے ایک ہفتے بعد پھر نورین کو وہاں دیکھا اور اس بار میں نیرس میں کرسی ڈال کے بیٹھ گیا۔ میرے پاس بچوں والی ایک دوربین تھی۔ زیادہ طاقتور دوربین کی مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نورین کو ویسے ہی پہچان سکتا تھا۔ میری نظر کمزور نہیں ہے لیکن میں نے دوربین کو فوکس رکھا اور بیٹھا رہا... بیٹھا رہا... ایک گھنٹا گزر گیا۔ پھر دوسرا گھنٹا گزر گیا۔ میری بیوی نے کہا کہ کھانا کھا لو... کیوں پاگل ہو رہے ہو اس

www.kahopakistan.com

آوارہ لڑکی کے پیچھے... مگر میں نے اسے ڈانٹ کے بھگا دیا۔ پونے تین گھنٹے بعد وہ نکلی اور کار میں بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی نورین باہر آئی۔ کار چلی گئی۔ دس منٹ بعد جمی کی گاڑی باہر آئی۔ میں نے اس کے اسٹور میں فون کیا۔ سیلزمین نے کہا کہ وہ کہیں گئے ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے پھر فون کیا تو خود جمی نے ریسیو کیا۔

''اگلے روز میں نے غلام رسول سے پوچھا کہ کل شام نورین کہاں تھی۔ وہ حیران بھی ہوا اور اس نے برا بھی منایا لیکن میرے اصرار پر اس نے کہا کہ وہ اپنی ایک سہیلی ناہید کے گھر گئی تھی۔ دونوں محلے میں رہتی ہیں۔ کبھی وہ آجاتی ہے کبھی یہ چلی جاتی ہے مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ ابھی اس کو کچھ مت بتانا... میرے فون کا حوالہ بھی مت دینا۔ میں تمہارا دوست ہوں... تمہاری بہن میری بہن ہے۔ میں اس کے بارے میں کوئی غلط بات منہ سے نہیں نکال سکتا۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا کہ سہیلی کے ساتھ وہ کہاں جاتی ہے۔ غلام رسول نے بہت پوچھا لیکن میں نے کہا کہ اسی ہفتے میں کسی دن میں تمہیں فون کر کے کہیں بلاؤں گا، اس وقت سارے کام چھوڑ کے آجانا اور خود دیکھ لینا۔ پانچ دن بعد میں نے اسے فون کیا اور وہ آگیا۔ میں نے اس کی موٹر سائیکل دیکھی۔ جمی کے گھر کے باہر... لیکن اس وقت میں گھر سے نکل رہا تھا۔ میری اچانک رات کی ڈیوٹی لگ گئی تھی۔ میں نے بیوی سے کہا کہ غلام رسول آئے تو یہ مت بتانا کہ میں ابھی ڈیوٹی پر گیا ہوں، یہ کہنا کہ وہ تو صبح سے گئے ہوئے ہیں لیکن غلام رسول نہیں آیا... میری بیوی نے رات سونے سے پہلے دیکھا تو اس کی موٹر سائیکل وہیں کھڑی تھی۔''

خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس میں اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا بھی میں اسی طرح سن رہا تھا جیسے سامنے دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی ٹک ٹک... پھر فاروق نے ہاتھوں کو منہ کے پاس لا کے پھونک ماری۔ ''میرا خیال ہے اب ایک کپ کافی ضروری ہے۔'' وہ اٹھ کے اندر گیا۔

مرغی والے نے کہا۔ ''بات کی سمجھ آگئی ڈرپوک صاحب؟''

میں نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور سوچتا رہا۔ معلوم نہیں کتنی دیر بعد فاروق آیا اور اس نے میرے سامنے بھاپ دیتی کافی کا مگ رکھ دیا۔ مرغی والے نے مگ کو بڑی وحشت سے دیکھا۔ ''او یار پھر کافی۔ بڑی گرم ہوتی ہے نامراد... جگر کو جلا دیتی ہے۔''

فاروق نے شڑپ کر کے ایک گھونٹ لیا۔ ''صبح جب میں ڈیوٹی ختم کر کے آرہا تھا تو میں موٹر سائیکل پر اسی سڑک سے گزرا... جس پر غلام رسول کی لاش پڑی تھی۔ سڑک کے درمیان پڑے بندے کو میں نے دور سے دیکھ لیا تھا مگر مجھے کیا خبر تھی کہ وہ میرا یار غلام رسول ہوگا۔ جسے خود میں نے وہاں جانے کو کہا تھا جہاں فرشتہ اجل کو اس کی جان لینا تھی۔ جہاں اسے قتل ہونا تھا اپنی ہی بہن کے آشنا کے ہاتھوں۔''

میں نے کہا۔ ''فاروق! کیا جائے واردات پر خون تھا؟''

اس نے نفی میں آہستہ آہستہ سر ہلایا۔

''لیکن پولیس کہتی ہے کہ وہاں خون تھا۔'' میں نے کہا۔

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ''ایسے ہی ایک قتل کو حادثہ بنانے کی کہانی میں نے کچھ دن پہلے سنی تھی۔ جھوٹ سچ کا مجھے علم نہیں۔ سنا ہے کوئی میرے جیسا غریب آدمی... جو عوام کہلاتے ہیں اس نے فلمی انداز میں عشق کیا کسی وڈیرے کی بیٹی سے... موری کی اینٹ چوبارے چڑھنا چاہتی تھی۔ اس کو مار کے اسی طرح سڑک پر ڈالا گیا۔ وہاں دو کالے بکرے ذبح کیے گئے۔ مقتول کی لاش پر ان کا خون بہایا گیا۔ پھر ایک ٹرک اس کے اوپر سے گزرا... کچلے ہوئے جسم پر سے خون کی لکیریں سڑک پر نظر آنے لگیں جو خود ایک جھوٹی کہانی کو سچ بنا کے پیش کرتی تھیں کہ متوفی کو کسی نامعلوم گاڑی نے مارا اور گاڑی والا بھاگ گیا۔ یہی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی لکھا گیا ہوگا۔ یہی سچ بنا۔ کسی کو اسے چیلنج کرنے کا خیال تک نہیں آیا ہوگا۔''

''اور ایسا ہی کیس یہ بھی ہے۔ غلام رسول کو جمی نے گلا گھونٹ کے مار ڈالا۔ پھر اس کی لاش وہاں پھینک دی اور موٹر سائیکل بھی... جہاں اسے تم نے دیکھا۔''

''ہاں، پولیس نے وہاں خون بھی ڈال دیا ہوگا... انسان کا خون کون سا نایاب یا گراں ہے؟''

''میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ جب غلام رسول کو گلا گھونٹ کے ہلاک کیا گیا تھا... تو نورین بھی وہاں تھی؟''

''یہ جو فلمی قسم کا عشق ہوتا ہے۔ اس کا جادو ایسے ہی سر چڑھ کے بولتا ہے۔ بے وقوف لڑکیاں اپنے پرائے کی اور برے بھلے کی تمیز بھلا بیٹھتی ہیں۔ جمی اس کا ماہر تھا۔ جب وہ اپنے عشق کا جادو چلاتا ہوگا تو ایسے عقل سے بیگانہ کرنے والے ڈائیلاگ مارتا ہوگا کہ ہر لڑکی ہپناٹائز ہو کے ہوش و حواس میں نہیں رہتی ہوگی۔ وہ جادو کے منتر لڑکیوں کو گھر سے بھاگنے پر مجبور کرتے ہیں خواہ انہیں معلوم ہو کہ بعد میں تلاش کرنے والے انہیں تلاش کر لیں گے اور غیرت کے نام پر قتل

کر دیں گے۔ زندہ دفن کر دیں گے یا کتوں کے آگے ڈال دیں گے... یہ سب ہوتا رہتا ہے۔ خبریں بھی آتی رہتی ہیں لیکن ان واقعات میں کمی آرہی ہے یا اضافہ ہو رہا ہے؟''

مرغی والے نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''اب تو روز کی بات ہوگئی ہے۔ ماں باپ اغوا کی رپورٹ لکھواتے ہیں پولیس انہیں پکڑ لیتی ہے عدالت رہا کر دیتی ہے کہ یہ بالغ ہیں ملک کے قانون اور شرع کی رو سے انہیں اپنی مرضی سے شادی کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن اس کے بعد وہی ہوتا ہے خاندان اور قبیلے والے انہیں قتل کر دیتے ہیں۔''

فاروق نے کہا۔ ''کیوں بڑھ رہے ہیں آخر ایسے واقعات؟''

''فلمیں... اور ٹی وی ڈرامے... گاؤں اور قصبوں میں بھی کیبل پہنچ گیا ہے پھر کیمرے والے موبائل ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یعنی جب غلام رسول کو مارا گیا تو اس کی بہن دیکھتی رہی... اس نے اپنے عاشق صادق کو روکا نہیں؟''

فاروق تلخ ہو کے بولا۔ ''آپ روکنے کی بات کرتے ہو؟ اس نے اپنے محبوب کی مدد کی ہوگی۔ بھائی تو ظالم سماج تھا، اس کی خوشیوں کا دشمن... آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بیٹیاں اور بہنیں اپنے باپ کی یا بھائی کی عزت کا خون کر کے ایک اجنبی کے ساتھ نکل جاتی ہیں؟ اٹھارہ بیس سال کا خونی رشتہ توڑ کے؟''

میں نے گھڑی دیکھ کے سوال کیا۔ ''تم نورین کو بچپن سے جانتے ہو... کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟''

''ایسا ہر لڑکی کر سکتی ہے... جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔''

''پھر اس نے خود فون کر کے مجھے اور صائمہ کو مدد کے لیے کیوں بلایا؟ اسے تو معلوم ہوگا کہ قاتل کون ہے؟''

''سب ڈراما۔'' فاروق نے کہا۔ ''بزدل صاحب! آپ بھی کوشش کر لیں۔ جمی نے پولیس کی مدد سے ایسا پکا کام کیا ہے کہ اس پر کوئی ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اس کی لیڈیز شاپ پر کون آتی ہیں... وی آئی پی اور وی وی آئی پی خواتین... یہ نظام انصاف انہی کے اشارے پر چلتا ہے۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو... جمی کا میں بھی کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا... خواہ میں ایک نہیں دس کالم لکھ دوں... لیکن واپس جانے سے پہلے میں نورین سے بات ضرور کروں گا۔''

رات کے دو بجے میں لوٹ کے مرغی والے کے گھر پہنچا تو صائمہ انتظار سے تنگ آ کے سو گئی تھی۔ مرغی والے کی بیوی نے دونوں بچوں کے کمرے میں ہمارے سونے کا انتظام کر دیا تھا۔ کمرے میں بجلی کا ہیٹر بھی جل رہا تھا اور جدید قسم کی پولسٹر وول والی ہلکی پھلکی مگر برفانی سردی کو روک دینے والی رضائیاں بھی رکھی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ صائمہ کا بیڈ تھا دوسری دیوار کے ساتھ میرا۔

جو کچھ میں نے سنا، میرا دماغ خراب کرنے کے لیے کافی تھا۔ رضائی میں گھسنے کے بعد بھی میں آنکھیں کھولے اندھیرے میں نظر نہ آنے والی چھت کو گھورتا رہا۔ جب آہستہ آہستہ میرا بدن گرم ہوا تو نیند نے تھکے ہوئے بدن کو اپنی آغوش راحت میں لے لیا۔

آنکھ کھلنے پر جب میں نے گھڑی کی دونوں سوئیوں کو منطبق پایا تو مجھے یقین نہیں آیا لیکن شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ باہر سردیوں کی دوپہر آگئی تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ گرم پانی دستیاب ہونے کے باوجود غسل کروں۔ ہاتھ منہ دھو کے میں باہر نکلا تو دونوں خواتین کچن میں اسٹول پر بیٹھی تبادلۂ خیالات میں مصروف تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتی ہیں۔ ان کے چہرے دیکھ کے میں نے اندازہ کیا کہ انہیں نورین کے بارے میں سب معلوم ہو چکا ہے۔

مرغی والا اپنے پولٹری فارم کی ڈیوٹی پر جا چکا تھا۔ اس کی بیوی نے بتایا۔ ''ان کے لیے نہ کوئی اتوار ہے نہ تہوار... سال کے تین سو پینسٹھ دن وہ ہیں اور ان کی مرغیاں... ہم ان کے بعد۔''

صائمہ نے فوراً ایک تائیدی بیان جاری کیا۔ ''کہتے سب یہی ہیں کہ آخر ہم اتنی محنت کس کے لیے کرتے ہیں... کماتے کس کے لیے ہیں؟''

میں وہیں تیسری اسٹول نما کرسی پر بیٹھ گیا۔ مرغی والے کی بیوی میرے لیے ناشتا بنانے لگی۔ ''صبح سے نورین کے تین فون آچکے ہیں۔ ڈاکٹر صائمہ کا موبائل فون رات کو باہر ہی رہ گیا تھا جہاں ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور آپ لوگوں کی واپسی کا انتظار۔ میں نے کہہ دیا کہ ابھی تو وہ سو رہے ہیں۔''

میں نے صائمہ کی طرف دیکھا ''اگر تمہیں ریوالور مل جائے تو یقیناً تم مجھے شوٹ کر دو... یہی سوچ رہی ہو نا تم؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں نے شام کی فلائٹ سے واپسی کے لیے بکنگ کرا دی ہے۔''

میں نے احتجاج کیا۔ ''مجھ سے پوچھے بغیر... کل تو

www.kahopakistan.com

کرسمس ہے اور سنا ہے 25 دسمبر کو مری میں برف باری ضرور ہوتی ہے۔"

"ٹھیک سنا ہے آپ نے بھائی صاحب۔" مسز مرغی والا نے کہا۔

"میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں رہا... تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔" صائمہ نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے تمہیں سب معلوم ہو گیا؟"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی عورت ایسا کر سکتی ہے۔" مسز مرغی والا نے کہا۔

"ڈاکٹر صائمہ بھی آپ کے خیال کی تائید کریں گی... لیکن میرا خیال بلکہ یقین کامل ہے کہ ہر عورت ایسا کر سکتی ہے... تاریخ گواہ ہے..."

"بھاڑ میں گئی تاریخ اور جہنم میں جائے نورین۔" صائمہ چیخ کے بولی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ صائمہ ایک جذباتی بحران سے گزر رہی ہے چنانچہ ابھی اس کو قائل کرنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے... تاہم مجھے صائمہ کے ساتھ گزارے ہوئے چار سالہ ازدواجی زندگی کے تجربے پر بھروسا تھا۔ خوشامد، چرب زبانی، تیر بہدف محبت بھرے جذباتی ڈائیلاگ... چار زبانی میں یہ تین مردوں کی شمشیریں... جن سے ہر صائمہ فتح ہو جاتی ہے۔

میں ناشتا کر رہا تھا کہ توپ صاحب کا فون موصول ہوا جو میں نے غیر ارادی طور پر ریسیو کر لیا۔ میرے ہیلو کہتے ہی توپ صاحب نے چیخ جیسی آواز نکالی جو درحقیقت ان کے پیک سے بھرے منہ کا قہقہہ تھی۔

"بھئی خوب میاں بزدل... خوب چھکایا۔"

میں نے کہا۔ "آپ کے سرِ عزیز کی قسم میں نے آج تک ایک بھی چھکا نہیں دیا۔"

وہ پھر ہنسے۔ "یعنی آپ پرواز کر گئے اس پری رو کے ساتھ سوئے کوہ قاف... بلکہ کوہسار مری کی برف پوش فضاؤں میں... عاشقانہ گرم بازاری..."

میں نے کھانستے ہوئے کہا۔ "آج آپ کے خاندانی پنواڑی نے ضرور پان میں بھنگ ڈال دی ہے... گویا رنگ میں بھنگ... میں تو پڑا ہوں اپنے اسی گور غریباں میں جسے فلیٹ بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"ذرا توقف فرمائیے... یعنی شارٹ بریک... میں ذرا فراغت پالوں۔" انہوں نے حقے کی طرح گڑگڑاتے ہوئے فرمایا۔

چشم تصور سے میں نے یہ سین دیکھا کہ توپ صاحب نے اس کرسی کے پیچھے والی چوتھی منزل کی کھڑکی کھولی... گردن باہر نکال کے دائیں بائیں دیکھا اور پیک اگل دی۔ پیک کے تیس چالیس فٹ نیچے پہنچنے تک توپ صاحب پھر اندر غروب ہو چکے تھے۔ کھڑکی بند تھی اور نیچے کوئی شامت کا مارا بدبخت سب کی نظر میں تماشا بنا اوپر دیکھ رہا ہو گا کہ مجرم نظر آ جائے تو پیک نہیں اسے خون اگلنے پر مجبور کر دے۔

یہ توپ صاحب کے لیے تفریح تھی۔ بقول ان کے تمیز، تہذیب، قانون... اصول اور اخلاق سے جکڑے ہوئے انسان کی واحد تفریح...

"تو میاں بزدل... دروغ گوئی بھی فن ہے گویا جس میں تم ہو ابھی طفل مکتب... ہم تو گویا اس انکشاف پر وہ رہ گئے... دم بخود اور بچھ انگشت بدنداں... کہ اپنی عزیزہ طبیبہ صائمہ گویا وہ بھی ہے کسی ڈی آئی جی کی بھانجی... جو ایوانِ وزیراعظم میں افسر خاص ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ "یہ کون الو کا پٹھا کہتا ہے؟"

"یہ خطاب میں اسے بطور سلام پہنچا دوں گا۔ تمہارے دوست اور مستقبل کے قاتل غلام خان کو... اسے دارالخلافہ اسلام آباد سے کسی کوتوالی شرافت نے فون پر یہ اطلاع دی۔"

میرا دل بیٹھ گیا۔ "اس نے تو فوراً کہہ دیا ہو گا کہ یہ جھوٹ ہے۔"

"بھئی لاج رکھ لی اس نے گویا دوستی کی۔ تمہارے جھوٹ کو صدق و سچ بنا دیا مگر خیر... اصل سوال تو ہم بھول گئے... تم سے مراجعت کا کوئی ارادہ ہے یا ہم یہ قطعہ لکھنے اور کالم گھسیٹنے پر کسی اور احمق کو رکھ لیں؟"

میں نے جل کے کہا۔ "توپ صاحب! مل جائے تو ضرور رکھ لیں مگر کوئی زمانہ چبا لیے بغیر کوئی گالی نہیں دیتا... سلام کا جواب نہیں دیتا تو قطعہ اور کالم کیا دے گا۔ آپ کی طرف میرے واجبات ہو گئے ہیں دولاکھ تئیس ہزار چار سو ہیں... یہ وصول کیے بغیر میں فرشتہ اجل کے ساتھ بھی نہیں جاؤں گا بلکہ کوشش کروں گا کہ اسے آپ کی طرف بھیج دوں۔"

"میاں بزدل! فون کال کا بل بڑھ رہا ہے دم بدم... کالم بعد میں برقی ڈاک سے ارسال فرما دینا لیکن قطعہ تو فی البدیہہ کہو... یہ حکم ہے ہمارا گویا۔"

میں نے جیب سے کاغذ نکال کے کہا۔ "آپ امتحان لے رہے ہیں میرا توپ صاحب! مگر آپ بھی کیا یاد کریں

گے... لکھیے۔"

پہلے خط لکھتے تھے اب کرتے ہیں ایس ایم ایس اسے
چوری چوری اس کو پڑھ لیتی ہیں میری سالیاں
کل کہیں موبائل اس کے باپ کے ہاتھ آ گیا
در جواب آں غزل تھیں ماں بہن کی گالیاں

توپ صاحب کے حلق سے پھر چیخ جیسی آواز نکلی۔ "بہت خوب گویا۔" مگر میں نے تبصرہ سننے سے قبل ہی فون بند کر دیا کیونکہ صائمہ تو خیر عادی تھی مگر مسز مرغی والا میرے اشعار پر ہنس ہنس کے دہری ہو رہی تھیں۔

"کتنی بہنیں ہیں تمہاری؟" اس نے صائمہ سے پوچھا۔

"میری تو کوئی نہیں... ان کی ہی ہیں سب... میرے علاوہ۔" صائمہ نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ "اب ہم چلتے ہیں تمہاری محبت اور مہمان نوازی ہمیشہ یاد رہے گی۔"

"اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو... تم نے تو کہا تھا کہ مری میں برف باری دیکھنے چلیں گے... ہم بھی چلتے تمہارے ساتھ۔"

"پھر تو برف پڑ جاتی میرے ارمانوں پر۔" میں نے سوچا۔ صائمہ سے تو بات کرنے کا بھی موقع نہ ملا۔ واپسی تک مرغیوں کا اسٹاک پیدا بن چکا ہوتا۔ صائمہ ایک مرغی نظر آتی اور میں وہ مرغا جو توپ صاحب کے لیے ہر روز انڈے کی طرح ایک قطعہ دینے پر مجبور ہوں۔

جب ہم نورین کے گھر کے قریب تھے تو اس کا پھر فون آ گیا۔

یہ صائمہ کا اپنا محلہ تھا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ اس کا وہ گھر میں نے بھی دیکھا تھا جو اس کے چچا نے ہتھیا لیا تھا۔ وہ ابھی تک اس میں مقیم تھا لیکن ایک تو اس نے باہر کی طرف والی دکان کو کہیں اور شفٹ کر دیا تھا۔ دکان کی جگہ اس نے ایک کمرا بنا لیا تھا اور پھر پوری عمارت کو دو منزلہ کر رہا تھا...

میں نے صائمہ کے چہرے پر اداسی دیکھی تو آہستہ سے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "زندگی اسی کا نام ہے سب بدل جاتا ہے... ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔"

"میں بھی رونا نہیں چاہتی۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "حالانکہ اس گھر گلی اور محلے سے میری یادوں کا بڑا سلسلہ ہے... اس گھر کے اندر جائے بغیر بھی میں سب دیکھ سکتی ہوں۔"

وہ گھر گزر گیا تھا۔ میں نے اس کا دھیان دوسری طرف کر دیا۔ "اب آگے بتاؤ... نورین کے گھر کا راستہ۔"

"یہ ہے ناہید کا گھر۔" اس نے ایک پرانی طرز کے لیکن کافی بڑے سہ منزلہ گھر کی طرف اشارہ کیا۔ "نورین کا آخر میں۔"

میں نے ایک دم بریک لگائے۔ "میں پہلے اس سے ملنا چاہوں گا۔"

"وہ مجھے نہیں جانتی... میں کیا بہانہ کروں؟"

"ہو سکتا ہے تمہیں بہانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔"

"وہ پولیس کی کار دیکھ کے بدک جائے گی۔ تم گاڑی آگے لے جاؤ... اگر ناہید نے مجھے اندر بلا لیا تو میں تمہیں بلا لوں گی۔"

جتنی دیر میں گاڑی کو میں نے پچاس قدم آگے جگہ دیکھ کے پارک کیا۔ ناہید خود گیٹ پر آ گئی۔ معلوم نہیں ان کے درمیان کیا بات ہوئی۔ چند سیکنڈ بعد صائمہ نے خالص بیویوں کے انداز میں کہا۔ "سنیں جی... آپ بھی آ جائیں۔"

ناہید نے باہر جھانکا تو میں گیٹ پر کھڑا تھا۔ وہ مجھے بھی اندر لے گئی۔ ہم ایک پرانے انداز کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے جس میں دیواروں پر مکے مدینے کی تصاویر کے علاوہ درجن بھر طغرے ہر دیوار پر نظر آ رہے تھے۔ صوفے کے ہر کشن پر گوٹے کی جھالر۔

ناہید اس ماحول میں زیادہ ماڈرن نظر آتی تھی۔ اس نے سلیولیس شرٹ کے ساتھ جینز پہن رکھی تھی اور اس کا ہیئر اسٹائل بھی ٹلی تھا۔ وہ خاصی قبول صورت تھی اور اس کا باقاعدگی سے بیوٹی پارلر جانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے حسن کی نمائش کو کتنی اہمیت دیتی ہے... اس سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ گھر والوں کی طرف سے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔

"آپ اسی محلے میں رہتی تھیں؟" اس نے سامنے بیٹھ کے خوش اخلاقی سے کہا۔ "میں نے آپ کو دیکھا نہیں کبھی... دراصل ہم نے یہ مکان ابھی پانچ سال پہلے ہی خریدا تھا۔"

صائمہ نے کہا۔ "ہاں پہلے اس میں مرزا صاحب رہتے تھے اور یہ گھر بھی دو منزلہ تھا۔"

"آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟" ناہید نے ایک خالص زنانہ سوال کیا۔

میں نے کھنکھار کے کہا۔ "مس ناہید! آپ کیا کرتی پھرتی ہیں؟"

وہ چونکی۔ "جی! کیا مطلب ہے آپ کا اس سوال سے؟"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم تو ہے لیکن میں خود آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں... نورین کو آپ ہی سے ملوانے لے جاتی تھیں؟"

www.kahopakistan.com

ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو کے گر جائے گی۔ ''ک... کو... کون جمی...؟''

میں نے کہا۔ ''وہ جو ایک چائنیز بیوٹی پارلر اینڈ مساج سینٹر کے ساتھ والے گھر میں رہتا ہے۔ جس کی بلیو ایریا میں لیڈیز شاپ ہے اب کچھ یاد آیا آپ کو... آپ وہاں باقاعدگی سے جاتی ہیں۔''

وہ صوفے پر گر گئی۔ ''مجھ سے... نورین نے کہا تھا... مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ گھر میں کیا بتا کے آتی تھی؟... اور تم گھر والوں سے کیا کہہ کے جاتی تھیں؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ''پلیز... آہستہ بات کریں۔''

میں نے کہا۔ ''گھر سے تم واک کے لیے جاتی تھیں، اس پارک میں جو بیوٹی پارلر کے سامنے ہے اور جمی کے گھر کے سامنے ہے... رائٹ؟''

وہ خاموش رہی۔ اس کی خاموشی ہی اعترافِ جرم تھی۔

''تم دو سے تین گھنٹے بیوٹی پارلر میں گزارتی تھیں۔ عموماً شام چھ بجے سے آٹھ ساڑھے آٹھ تک... نورین اتنی دیر جمی کے ساتھ ہوتی تھی۔'' میں نے کہا۔

''تم... پولیس والے ہو؟'' وہ سخت خوف زدہ ہوگئی۔

''نہیں... لیکن پولیس بھی آئے گی ناہید... کیونکہ نورین کے بھائی غلام رسول کا قتل ہوا ہے۔''

''اسے ڈاکوؤں نے مارا تھا... مجھے معلوم ہے۔''

میں اسے گھورتا رہا۔ ''اسے جمی نے قتل کیا تھا۔''

''جمی نے۔'' ناہید کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ ''کیا اسے پولیس نے گرفتار کرلیا ہے؟''

''نورین کے جمی سے مراسم کا علم اس کے بھائی کو ہوگیا تھا۔ تم نورین کی سہیلی ہو... نورین نے تمہیں کیا بتایا تھا؟''

''وہ... وہ کہتی تھی... جمی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ بہت دولت مند ہے... بہت اچھا ہے...'' اس نے بتانا شروع کیا۔

اس کہانی میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ یہ غربت اور امارت کے درمیان باہمی ضرورت پوری کرنے کی وہ تاریخ تھی جو ہر زمانے میں ہر جگہ لکھی گئی اور لکھی جا رہی ہے۔ نورین وہ لڑکی تھی جو فلموں اور اسٹار پلس ڈراموں کے گلیمر میں کشش محسوس کرتی تھی اور جوانی کے جذبات اسے مجبور کرتے تھے کہ وہ شادی سے پہلے ہی یہ زندگی اپنانے کا کوئی راستہ خود تلاش کرے ورنہ ماں باپ نے اکرم جیسے کسی ماموں زاد کے ساتھ باندھ دیا تو باقی ساری عمر پاؤں کی جوتی بن کے جوتے کھانے اور بچے جنتے گزرے گی۔

اس کے برعکس جمی وہ نوجوان تھا جو قوتِ خرید رکھتا تھا۔ وہ بھی جوان تھا اور اس کے جذبات بھی سیلاب بے عناں کی طرح تھے۔ فائدہ اسے یہ تھا کہ اپنی دولت سے وہ جذبات کی تسکین کا سب سامان خرید سکتا تھا۔ بازار میں نورین جیسی سیکڑوں ہزاروں لڑکیاں موجود تھیں جن کو ایکسپلائٹ کیا جا سکتا تھا۔ نورین ہوگئی... کیونکہ ان سیکڑوں ہزاروں لڑکیوں کے عام سے غریب شریف اور باعزت کہلانے والے ماں باپ ان کی خواہشات کی تکمیل کر ہی نہیں سکتے تھے نہ وہ روایتی شوہر جو صبح سے شام تک مزدوری یا کلرکی کرتے تھے اور پھر رات گئے کسی ویگن کی کھلی چھت پر بیٹھ کے گھر آتے تھے۔

اس کہانی کے دوران میں نورین کا فون پھر آیا اور صائمہ نے بڑی صفائی سے جھوٹ بول کے اسے ٹال دیا کہ ابھی وہ اسلام آباد میں ہے لیکن دوپہر تک وہ ضرور اس کے پاس پہنچ جائے گی۔ اس نے صائمہ کو بتایا کہ گزشتہ رات پولیس نے اس کے گھر والوں کو ماموں اور ماموں کے بیٹے سے ملنے نہیں دیا اور غالباً رات بھر ان پر تشدد بھی کیا گیا ہوگا۔

ناہید نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کہا۔ ''اب یہ بھی بتا دو کہ تم اس بیوٹی پارلر میں کس سے ملنے جاتی تھیں... یا میں بتاؤں؟''

اس نے کہا۔ ''جب آپ جانتے ہیں تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''سچ خود تمہاری زبان سے اچھا لگے گا۔''

اس نے ہار مان لی۔ ''پہلے تو میں بال سیٹ کرانے گئی تھی۔ پھر وہاں کی مالکہ نے کہا کہ کیا میں ماڈل یا ایکٹریس ہوں؟ وہ سب جانتی تھی مگر انجان بن کے لڑکیوں کو اٹریکٹ کرنے کے لیے وہ یہی طریقے استعمال کرتی تھی۔ جب میں نے انکار کیا تو وہ بڑی حیران ہوئی۔ کمال ہے تم جیسی حسین اور خوب صورت جسم رکھنے والی لڑکی تو شوبزنس اور ماڈلنگ میں تہلکہ مچا دے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ میں لاکھوں کما سکتی ہوں اور بہت جلد ٹاپ ماڈل بن سکتی ہوں... اس کے پاس شوبزنس کے لوگ آتے ہیں... ایکٹر... پروڈیوسر... فوٹوگرافرز... وہ مجھے ان سے ملا دے گی... اس نے مجھے ایک فیشن فوٹوگرافر سے ملوایا جس نے میرا فوٹو سیشن کیا۔ بس اس کے بعد میں پھنس گئی۔ میں اس فوٹوگرافر کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس نے مجھے بلیک میل کیا اور دوسرے کچھ لوگوں سے ملوایا۔ ان میں جمی بھی تھا۔ لیکن اس نے نورین کو دیکھا تو اس کے چکر میں پڑ گیا۔ نورین بھی اسی طرح میرے ساتھ بیوٹی پارلر گئی تھی۔''

صائمہ نے کہا۔ ''تم گھر میں اکیلی ہو؟''

''نہیں... اوپر کے دونوں فلور ہم نے کرائے پر دے رکھے ہیں... ماں بیمار ہے... باپ کی نمک منڈی میں دکان ہے۔''

''کیا بیماری ہے تمہاری ماں کو؟'' صائمہ کو اچانک یاد آگیا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے۔

''اس کی ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں... کیلشیم کی کمی ہے... ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہڈیاں بھربھری ہوگئی ہیں... مشکل سا نام ہے اس بیماری کا۔''

''آسٹیوپوروسس۔'' صائمہ نے کہا۔

''جی... یہی ہے اسے... اگر وہ گر جائے تو اس کی ہڈیاں ٹوٹ سکتی ہیں اور پھر ان کا جڑنا مشکل ہوگا۔ وہ لیٹی رہتی ہیں باتھ روم بھی وہیل چیئر پر جاتی ہیں۔''

''تمہارے بھائی نہیں؟''

''چار بہنوں کی شادی ہوگئی... وہ سسرال چلی گئیں۔ چار بھائیوں کی بھی شادی ہوگئی... وہ بھی سسرال کے ہوگئے۔ انہوں نے لو میرج کی تھی مگر بہت دیکھ بھال کے اور ناپ تول کے... ان کے ''اِن لاز'' نے دامادوں کو باہر سیٹ کرا دیا۔ ابا اس عمر میں بھی کام کرتے ہیں۔''

''چنانچہ تمہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں رہا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے ایک پرانی کہاوت یاد آرہی ہے۔ بیٹیاں لے گئے جنوائی اور بہوئیں لے گئیں پوت... ہم رہ گئے اوت کے اوت۔''

صائمہ نے مجھے بدمزگی سے دیکھا۔ ''تمہاری ماں کے نو بچے ہی ان کی بیماری کے سبب بنے۔''

ناہید نے کہا۔ ''چار مر بھی گئے۔''

میں نے کہا۔ ''ناہید... کیا تمہیں اندازہ ہے کہ قانونی طور پر تم بھی مشکل میں پڑ سکتی ہو۔''

وہ رونے لگی۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ نورین نے خود مجھ سے کہا تھا کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔''

''تمہارے منہ سے پیار محبت کی اور عیاشی کی کہانیاں سن کے اس کو للچانے والی تم نہیں ہو... بالکل اسی طرح جیسے بیوٹی پارلر کی مالکہ نے تمہیں ورغلایا تھا... برائی کا راستہ قدرتی کشش رکھتا ہے اور اس عمر میں بہت خوب صورت بھی لگتا ہے۔''

''اب میرا کیا ہوگا سر؟'' وہ روتی رہی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو لڑکی! یہ ایک قتل کا کیس ہے۔ جب جمی سے تفتیش ہوگی تو نورین کا نام آئے گا۔ نورین تمہارا نام لے گی کہ اسے جمی سے ملوانے والی تم تھیں... پھر تمہیں یہ سب بتانا پڑے گا۔''

''خدا کے لیے مجھے بچالیں سر۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے آنسو صائمہ پر کیا اثر کر رہے ہیں۔ یہ اس کا پرانا محلہ تھا۔ نورین اس کی بچپن کی سہیلی تھی اور ناہید اس کی سہیلی کی سہیلی تھی۔ وہ جذباتی ہو رہی تھی لیکن میں اس کیس کو قانون کی نظر سے نہیں... حالاتِ حاضرہ کے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کراچی میں بیٹھ کے میں نورین یا ناہید جیسی کسی لڑکی کی کچھ مدد نہیں کر سکتا... میں کتنا بڑا توپ صحافی سہی... نہ میرا کالم... نہ میرے مراسم اور نہ میری قانونی مدد ان کو بچا سکتی تھی... ان کو بچانے کا صرف ایک طریقہ تھا یہ کہ میں کچھ بھی نہ کروں۔

اچانک صائمہ نے پھر ایک ڈاکٹروں والا سوال کر دیا۔ ''تمہارا تو اب خاصا تجربہ ہے... لیکن شروع میں ایسا ہوتا ہے کہ تم جیسی لڑکی بن بیاہی ماں بننے کا سن کے گھبرا جاتی ہے اور پھر وہی اس کی مدد کرتے ہیں جو اس مصیبت کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ بلیک میل ہونے کا ایک اور راستہ کھل جاتا ہے۔ کیا ایسا نورین کے ساتھ بھی ہوا؟''

میں نے دل ہی دل میں صائمہ کی ذہانت کا اعتراف کیا کیونکہ یہ سوال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ شاید آ ہی نہیں سکتا تھا۔

''وہ... آج کل مشکل میں ہے...'' ناہید نے اپنے آنسو خشک کیے۔

صائمہ کے لیے شاک کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ ''اب اس کی مدد کون کرے گا؟ وہی جمی؟''

''وہ... وہ کہہ رہی تھی... کہ وہ خودکشی کرلے گی۔''

صائمہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''دیکھو ناہید! میں ایک ڈاکٹر ہوں اور یہ ہیں بزدل صاحب... بہت بڑے اور نامور صحافی... ہم یہاں نورین کے بلانے پر آئے تھے۔ اس کی مدد کرنے... غلام رسول کے قاتل کا پتا چلانے۔ قاتل تو ہم نے تلاش کرلیا ہے لیکن اس قاتل کو سزا دلوائیں تو یہ سزا خود نورین کے لیے ہے... اور تمہارے لیے... قاتل کا اور دلدار کا ہاتھ ایک ہی ہے۔''

میرے ذہن میں فیض کے الفاظ آئے۔ میرے قاتل میرے دلدار... میں نے صائمہ کو نکلنے کا اشارہ کیا۔ ''ناہید! مجھے نہیں معلوم تم جیسی اور نورین جیسی کتنی لڑکیاں ہوں گی جن کو جمی جیسے... اس فیشن فوٹوگرافر جیسے اور بیوٹی پارلر کی مالکہ جیسے لوگ

www.kahopakistan.com

SCAN DOT

مل کے بدنامی کی اس خوب صورت دلدل کی طرف دھکیل رہے ہیں جو بڑی گلیمرس ہے۔ گناہ کی لذت اس عمر میں بڑی کشش اور بڑا لطف رکھتی ہے۔ پھر دولت کی مقناطیسی قوت ہے جو سب کو کھینچتی ہے۔ میں نہ کوئی مسیحا نہ پیغمبر... نہ لیڈر اور نہ مصلح قوم... مجھ سے پہلے بھی یہ سب ہوتا رہا اور کوئی بھی شیطان کو نہ روک سکا کہ وہ گناہِ آدم کی خواہش کا وجود مٹا دے۔''

صائمہ نے گھڑی دیکھی اور بے چینی سے پہلو بدلا۔

میں نے کہا۔ ''سوری... میں کالم بولنے لگا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں یا قانون یا اس منافق سوسائٹی کے ٹھیکے دار مل کے جی جیسے لوگوں کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ اس بیوٹی پارلر کا وجود ختم کر سکتے ہیں... ہاں ہم تمہیں مزید خرابی اور پریشانی سے بچا سکتے ہیں اگر تم بھی ایسا چاہو...''

''کیا تم ایسا چاہتی ہو؟'' صائمہ نے پوچھا۔

ناہید نے سر ہلایا۔ ''آپ نورین کی مدد کریں گی۔ پلیز مجھے بھی بچا لیں۔''

میں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ''تمہاری زندگی تمہاری اپنی ہے۔ اسے جیسے چاہو گزارو... میں تو صائمہ کی وجہ سے یہاں آ گیا تھا۔ اور صائمہ کہے گی تو میں نورین کو ایک بار اس دلدل سے یوں نکال لوں گا کہ اس کے دامن پر داغ تک نظر نہیں آئے گا۔ وہ بھی اگر دوسری بار گرنا چاہے تو اس کی مرضی... میری یہ زندگی صائمہ کے لیے ہے... اس کی سہیلیوں کے لیے نہیں۔''

ناہید ہمیں دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئی۔

''بزدل صاحب! میں کیا کروں؟''

میں نے پلٹ کے کہا۔ ''کچھ نہیں... سمجھو ہم یہاں آئے ہی نہیں تھے۔ تم سے ملے بھی نہیں تھے۔''

جب میں صائمہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کی تو صائمہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور مسکرا بھی رہی تھی۔

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہی ہو مجھے؟ اور یہ بارش میں دھوپ کیسی...؟''

''مجھے ناز ہے تم پر... تمہاری محبت پر... اور اس پر جو تم میرے لیے کرتے ہو۔''

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ''پلیز یہ مجھے لکھ کے دے دو۔ میں فریم کرا کے اپنے کمرے میں لٹکا لوں گا یا تعویذ بنا کے پہن لوں گا... کون سا گھر ہے نورین کا؟''

اس نے کہا۔ ''پہلے تھانے تو فون کرو... وہ بے گناہ پٹ رہے ہوں گے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں... تم کیا سمجھتی ہو... جو فاروق نے مجھے بتایا تھا اور جو نورین نے تمہیں بتایا، وہ اس تھانے دار شرافت کو پہلے سے معلوم نہیں ہوگا۔ یہ گاڑی اس نے مجھے رشوت میں پیش کی تھی۔ میرا منہ بند رکھنے کے لیے۔ جمی نے جو کچھ کیا۔ پولیس کو اعتماد میں لے کر کیا ہوگا۔ اس بیوٹی پارلر میں جو کچھ ہوتا ہے، پولیس کو اعتماد میں لیے بغیر نہیں ہوتا۔ یہاں وہاں ہر جگہ... یہ وی آئی پی اور وی وی آئی پی... ان کی بیگمات اور نام نہاد بیگمات... سیکریٹری اور پرسنل اسسٹنٹ... داشتائیں اور محبوبائیں... سب ایک ہی حمام میں ہیں... لیکن وہ بے لباس نظر نہیں آتے... کیونکہ ان کا حفاظتی لباس ہے ان کا پیسا... ان کا اثر رسوخ... ان کی طاقت... اور یہ جو تم جیسے خوش فہم سمجھتے ہیں کہ میڈیا کی بڑی طاقت ہے... میں ایک کالم سے سب کی ایسی تیسی کر سکتا ہوں... تو حقیقت یہ ہے سوئٹ ہارٹ کہ میں بزدل ہوں... نام کا نہیں... کام کا بھی... نیت کا بھی... پھر میرے جیسے بزدل ہی ہیں جو آج کی ہر خرابی کے ذمے دار ہیں۔ کیونکہ ہم سمجھوتا کر لیتے ہیں اپنے مفادات سے... ڈر جاتے ہیں... جو ڈر گیا سو مر گیا۔''

''تم پھر کالم بولنے لگے۔'' صائمہ نے شوخی سے کہا۔

''یہی ہے نورین کا گھر۔''

میں نے گاڑی روک کے کہا۔ ''مری میں برف باری ہو رہی ہے۔''

''ہونے دو... جہاز پر ہماری شام کی بکنگ ہے۔''

''لیکن اب ہم دو نہیں... تین ہوں گے... نورین کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے ہمیں اسے اپنے ساتھ کراچی لے جانا ہوگا۔ تم اس کی سہیلی ہو۔''

''میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں...'' صائمہ نے کہا۔ ''نورین کو اس کے بار گناہ سے نجات دلانے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں... مگر تیسری سیٹ اب کہاں ملے گی کل سے پہلے۔''

کال بیل بجانے سے پہلے میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ... ہم نورین کو اپنے ساتھ مری تو لے جا سکتے ہیں... برف باری دکھانے... اس کا دل بھی بہل جائے گا اور تمہارا بھی۔''

صائمہ مسکرائی۔ ''ہاں... اس میں میرے لیے بھی خطرے کی کوئی بات نہیں... یہ ہو سکتا ہے... میں نے اسے بچایا تو وہ مجھے بچائے گی... تمہاری بدمعاشی سے۔''

میں نے ایک آہ بھری۔ ''کاش میں بدمعاش ہوتا جمی کی طرح... مگر میں تو بزدل ہوں۔'' پھر میں نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

www.kahopakistan.com

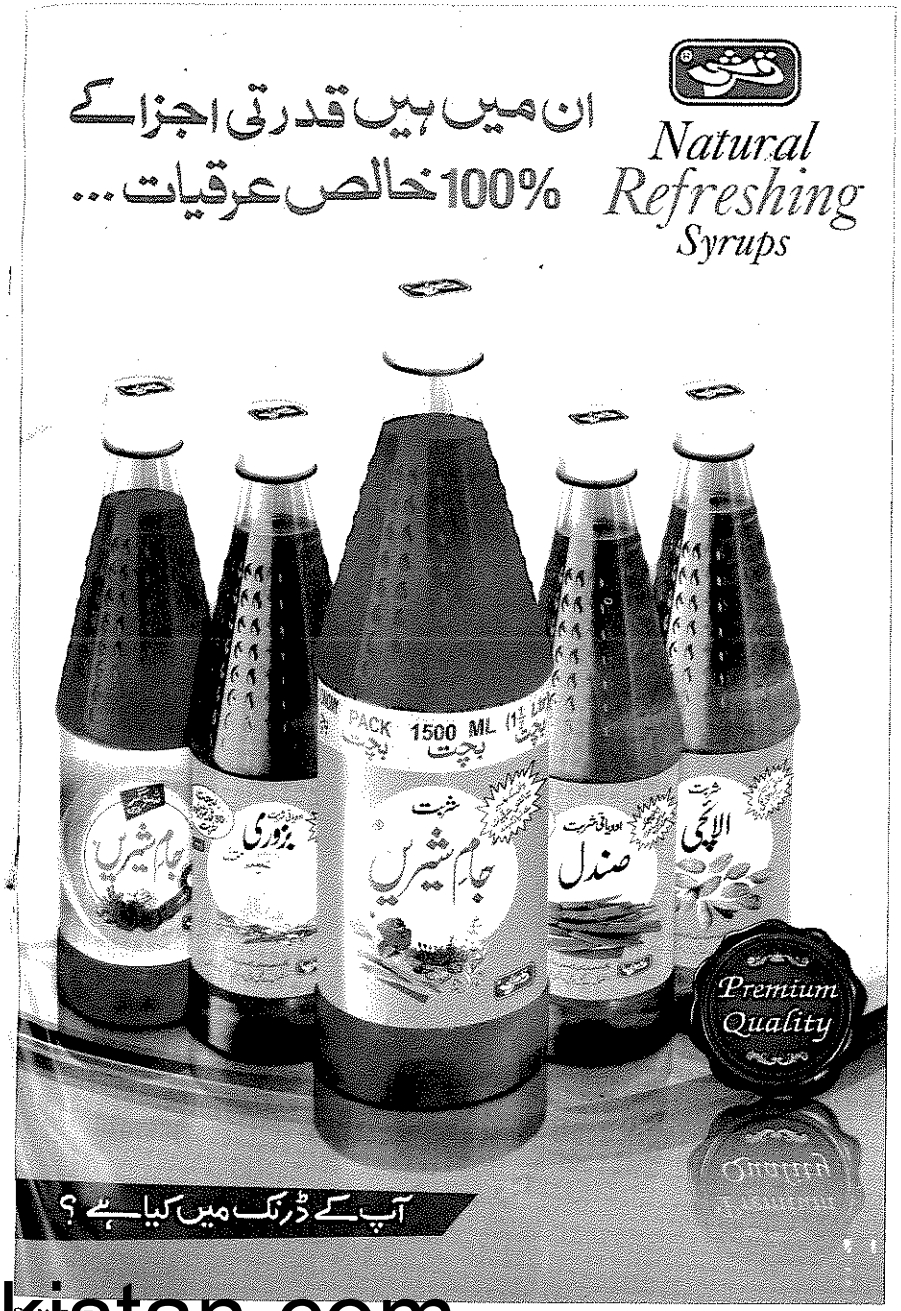

www.kahopakistan.com